

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
سینس ڈائجسٹ
ماہنامہ
مئی 2015
کھولنا
معراج رسول

MAY-2015 PRICE RS. 60/-

REGD. NO. SS-11

Monthly SUSPENSE DIGEST

Copyright



شربت فولاد

ایسا گھٹا کیا۔۔۔

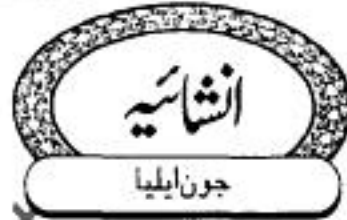
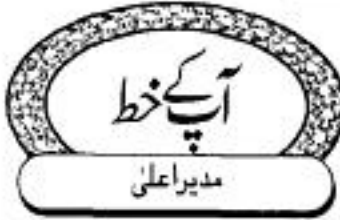
جسم میں آئرن کی کمی سے بے پروا رہیں، ہون سب ہی افراتفرات، کمزوری اور خون کی کمی
تیار یوں میں جھٹا رہے ہیں۔ تو ایسی صورت میں لیجئے قرشی شربت فولاد آئرن کی طاقت سے
بھر پور لائے جسم کی جان میں جان
کوئی عام نہیں صرف قرشی شربت فولاد۔

قرشی شربت فولاد کے فوائد

- جسم میں فولاد بڑھاتا ہے اور خون کی کمی دور کرتا ہے۔
- لوبڈ پریش میں مفید ہے۔
- غذا کو اچھی طرح ہضم کر کے جذب ہونے دیتا ہے۔
- بچوں کی نشوونما میں مفید ہے۔
- دورانِ حمل عورتوں کے لیے بہترین ٹانگ ہے۔

آئرن ٹانگ
پوری فیملی
کے لیے





08

سینس کا شادرت قارئین کی تحفہ
شرین تیرا کلمے اور پڑھو مشورے

07

ماہ مئی کے حوالے سے ایک
صاحب دانش کی خصوصی تحریر



43

قسطوں میں مکان مسموم و خستہ
کرنے والوں کی زندگی کا تاوان

16

ماہی کا آئینہ باقیہ اللہ تعالیٰ متوکلین
کے سبق آموز اور عبرت آئینہ العالمت



97

جہاں کتاب ایک غریب
سلطان کی بے دودھ سون کا ماجرا

62

اجلی کتاب اور مکروہ چہ سروں والی
شیطان قوتوں کی برہمت کا لرزہ خیز منظر



141

ایک مبارک کھلاڑی کے خاموش
اشتہا کا عجیب نمک منظر

114

تفسیر عمر کے شکار ایک جوتے کی بے بسی
اور بیگ صاحب کا انداز سیاں



دانش علی



قارشین

153

آپ کے ہاتھوں کی ایک ٹمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

150



منظر امام



مجدد الدین نواب

215

رشتوں کی حقیقتوں کو واضح کر کے
ایک دھندلا شش رو داد

168

ایک سوچنی سوچ بھی چھانوں کا صحت محبت کی
عنائیوں رفتوں اور رقابتوں کا ایک نیا سلسلہ



فرحت یاسمین



ضبیات نسیم بلگرامی

237

احساس بر شاری کی نسا کو فراموش
کرنے والے ایک جہیز کی اذان

223

دن و شب کا فخر سننے والے
ایک شعر کا خاص قصہ



طاہر جاوید مغل



سلیم انور

252

ظہورِ نظر کی نظیروں میں رہنے
کے لیے ایک اندھے راستے کا زندہ ماہر

241

پل بھر میں مات کھانے
والے ایک شرور کا ماحیر



OSÉM[®]

SILKY
TALCUM POWDER



 facebook.com/snscare

OSÉM PT. 14

دنگل

”ہیٹان! اسے صاحب و جوہر چہان، اسے صاحبِ جہت و برہان اور کلام کیا تھا جو ہم کر رہے تھے؟“
”صاحبی! ہم ان پانچ جوہری ہوں کے دھماکوں، جوہری ہوں کے ہتھی دھماکوں کے بارے میں کلام کر رہے تھے جو پچھلے دنوں ہندوستان نے کیے اور
مجھ جی کی ہیٹان، اس اور ایشی کے لیے اور زندگی کی نئی، نئی، شادابی اور شادیاں کی کونجے، ہے ڈھنگے اور لٹکے لٹکنے دیے اور پھر اس کلام میں برطانیہ کے
سارے راج کی سازشوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ کہا گیا تھا۔“

”ہاں ہیٹان! مجھے یاد آیا کہ اس کلام کا سلسلہ یہ تھا اور یہ بھی یاد آیا کہ پھر اس کے چند روز کے بعد ہم نے سرزمینِ خورشید آب و شاداب کا رخ کیا تھا اور اپنے
شجرے کے بزرگ سید وارث شاہ کے فیضان کے مہمان ہوئے تھے۔ ہم نے وہاں حقیقت کی حقیقت کے چھپنے سے اس کے مظہر اور معنی کا رزق حاصل کیا تھا اور
اس کی ہڈیوں کو کتوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔“

”حضرت صاحب، جوئی جی! کچھ ایسی ہی بات فارسی کے کسی مالی مرتبہ شاعر نے بھی کہی ہے۔ یعنی یہ بات کہ ہم نے مغز کا مرقان مرقان اور فیضان فیضان
کو سب کر لیا۔ اب وہی ہڈیاں تو وہ وقت کے برزنوں اور بازوئوں میں کچھ سے لگانے والے ہاتھروں کے تھوڑوں کے آگے ڈال دی ہیں۔“
”تمہیں خوب یاد آیا ہیٹان!“

”ہاں مجھے یاد آیا اور وہ یہ کہ ہندوستان کے جوہری ہوں کے دھماکوں کے بعد ہم دونوں پنجاب چلے گئے۔ کچھ دن بعد وہاں جو کچھ ہوا وہ تو بہت حیران
کرنے والا تھا۔ یعنی مئی کے مہینے کی کسی تاریخ کو پاکستان نے بھی جوہری بم کے پانچ دھماکے پھٹے کر دیے۔ اس دفاعی جہاد نے پنجاب کے خاص و عام کو پائے
کو بی دست افشانی اور وجہ کے حال میں مست و بے خود کر دیا اور جب ان دھماکوں کے دو دن بعد پاکستان نے پانچ اور پانچ کا حساب برابر کر کے چھٹا
دھماکا کیا تو پنجاب کے لوگوں کو کھرا بے معجزاتی فیضان کی رسد نصیب ہوئی جو کسی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔“
”تو بات یہ ہے کہ مجھے بھی پنجاب کے شہروں میں نشاط و طرب کی وہ کیفیت کا رخ یاد آگئی تھی جس کا کچھ آڑھوں کے بعد دو تین بار یہ تجربہ ہوا ہوگا۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ 1971ء میں سرحد پاکستان کے سقوط کے بعد پاکستان کے ہر فوجی بصرین نے جو خود کو تسلیم فرمائی تھی، ان میں اس حقیقت کا
اعتراف کیا گیا تھا کہ ہندوستان، پاکستان سے دو گنا طاقتور ہے۔“

”سالہا سال کی اس کیفیتی صورت معاملہ کے اختتام میں نقش ہو جانے کے بعد جب پاکستان نے ہندوستان کے پانچ جوہری ہوں کے دھماکوں کے بعد چھ
جوہری ہوں کے دھماکے کیے تو ہم جہاد کے سرور مقدس سے ہرگز ہموں۔ اور کوئی شپیش کہ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کو سمجھنے میں کچھ مشکل تھی۔
پھر یہ کہ پاکستان کے خواص اور عام کو جو اخلاقی برتری حاصل تھی، جوہری ہوں کی ہلاکتیں برساتے میں ہندوستان نے پہل کی تھی پاکستانی نے نہیں۔
میرے ان خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے شاعر و نثر نگار نے نہایت غیر شاعرانہ رویے کا ارتکاب کیا اور یہ کہ انہوں نے ہندوستان کے جوہری ہوں
کے پانچ دھماکے کے بارے میں پاکستان میں جو دھماکے کرائے۔ جن کا حاصل یہ تھا کہ

”ہیٹان! میں نے صورت معاملہ کے ایک رخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ میرے گمان میں قابلِ لحاظ حد تک درست ہے۔ مگر جانا اور مانا جائے کہ
اس کا ایک اور رخ بھی ہے اور اس کے باب میں پاکستان کے سب سے زیادہ کوشش کرنے والے مسکن کے نہایت محترم اور معتبر ماہروں اور عالموں نے ہمیں بڑی
دانش جوئی و دانش بلی، دانش یاری اور دانش مندی کے ساتھ پُر زور اور ارجمند اخراجات کیے ہوئے ہیں۔ ان کے اقادات کا جوہر یہ ہے کہ ہم اپنے اچھے ہونے
معاظلوں کو پہلو اتوں اور حاکمی کا روائی کے ٹر جوش اور جہاد پسند قومندوں کی طرح لے کر گئے تو عادلانہ خائے چت ہوں گے اور حریف ہمیں تاریخ کے
دھنگ میں بری طرح کندہ کر کے مارے گا۔ مانا کہ زندگی ایک دھنگ ہے۔ جس میں کتنی لڑی جاتی ہے اور کتنی جانتا ہے۔ ”لوکان“ جیسے داؤدار سے جاتے ہیں۔
مگر زندگی دھنگ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ علاوہ ہی سب کچھ ہے۔ دو دانش و دلیل، محبت اور برہان کی ایک مباحثہ گا ہے جہاں قوموں کی قسمتوں کے
فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں انسانوں کے جان اور مستقبل کے سب سے زیادہ اہم قضیوں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ اور دھنگ اور ”میدان واریوں“ کا دور نہیں
ہے۔ یہ لنگر اور تہہ برکادور ہے۔ اس دور کا ہم نے جو سب سے زیادہ توجہ طلب تقاضا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کو جوتھ کا کشتہ بگاڑ رہے ہیں جس جہت ارتقا کے
وسط اور گرد و پیش سے آگاہی حاصل کریں۔“

”ہم قائد کش اور خلافت زور و صمود کر رہے ہیں۔ ہم نہیں اور کئی یں کا ایک ہے ڈھنگا چوڑا ہیں۔ ہماری آبادی کے سب سے بڑے ٹکے کو کسی طرح بھی
”میدانِ باغی“ کے خانے میں مندرج نہیں کیا جاسکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ ”انیم انسان“ ہیں۔“

جان لیا جائے کہ میں یعنی جون ایلیا کسی بھی نسلی، لسانی اور مذہبی گروہ کی خوشنودی کھانے کی خاطر یہود و عیاری اور قلم رولات اور کاندھ کی فاشی کا مجرم قرار
پانے کے لیے اپنی آخری سانس تک تیار نہیں ہوں گا۔ سنا جائے کہ ”جون ایلیا“ کو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ انہیں تین ڈھانچے کے لیے
کچیلے چائیں۔ ان کے پیار و دعاؤں اور زچہروں کو دو ایمیں چائیں۔ ان کو دو قصوں کو کسی نہ کسی حد تک انسان کہلانے جانے کے لیے حرفوں کی شہد
چاہیے۔ یہ ذہن کی جراثیمی، جہاد اور جہاد کا دور ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو ماننے میں انکسار سے کام لے رہے ہیں، انہیں اپنے جسد کے لیے کافور اور کفن کا
بندوبست کر لینا چاہیے۔ وہ اعلیٰ اہل البلاغ۔

عزیز قارئین
السلام علیکم!

مئی 2015ء۔ موسم گرما کا دلچسپ شہرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ موسم چاہے گرم ہو یا سردہ آج حالات کی گرما گری نے ہر انسان کو ماحول بدلنے کی فکر میں مبتلا کیا ہوا ہے کیونکہ گوارا شعل کی وجہ سے سب کا مزاج برہم ہے۔ پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں جس طرح جھگڑا کا گمان ہو رہا تھا اور مثال بننے اور قانون کی پالادتی کا نعرہ لگانے والے جس طرح بد نظمی اور بے قاعدگی کا اظہار کر رہے تھے اور عالمی سطح پر میڈیا نے جیسے مناظر پیش کیے، کیا اس سے پاکستان کے شخص اور وجہ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ ایک گہرا فکر یہ ہے۔ غرض اس صورتحال کی سیاست سے حصارف کرانے اور بین الاقوامی سطح پر ایک نئی سوچ کو ترمیم دینے کا یہ طریقہ کس قدر مثالی ہے اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ عوام کے مفاد کا صرف نعرہ لگانے سے کام نہیں چلے گا، اس کا عملی ثبوت بھی چاہیے۔ یکم مئی پر عطا تو حیدر دونوں کے نام پر مٹایا جانے والا قطعہ ایک عالمی دن ہے۔ اگر اس دن اس طبقے کے مسائل کے حل کی جانب بھی کوئی بھرپور قدم اٹھایا جائے تو اس دن کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ جیسے کہ انجمنی تعلیم کا حصول اس طبقہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد یا اعتبار طبقے کے دل میں بے روزگاری کا موسم کے لیے دردناک واقعہ ہے مگر علاج کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاندار کالجوں کے لیے ممکنہ اسکولوں کے سہائے بہترین اساتذہ اور کم بجٹ میں تعلیم کا حصول ممکن بنادیا جائے تو ضرور طبقے کا ایک بڑا غم پورا ہو جائے، جسے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے لگایا ہے کے پٹے چبانے پڑتے ہیں، اس کے باوجود اکثر بڑا وہ نہیں ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم چھوڑ کر حاشیہ معاش کے لیے لگنا پڑتا ہے۔ اور یا ایک انتہائی خفیف دلوں کو ہوتا ہے جب کوئی اپنے مقصد سے ہٹ کر زندگی گزارنے کی طرف کاغذ مزاج اور چاہتی کر گرما گری باتوں کے بعد ہم چلتے ہیں اپنی ٹھنڈی چھاؤں میں قفل کی جانب، جہاں مطلق سکین ابراہان اور کہیں تھوڑا دھوپ ہے۔

بقیہ خان، واہ کینٹ سے محفل کی دعوت مئی 2015ء پر مل کا شمار سامنے ہے۔ گمان ابرو شہر تک رہیں، چار یا پانچ لالیاں سب دیکھنے کے لائق سوائے لڑکی کے۔ واہ کیا کہنے جون ایلیا کے کہیں انھوں کے۔ جو مصروف معاویہ، دیکھ کر تیرے کے ساتھ کمر بستہ رہے، ہر اور ساتھ دیکھ کر 71ء نے بڑیت، شرمندگی، شکست اور بے بسی کے اصل معنی سمجھ لیے تو قحط کھیل کے اس کو کھیل ہی سمجھیں۔ دکھ بھی ہمارے بڑا وہ نہیں ہے بلکہ یہ کہ ہم سے ہوتا ہے۔ طالب حسین علیہ السلام نے آپ کو با عزت بری کیا، ملاک ہو۔ دعا ہے دیگر بھائی بھی سرخ رو ہوں۔ تاہم سیال، ہمارے دل کے حال بھی اس کے دل جیسا ہے۔ آفریدی کے چچے پر بھی آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ کیا بڑا بھائی ہے کچھ ہو گیا، اس کا آسان حل یہ نکالنا کہ اب کچھ دیکھتی ہیں۔ کوئی نئی طرح کی صورت حال کی لیکن کان کنسٹری کی طرف دعائیں مانگ مانگ کر رہا ہے۔ بہر حال جیت کا اصل حق اسی کا ہے جو ابھی کارکردگی دکھائے۔ اب تو پڑوسی بھی کسی فاضل پار گیا۔ اپنی شکست کے بعد اگر کسی ٹیم کی شکست کا دکھ ہوتا ہے تو وہ اٹھتا ہے۔ یہ میری اپنے طبقے سے محبت اور وفاداری ہے۔ بہترین شہرہ احسان کرا، احمد خان توحیدی ا بڑے خطرناک مزاج ہیں آپ کے۔ ہم تو پہلے ہی ورلڈ بینک کے مقروض ہیں آپ مزید اضافے کی بات کر رہے ہیں۔ دیکھ جاتے تھروں کے ساتھ روٹی نیازی، مہرین، طاہرہ اور نادر سیال۔ ذریعہ حسن، درہواری، اور بیس خان اور ابراہان وارث نے بھی اچھا لکھا۔ اور ان کے گھبراہٹوں پر عرض کریں، ساری بھردی، دور ماندہ عشق کے فیروز، جیت کے ساتھ کمر اس نے سارے تجسس کا بیڑا فرقی کر دیا بھکاری بن کر۔ یہ مانا کہ عشق کے چھوڑات کر یہ کیسا عشق تھا خود بھیک مانگنے سالوں در در اور محبوبہ ڈنوا ڈنوا کی لیے آسو بھاتی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید لکھ، سچے سوئی، سوچ، صبح نور، صادق جہاں کے اسٹین اور دروول کی بے بہادری دیکھنے والے ڈاکٹر صاحب کی "معاذ" حاصل مطالعہ رہی۔ مذاپ ماضی، عمدہ کاوش تھی۔ اختتام آزر وہ کر گیا۔ سوائے جنوں، ڈاکٹر بھٹی کی نہایت عمدہ تحریر ہے۔ خدا کرے امت مسلمہ امریکی چالوں کو سمجھے، دعا ہے بین المذاہب ہم آہنگی ہو اور زمین فساداتی الارض سے بچے رہے۔ پانی میں شکار، مسام کی موت کی ذرے دار، بھلائی نہیں خود اس کی دوست بھی تھی جس نے آخر دم تک اچھا پر پردہ ڈالے رکھا۔ سلسلہ مکافات، مکافات میں پرکھی جانے والی انتہائی سنی آموز تحریر تھی۔ عظیم احمد کا نام مکی بار ستا ہے یہ میری کم علمی ہے۔ یوں لگتا ہے برسوں سے لکھ رہے ہوں، مکی بار ویکوں کی بہت زار سے آگاہی ہوئی اور یہ بھی مکی بار جانا کہ آسرا دینے والے بھی (شوکت چغتائی کی طرح) بے آسرا ہو جاتے ہیں۔ کاش! انسان اپنے بڑوں کی تعلیمات کو بہرا نہ۔ کاش! ہم ہر اس فیصلے کو در گردی جو ہم سے پہلے کر چکے۔ بارودی، اسکاٹ لینڈ یارڈ کی اسمارٹ آفیسر مریمہ کھوئی والے پر مرملی کیونکہ وہ اپنے چلنے پھرنے میں مریمہ کے ہیں۔ منظر نامہ کاش و نیاس میں کوئی ایسا جزیرہ ہوتا۔ فرزند دروغ، بندوبست، بزدل، چال اور دوسری شکست بھی ٹھیک تھیں۔ اشعار میں ضیف، گول، مہرین، مذاہد چوہدری، ذویب احمد، مونا نیازی اور محمد علی کے اشعار اچھے لگے۔ تو اب لڑیں اور کتر نہیں بھی خوب تھیں۔"

انجناز احمد راسیل، مای، ضلع ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "بندہ ناچز آپ سب کی خیریت کے لیے دعا گو ہے۔ ماہ اپریل کا خوب



صورت شمارہ بروقت مل گیا اور بہت خوشیاں دے گیا۔ بہاروں کے اس موسم میں گویا ہم نے بہار کے حزرے کوٹ لیے ہیں۔ میں ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے میرا رابطہ ایسے لوگوں سے ہوا جن کی کوئی وجہت پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔ وہ محمد میری زندگی کا حاصل تھا جب مسافر کے حقیقی کارسماٹر جگہ کے میں بروقت تھا۔ چوک اعظم لپے کے یہ زندہ دل انسان اور عظیم قلم کار اپنے دل میں ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ سے وابستہ لوگوں کے لیے کتنی محبت رکھتے ہیں، اس بات کا اندازہ مجھے ان سے ملنے کے بعد ہوا۔ سرور قی پر جو مجھ کو پہلے دل نواز شولڈر پر بٹھائے اس وراثتی کا آدرش دینی نظر آئی۔ فہرست حسب سابق قابل ستائش امانت میں سچائی مکی۔ انشاء یہ میں جون ایلیا صاحب کی حکمت و دانش تاجیں نگاہ قلب سے پڑھنے کے بعد ادارہ جاسوسی میں ایڈیٹر صاحب کی پر فکر باتیں ملاحظہ کرنے کے بعد محفل گلستان میں قدم رکھا تو اس وقت بھائی منصور صاحب ہاتھ گلاب نظر آیا۔ بھائی صدائے مبارک ہو..... فریب حسن ہم بھی کچھ توں کے سفیر جناب طاہر جاوید غل صاحب کی کوئی داستان پڑھنا چاہتے اور میں احمد ابراہیم وارث، رمضان شاہ، احمد خان جویدی کے تہرے بھی اچھے لگے۔ دو شہزادہ راجہ زاہد آپ کا حسن نظر ہے۔ مہرین تان زاور اپنا مشہور پڑھ کر بہت خوش ہوئی۔ محمد قدرت اللہ نیازی بھائی بھی زبردست تہرہ کر گئے ہیں۔ سید محی الدین اشفاق آپ کے شہر میں ہم آئے اور آپ کو فخر ہوئی۔ سب سے پہلے حسب معمول عبدالرب بھٹی صاحب کی سوائے جنوں پڑھی۔ اسٹوری بہتر سے بہترین کی طرف کا مزن ہے۔ عابد شکھری کا اسٹوری میں چھاپا ہوا ہے فخر اور شریک جنگ میں انشاء اللہ آخریت فخر کی ہوگی۔ سوائے جنوں کی موجودہ قسط کا اختتام تحسین کو حوزہ ہوا دے گیا۔ میں بھی اس وقت کافی ہنگامے نظر آئے۔ اس دنیا میں کوئی عیاشی شاید پرکھ لے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ محبوب کی ماضی کی تلخی عیاشی کی کوہ ماروی سے باہر بیٹھا۔ ویلڈن نواب صاحب۔ آخری صفحات پر عظیم احمد کی سلاسل مکالمات بہت ہی خوب صورت اور غور طلب اسٹوری ثابت ہوئی۔ انسان اپنی میں کیا کچھ کرتا ہے اس بات سے بے خبر کر کل کو یہ سب کچھ اس کے اپنے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ بیگم چٹائی کو بھی مکالمات عمل سے دو چار ہونا پڑا۔ عشق، عشق نہ کچھ ذات غیر و زبخت کی داستان عشق کافی دلدوز ثابت ہوئی۔ عشق بھائی انسان کو ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ فخر و زبخت کو کوہ ماروزہ مری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ کاشف زہیر صاحب کی طراب ماضی اور شرم عباس کی بزدلی میں بے مہرہ دلا جواب ثابت ہو گیا۔ ویلڈن۔ محفل یعنی محفل شعر و سخن میں مہرین تان زاور اور راجہ زاہد عظیم بشارت یہ کمال کے اشعار اچھے لگے۔ اگر یہ اشعار بیست بیست بیست ثابت ہوں۔

۱۲۰ و سیم احمد خان، محفل میں شریک ہیں۔ "مائل بر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے کلام بخود کہتے ہیں کہ وہ بنگلہ ٹاؤن میں حیدر نے بازو پر ٹیڑھ بخود کہے ہیں مگر خود کر کے برے معلوم ہوا کہ حیدر کے ڈراموں کا کلام اسکن ہے۔ حیدر کے کاندھے پر بیٹے کو ترانے مائل کی خوب صورتی کو بڑھا دیا۔ انسانیہ کے بعد محفل میں پہلے منظور علی، بھائی مبارک ہو بھئی، مارچ میں وزارت اور اپریل میں صدارت و خلیفہ۔ آپ کا تاجر و بہت اچھا لک۔ طالب حسین طلیح بھائی آپ کو مبارک ہو کہ انکس ہوئی آپ با عزت بری ہو گئے۔ احسان عمر بیارے ہمیں آپ کے کلمے کہ محفل یا داراں میں مختلف علاقوں کے لوگ اپنے علم اور سمجھ کے مطابق چونکے ہوئے نظر آئے۔ خطوط کے ایڈ میں ہم نے اپنے آپ کو بیک بک کی صدارت کرتے ہوئے پایا۔ کہنا میں کا آغاز جمال دینی کی پالی میں شکار سے کیا۔ بھائی کی جالاکا ایک آنکھ نہ بھائی۔ منظور عام کی سنجیدہ وی اسٹوری سنجیدہ و جلال میں اچھی لگی۔ پناہ گاہ میں حاکم کو پروفیسر قدوائی کی صورت میں اپنا نام رکھا۔ بھائی نے عباس کی بڑوں میں کوثر نے جینی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بندوبست میں تنویر حسین نے کتا دو کی کٹیڑوں کی حفاظت اور انجیل کی ملازمت کا اچھا بندوبست کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی گھاڑی بھی صبر حاضر کے مطابق زیر دست تحریر رہی۔ مرم و مدد بٹ کی حسین اتفاقات کہانی کا نام اور کہانی کا سبیل ایک ساتھ کس میں ہوا۔ ملک منظور حیات کی فرزندہ دروغ میں آسیہ کی موت کا دکھ ہوا۔ محفل شعروں میں اس مرتبہ کچھ خاص مٹاؤ نہ کر سکی۔ سب اشعار اس ٹیک کی گئے۔ کچھ نہیں اور معلومات سب دلچسپ رہیں۔ 23 مارچ قرار داد پاکستان کا دن اپنی رنگی کارڈ والی کے ساتھ گزر گیا۔ آج پاکستان کا حال دیکھ کر دل خون کے مسکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے۔ آمین۔"

مرزا طاہر الدین ایک میر پر خاص سے چلے آ رہے ہیں۔ "سپنس اپریل میں دہلی پہنچے اور شعر شائع ہوئے بڑی نوازش۔ شکر ہے۔" الیاس صاحب کی رومانوی کہانی میں بھی ہمدردی سے درمیانہ مشق بہت خوب کہانی رہی۔ چڑھ کر کہیں کہیں سے رومانوی کردار جیسے علی بیٹوں، پیر راجھا، شیریں فرخاں اور سوہنی ماہیوال الیہاں سب لوگوں نے مشق میں کچھ نہ کچھ کیا۔ کسی نے دودھ کی شہرت کو کوئی سرو چاڑ کر ادھش میں امر ہو گئے آئے مگر الیاس صاحب کے فیروز بخت نے تو کمال کر دیا۔ فحش اور راج کو کلات مار کر ایک بھکاری کے مشق میں بھکاری بن گیا وہ بھی ایسے ویسے نہیں۔ ساری برادری کے من پسند بھکاری۔ الیاس صاحب کیا خوب اور محنت کہانی لے کر آئے۔ بہت خوب۔ درخواست ہے اس کی کوئی دلچسپ کہانی پھر ہو جائے۔ بندوبست خور یا ض، بڑول، قمر عباس کی کہانیاں خوب محنت سے لکھی گئی ہیں۔ الیاس صاحب بڑی دلچسپ کہانی لے کر آئے۔ پانچواں قدم والی صاحب مجھے کردار محظوظ صاحب کی لکھ سکتے ہیں۔ عظیم صاحب کی آخری صفحات میں جگر پختا کی شہرت بگڑ کہانی ہے۔ سچ ہے جیسے کہانی دیکھی بھرنی۔

۱۰ رمضان پاشا گھن اقبال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ۲۰15ء کے سہس کے سرواق کی دوئیزہ نہ صرف مسکن جی بلکہ سندرت بھی تھی، کبوتر بھی خوب صورت اور توانا تھا۔ انتہیہ جوان صاحب سے نہایت پائے کا سبق اذہر کیا۔ محفل میں اول نمبر پر آنے والے محمد منور معادی کو مبارکباد و موصوف کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ تاہر سیال بھائی آپ کا شعر یہ کہ آپ نے اپنے تبصرے میں اسی حقیر فقیر کا بھی ذکر فرمایا۔ اشعار کی محفل میں عمران کاظم، رشیدوار، عبدالجبار رومی انصاری کے اشعار بہت پسند آئے۔ سب کو داد دیتا ہوں اور اب کہتا ہوں پر تبصرہ۔ سوائے جنوں اور مارو کی کیا



فطین بہت دھماکا خیز تھیں۔ شش و پنج میں مبتلا ہوں کہ کسے اول نمبر دوں اور کسے دوم۔ سلاسل مکافات، یہ ناول بہت عمدہ تھا۔ حسین اعلا تات، غیر ملکی کہانیوں میں سب سے اعلیٰ درجے کی کہانی تھی۔ بہت لطف آیا۔ گھاؤ حسب معمول شیر شاہ صاحب نے ایک حساس موضوع پر مضمون تحریر کیا۔ انعام پر آنکھیں لم ہو گئیں۔ بندوبست نہایت پور کہانی تھی۔ چال، بہت دلچسپ، اچھے کو تھپسا، پتا گاؤ، اس بار منظر صاحب قاری کو ہٹانے میں ناکام رہے۔ دوسری شکست، خاصی متاثر کن تھی۔ سائنسی کہانی مذاب ماضی نے دل میں بڑا تھلکہ بچا دیا۔

محمد قدرت اللہ نیازی، تجسیم ناؤن، غانیوال سے تہرہ کر رہے ہیں۔ اپریل 2015ء کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ مری کا اثر سرور قی پر بھی نظر آیا۔ جون ایلیا کشیدہ حکمت کو پانے کا مشورہ دیتے نظر آئے۔ ادارہ پر کرکٹ و سیاست سے مزین رہا۔ گوارنٹر قائل میں شکست کے فوری بعد کچھ کھلاڑیوں کو ملے اور قبیحہ لگاتے دکھایا گیا۔ شاید مکر و ابھری کی خوشی انہیں قبیحہ لگانے پر مجبور کر دی تھی۔ مری صدارت پر اپنے شیر غانیوال کے محمد منصور صدادیہ کو قابض دیکھ کر ہم بھی خوشی سے بھول کر کہا ہو گئے۔ تہرہ کافی جامع تھا جس میں حالات حاضرہ کو بھی موضوع بنایا گیا۔ ورلڈ کپ میں بھارت سے ہارنے کی روایت ہم سب کے لیے افسردہ کی کا باعث ہے۔ محمد منصور بھائی آپ زیادہ دل پر نہ لیں۔ زیب حسن! آپ آتے رہا کریں۔ سال میں ایک دفعہ آنا کوئی فارمولہ تو نہیں ہے۔ آپ کی تجویز سے ہم متفق ہیں اور اس مطالبے میں آپ کے ساتھ ہیں۔ طاہرہ مکراد کا شکوہ سے بھرپور تبصرہ بھی کافی پر اثر رہا۔ طاہرہ باقی اہم تذکرہ نہیں کیا کرتے۔ اس بار آپ کا جائداد تبصرہ دیکھ کر داد و اوادوار کر رہے ہیں۔ اور یس احمد خان مہر فیک کو آواز دیتے نظر آئے۔ برابر وارث! یہ تو ابھی بات نہ ہوئی تھی۔ محمد خان توحیدی! نواب انگل نے آپ کی بات مان کر ماری اور مہرادی کی شادی کروادی ہے۔ فی زمانہ یہی ایک بلا ہے اور بلا ایک ہی کافی ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں تو مزید کی حسرت نہیں ہے۔ ہاں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ یاد سیال! پاکستان کا بیچ دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ 15 سے 20 روز بعد دیکھا جائے۔ در شہار! انجمن المسک زکوٰۃ لگاتی رہتی ہیں ڈونٹ وری! اور آپ کے لیے ایک مفت مشورہ ہے کہ بنا ہتھی چیزوں سے ڈراؤ اور ہاتھ نہ پھیرنا۔ مہرین! ناز اور اعجاز قائل کا مشترکہ محبت نامہ پڑھ کر دودھ جھریکے سے متوئے "دنیا ایک گولٹھا دلچ ہے" پر یقین آ گیا۔ عبدالجبار ماری انصاری! اور سہیل! آج کے سسٹمز نے بلاشبہ ہر سے پاکستان کے قارئین کو ایک رشتے میں جوڑ رکھا ہے۔ حسان محمد! کافی شاعرانہ انداز تبصرہ تھا۔ مکراد کی باتوں کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ انہیں بھی پتا چلنا چاہیے۔ دبی بات بات کچر کی تو وہ اب ایک کھاراز ہے۔ عیسیٰ الدین اشفاق! سسٹمز کا شمارہ 17 تک آ جاتا ہے ڈراؤ دیکھ کر سہیل! سسٹمز سے طلب کریں تو آپ کو یقین مل جائے گا کیونکہ یہ میرا آزمودہ نسخہ ہے کہانیوں میں سب سے پہلے درمائدہ مشق پڑھی۔ پہلے محمود و مہرادی! دواؤں نے وزیر بخت تینوں نے مجب مشق قیسے ترتیب دیے۔ تاہم فیروز بخت سب پر باقی ہے کیا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ مشق نہ پچھے ذات۔ فرخندہ کو کھیل سہل کرنے کے لیے اس نے اپنا مال دودھ و لٹ۔ کار و بار چاند ادب لٹادی۔ الینہ فرخندہ! کوکاش! کہ وہ ملک التجاری کی بیوی کہلائے پوری نہ ہوگی۔ سوداے سسٹمز میں عابد اور نامہ اسرا انگلی آبدوز پر اسرائیلی فوجیوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں اور انہیں پانی کے دہانے پر دیکھیں اب کیا انجام ہوتا ہے؟ ماری میں شش کا مراد اور ماری رشتہ از دواؤں میں بندھ ہی گئے۔ محبوب اور میرا تمام مددیں پڑ کر گئے ہیں۔ شاید اب سیرا کی بات بھی بن جائے۔ بے اور ملی کا کاہل بھی مزہ دے گیا۔ آخری صفحات پر عظیم احمد سلاسل مکافات لے کر آئے۔ عظیم نے اپنی باپ سے جو سلوک کیا! قارئین ان سے وہی سلوک کیا قیاس قیاس ان کا انعام! اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ قارئین! جس طرح بیگم چغتائی کے وکیل کو کوشتیں داد اس سے اس کی نفی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ شاید منظور! اس سے آگاہی! ثابت ہوا۔ کاشف زیر کی مذاب ماضی مستقبل کی سائنسی سرگرمیوں مشعل ایک تصوراتی کہانی تھی۔ سسٹمز، انکیشن اور قمری! مہر پور کہانیوں میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید حسب معمول ملی سسٹمز کی کڑی پر افسردہ نظر آئے۔ مری میں کی بڑوں نے بہت کھرا اثر چھوڑا۔ کوثری! دوت کوثری نے سسٹمز کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی زندہ در گور کر دیا۔ کوثری بڑی مکر آڑے آئی اور ازلے کا جو ایک موقع اسے ملا اس نے وہ بھی مٹوایا۔ پتا گاؤ، پتھر امام کی ایک علامتی تحریر تھی جس میں انہوں نے شش بلیج معاشرے کی برائیوں اور سیاست کے کندھاؤ کر کیا۔ باربریم کی دوسری شکست مری کے آزاد ماحول کے محتاج افراد کے لیے ایک سبق آموز تحریر ہے۔ جہاں لڑکیوں کو شوہر ڈھونڈ کر انہیں نہ صرف سپورٹ کرنا پڑتا ہے بلکہ شوہر کی محتاجی میں سرگرداں دیکھ لڑکیوں سے بچانا بھی ہوتا ہے۔ کزنوں میں اسے ہاسٹل کی کزنوں نے مزہ دیا۔ محفل شعر و سخن میں شازیہ کمال کراچی اور جاوید بلوچ کا احتجاج بہت آیا۔

نرویا! اعجاز، لاہور سے تشریف لائی ہیں۔ 3 ماہ کے عمل و قلم کے بعد آج قلم اٹھایا ہے اور سسٹمز کی محفل میں حاضری دینے حاضر ہیں۔ ڈائجسٹ اس بار 17 مارچ کی ایک پُر بہار شام کو موصول ہوا۔ چائل ایک آنکھ نہیں بھایا بلکہ اسے انجور کرتے ہوئے جون ایلیا سے کشیدہ حکمت و دانائی کی میراث کے موتی سپینے۔ محفل کے شرکا اور تمام ہم وطنوں سے ان صاحب کے ذریعے عالمی کپ کے اربانوں اور انگلوں کے نامہائی وصال کی ہم تعزیت کرتے ہیں۔ بڑے بے آبرو ہو کر ایڈیٹنگ کے کوچوں سے ہم شکستیں کھاتے ہیں۔ ہمارے ارادوں اور حوصلوں کی دیواریں کون سی کھڑ ہیں۔ اس امر سے آگاہی کے باوجود کہ کمیلیوں میں سیاست اور سازشیں دھیل ہیں۔ ہم آئندہ میں بھی بی اپنی واپسی کا سفر جاری رکھیں گے۔ الیاس بیٹا پوری کی درمائدہ مشق کا آخری پڑاؤ بہت سے اتار چڑھاؤ کے بعد مقام ہوا۔ پہلے ہی حصے سے اسی کے تمام تذکرہ دار اپنے جیکہ کا مکمل آئینہ تھے۔ فیروز بخت کا بھاری مشق کی خاطر دیر پوز مری بھی احسن کا شمار ہو جاتا ہے۔ فرخندہ کی زندگی کا نقشہ خواہشات کا مرتبہ بن جاتا اس کے اپنے اعمال کا سلسلہ تھا۔ اگر کچھ سے کام لیتی تو نہایت معزز اور پرنسپل زندگی بنائیں کھولے اس کی ششگر تھی۔ سائنس فکشن کی کہان اس بار کاشف زیر کے ہاتھ میں نظر آئی۔ غلامی سطر اور قدرت کے ہمہ پیش انسان کے لیے ایک معما بنے رہیں گے۔ کہانی نے عمل طور پر سحر زدہ دکھا۔ سوداے جنوں! ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی محفل نگاہ اور مہر کی



ریحیج کا واضح ثبوت ہے۔ یہودیت کے تانے بانے آشکار کرتے ہیں کہ ان کی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ حسین اتفاقات میں روح کی محفل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔ انیس کے ساتھ کی مٹی کا حق ہے وفا کی کا کا قابل فراموش بدلہ ملا ہے۔ فرزند روح میں عاقبت ۱۲ اندیش والدین کی اتار پستی نے آسیہ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ لیاقت علی نے اپنی مردانگی کے زخم میں آسیہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی گھاؤ میں سسکی انسانیت اور ادب باپ افتاد کی سب سے حساس کونج بہت مہرت تک تھا۔ بندہ دست اور بزدل مغربی تہذیب کا ایک جزوی آئینہ نظر آ گیا۔ ماروی اب دلیچ اور دلیچ کی کس چاٹ بن چکی ہے جس میں دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں۔ چال اور دوسری نکست بھی بہتر نہیں۔ منظر امام کی پناہ گاہ ہمیشہ کی طرح مختصر اور پُر اثر و پُر فکر..... وہ وقت دور نہیں جب جنگوں میں انسان سیرا کر رہے اور انسانی ہستیوں پر حیوانیت اور درندگی کا ران ہوگا۔ خواجہ احمد احرار روحانی کمالات کی ایک ایمان افروز تحریر جو ہمیشہ میں اپنی بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اعادہ کرتی ہیں۔ پانی میں شکار مغربی حوریت کے چٹخ اور جسے کسی کا ایک چھوٹا سا ٹیلر۔ آخری صفحات پر مقیم احمد کی سلاسل مکافات ہے حد جاندار تحریر جس کی کہانی کی بدلت شاندار اور تمام ٹوسٹ اور ٹرن متوقع تھے۔ مقیم احمد کے اعجاز بیان اور انسانی نفسیات پر عبور نے بہت متاثر کیا۔ اس دنیا میں یونی کوئی لھلھ بول کی کٹائی کے بغیر سطر آخرت کی کٹ کٹی نہیں لی سکتی۔ مکافات کے سلسلے کی یہ کڑی اب تسنیم کے گرد لپٹی نظر آتی۔ کزنوں میں صفحہ 119 پر رضوان خلی کا انتخاب بہت تھا۔ محفل شعر و سخن کے سلسلے میں ہم محمد قدرت اللہ نیازی کے ساتھ جگر پیسے سے ہانگل مشق ہیں۔

✽ اور نیک احمد خان، ہاشم آباد، کراچی سے بھی لکھتے ہیں: "سینس ڈائجسٹ بروقت مل گیا جو دیدہ زیب رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ سرورق کی حسین نازنین دوش پر مچھتوں کے امن امن کے سفر کو بھانے سوچوں میں پنہاں ہے۔ انٹرایس میں حکمت و دانائی کے موتی چنے اور پیسے سے بہرہ مند ہوئے۔ ناموں میں سر فرست محمد صفدر معاویہ نظر آ رہے تھے۔ سوشل سائنس کی قیادت کریں۔ دیگر دوستوں کی آرا بھی اچھے اچھے اعزاز لیے ہوئے تھیں۔ الیاس سیتا پوری کی خوب صورت ہوائے میں بھی ہوئی در ماندہ مشق تمام اونی لکھنے کی نکت نے اپنے معاملات میں سرورق کی اعتبار کی۔ ساتیس کشن عذاب ماشی بھی بہتر تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی سوادے جنوں بھی دلچسپی سے لکھا گیا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ حسین اتفاقات فرزند روح بھی عجب تھیں۔ شیر شاہ سیدی کی کہانی متاثر کن تھی۔ جب سیماسیائی کر کے دیکھیں گے تو اس لیے عقیدت اور محبت تو واجب بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہر کہانی میں معاشرے کے لیے سوال ہوتا ہے مگر شاید ہم ہمیشہ قوم ہے جس ہو چکے ہیں۔ وہاں تو متاثر ہوتے ہیں پھر اپنی اپنی پرانی ذکر پر چڑھا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے اور سلسلہ دراز ہی ہوتا جاتا ہے۔ اس کے علاوے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بندہ دست میں انکے انجمنی صوبہ کا ٹھوس دستاورد اور انجمن کے لیے آئندہ چھپنے کا سامان کر دیا۔ محفل شعر و سخن کے کزنوں نے بھی لکھتے کو پر لطف بنادیا۔ بزدل میں کوزرہ دیتوں سے منہ موڑ کر ان کی نظروں میں بزدل بن گیا۔ دلوں کو تسخیر کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ماروی بھی اپنے اعتقادی مراحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ محفل میں بھی پناہ گاہ بھی اچھی لکھی۔ خواجہ احمد احرار روح کو تسخیر کرنے والے دیکھنے کے قے کا سلسلہ تھا۔ اللہ سے لوگ نے والے اللہ کے سچ دوست ہوتے ہیں۔ پانی میں بھی جس میں ایک بچی نے انتہائی نفرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی محبت کے گھات اتار دیا۔ دوسری نکست بھی اچھی تحریر تھی۔ آخری کہانی سلاسل مکافات نے بھی آخری صفحات کی کہانی کا حق ادا کر دیا۔ انسانی رویوں کا کھجور کرتی ہے کہ کہانی تھی۔"

✽ رضوان خلی کی کڑی وی، اور جی ناؤن سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ "دل مضطرب، سرخ بھل کے مانند تڑپنے لگا، فرات میں بام مروج کی حد چھونے لگا۔ بے خودی میں اچھے گویا خیالوں میں اڑتے قدموں نے بارگاہ محبوب سسکیں کی چوکت کا پیر لیا۔ سرورق کی تمامہ و سلاسل میں بہت ہم رنگ لباس زیب تن کیے ایک کلائی میں سونے والی ہم رنگ ۱۹۹۹ دکان "چوڑیاں" دیکھیں کان میں سنبھری پالی، بائیں شانے پر تعریف فرما پیا، ہر لکھا کپڑا، واہ می واہ..... دیدہ زیب فہرست..... میں نے راحت کی بات اور رنج کیا۔ میں نے آرام کو آواز دی، آلام میرے صدمے میں آیا۔ ایک صدمہ انکساریہ نجات میں مرحوم جون ایلیا نے گراں قدر منفرد تا یاب الفاظ کے ساتھ پارے نکھیر دیے۔ ادارے میں آپ کی بات آگے بڑھاتا چلوں۔ انسانی خواہش اور "دل" سے منسوب ہوتا ہے۔ محفل خطوط میں طاہرہ بھگزار کی محفل رنگ تبصرے نے چرچاں کا سماں باندھ لیا۔ حسن پرست تو سرورق کی بدلت حوالی نظر آ رہی ہے لازم و ملزوم..... عبدالجبار روی انصاری کے شاندار تبصرے پر میں قربان، اپنی شاعری میں میرا اعلان بھی پرودہ پیچے گا۔ سیدی الدین اتفاق کا حق آپ کے شیریں سخن الفاظ شرف قبولیت کی سند پائیں تو میری طرف سے آپ کی مضامین کی۔ منفرد تا یاب الفاظ کی خالق شاعرہ سیاب ملک سے گل میں شامل ہونے کی درخواست..... در ماندہ مشق میں الیاس سیتا پوری کا یہ جملہ دل پر اثر کر گیا لکھتے ہیں۔ میں نے کسی شیر کو نہیں دیکھا جو دوسرے شیر کو کھتر کیجے۔ میں نے لی کوئی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا سلاسل مساوات ہر کسی میں مل جاتی ہے لیکن اگر نہیں ملتی تو انسانوں میں..... کشف زہری کی انکساریہ ترقی کی عذاب میں ایک مارک کے شیطانی داغ نے کتنے انسانوں کی جان لے لی۔ دام ظرب میں چٹا کرنے والے ایک ساحری کا ذکر نمایاں ارم واحد بت کی حسین اتفاقات میں بھی..... ملک صفدر حیات کی فرزند روح آسیہ کے قابل لیاقت کو کمال مہارت سے پکڑ لیا، اچھی کہانی..... ڈاکٹر شیر شاہ کی گھاؤ ہمارے ہے جس، ہے میرے حشراتوں کے ہاتھ پر لٹک کا نیک ثابت ہوئی۔ مغربی اب سے ممدو انتخاب تحریر یا ضی کی بندہ دست انسان دوست ثابت ہوئی۔ ماروی میں مراد ایند محبوب کے تاریک پہلو مل کر سامنے آ گئے ہیں۔ سلیم انوری کی مختصر شاندار چال فک پر نے بلک والٹر کی چال کا خوب توڑ کیا۔ منظر امام کی پناہ گاہ حراج کے شورش رنگ سے اسارت لے کر پوریت پر ختم ہو گئی۔ موصوف کہانی پر گرفت رکھنے میں یکسر ناکام ہو گئے۔ تصوف کے دار صفحات سے ضیا تسنیم بگرامی نے خواجہ احمد احرار جگر پیسے کا بہت خوب صورت جھنڈا دیا۔ جمال دتی کی



تحریر پانی میں شکار، انجیل نے سام کو نہایت چالاکی سے پانی میں ٹھکانے لگا دیا۔ ہارلمی دوسری گفت سبکی ٹیلر کی شال کی اوٹ پٹانگ روداد بچے کہانی سے بھی گئی گزری۔ پڑھ کر افسوس ہوا کہ اس کہانی پر باقیہ شائع کیوں کیا؟۔ عظیم احمد کی سلاسل مکافات ایک ہی چہرے کے ہزاروں روپ اور ہر روپ کی ایک الگ داستان بیست کہانی۔ محفل شعر وطن میں عہد ابھار روی، رمضان پاشا، محمد رشید سیال، اور بیس احمد خان، احمد خان کا انتخاب پشما آکٹوری لگا کے۔ اس کے ساتھ اپریل کے خوب صورت سرورق سے بھرے ورق تک انتہام پڑے ہوا۔

✽ راناشی حماد و قیدی سزائے موت، سینٹرل جیل، ساہیوال سے محفل میں شامل ہیں۔ ”کانی غریب کے بعد محفل یاروں کی بزم میں داخلے کے لیے خود کو راضی کر پایا ہوں کہ کچھ میرے خطوط کی تنقید کی بنا پر محبت ناموں کو روٹی کی نوکری کی نذر کر دیا جاتا تھا (یہ آپ کی لفظی ہے) اور آپ کی پذیرائی بھی انہی لوگوں کو ملتی ہے جو آپ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قبابے ملا دیتے ہیں۔ میں آپ کے ادارے سے چھپنے والے تمام رسائل کا رسا تھا۔ (آگے سفر جاری رکھیے) مدعا یہ تھا کہ سبکس میں شائع ہونے والی تاریخی کہانیوں میں مسلمان شہر انوں اور پرانے ادوار کے بادشاہوں کے نام سے منسوب کہانیوں میں ان کی خامیوں کو پائی لائن کرنے کے بجائے ان کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ آپ کی محبت میں آپ سے مشک ہونے والے لوگ تاریخ سے محبت حاصل کرنے کے متقی ہیں (شاید آپ نے توجہ سے ان اور ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا) اس ایک خامی کے علاوہ سبکس کی ہر چیز قابلِ داد اور قابلِ ستائش ہے۔ سبکس کی تمام کہانیاں بھاری بھونکے ہوئے ہیں۔ یہ صرف اصلاحی تنقید تھی۔ (مگر اسے آپ نے دل پر بھی لے لیا) سزائے موت کے قیدیوں میں سراسر ایسی پہیلی ہوئی ہے ٹکوس کے سزائے موت کے فیصلے پر عملدرآمد کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ سب کو معاف فرمائے۔“ (آمین)

✽ علی رضا ولد گل جہان، کمالیہ شکر گڑھ سے بچے آرہے ہیں۔ تقریباً 10 سال سے سبکس اور جاسوسی کاغذوں میں مہر یوں اور پہلی دفعہ نکل کھڑے ہوں۔ اس سے پہلے آپ نے ایک شعر میرا شائع کیا جس کا میں بہت محظوظ ہوں۔ تمام لفظوں سے ڈانچت بہت مزے دار ہے۔ میں ایک کہی ہے ظاہر جاوے بغل صاحب کی کوئی بچی شاعری لکھ کر بعد شائع نہیں ہوئی۔ میرا چاہ 2 نومبر کو پیدا ہوا اور 3 نومبر کو اللہ کو پیار ہوا۔ میں نے اس کا نام علی رضا رکھا تھا اور اب اپنے بیٹے کے نام علی رضا اور شعر لکھتا ہوں۔“ (اللہ آپ کو مہر کی توہن دے)

✽ سعید عباسی، بہاولپور سے حاضر ہیں۔ ”سبکس 17 تاریخ کو ملا۔ ناکل ڈرامہ بھی نہیں بھایا۔ بالکل نیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عظیم احمد کی سلاسل مکافات پڑی۔ انسان جو ہوتا ہے وہی کاغذ ہے، بالکل اسی طرح تبسم چغتائی نے جو کیا تھا بے میں آج میں بھی لایا اس کے ساتھ کر رہی تھی۔ کہانی کے باقی کردار عقیدہ تبسم تارن بس ٹھیک ہی تھے۔ دوسری کہانی فرحماں کی بڑول پڑی۔ کوز بڑول نکلا یعنی اس کے پیار میں بالکل ہو گئی۔ تیسری کہانی کاشت زبیر کی مضاب نامی پڑی۔ سبکس و دنیا پرستی و دوست داستان لڑا دینے والی کہانی سبکس سے بھر پور کارن اور اپنا کار کردار پسند آیا۔ چوتھی کہانی ارم و احمد بیٹ کی مسکندہ قات پڑی۔ سبکس بہت ہلکا ہلکا اور شاعرانہ جس نے روح کو الو بتایا۔ ایک حیرت سے دو طرفہ اور بات ہوئی۔ پانچویں کہانی منظر عام کی پناہ گاہ پڑی۔ صوفی سی مزاحیہ جملوں والی داستان میں تھی قدوائی اور حاکم کار کردار پسند آیا۔ چھٹی کہانی ہارلمی دوسری پڑی۔ سبکس کی سبکی شال کو ڈھونڈ نکالا۔ یعنی کاغذ تمام ہوا۔ ساتویں کہانی غریب نامی کی بندہ بست پڑی۔ بے روزگار رنگری چور انجیل بوڑھے کی لکڑیاں چرائی گئیں اور خزاں کا رنگری گئی۔ ایک نے اس سبکس کا خوب مل نکالا۔ آٹھویں کہانی مندر حیات کی فرزند دروغ پڑی۔ لیاقت کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ تھریس کی گناہ۔ آسیہ بے چاری ماری گئی۔ نویں کہانی پانی میں شکار پڑی۔ انجیل کا چالاکی سے سام کو پانی میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دسویں کہانی چال سلیم آٹو گئی۔ سب نے وائٹری چال اپنی ہی پر چلی اور اس کو بے خوف بنا کر اس کے سی بھاگ دیا۔“

✽ احمد خان تو حیدر، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ ”فروری 28 دن ہونے کے باوجود شمارہ اپریل 16 مارچ کی شام مل گیا۔ بروقت جلد آمد پر شکر ہے۔ حیدر خان کاندھلے پر پیارا کیوتر بھائے پیار و اس کا پیغام دینی نظر آئی۔ جس میں بے ہوشی سے ہم دینی تہوار چہ انشاں و حمد و ثنا سے اور قومی تہوار آتش بازی لائی سیکھو اس سلسلے میں، ایسے دینی احکام پر عمل مستحسن اور قومی ترقی کے لیے ملی اتحاد و اتحاد میں کہیں تو دنیا میں ہم سب سے زیادہ امن و سکون رکھنا ترقی مالد اور قوم بن سکتے ہیں۔ صاحب اسلام کا دوا دہ کرنے والوں نے جو حنا آدھیں قصور اور سرگودھا سے نئی کام پر آنے والے مسافروں کو بھی زندہ جلا دیا۔ اف۔ اللہ تبارہ جون ایلیا، عجالت، زندگی میں مصائب و آلام سے نجات و دائمی صحت و دانائی و فہم سے ممکن ہے۔ کاش، ہم دوسروں پر فخر سے کہنے کے بجائے اپنے گریبان میں جمائیں۔ محفل چٹوڑ میں چٹا لکائی۔ جناب مندر سعادہ کری پر بلوہ و افروز تمبرہ ویری گنڈ۔ مبارک ان کی۔ بے بی گڑیا ظاہر و مگرار، پشاور و آبی سب سے زیادہ مقصوم شہر ہے۔ تمبرہ بہت اچھا مگر طویل۔ بھائی طالب حسین ملنے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر۔ آپ باعزت بری ہو گئے۔ میں سب کے لیے ہر روز حضرت نوح والی دعا سوز قراؤں گے۔ 10 پڑھتا ہوں۔ بھائی نور سیال، بیچ کا شہر آپ کے سامنے ہے۔ سیاسی مداخلت اور کرپشن ختم ہوگی تب جیتیں گے۔ سسر مرین ناز ایڈا لگا زار اسٹیل، اللہ نیازی جیسے سینئر سرمایہ دار کے بجائے 27 افراد کے سربراہ خاندان مکان بچھے اکیلا رہنے کے لیے دیں۔ احسان مکر و قدرت اللہ نیازی، ردولی انصاری، اور شہباز بیچ زادہ تمبر سے اچھے مگر نہ طویل۔ کہانیاں، بھاگ کریم کے دائرے میں مراد اور ماروی کے نکاح میں شرکت چھوڑ سے لینے گیا۔ تو محبوب و فیروزہ کی نیست نیوٹ بے بی کو کچھ کر سکتے ہیں آگئے۔ مراد اور ماروی تو مجھے جتنی مومن پر۔ سیتا پوری صاحب کی در باندہ و عشق خوب رہی۔ دونوں اکیس تحریر کے آگے منتظر ہیں۔ سو دوائے جنوں خوب چارہ ہے۔ بس امریکی و بیورو لابی سے اکٹاہت ہوتی ہے۔ ملک صاحب کی فرزند دروغ، آسیہ کو لیاقت سے انکار کا والدین کو بتا دینا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی گناہ،



کائنات میں انسان کی فطرت کے شوقین حضرات کے لیے ضرور دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ سودائے جنوں، ڈاکٹر صاحب نے مسیحیت اور مسلموں کے مرام اور ملت کی عمدہ کہانی قدم قدم پر موت کے سامنے ڈٹ جانے والے سلم اخوت کا مظاہرہ بڑی گرم جوشی سے پیش کیا جا تا رہا۔ صمیمانہ گفتگو، یہ کہانی کمال کی ہے۔ فرزند دروغ، ملک مفرد حیات جب بھی کرتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ ایک اجماعی نیت اور فرض شناس کی خدا خود بخود مدد کرتا ہے۔ بہت عمدہ اور دل کو چھو لینے والی کہانی۔ گماڈ، ڈاکٹر شیر شاہ سید بہت ہی دردناک کہانیاں کا انتخاب کرتے ہیں۔ بد دوست، ابو رب، امریکا جسکی ترقی یافتہ ہوں۔ انسانیّت کے علم بردار لیکن یوزمروں اور والدین کے لیے اسلام نے جو ہدایت کی ہے۔ اس لیے وہاں نہج سے بہتر تعلیمات کسی مذہب میں نہیں۔ یہ کہانی ایک یوزمرو سے شخص کی تنہا پریشانا زندگی کی غم زد تصویر تھی۔ بزدل، گوئی ایک ایسا شخص جو بے حد بزدل تھا۔ اس کی خاطر ایک لاکھ جو اس کی محبت تھی اور نیم پاگل ہو چکی وہ دیکھ کر سکا۔ پناہ گاہ، اختر امام نے ایک ناگوار قصہ تحریر کیا۔ پوری کہانی ہی ناگوار سمجھتی تھی۔ خواجا حرارہ و بز دکان دین کی حرکت اختیار اور ایمان افروز کہانی۔ بہت سی باتیں جو اس نے قدم قدم پر زنجائی کرتی ہیں۔ دوسری ٹھنک، ایک اجماعی کہانی، ایک معمولی مثال سے شروع ہونے والی کہانی جس میں بہت راز چھپے تھے۔ مسائل مکافات، اس ماہنامہ کی آخری شاہکار کہانی۔ انسانی نفسیات اور مذاہب باطنی کی ایک دلچسپ کہانی، نیلم چغتائی نے اپنے خراب باطنی کمبوٹ کے لمبا دے میں چھا کر کہانی بنائی اور ۔۔۔ اب بھی جہوت کا سپارے گرماں کی جھونی کہانی کے خلاف ڈٹ گیا۔ سب ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھ رہے تھے لیکن مکافات فعل اور ضد الی حکمت معلّٰی نے سزا وار کو ایک مذہب تک کرپ میں مبتلا کر دیا۔ کٹر میں اور خلف حسب معمول ایک سے بڑھ کر ایک۔"

www.dawateislami.net

حبیب الرحمن، خوش بخت الرحمن سینٹرل ہیل ٹوٹ لکچر ہے اس سے اپنے شکایت تانے کے ساتھ حاضر ہیں "ایک شکایت ہے ادا ..
الوں سے۔ بات ہے کہ میں نے 2010ء سے ادارے کے تمام ڈائجسٹوں میں تیسرے لیکن شروع کیا تھا جو اب تک کلمہ مقررہ وقت پر پہنچ دیتا ہوں
لیکن پھر ایک ماہ بعد جواب نہ دیا یعنی ایک سال میں 3 یا 4 خط شامل اشاعت اور باقی میں شامل اس کے علاوہ جو چیکیں دوپسٹ آؤں گی ان کی نذر اس
میں آپ کا بھی کوئی تصور نہیں پاکستان ملک ہی ایسا ہے۔ اس میں ہر آدمی اپنا تصور اور کلمہ دے کر تعجب دیتے ہیں۔ میرے جیسا آدمی جو
سزائے موت کے سیلوں میں بند ہوں جس کے پاس کاغذ قلم سے لے کر ذرا نقد بھی بہت زیادہ مشکل ہے یہاں تو اس مشکل کو حل کیسے کرے گا یعنی کہ اس
مشکل کا حل۔ اس کے علاوہ ایک خبر ہے اس بارے میں بھی مختصر بتاؤں کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جس کا کلمہ ہے کہ وہ انگریزی میں توانائی کا ایک فارمولا
جانتا ہے جس میں ۔ کوئلہ، گیس، پانی اور برقی ضرورت نہیں ہے اس کے علم پر یہ بجلی کا بحران ختم کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ ناچاں ہیرا۔ ملک و قوم کی
اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوگی؟ امید ہے کہ اس شخص کو خد میں شامل کریں گے۔ پانی شہرہ جموںی طور پر بہت اچھا ہے۔ اسلامی قدرین دوست روشنی رشید
سے اچھا ہے کہ وہ ضرور ڈائجسٹ میں شامل رہا کریں۔

بقیہ انعام ریاض، نیول کالج ڈالہا، کراچی سے ملنے میں حاضر ہیں۔ 20 مارچ کی خوش گوار صبح کو نیند کی آغوش سے بچنے ہی نہیں سہیں کا دیر اور نصیب ہوا۔ سرورق پر دو شیرازہ کے کاغذ پر... سفید کپڑوں پر سے جب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ورق پلٹے تو جون ایلیا کا انشائیہ نینوں کے سامنے آ گیا۔ نین بچھلنے کی مصروفیات کے بعد آج خطا کھینچنے بھی ہوں۔ مخطوط کی نقل میں آتے ہی ہم تو جیسے شاہ کی کینیت میں آ گئے۔ ارے یہ کیا مار کے بچھڑا ہے۔ کابو کیا ہے۔ کوئی ہمیں بتائے گا کہ وہ سب کہاں کوچ کر گئے۔ (اسی کاغذ پر ایک لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں) محمد صہبہ معاویہ بکلی پوزیشن آئے۔ آپ کو کیا بات یاد اور آپ افسردہ نہ ہوں کیونکہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے لیے دارا، معمولی بات ہے۔ یہ سب حسن صاحب آپ کی طرح یہ درخواست، ہم ان کی بارگاہ پر بھیجے ہیں کہ حسن صاحب کی کوئی قطعہ اور گہائی شروع کریں۔ جناب طالب حسن کچھ جملے سے رہا ہونے پر آپ کو بہت بہت مبارک ہو اور ان کے آئے والی زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔ دو دریاں بارہیت تو کھیلوں کا حصہ ہے لہذا آپ کو دیکھنا مسرت بخورے گا۔ صہبہ جون ایلیا کا ترجمہ اور ایشل کا ترجمہ بہت عمدہ تھا۔ قدرت اللہ صاحب کا ترجمہ بہت ہی عربی لہجہ میں تھا۔ سرورق میں وہ... میں نہیں پڑا ہوتا۔ اب سب یہ... (بہت اچھے بھی بہت اچھے)

سچا و خان آف موہنجھڑو کی جیل میانوالی سے مکمل میں شریک ہیں۔ "سینس ڈائجسٹ" نے ان کا قادی ہوں۔۔۔۔۔

لیکن خط لکھنے کی دوسری بار کوشش کر دیا ہوں۔ سچا و خان مارچ کے شمارے میں لکھا جو شاید موسم کی خرابی ٹریک جہاں وجہ سے رو گیا۔ مجھے ایک دوست نے کہا کہ یہ سب لکھنا کہ سینٹرل جیل میانوالی سے خط لکھ کر دیا ہوں کیونکہ جیل میں رہنے والوں سے کوئی بات نہیں کرتا۔ میں نے کہا جو بھی ہو چاہے کوئی بات کرے یا نہ کرے بتانا سچ ہے کیونکہ یہ لازمی تو نہیں کہ مذہبوں میں صرف وہی دہشت گرد بند ہوں۔ کوئی بات نہیں ہم نے اپنی کوشش جاری رکھنی ہے۔ ہمارا خط بھی شامل ہوگا (اور دیکھ لیجیے آپ کا خط شامل ہو گیا) ہمیشہ کی طرح مسطور معادہ بھائی کو اچھے تہرے کے ساتھ کری صدارت پر بیٹھے ہوئے دیکھا خوش ہوئی۔ طالب مسکن طوطی بھائی مبارک ہو۔ آپ کو کئی زندگی ملی ہے۔ بھائی ایک کانگرو ادا کرتے رہتا۔ سب سے پہلے ماروی پڑی۔ محبوب کو کوٹھو بہو نہیں ملی البتہ مرادی سراویں پوری ہوئیں۔ سداے جنوں اچھی جا رہی ہے۔ میں بہت سے سر فروش باقی ہیں جن پر مسلمانوں کو فخر ہے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔"

اب ان فارمین کے؟ مہجن کے؟ مے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

امتیاز جنگ، منسلک انکم، محمد زریان سلطان، دارو پانزار، کراچی، مولانا رضوان، کوہنگی، کراچی، اطہر حسین، کراچی، زبیرہ صدیقی، لاہور۔ حیدر نواز سیب
ملتان، شوخ خالد، دادو، امجد علی، لاہور۔ حمیرا اقبال، کوہنگی کراچی، مقبرہ طارق، ملتان

www.bookstube.com

www.movies.net

www.urdutube.net

DEEP CLEANING & EXTRA WHITENING FORMULA

Soda White

BAKING SODA TOOTHPASTE

TARTAR CONTROL Gum Protection Fresh Breath

Quality BRUSH Pack

Pakistan's ONLY Baking Soda Toothpaste

دانت سفید کاک

facebook.com/snscares

SW-06-14

قطب الدین ایبک

ڈاکٹر ساجد امجد

تاج وری اگر مقدر میں ہو تو چاہے انسان فقیر کے گھر میں پیدا ہو یا غلام منڈی میں فروخت ہو جائے... بچانے کی ہوا اسے آپ ہی شاہوں کے درمیان دھکیل دیتی ہے۔ اور پھر حالات و واقعات کی ترقیب ایسی تربیت کرتی ہے کہ اس کی سوچہ بوجہ پر دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ قطب الدین ایبک بھی ایک ایسا ہی لاوارث غلام تھا جو کم سنی میں معمولی ناموں پر بازار میں فروخت ہوا اور سن شعور تک پہنچتے پہنچتے غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بن گیا... وقت کا پہیا بھی عجب کھن چکر ہے جو کبھی سونے کو مٹی بنا دیتا ہے تو کبھی نرے کو آفتاب بنا کر آنکھیں کھین کر دیتا ہے۔ جو بھی ہے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اپنے وجود کا ثبوت کرنے کے لیے انسان کو چار رستوں پر چلنا پڑتا ہے، ورنہ بہت سے شہ زور اسی پیرے کے نیچے دب کر بے نام و نشان چلے گئے کیونکہ انہیں ان رستوں پر چلنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا لیکن... قطب الدین ایبک کو اس ہنر میں کمال حاصل تھا۔ تب ہی بادشاہت اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔

ہاشمی کا آئینہ: اختیار و رہبریت ان دونوں کے عبرت اور واقعات

بھڑکوں میں گزارہ ہوگا۔
یعنی خریب لوگ اپنے بچوں کو خود بھی فروخت کر دیا کرتے تھے اور سوداگر انہیں منڈی تک پہنچا کر اچھے دام وصول کرتے تھے۔ منڈی میں ایسے غلام بھی ہوتے تھے جنہیں بردہ فروش افلاس لے آتے تھے۔
قاضی فخر الدین ایک ایک غلام کو دیکھتے رہے۔ سوداگر ان غلاموں کی تعریف میں مبالغہ آرائی بلکہ شاعری کر رہے تھے تاکہ خریدار متوجہ ہوں۔
”ترکستان کا نایاب ہیرا۔ قدر دانوں کے لیے عظیم تحفہ۔ ہاتیں مینھی آواز رسیلی۔ عقل و دانش کا پتلا۔ کم سن مگر جہاں دیدہ۔“

ایک جگہ یہ آواز سن کر قاضی فخر الدین کے قدم رک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سوداگر کے قریب ایک بچہ کھڑا ہے۔ عمر بہ مشکل دس سال ہوگی۔ چہرہ خوب صورت تھا مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ نور کا پتلا ہوا البتہ آنکھیں بے پناہ ذہانت کا

عکس۔ شاہی اور کی غلام منڈی میں آج خلاف معمول کچھ زیادہ بھڑکی۔ اس لیے نہیں کہ کوئی غیر معمولی غلام فروخت کے لیے آیا ہوا تھا بلکہ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مینے کا پہلا جمد تھا۔ پہلے جمنے کو اکٹھا کر دیا کرتی تھی۔

قاضی فخر الدین بن علی اعظمی زکوٰۃ کی چند ساتھیوں کے ساتھ جامع مسجد سے باہر آئے۔ ان کے ساتھ چند دنوں سے ایک غلام کی ضرورت تھی۔ اس وقت ان کے ساتھیوں نے غلام منڈی کا رخ کیا تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ جہاں ان میں قدم رکھتے ہی بھڑ بھاڑ دیکھ کر ان کا دل گھبرانے لگا تھا لیکن ساتھیوں کی دلچسپی دیکھ کر ان کی بھی ہمت بندھی رہی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انسان بھڑ بھڑکیوں کی طرح فروخت ہوا کرتے تھے۔ نہ بیچتا جرم تھا نہ خریدنا۔ کوئی یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ کس کے جگر گوشے ہوں گے۔ کہاں سے آئے ہوں گے۔ کس کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ آقا اچھا لگ گیا تو زندگی سنور جائے گی ورنہ



مظاہرہ کر رہی تھیں۔ باریک لبوں پر مستقل مسکراہٹ تھی جو اس کے مزاج کی خوش اخلاقی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ قاضی صاحب اس بچے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد سوداگر سے مخاطب ہوئے۔

”کیوں بھائی، ترکستان کے اس حقے کا نام کیا ہے؟“

”قطب الدین۔“

”ماشاء اللہ بڑا اچھا نام ہے۔ اب تم ہمیں یہ بتاؤ کہ

اس لڑکے کو تم کہیں سے اٹھا کر لائے ہو یا.....“

”ارے جناب، اس بازار میں میری شہرت اسی وجہ

سے ہے کہ میں بدو و فروش نہیں ہوں۔ کھرا سودا کرتا ہوں۔

اس بچے کی میں نے بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اب اپنا منافع

شامل کر کے اس کی قیمت خریداروں سے وصول کروں گا۔

آپ قیمت لگائیں یا پھر میں عرض کروں؟“

”آپ ہی فرمادیں۔ میری جیب اجازت دے گی تو

ٹھیک ورنہ آگے بڑھ جائیگا۔“

”آپ مجھے قدر لانا معلوم ہوتے ہیں اس لیے

جانے نہیں دوں گا۔“ قاضی غلام الدین نے قطب الدین کو

اپنے قریب بلا کر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔

”بیٹا، تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو۔“

”میرا مالک جس سے میری قیمت وصول کرے گا،

میں اس کے ساتھ جانے کا پابند ہوں۔“

قاضی صاحب نے سوداگر سے قیمت پوچھی اور پھر

تھوڑی سی ہنگامہ اور رد و بدل کے بعد قطب الدین کو خرید لیا۔

جب قاضی صاحب اسے لے کر چلے گئے تو سوداگر ان کے

پیچھے دوڑا۔

”قاضی صاحب! مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ اس بچے

کے ایک ہاتھ کی پھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں یہ بتانا بھول

گیا تھا۔ اب آپ کی مرضی مجھے اس عیب کے ظاہر ہونے

کے بعد آپ اسے خریدیں تو ٹھیک ورنہ آپ کی دی ہوئی رقم

حاضر ہے۔“ قاضی صاحب نے قطب الدین کی انگلی کی

طرف دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ بس اتنا ہوگا کہ آج سے اس کے

نام میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔ ترکی زبان میں ایک

اسے کہتے ہیں جس کی انگلی نہ ہو۔ آج سے میں اسے قطب

الدین ایک کہوں گا۔“

”قاضی صاحب! مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے نیک

آدمی کی صحبت میں رہ کر یہ بچہ کسی بڑے مرتبے پر پہنچے گا۔“

قاضی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور قطب

الدین کو لے کر آگے بڑھ گئے۔ قاضی غلام الدین بن عبد العزیز کوئی حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے تھے اور نیشاپور میں نہایت اچھی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے دل میں خدا نے یہ بات ڈالی کہ اس بچے کو غلام سے زیادہ اپنا بیٹا سمجھیں اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کریں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں سے بھی کہہ دیا کہ قطب الدین کو وہ بے شک اپنی خدمت اور گھر کے کام کاج کے لیے لائے ہیں لیکن اسے اپنا بھائی سمجھنا اور اپنے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھانا۔

قطب الدین ان کے ساتھ قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔

دن بھر وہ کتب میں گزارتا اور شام کو گھر کے کام کاج میں مشغول ہو جاتا۔ اس نے چند ہی دن میں ایسی سعادت

منجائی کا مظاہرہ کیا کہ قاضی صاحب اسے اپنے بیٹوں سے

زیادہ سمجھنے لگے۔

قاضی صاحب کے بیٹے آپس میں یہ باتیں ضرور

کرتے تھے۔ والد صاحب ایک غلام کو ان پر ترجیح دیتے

ہیں لیکن والد کے غائب ہونے کے بعد قطب الدین کے خلاف کوئی قدم

نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے پھر بے ترکیب نکالی کہ قطب

الدین کے خلاف من گھڑت شکایتیں قاضی صاحب تک

پہنچانے لگے۔ ایک مرتبہ تو چوری کا الزام بھی اس پر لگا دیا۔

قاضی صاحب نیک طبیعت بھی تھے اور جہاں دیدہ بھی۔ وہ

سمجھتے تھے کہ چاروں بیٹے کیوں اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔

انہوں نے نہایت عرق ریزی سے چوری کے الزام کی تفتیش

کی اور قطب الدین کو بے قصور پاکر بیٹوں کی سرزنش کی۔

ملاوٹھو بچو! تمہارے والدین حیات ہیں اور

تمہارے ساتھ ہیں۔ قطب الدین بے چارہ بن ماں باپ کا

بچہ ہے۔ انہوں نے نہ جانے کس مجبوری کے تحت اپنے جگر

کوٹھے کو سوداگر کے حوالے کر دیا اور وہ ہم تک پہنچ گیا۔

رات کی تنہائیوں میں کیا وہ اپنے ماں باپ کو یاد نہیں کرتا

ہوگا۔ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اگر ہم اس کی دلداری

کریں تو کیا یہ ثواب کا کام نہیں۔ ہمیں تو اس کا اتنا خیال رکھنا

چاہیے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھول جائے اور تم لوگ ہو کہ

اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ یہ بھی تو سوچو وہ گھر کے کام

کاج میں کتنا مستعد رہتا ہے۔“

قاضی صاحب کے لڑکوں نے یہ باتیں سن تولیں اور

چپ بھی ہو گئے لیکن قطب الدین کی طرف سے ان کا دل

صاف نہ ہوسکا۔ اب انہوں نے اسے پریشان کرنے کے

لیے یہ طریقہ وضع کیا کہ اسے تنگ کرنے کے لیے ہر وقت

معروف رکھنے لگے۔ اسے ہر وقت کام میں لگائے رکھتے۔

نے نہایت قتل سے جواب دیا۔

”کون کہتا ہے میرا کوئی بیٹا نہیں۔ عام طور پر بادشاہوں کے چند بیٹے ہوتے ہیں جو اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت کے وارث قرار پاتے ہیں لیکن میرے ہزاروں ایسے سعادت مند بیٹے موجود ہیں جو میرے بعد عمان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مدت تک میرا نام زندہ رکھیں گے۔“

ابھی یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ ایک سوداگر کی آمد کی اطلاع ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے جو غالباً غلام ہے۔ سوداگر اس غلام کو فروخت کرنے کے لیے لایا ہے۔ شہاب الدین غوری نے اپنے امیروں پر ایک نظر ڈالی اور سوداگر کو اجازت مرحمت فرمادی۔

اس اجازت کے ساتھ ہی ان امیروں نے سمجھ لیا کہ اب اجلاس ختم ہوا۔ انہوں نے جگہ خالی کر دی اور سوداگر حاضر ہوا۔ اس کے ساتھ قطب الدین بھی تھا۔

شہاب الدین کی نظریں سوداگر سے زیادہ قطب الدین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا تجربہ بتا رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں۔ اس کی پیشانی اس کی عظمت کا صاف پتہ دے رہی تھی۔

”سوداگر! تم یقیناً اس غلام کی قیمت دل میں سوچ کر آئے ہو گے؟ ہمیں بتاؤ تاکہ ہم اسے خریدیں۔“

”میں نے اس کی کوئی قیمت طے نہیں کی۔ میں تو اسے آپ کی خدمت میں بطور تحفہ لے کر آیا ہوں۔“

”ہم تمہیں اس لڑکے کی قیمت ادا نہ کریں لیکن تمہارے لڑکے کی قیمت تمہیں ضرور ادا کریں گے۔“

شہاب الدین غوری نے سوداگر کو ایک بیش بہا رقم ادا کی اور قطب الدین بھی لے لیا۔

قطب الدین، قاضی فخر الدین کے مکان سے شہاب الدین غوری کے عظیم الشان محل میں پہنچا تو اس کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ اسے وہ اپنی خوش قسمتی تصور نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس نعمت کو وہ ہاتھ سے جانے دیتا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے مستعدی سے سرگرم خدمت تھا۔ شہاب الدین غوری بھی اسے ایک محل کے لیے خود سے جدا نہ کرتا تھا۔ دربار میں بھی

ابھی وہ ایک کام کرنے نہیں پاتا کہ دوسرا کام بتا دیتے۔ اس سے مقصد ان کا یہ تھا کہ وہ تنگ ہو کر کہیں بھاگ جائے لیکن وہ ایسا مستعد ثابت ہوا کہ اس کے ماتھے پر تل تک نہیں آیا۔ وقت گزرتا رہا۔ قطب الدین قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ تہذیب و اخلاق کے بہت سے درس حاصل کر لیے۔

اتفاق یہ ہوا کہ قاضی فخر الدین کا انتقال ہو گیا۔ اب قاضی صاحب کے بیٹوں کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا۔ انہیں قطب الدین کا وجود برداشت نہیں تھا اور وہ انہیں نہیں چھوڑ کر جانے والا تھا نہیں۔ ان بیٹوں نے آپس میں طے کیا کہ قطب الدین کو کسی سوداگر کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے۔ کچھ مہینے بھی ہاتھ لگ جائیں گے اور قطب الدین سے پیچھا بھی چھوٹ جائے گا۔

اس زمانے کے نیشاپور میں کسی غلام کا خریدنا یا فروخت کرنا کون سا مشکل تھا۔ قاضی صاحب کے بیٹوں نے برادران یوسف کا سامان کیا اور اسے لے کر ایک سوداگر کے پاس پہنچ گئے۔

”یہ ہمارے باپ کا غلام ہے۔ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اب ہمارے اپنے ہی ہونے کے لیے نہیں ہے، اسے کہاں سے کھلائیں۔“ سوداگر نے ایک معقول رقم دے کر قطب الدین کو خرید لیا۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین غوری کو خداوند تعالیٰ نے صوبہ آرمینیا کی سرحد پر کوئی اولاد نہ دینے نہیں تھی۔ اس لیے اس کو ترکی غلام خریدنے اور انہیں بیٹوں کی طرح پالنے کا بڑا شوق تھا۔ دور و نزدیک کے تاجر بڑی قیمت کے لالچ میں ترکی غلاموں کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

وہ اس وقت خراسان میں تھا اور اپنے امیروں کے جہرمت میں گھرا بیٹھا تھا۔ نئی فتوحات اور سلطنت کی حدود بڑھانے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک منہ چڑھے امیر نے یہ تذکرہ پھینک دیا۔

”کیا ہی اچھا ہوتا کہ خداوند تعالیٰ آپ کو کوئی بیٹا بھی عطا کرتا تاکہ کسی ناگزیر واقعے کے پیش آنے کے بعد اس کی تخت سلطنت کا وارث بنادیا جاتا۔ آپ جو اتنی محنت کر رہے ہیں تو کس کے لیے؟“

ایسی بے موقع بات سن کر تمام امیروں کے چہرے فق ہو گئے تھے کہ دیکھیں شہاب الدین غوری کا رومل کیا ہوتا ہے لیکن شہاب الدین خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا اور اس

وہ بادشاہ کی پشت پر کھڑا ہوتا تھا۔

ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو کسی طرح بھی کسی غلام کی فطرت سے بعید تھا۔ جشن کی ایک محفل منعقد ہوئی جس میں سلطان کے قریب ترین مخصوص درباری شریک تھے۔ قطب الدین ایک بھی شریک محفل تھا۔ سلطان نے درباریوں کو خلعت و انعام سے سرفراز کیا۔ سب سے زیادہ قیمتی اور بہترین انعام قطب الدین کو ملا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو قطب الدین نے اپنے حصے کا شاہی انعام فراشوں اور خدمت گاروں کو بخش دیا۔

یہ خبر جب سلطان تک پہنچی تو اسے تعجب بھی ہوا اور خود پر فخر بھی ہوا کہ اس کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ اس نے قطب الدین کو طلب کیا۔

”ہم نے سنا ہے کہ ہمارا بخشا ہوا انعام تم نے فراشوں اور خدمت گاروں کو بخش دیا؟“

”سلطان! یہ جسامت مجھے اس لیے ہوئی کہ سخاوت کا یہ سبق میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔“

”کچھ تو اپنے لیے بھی رکھ لیتے۔“

”میرے لیے آپ بہت زیادہ دے رہے ہیں۔ ہاتھ جب خالی ہوں گے، آپ کا دست سخاوت میرا دھڑکا دے گا۔“

سلطان اس کے اس کلام سے اتنا خوش ہوا کہ اسے درباری امیروں میں شامل کر لیا اور اس کی جگہ تخت کے سامنے مقرر کی حالانکہ وہ ابھی اچھی طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا۔

اسے مقرر ہونے کے بعد بھی قطب الدین ایک کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ ہر روز چار

سلاش کرنے کے لیے جنگل کی طرف جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ جنگل سے نکل کر واپس آئے ممد کے کنارے تک چلا گیا۔

کسی خطرے سے بے نیاز وہ اپنے تھوڑے سے لشکر کے ساتھ چلا جا رہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹپوں کی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ ابھی وہ واپسی کا اعلان کر رہا تھا کہ خطرہ

مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گیا۔ ایک بڑا لشکر اس کے سامنے

تھا۔ یہ خوارزم کی فوج تھی جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ خوارزم اور غزنوی کے درمیان ہمیشہ کی دشمنی تھی۔

آج ان کا داؤ چل گیا تھا۔ قطب الدین بھی محل میں رہ کر بھی غزنی کی فوج کی مدد سے

غزنی کا باہر ہو چکا تھا۔ اس نے اب فرار کو بے عزتی سمجھا اور

کھوار کھینچ کر میدان میں آ گیا لیکن لشکر کم ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا اور گرفتار ہو گیا۔ خوارزم کے لشکر کی اسے سلطان خوارزم کے پاس لے گئے۔ سلطان شاہ کے حکم سے اسے لوہے کے پنجبرے میں قید کر دیا گیا۔

قطب الدین کے ساتھی فرار ہو کر سلطان شہاب الدین کے پاس آئے اور سارا ماجرا سنایا۔ شہاب الدین غوری یہ سن کر تڑپ اٹھا کہ اس کا چھپتا غلام گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس نے اسی وقت لشکر کو تیار ہونے کا حکم دیا اور سلطان شاہ پر حملہ آور ہو گیا۔ سلطان شاہ شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ اسے بھاگتے ہوئے یہ ہوش نہ رہا کہ وہ پنجرا اٹھا کر لے جاتا جس میں قطب الدین کو قید کیا گیا تھا۔ غزنی فوج کے سپاہی قطب الدین کو اسی عالم اسیری میں پنجبرے سمیت اونٹ پر لاد کر شہاب الدین کے سامنے لائے۔

”خدا کی قسم قطب الدین، تو اس لیے پیدا نہیں ہوا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے اس لوہے کے پنجبرے میں جاؤ۔“

شہاب الدین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اسی وقت سے پنجبرے سے باہر نکالا اور اس کے کچے

میں موتیوں کے ہار ڈالے۔ اب قطب الدین کا مقام و مرتبہ پہلے سے بھی دو چاند ہو گیا۔ امیر الامراء بتا دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

تاج الدین یلدوز کے ایک کمرے میں اس کے اہل خانہ باہم شریک گفتگو تھے۔ اس وقت سلطان

شہاب الدین کی فیاضی اور قطب الدین کے کارنامے موضوع گفتگو تھے۔ قطب الدین کی اسیری اور غزنی کا

تذکرہ نکل آیا۔

تاج الدین کی بیٹی فاخرہ اس گفتگو میں دخل نہیں دے رہی تھی لیکن سب رسی تھی اور اندر ہی اندر قطب

الدین کو دیکھنے کا اشتیاق بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

تاج الدین یلدوز بھی شہاب الدین کے غلاموں میں سے ایک تھا۔ جب وہ بچہ تھا تو اسے شہاب الدین نے ایک

سوداگر سے خریدا تھا۔ یلدوز کی صورت و سیرت کی پاکیزگی اور حسن نے شہاب الدین کو اس کا دلہن بنا دیا تھا۔ اس کے

بہت سے لے پالکوں میں یلدوز کو ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ جب یلدوز جوان ہوا تو سلطان نے اس کے چہرے پر

برتری اور حوصلہ مندی دیکھ کر اسے اپنے گرامی قدر امیروں کی جماعت میں شامل کر لیا اور کرمان کا علاقہ اس کی جاگیر

بنی دے دیا۔ اب وہ بھی کرمان اور بھی غزنی میں رہنے لگا تھا۔ ان دنوں غزنی آیا ہوا تھا۔

جب بہت دیر گفتگو ہو چکی تو فاخرہ سے رہا نہیں گیا۔ اس کا جی چاہا کہ قطب الدین کا نام بار بار اپنے ہونٹوں سے

اداکرے۔

ماہر کیا ہے؟ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا لیکن تعذیب کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ایک روز اس نے حلیہ تبدیل کیا اور قریب کے دیہات میں نکل گیا۔ کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی ہندو جوگی ہے۔ اس نے دیکھا کہ دیہات میں خوف کی فضا طاری ہے۔ ہر جگہ مسلمانوں کی آمد اور راجا کی بزدلی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک کھیت میں کچھ کسان کھڑے یہی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔
”تم لوگ اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟“

”خوف کی تو بات ہی ہے۔ مسلمان پالی ملتان پر اپنا قبضہ چاہتے اور اچھ کی طرف آئے ہیں۔ راجا کی بزدلی کا یہ عالم ہے کہ قلعے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ رانی بے چاری بھی کیا کرے۔ وہ تو سنا ہے راجا سے کہہ کہہ کر تھک گئی کہ شہاب الدین سے میل جول کر لو۔“

ایک اور دیہاتی نے کہا۔ ”وہ کیسے میل جول کر لے۔ وہ تو راجا جیسے دلوں (مخبرات کا راجا) کی مدد کی امید میں بیٹھا ہوا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اپنی فکر بڑی ہوئی ہے۔ وہ کیوں مدد کو آنے لگا۔ مسلمانوں سے دشمنی مول لینا کوئی آسان ہے۔“

”بھائی اصل بات تو یہ ہے کہ راجا اور رانی میں ہنسی نہیں ہے۔ دو بچے بھی نہ جانے کیسے ہو گئے۔“

”راجا کے دو بچے ہیں؟“ قطب الدین نے پوچھا۔
”ہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکا تو مجیم دیو کی لڑکی کے منہ میں گرفتار ہو کر راج ہنسی سے غافل ہی ہو گیا ہے۔ ان دونوں کی سنا ہے وہ مجیم دیو کے پاس چلا گیا ہے۔ ماں بیٹی قلعے میں لپکتی ہیں۔“

اب یہ بات سننے کی نہیں رہ گئی تھی کہ فصیل سے جھانکنے والی عورتیں کون ہو سکتی ہیں۔ قطب الدین لشکر گاہ میں واپس آ گیا اور جو معلومات اس نے حاصل کی تھیں، ان کی روشنی میں وہ آئندہ کے لیے سوچنے لگا۔

اس روز بڑی تیز ہوا تھیں چل رہی تھیں۔ خیمے میں رکھا ہوا چراغ بری طرح بجوڑک رہا تھا۔ لشکر گاہ میں خاموشی بھی تھی اور پراسرار بیت بھی۔ خیز قطب الدین کی آنکھوں سے نکل کر دور کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک ہوا کا جھونکا آیا اور چراغ بجھ گیا۔ اب قطب الدین کی آنکھیں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ اسی وقت اس کے خیمے کے باہر کھڑے محافظ نے اندر آ کر مشعل روشن کر دی۔

”اباجان! ہم نے قطب الدین کو کبھی دیکھا نہیں اور آپ اتنی تعریفیں کر رہے ہیں۔“

”تم کہاں سے دیکھتے ہو۔ تم تو زیادہ تر کرمان میں رہی ہو۔“

”قطب الدین ہے کون؟“ فاخرہ نے ایک مرتبہ پھر قطب الدین کا نام اپنے ہونٹوں سے ادا کیا۔

”میں نے بتایا تو ہے سلطان شہاب الدین کا لے پالک بیٹا ہے لیکن اعزاز و اکرام میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔“

”کیا آپ کے اس سے تعلقات کشیدہ ہیں؟“

”یہ کس نے کہا دیا؟ وہ تو شہاب الدین کے رشتے سے میرا بھائی ہوا۔“

”آپ اتنے دن سے یہاں ہیں، وہ ملنے تک تو آیا نہیں۔“

”ہم نے کیا اسے مدعو کیا تھا جو وہ آتا؟“

”سلطان کی خوشنودی کے لیے اس کی دعوت آپ کو کرنی چاہیے۔ اگر اس کی بیوی ہے تو اسے بھی بلائیں ہم اس سے مل سکیں گے۔“

”ابھی اس کی شادی ہمال ہوئی ہے۔“

فاخرہ یہی سنتا چاہتی تھی لہذا اس کو چپ ہو گئی۔ اس نے تاج الدین کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ قطب الدین کو مدعو کرنا چاہیے۔ تاج الدین کی ہانک سوچتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ شہاب الدین کی خوشنودی کے لیے قطب الدین کو مدعو کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆

شہاب الدین غوری ملتان فتح کرنے کے بعد اچھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قطب الدین ایک بھی اس معر کے میں اس کے ساتھ تھا۔ اپنی دانش اور بہادری کی بدولت وہ سلطان کی نظروں میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکا تھا۔ اس معر کے میں اس نے مزید دس ہزار فوج پیدا کر لی۔

اچھ کے راجا کو شہاب الدین کی آمد کی خبر ملی تو وہ مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کر سکا اور قلعہ ہند ہو گیا۔ شہاب الدین نے قلعے کے ارد گرد اپنے خیمے لگا دیے۔ تسخیر قلعہ کی کوششیں کرنے لگا لیکن ہردن کے گزرنے کے ساتھ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ بے زور طاقت قلعہ فتح کر کے مشکل ہو جائے گا۔ قطب الدین کچھ اور ہی مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہاب الدین جب بھی باہر نکلتا ہے فصیل پر دو نسوانی قدا بھرتے ہیں۔ ان کے چہرے چادروں سے چھپے ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے نظر نہیں آتے لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتیں ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

کے قریب ہو۔ آپ اسے جو پیغام دیں، وہ رانی تک پہنچا دے۔“

اب رات بہت تھوڑی رہ گئی تھی لہذا قطب الدین نے ان دونوں کو جانے دیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد قطب الدین پھر سوچنے بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اسے وہ مناظر یاد آرہے تھے جب دو عورتیں شہاب الدین کو دیکھنے کے لیے فسیل پر آ جاتی تھیں پھر وہ اب یہ بھی سن رہا تھا کہ رانی اور راجا کے درمیان نا چاتی ہے خصوصاً مسلمانوں کے معاملے میں۔

طوفانِ تحم چکا تھا لیکن قطب الدین کے دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اسے جلد سے جلد سلطان سے ملنا تھا۔ جس نماز فجر باجماعت ادا ہوئی تو قطب الدین سلطان کے پہلو میں کھڑا تھا۔ نماز کے بعد وہ سلطان کے ساتھ اس کے خیمے میں بیٹھا اور رات میں پیش آنے والے واقعات سے اسے آگاہ کیا۔

”سلطان! سلطان فولادی تلواریں زنگ آلود ہو جائیں وہاں ذہن کی تلوار کام آتی ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ اب برسات کا موسم قریب ہے۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ محاصرے کے ذریعے قلعہ اور چال کاغذ پر مشکل ہوگا لہذا اس سلسلے میں کوئی اور چال چاہیے۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ترکیب آئی ہے؟“

”ترکیب یہ ہے کہ ہم ایک قاصد کے ذریعے پیغام رانی کو پہنچائیں کہ اگر اس کی کوشش سے قلعہ فتح ہو گیا تو اسے اسے اپنی ملکہ بنا لیں گے۔“

”قطب الدین! کیا تم پھر سے بچے ہو گئے ہو۔ ایک ہندو رانی میری ملکہ بننے پر کیوں تیار ہوگی؟“

”راجا اور رانی کے درمیان قطعی ہم آہنگی نہیں۔ میں نے تمام معلومات حاصل کر لی ہیں۔“

قطب الدین نے یہ بھی غلطی نہ کی۔ رانی اسے چپ چپ کر دیکھتی رہی ہے۔ وہ یقیناً آپ کو پسند کرنے لگی ہے۔ اس کے بعد اگر آپ کا پیغام گیا تو وہ یقیناً خوش ہوگی۔“

قطب الدین نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو رضامند کر لیا۔ اب یہ انتظار تھا کہ قلعے سے کوئی باہر آتا ہے یا نہیں۔ دو دن گزر گئے اور پھر ایک دن اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ایک شخص قلعے سے باہر آ گیا۔ لشکر کے لوگ اسے قطب الدین کے پاس لے آئے۔ قطب الدین نے اسے اعتماد میں لے کر سلطان کے نام سے یہ پیغام اسے دیا۔

”اپنی رانی سے کہنا کہ اگر وہ کسی طرح شہر پر ہمارا قبضہ

”امیر اعظم! شاید کسی طوفان کی آمد ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو میرا خیمے میں رہنا مناسب نہیں۔ ہمیں کسی کھلی جگہ پر ہونا چاہیے۔“

وہ مشعل کی روشنی میں باہر نکل آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دو آدمی رسیوں سے بندھے پڑے ہیں۔ محافظ کوشش کر رہا تھا کہ قطب الدین کی نظر ان پر نہ پڑے لیکن قطب الدین نے انہیں دیکھ ہی لیا۔

”یہ دونوں کون ہیں اور انہیں یہاں کیوں ڈالا گیا ہے؟“

”امیر اعظم! یہ دونوں جاسوس ہیں اور قلعے سے نکل کر اس طرف آئے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا مقصد آپ کی جان کو... ضرر پہنچانا ہو۔ میں نے چند دوسرے پھرے داروں کی مدد سے انہیں گرفتار کر لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ آپ کے آرام میں خلل نہ ڈالوں۔ صبح ہو تو آپ کی خدمت میں انہیں پیش کر دوں۔“

”تمہیں فوراً مجھے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی پیغام لے کر آئے ہوں۔“

”حضور! غلطی ہو گئی۔“

”ان دونوں کی رسیاں کھول دو۔“

محافظ آگے بڑھا اور دونوں کو آزاد کر دیا۔ قطب الدین دونوں کو لے کر خیمے کے اندر آ گیا۔ وہ دونوں پھرے مہرے سے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اپنی گرفتاری پر گھبرائے ہوئے نہیں تھے۔ قطب الدین نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

”تمہیں نے مجھ سے کہا ہے اور کس مقصد سے آئے ہو؟“

”ہمیں کسی نے نہیں بھیجا۔ ہم تو مسلمانوں کے سرداروں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ راجا کی ہٹ دھرمی نے قلعے کے لوگوں کو جان کے منہ پر جتا کر دیا ہے۔ آپ لوگ حملہ کر کے ہماری جان کیوں بچاؤ گے۔“

”اگر ہمیں قلعے کے اندر سے کوئی سہارا مل جائے تو شہر ہمارے قبضے میں آجائے۔ تم بتاؤ ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”ہم آپ کی مدد تو نہیں کر سکتے لیکن ایک اطلاع فراہم کر سکتے ہیں۔“ ان دونوں نے کہا۔ ”رانی اور اس کے درمیان چپقلش رہتی ہے۔ اس موقع پر تو دونوں کے درمیان خوب جھگڑے رہنے لگے ہیں۔ اگر کسی طرح رانی کو شیشے میں اتار لیا جائے تو وہ یقیناً مدد کریں گی۔“

”پھر یہ کام تو تم ہی کر سکتے ہو۔“

”شاید نہیں کر سکتے کیونکہ رانی تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی البتہ ہم کوئی ایسا آدمی تلاش کر سکتے ہیں جو رانی

روح افزا



اور کیا چاہیے!



کر دو اے تو سلطان شہاب الدین اسے اپنی ملکہ بنا لے گا۔“
یہ پیغام لے کر وہ شخص قلعے میں واپس چلا گیا۔ اسی
رات وہ پھر آیا اور رانی کا پیغام پہنچایا۔

”رانی ماں کا کہنا ہے کہ میری عمر تو اب ایسی نہیں رہی
کہ بادشاہ کی ملکہ بنوں البتہ میری لڑکی اس قابل ہے کہ وہ
شہاب الدین جیسے جاں باز کے عقد میں آئے۔ میں بادشاہ
کے عہد کی قہر کی قہر کے لیے تیار ہوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ
جب بادشاہ کو فتح حاصل ہو تو وہ میری لڑکی کو اپنی ملکہ بنائے
اور قلعے پر قابض ہو کر میرے مال و متاع اور اسباب کو ہاتھ
نہ لگائے۔“

قطب الدین نے سلطان سے اجازت لیے بغیر رانی
کی یہ شرطیں منظور کر لیں۔

”اپنی رانی سے کہنا کہ سلطان تمہاری بیٹی کو ملکہ
بنانے کے لیے تیار ہے۔ تمہاری دیگر شرطیں بھی قبول ہیں۔
بس تم شہر پر قبضہ کروانے کی تیاری کرو۔“

اس کے دو دن بعد رانی کا جلاک ہونے کی خبر
آگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ رانی نے اسے قہر پر چڑھنے کا
مشورہ دیا تاکہ دشمن کی فوج کا جائزہ لے کر خود بھی اس کے
ساتھ آگئی۔ جب وہ بالکل آخری زمین پر پہنچا تو رانی نے
موقع دیکھ کر اسے دھکا دے دیا اور شور مچائے گا۔ وہ اتنی
بلندی سے گرا تھا کہ گرتے ہی اس کا دم نکل گیا۔ اس کی فوج
میں وہی بے بدولی پھیل گئی تھی۔ اس کے مرتے ہی کسی نے
لڑنے کی طاقت نہ رہی۔ سارا انتظام رانی کے قبضے میں
آ گیا۔ رانی نے اپنے سپہ سالار کو مجبور کیا کہ وہ شہر مسلمانوں
کے حوالے کر دے۔

رانی کی موت کے بعد شہر پر شہاب الدین کا قبضہ
ہو گیا۔

شہر پر قبضہ ہوتے ہی شہاب الدین نے راج کمار
سے شادی کر لی اور اسے مسلمان کر لیا۔ شہاب الدین نے
قطب الدین کو بلایا اور اسے انعام و اکرام سے نوازا کہ اس
کی کوششوں سے قلعہ فتح ہوا تھا۔

”قطب الدین! میں چاہتا ہوں تم راج کمار اور
رانی کو لے کر غزنی چلے جاؤ۔ غزنی پہنچ کر رانی کو اسلامی
تعلیمات اور قرآن سے بہرہ ور کرو۔ ملتان اور اچھ کے
انتظامات میں استحکام پیدا کرنے کے بعد میں بھی غزنی چلا
آؤں گا۔“

قطب الدین نے دونوں ماں بیٹیوں کو ساتھ لیا اور
غزنی پہنچ گیا۔

تاج الدین یلدوز کو موقع مل گیا کہ سلطان کی
خوشنودی کے لیے نہ صرف قطب الدین کو مدعو کرے بلکہ نئی
ملکہ اور اس کی ماں کو بھی اپنے گھر دعوت پر بلائے۔ اس
وقت یہ بھی اچھا موقع تھا کہ سلطان غزنی میں نہیں تھا۔

تاج الدین ایک روز قطب الدین کے مکان پر آیا
اور سلطان کی نئی شادی کی خوشی میں اسے اپنے گھر آنے کی
دعوت دی۔

”سلطان اس وقت موجود نہیں ہیں۔ میں ان کی
اجازت کے بغیر یہ دعوت کیسے قبول کر سکتا ہوں؟“

”ملکہ نہیں اور نہیں جائے گی اپنے بیٹے کے گھر جائے
گی۔ ہم سب سلطان کے بیٹے ہی تو ہیں۔ ملکہ کے لیے یہ بھی
مطلوبی ہے کہ وہ مسلم گھرانوں کی طرز معاشرت سے
واقف حاصل کرے۔“

”سلطان کو معلوم ہوا اور اس نے اسے ناپسند کیا تو؟“
”میں نے الزام اپنے سر لے لوں گا۔ وہ میری کوئی
بات نہیں جانتے۔“

قطب الدین نے ہائی ہوئی۔

شاہی سوار یاں تاج الدین کے محل تک پہنچ گئی تھیں۔
فاخرہ کی خوشی ویدنی تھی۔ کچھ دیر بعد قطب الدین کو اندر آتا
ہی تھا لیکن فاخرہ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ محل کی صحت سے
ان سوار یوں کو اترتے ہوئے دیکھنے کے لیے باہر نکلتی تھی۔
اس کی نظریں قطب الدین پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے خود کار
خبر تھی کہ وہ اس سال کا نو جوان اس کے
ساتھ تھا۔ اس کا چہرہ رابدن، بڑی بڑی آنکھیں اور
چوڑی پیشانی اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔
ہلکی موچیں اور چہرے پر سبزہ خط کا آغاز اس کی مردانہ
وجاہت کا سبب تھا۔

ابھی آنکھوں نے اسے دیکھتے رہنے کا حق ادا نہیں کیا تھا کہ
قطب الدین محل میں داخل ہوا۔ فاخرہ نے اتر آئی اور اس
وقت کا انتظار کرنے لگی جب دیوان خانے میں سب جمع ہوں
اور اسے قطب الدین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے۔

فاخرہ کی بڑی بہن کئی مرتبہ دیوان خانے کا چکر لگا
آئی تھی لیکن فاخرہ اپنے اندر ایسی جھجک محسوس کر رہی تھی جو
اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ کھانے کا دور شروع
ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ تاج الدین یلدوز فاخرہ کو
بلائے آیا۔

”کمال ہے گھر کے تمام افراد دیوان خانے میں ہیں
اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ تم ہی کو قطب الدین سے ملنے کا اشتیاق

”اس وعدے کو یاد رکھیے گا۔“ فاخرہ نے کہا اور اگلے قدموں لوٹ گئی۔ دوسرے دن وہ اپنے والدین کے ساتھ کرمان چلی گئی۔

شہاب الدین اچھ کی مہمات سے فارغ ہو چکا تھا۔ یہاں سے وہ براہ ریکستان سحرات کی طرف روانہ ہوا۔ سحرات کا راجا بھیم دیو، راجا اچھ کا حامی و مددگار تھا۔ اس کی طرف سے دھوکا لگا رہتا تھا کہ کسی بھی وقت اچھ کا رخ کرے گا لہذا اس پر حملہ کر کے اس کی طاقت کو توڑنا ضروری تھا۔

راجا بھیم دیو ایک طاقتور راجا تھا۔ اس نے خوب فٹ کر شہاب الدین کا مقابلہ کیا۔ بڑے زوروں کی معرکہ آرائی ہوئی۔ ایک طویل مقابلے کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ بہت سے مسلمان سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ شہاب الدین بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر غزنی کی طرف لوٹ گیا۔

اس عرصے میں شہاب الدین کی نئی ملکہ کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ قطب الدین کا دل بڑھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ شہاب الدین کو ان ماں بیٹیوں کا خیال نہیں رہا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ عورتیں جب اپنے شوہروں کی موت کی نہیں ہوئیں تو میری کیا ہوں گی۔ اس لیے اس نے ان پر توجہ نہیں دی۔ کچھ عرصے بعد راج کمار کی اب بھی انتقال ہو گیا۔

شہاب الدین کے غزنی سے آ جانے کے بعد قطب الدین کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اسے کئی نئی فائزہ کا خیال آتا تھا لیکن اب وہ غزنی میں نہیں تھی۔ اس سے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سے ملنے کرمان آئے گا لیکن شہاب الدین اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے دور ہونے نہیں دے رہا تھا۔

شہاب الدین اس مرتبہ پھر ہندوستان کا رخ کرنے والا تھا۔ اس کے لیے وہ کھڑکی تیاری کر رہا تھا۔ اسے قدم قدم پر قطب الدین کے مشوروں کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ کسی ضروری پیغام کے لیے ایک قاصد کرمان بھیجا تھا۔ قطب الدین نے سنا تو ایک بہترین موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے سلطان سے درخواست کی کہ یہ اہم پیغام کسی قاصد کے ہاتھ بھیجنا مناسب نہیں۔ یہ پیغام لے کر وہ خود تاج الدین کے پاس جائے گا۔ سلطان نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا۔

وہ تقریباً ایک سال بعد فاخرہ سے ملنے والا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جس دن قطب الدین غزنی سے کرمان

”ابا جان! آپ کو تو معلوم ہے کہ کسی غیر مرد سے ملنے ہوئے مجھے کتنی شرم محسوس ہوتی ہے۔“

”وہ غیر نہیں ہے۔ تمہارے لیے چچا کا درجہ رکھتا ہے۔ فوراً آ جاؤ تاکہ میں اس سے تمہارا تعارف کراؤں۔ نئی ملکہ اور اس کی والدہ بھی آئی ہے۔ تم یہ بھی دیکھ لو گی کہ ہندو عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔“

”آپ چلیں میں آتی ہوں۔“

”کچھ دیر میں کھانا لگنے والا ہے۔ میرے ساتھ ہی چلو ورنہ تم اور دیر لگاؤ گی۔“

وہ سر جھکائے خاموشی سے باپ کے ساتھ چلا خانے میں پہنچ گئی۔ قطب الدین ہی تھا جس نے سب سے پہلے نظر اٹھا کر فاخرہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ حسن کا ایسا نام درموند اس کی نظروں سے اب تک کیوں پوشیدہ رہا۔

”یہ میری بیٹی فاخرہ ہے۔“ تاج الدین نے تعارف کروایا۔

وہ چلتی ہوئی گئی اور راج کمار کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔ مگر اس کی آنکھیں قطب الدین کے سر پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی دوران کھانے کا وقت ہوا اور وہ سب کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کمرے میں بھی فاخرہ نے اپنے لیے ایسی نشست کا انتخاب کیا جو قطب الدین کے سامنے تھی۔

دونوں وقفے وقفے سے نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔

کھانے کے بعد جب سب لوگ رخصت ہونے لگے تو فاخرہ کہیں غائب ہو گئی۔ قطب الدین کی نظریں اسے ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ دیکھ نہیں سکی۔ قطب الدین نے مایوسی کے عالم میں غلام گردش پار کی اور اپنی سواری کی طرف بڑھنے لگا۔ تاج الدین اسے رخصت کر کے واپس جانے لگے۔

”اللہ حافظ!“ ایک جانب سے آواز آئی۔ قطب الدین نے چونک کر دیکھا۔ ملکہ اور راجا آگے بڑھ چکی تھیں۔ فاخرہ چائیک کی جانب سے نمودار ہوئی۔

”کیا ہم دوبارہ مل سکیں گے؟“ قطب الدین نے کہا۔

”آپ کو سلطان کی خدمت سے کہاں فرصت ہے۔“

”آپ کے لیے تو وقت نکالنا ہی ہوگا۔“

”اگر میں ابا جان کے ساتھ کرمان نہیں گئی تو ملاقات ہوگی۔“

”کرمان غزنی کا ایک صوبہ ہی تو ہے۔ میں تم سے

جانے کے لیے لکھا، اسی روز تاج الدین کرمان سے غزنی پہنچ گیا۔

قطب الدین کرمان پہنچا تو خلاف توقع فائرہ نے اس کا استقبال کیا۔ استقبال بھی طعنے کے نشتروں کے ساتھ۔ ”ہمیں آپ نے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ خود نہ آئے تو خیریت کا نام ہی بھیج دیتے۔“

”میں نے خط کا نہیں خود آنے کا وعدہ کیا تھا۔“
”یہ وعدہ بھی خوب نبھایا۔ آپ تو کہتے تھے کہ کرمان غزنی کا صوبہ ہی تو ہے، چلا آؤں گا۔ کرمان تو ہندوستان سے بھی دور ہو گیا۔“

”اب شرمندہ کیوں کرتی ہو۔ ہم تو یہ چاہتے تھے کہ آپ سے ملنے روز کرمان آیا کریں لیکن سلطان کی آمد کے بعد فرصت ناپید ہو گئی۔ سلطان کو ہندوستان کے ایک علاقے میں بہت بری شکست ہوئی ہے۔ اب وہ دوبارہ ہندوستان کا رخ کرنے والے ہیں۔ شاید اس مرتبہ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا پڑے۔“

”یا اللہ خیر! ہمیں جنکوں کے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ کے دشمنوں کو کچھ نہ بھی ہوا تو طویل عمریے کی دعا کی تو ہے۔“
”فکر مت کرو فائرہ..... ہم تمہارے پاس سے ایک ایسی چیز مانگنے والے ہیں جو اس جدائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔“

”اس میں بھی آپ کو یرگم جائے گی۔“
”کیوں؟“

”اباجان کرمان میں نہیں ہیں۔ وہ آج ہی غزنی گئے ہیں۔“
”غزنی گئے ہیں مگر کیوں؟“

”کوئی خاص بات نہیں بس سلطان سے ملاقات کی غرض تھی۔ کوئی اور بات ہو سکتی تھی۔“

یہ اطلاع سننے کے بعد جانا نہیں تھا کہ وہ کرمان میں ٹھہرتا۔ اس کی ممکن تو فائرہ سے بات کرنے کے بعد ہی اتر گئی تھی۔ وہ کرمان سے چلا آیا۔

راستے بھر وہ یہ سوچتا آیا تھا کہ اگر کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ وہ ہندوستان نہ جاسکے تو فائرہ سے ملاقاتوں کا موقع مل سکے گا۔

غزنی پہنچ کر وہ ابھی لباس بھی تبدیل کرنے نہیں پایا تھا کہ سلطان نے اسے طلب کر لیا۔ سلطان کے پاس تاج الدین یلدوز بھی بیٹھا ہوا تھا۔

قطب الدین کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ سلطان نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب

تاج الدین اپنے لشکر کے ساتھ سلطان کے ہمراہ جاتا اور قطب الدین غزنی میں رہ کر سلطان کی نیابت کرتا۔

”سلطان شاہ خوارزم کی طرف سے برابر خطرہ لگا ہوا ہے لہذا کسی ڈسے دار آدمی کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مہم میں تاج الدین میرے ساتھ ہوگا۔ تم غزنی میں رہ کر ایک ایک ہل کی خبریں مجھے ہندوستان پہنچاتے رہو گے۔ میں نے تاج الدین سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ حفاظت کی غرض سے اپنے اہل خانہ کو غزنی پہنچا دے۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کی حفاظت کا بندوبست کرو گے۔“

”یہ غلام آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔“ قطب الدین نے طعنے ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیے اور سر جھکا دیا۔

شہاب الدین روانہ ہو گیا۔ تاج الدین اس کے ہمراہ تھا اور اس کے اہل خانہ غزنی پہنچ چکے تھے۔ قطب الدین بادشاہ کی نیابت کے لیے غزنی میں ٹھہر گیا تھا۔

تاج الدین یلدوز کے محل میں موسیٰ شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ فائرہ اور اس کی بڑی بہن ہندوستان سے آنے والی خبروں پر تہرہ کر رہی تھیں۔

”اباجان کو اگر غزنی میں ٹھہرنے کا حکم ملے اور قطب الدین ایک بادشاہ کے ساتھ چلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“
فائرہ کی بڑی بہن نے کہا۔

”تمہیں شاید یہ بات معلوم نہ ہو لیکن مجھے معلوم ہے۔ فائرہ نے اپنی بہن سے کہا۔“ سلطان معظم یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کے بعد اباجان ان کے جانشین ہوں۔

غزنی کی بالائی وادی کے ہاتھ میں جائے۔ اسی لیے سلطان انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں کہ جو فتوحات ان کے حصے میں آئیں، ان میں اباجان کا بھی نام ہو۔“

”یہ تو تم نے نئی بات بنائی کہ سوال یہ ہے کہ غیاث الدین کا بیٹا محمود موجود ہے جو سلطان شہاب الدین کا بھتیجا ہے۔ تخت کی وراثت تو اسے جائے گی۔ اباجان کوئی سلطان شہاب الدین کے صلیبی بیٹے تو ہیں نہیں۔“

”ہوسکتا ہے سلطان، اباجان کو اپنی زندگی میں ہی مقرر کر دیں۔ میں نے تو ایک بات کہی کہ اباجان کو اعزاز دینے کے لیے سلطان انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے کچھ علاقے فتح کر کے اباجان کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا جائے۔“

”اللہ! یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ مجھے ہندوستان دیکھنے کا

لاہور کا غزنوی حکمران راجا دہلی اور دوسرے مقامات ہند کے راجاؤں کی دشمنی تیز افغانوں کی یورشوں کے سبب بہت کمزور ہو چکا تھا لہذا جب خسرو، شہاب الدین کے مقابلے پر آیا تو مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور مجبوراً قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا اور پھر صلح کے لیے کوششیں کرنے لگا۔ اس نے اپنا ایک نو عمر لڑکا مع ایک شاندار ہاتھی شہاب الدین کے پاس بھجوا دیا۔ شہاب الدین نے اس پیشکش کو قبول کیا اور صلح کے ساتھ صلح لیا۔

دہلی کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد اس نے سندھ کے مشہور حکمران یادوہیل پر حملہ کیا اور دریائے سندھ کے کنارے کے تمام مقامات کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

شہاب الدین کے بیٹے ہی خسرو ملک اپنی سرشت بد پر اتر آیا۔ کھنکروں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس نے سیالکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ شہاب الدین نے تعمیر کروایا تھا اور اس کے بعد سندھ کی طرف لپکا تھا۔ خسرو نے بہت کوشش کی کسی طرح قلعے پر قبضہ ہو جائے لیکن وہ ناکام رہا اور تاحمداہو کی طرف لوٹ گیا۔ شہاب الدین کے سے مزہ پکھانے کے لیے لاہور پر حملہ کر دیا۔ خسرو ملک اس بار بھی قلعہ بند ہو گیا۔ شہاب الدین نے قلعے کا محاصرہ کیا اور اس محاصرے میں ایسی شدت پیدا کی کہ خسرو عاجز آ گیا اور جنگ آ کر شہر کے دروازے کھول دیے۔ شہاب الدین نے اس مرتبہ کوئی رعایت نہیں کی اور اسے گرفتار کر کے اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کے پاس غورستان بھیج دیا۔ غیاث الدین نے اسے ایک قلعے میں نظر بند کر دیا اور بعد میں موت کے کھٹا اتار دیا۔

خسرو ملک کی موت کے ساتھ ہی محمود غزنوی کے خاندان کا چراغ گل ہو کر رہ گیا۔ اب کوئی نہیں تھا جو شہاب الدین کے سامنے آتا۔

تاج الدین یلدوز کے محل کا پائیں باغ چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ گھر کے تمام لوگ خواب غفلت میں تھے لیکن باغ میں رہ رہ کر سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔ ان میں ایک

کچھ دیر بعد لڑکیوں کی والدہ بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئی تھیں۔ ایک ملازم نے آ کر خبر دی کہ قطب الدین ابیک دروازے پر ہیں اور بیانی کی اجازت چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی فاخرہ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ کام ملازموں کا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی گئی اور غلام گردش کو پار کر گئی۔ قطب الدین اسے راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے محافلوں نے ٹھوڑوں کو اصطبل میں باندھ دیا تھا۔

”زہے نصیب، آپ ہمارے گھر کا راستہ تو بھولے۔“ فاخرہ نے طنز کیا۔

”میں بھولے سے آ تو گیا، تم تو بھول کر بھی میرے گھر نہ آ سکیں۔“

”میں اگر آ سکتی تو صبح شام آتی۔ ویسے میں آپ کی ذہانت کی داد دیتی ہوں۔ آپ نے کس ترکیب سے اباجان کو ہندوستان بھیج دیا اور غزنوی میں گھس گئے۔“

”بھلا اس میں ہمارے ذہانت کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سلطان کا اپنا فیصلہ تھا۔“

”وہاں سے کوئی خبر آئی؟“

”اب کیا ساری باتیں یہیں سے کھڑے کر لوگی۔ اندر چلنے کے لیے نہیں کہو گی؟“

”میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آپ کو بیٹھنا بھی ہو گا۔“

فاخرہ نے اسے لے جا کر دیوان خانے میں بھجوا دیا۔ ملازموں نے خشک میوہ جات اور شربت لا کر رکھ دیا۔ فاخرہ کا دل ملک چاہ رہا تھا کہ یہاں کوئی نہ آئے لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اپنے والدہ اور بڑی بہن کو بھی بلانا پڑا۔

باتوں کا دروازہ کھلنے لگا لیکن فاخرہ سب سے بے نیاز اپنی دنیا میں کھولی ہوئی تھی۔ اسے تو جب ہوش آیا جب قطب الدین جانے کے لیے کھڑے ہوئے۔

اب کا گیا وہ کب آئے گا۔ اس نے سوچا اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی غلام گردش میں آ گئی۔

”فاخرہ! کیا ہمیں تنہائی کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آ سکتا؟“

”آپ ہی کہہ رہے تھے کہ میں تمہارے والدہ کے کہہ کر اس جدائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔“

”وہ ہندوستان گئے ہوئے ہیں۔ واپسی نہ جانے کب ہو۔ اس وقت تک ہم تمہارے بغیر کیسے رہیں گے؟“

”آپ پر ہمارے گھر کے دروازے بند تو نہیں ہوئے۔“

”آپ کی والدہ کو اعتراض ہو گا۔“

مردانہ آواز تھی ایک نسوانی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند نے ذرا جھک کر دیکھا تو ان میں ایک قطب الدین تھا اور نسوانی آواز فاخرہ کی تھی۔
 ”اباجان کو گھنے دو سال ہونے کو آئے۔ وہ نہ جانے کب تک ہندوستان میں رہیں۔ آپ ابی جان سے بات کیوں نہیں کرتے؟“
 ”میری مجبوری سمجھو فاخرہ۔ میں سلطان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ شادی بھی نہیں۔ وہ یہاں ہوتے تو اب تک ہماری شادی ہو بھی چکی ہوتی۔“
 ”اگر سلطان رضامند نہ ہوئے؟“

”پھر میں اپنا راستہ خود بناؤں گا۔ میں باغی بن سکتا ہوں بے وقائیں۔ سلطان سے پوچھنا ضروری ہے۔ وہ انکار کر دیں وہ الگ بات ہے۔ دیئے وہ انکار نہیں کریں گے۔ انہوں نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی۔“
 ”قطب الدین! ذرا سوچو، یہ ابھی بات نہیں کہ ہم چھپ چھپ کر ملتے ملتے کبھی کسی نے دیکھ لیا تو قیامت سے تم چیز اس گھر میں نہیں آ سکتے۔“
 ”تم ٹھیک کہتی ہو فاخرہ، چھپ۔ میں خود بھی سوچتا رہتا ہوں کہ میری بے تابی تمہیں رسوا کر دے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس باغ میں نہیں آیا کروں گا۔ تمہیں دیکھنے کو جی چاہے گا تو سب کی موجودگی میں آیا کروں گا۔“
 ”آپ تو خفا ہو گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ رہے ہیں۔“
 آپ ملتا ہی چھوڑ دیں۔ آپ سے ملے بغیر تو ہمیں کبھی کہاں چین ملے۔“

”فاخرہ بیگم..... احتیاط ضروری ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ کسی ایسے موقع کا انتظار کرو۔ سلطان کے غزنی پہنچنے ہی میں تمام دور یاں منادوں۔“
 دو سائے اپنی جگہ سے اٹھ کر قطب الدین اس خفیہ راستے کی طرف بڑھ گیا جو اسے باہر لے جاسکتا تھا۔ دیوار کے ساتھ اس کا گھوڑا بندھا تھا۔ قطب الدین سوار ہوا تو گھوڑے نے قدم اٹھا دیے۔

☆ ☆ ☆
 شہاب الدین نے لاہور فتح کرنے کے بعد ملتان کے حاکم علی کرماج کے سپرد کیا اور قاصد کو غزنی کی طرف دوڑایا کہ فتح نامہ قطب الدین کو پیش کرے اور نوید سنائے کہ سلطان عتق رب داخل غزنی ہوگا۔
 قطب الدین امراء کا اجلاس برخواست کرنے کے بعد فاخرہ کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ لاہور سے آئے

ہوئے قاصد نے محل میں قدم رکھا۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی، نفیریاں بجنے لگیں۔ جب تک قاصد قطب الدین تک پہنچتا تھا اسے خبر سب کو ہو چکی تھی۔
 قاصد نے فتح نامہ پڑھ کر سنایا۔ قطب الدین نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ فاخرہ کے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب اسے سلطان کی آمد کا جشن منانا تھا۔ شہاب الدین بہت سامان نفیست لے کر دکن میں داخل ہوا۔ ہفتوں تک غزنی کے در دیوار ستاروں کی طرح جگمگاتے رہے۔
 شہاب الدین کے آنے کے بعد قطب الدین، تاج الدین یلدوز سے ملنے ان کے گھر گیا ضرور، وہاں فاخرہ کو بھی دیکھا لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ تاج الدین سے فاخرہ کے متعلق کوئی بات کرتا۔ یہ موقع ایسا بھی نہیں تھا کہ سلطان سے شہاب الدین کو ذکر پھیرتا۔ تاج الدین کچھ دن غزنی میں گزارنے کے بعد اپنی جاگیر کرمان چلے گئے۔ فاخرہ کو بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔ قطب الدین انہیں رخصت کرنے بھی نہ جاسکا۔
 اسی زمانے میں خوارزم شاہیوں سے جنگ چھڑ گئی جو طویل عرصے تک جاری رہی۔ جب قطب الدین کے سپرد کی گئی لہذا اسے اتنی فرصت بھی نہ مل سکی کہ وہ کرمان جاتا اور فاخرہ سے ملتا۔ کسی قاصد کو اس کے پاس بھیجتا تو کیوں بھیجتا اور کیا کہلاتا۔
 اس جنگ کی وجہ سے غزنی میں بھی بغاوتیں مچنے لگی تھیں۔ شہاب الدین، تاج الدین کی مدد سے ان بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔
 قطب الدین کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ فاخرہ کس حال میں ہے۔
 قطب الدین انہیں ان کے کنارے مقیم تھا جو دریائے جیحوں کے پانی سے سیراب ہو کر خوارزم اور خلیج کی مشرقی جانب بہتی تھی۔ تیغوں کی جھنڈا اسے فاخرہ کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ رات کے وقت جب جنگ کے بادل چھٹ جاتے تھے تو وہ چاند سے ہاتھیں کرتا تھا۔
 غزنی سے اچھی خبریں نہیں آ رہی تھیں۔ کرمان کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔ اس نے ایک خط فاخرہ کے نام لکھا اور ایک با اعتماد آدمی کو کرمان کی طرف بھیج دیا۔ ہدایت بھی تھی کہ یہ خط فاخرہ کے ہاتھوں تک پہنچے اور اس کا جواب بھی لانا۔
 ایک ہفتے کے سات دنوں کی مسافت طے کر کے وہ

”پھر میں اپنا راستہ خود بناؤں گا۔ میں باغی بن سکتا ہوں بے وقائیں۔ سلطان سے پوچھنا ضروری ہے۔ وہ انکار کر دیں وہ الگ بات ہے۔ دیئے وہ انکار نہیں کریں گے۔ انہوں نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی۔“
 ”قطب الدین! ذرا سوچو، یہ ابھی بات نہیں کہ ہم چھپ چھپ کر ملتے ملتے کبھی کسی نے دیکھ لیا تو قیامت سے تم چیز اس گھر میں نہیں آ سکتے۔“
 ”تم ٹھیک کہتی ہو فاخرہ، چھپ۔ میں خود بھی سوچتا رہتا ہوں کہ میری بے تابی تمہیں رسوا کر دے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس باغ میں نہیں آیا کروں گا۔ تمہیں دیکھنے کو جی چاہے گا تو سب کی موجودگی میں آیا کروں گا۔“
 ”آپ تو خفا ہو گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ رہے ہیں۔“
 آپ ملتا ہی چھوڑ دیں۔ آپ سے ملے بغیر تو ہمیں کبھی کہاں چین ملے۔“
 ”فاخرہ بیگم..... احتیاط ضروری ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ کسی ایسے موقع کا انتظار کرو۔ سلطان کے غزنی پہنچنے ہی میں تمام دور یاں منادوں۔“
 دو سائے اپنی جگہ سے اٹھ کر قطب الدین اس خفیہ راستے کی طرف بڑھ گیا جو اسے باہر لے جاسکتا تھا۔ دیوار کے ساتھ اس کا گھوڑا بندھا تھا۔ قطب الدین سوار ہوا تو گھوڑے نے قدم اٹھا دیے۔

☆ ☆ ☆
 شہاب الدین نے لاہور فتح کرنے کے بعد ملتان کے حاکم علی کرماج کے سپرد کیا اور قاصد کو غزنی کی طرف دوڑایا کہ فتح نامہ قطب الدین کو پیش کرے اور نوید سنائے کہ سلطان عتق رب داخل غزنی ہوگا۔
 قطب الدین امراء کا اجلاس برخواست کرنے کے بعد فاخرہ کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ لاہور سے آئے

ہوئے قاصد نے محل میں قدم رکھا۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی، نفیریاں بجنے لگیں۔ جب تک قاصد قطب الدین تک پہنچتا تھا اسے خبر سب کو ہو چکی تھی۔
 قاصد نے فتح نامہ پڑھ کر سنایا۔ قطب الدین نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ فاخرہ کے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب اسے سلطان کی آمد کا جشن منانا تھا۔ شہاب الدین بہت سامان نفیست لے کر دکن میں داخل ہوا۔ ہفتوں تک غزنی کے در دیوار ستاروں کی طرح جگمگاتے رہے۔
 شہاب الدین کے آنے کے بعد قطب الدین، تاج الدین یلدوز سے ملنے ان کے گھر گیا ضرور، وہاں فاخرہ کو بھی دیکھا لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ تاج الدین سے فاخرہ کے متعلق کوئی بات کرتا۔ یہ موقع ایسا بھی نہیں تھا کہ سلطان سے شہاب الدین کو ذکر پھیرتا۔ تاج الدین کچھ دن غزنی میں گزارنے کے بعد اپنی جاگیر کرمان چلے گئے۔ فاخرہ کو بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔ قطب الدین انہیں رخصت کرنے بھی نہ جاسکا۔
 اسی زمانے میں خوارزم شاہیوں سے جنگ چھڑ گئی جو طویل عرصے تک جاری رہی۔ جب قطب الدین کے سپرد کی گئی لہذا اسے اتنی فرصت بھی نہ مل سکی کہ وہ کرمان جاتا اور فاخرہ سے ملتا۔ کسی قاصد کو اس کے پاس بھیجتا تو کیوں بھیجتا اور کیا کہلاتا۔
 اس جنگ کی وجہ سے غزنی میں بھی بغاوتیں مچنے لگی تھیں۔ شہاب الدین، تاج الدین کی مدد سے ان بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔
 قطب الدین کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ فاخرہ کس حال میں ہے۔
 قطب الدین انہیں ان کے کنارے مقیم تھا جو دریائے جیحوں کے پانی سے سیراب ہو کر خوارزم اور خلیج کی مشرقی جانب بہتی تھی۔ تیغوں کی جھنڈا اسے فاخرہ کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ رات کے وقت جب جنگ کے بادل چھٹ جاتے تھے تو وہ چاند سے ہاتھیں کرتا تھا۔
 غزنی سے اچھی خبریں نہیں آ رہی تھیں۔ کرمان کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔ اس نے ایک خط فاخرہ کے نام لکھا اور ایک با اعتماد آدمی کو کرمان کی طرف بھیج دیا۔ ہدایت بھی تھی کہ یہ خط فاخرہ کے ہاتھوں تک پہنچے اور اس کا جواب بھی لانا۔
 ایک ہفتے کے سات دنوں کی مسافت طے کر کے وہ

ایسا وار کیا کہ وہ زخمی ہو گیا۔ قریب تھا کہ گھوڑے سے گر جائے کہ ایک غلٹی سردار کی اس پر نظر پر پڑ گئی۔ وہ اس کے گھوڑے پر چڑھا اور اسے اپنی گود میں لے کر میدان سے بھاگ نکلا۔

سلطان کو چھوڑ کر بھاگے ہوئے امیر میدان جنگ سے بیس کوس کے فاصلے پر مقیم تھے۔ یہ سردار سلطان کو بھی وہاں لے کر پہنچ گیا۔ سلطان اپنے امیروں سے سخت ناراض تھا۔ صرف قطب الدین ایک تھا جو اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ سلطان اسی سے اپنے دل کی باتیں کر رہا تھا۔

”فرزند من! تو نے میرے امیروں کی بے وفائی دیکھ لی۔ یہ مجھے مرنے کے لیے میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ میں اپنے زخم اچھے ہوتے ہی غزنی جاؤں گا اور ایک نالغہ لے کر دوبارہ ہندوستان آؤں گا۔“

سلطان مقیم! آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو یہ حفاظت غزنی تک لے کر جاؤں گا۔“

”میرے بھائی! تم میرے ساتھ غزنی نہیں جاؤ گے۔ میں نے جو علاقے ہندوستان میں رہ کر فتح کیے ہیں، تم ان کی نگرانی کرو گے۔ چند امیروں کو بھی میں جو تمہارے ساتھ ہوں گے۔ میرے دوبارہ آنے تک ان علاقوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دو گے۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

اس حکم کی تعمیل اس نے کس دل سے کی یہ ہمیں کادل جانتا تھا۔ قاخرہ نہ جانے کیا سوچتی ہوگی۔ وہ میری جگہ پر کھڑی کی یا نہیں؟

شہاب الدین غزنی پہنچا تو تاج الدین یلدوز کی بھی کیا ہمت کی تھی پچھتا کہ قطب الدین کو ساتھ کیوں نہیں لائے۔

شہاب الدین نے غزنی پہنچتے ہی میدان جنگ سے بھاگنے والے امیروں کو سزا دینے کا حکم جاری کیا۔ اس نے تو یروں میں کچے ”جو“ بھجوا کر ان امیروں کی گردن میں لٹکا دیے اور اسی عالم میں ان کو مارے شہر میں پھروایا۔

شہاب الدین نے یہ حکم دیا کہ جو امیر اپنے تویرے کے کچے جو نہ کھائے اسے قتل کر دیا جائے۔ امیروں نے اپنی جائیں بچانے کے لیے تو یروں کے کچے جو کھالیے۔ تب جا کے خلاصی ہوئی۔

اس کے بعد بھی غزنی میں سوگ کا عالم طاری تھا۔ شہاب الدین کو اس شکست کا ایسا صدمہ تھا کہ ہر عیش خود پر حرام کر لیا تھا۔

قاخرہ کو اپنے والد کی زبانی قطب الدین کا احوال

قاصد واپس آیا۔ قطب الدین کو قاخرہ کا جواب موصول ہو گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا، وہ قیامت تک قطب الدین کا انتظار کرے گی۔

قیامت تو نہیں آئی لیکن سلطان کا پیغام آ گیا۔ اس نے کسی اور امیر کو خوارزم بھیج کر قطب الدین کو واپس بلا لیا۔ قطب الدین خوش تھا کہ اسے غزنی کا آسان دیکھنے کو ملے گا۔ قاخرہ سے ملاقات کا موقع ہاتھ آئے گا۔ اس نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے لیکن ابھی وہ راستے میں تھا کہ ایک اور پیغام مل گیا۔ وہ ہندوستان پر ایک اور حملے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا اور قطب الدین کو حکم ہوا تھا کہ وہ غزنی کی سرحدوں پر سلطان سے آکر مل جائے۔ اسے بھی سلطان کے ساتھ ہندوستان جانا ہوگا۔ انکار کی نہ تاب تھی نہ مجال اپنے لشکر کے ساتھ سلطان سے جا کر مل گیا۔

غزنی کے در و دیوار اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس مرتبہ شہاب الدین نے ایک نر بدست حملے کے بعد بھٹنڈہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ملک بھٹنڈہ میں بڑے بڑے راجاؤں کا مرکزی شہر بن گیا تھا اور راجا اجیر رائے پتھورا کے قبضے میں تھا۔

سلطان شہاب الدین قلعہ بھٹنڈہ کو اپنے ایک امیر کے حوالے کر کے وطن واپسی کا ارادہ کریں۔ یہ تھا کہ اسے خبر ملی کہ رائے پتھورا ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا کر بھٹنڈہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ دھاکا دہلی کھانڈے راؤ بھی ہے۔

سلطان عظیم الشان لشکر کی آمد کی خبر سن کر شہاب الدین نے واپسی کا ارادہ مٹوی کر دیا۔ قطب الدین ایک مرتبہ پھر قاخرہ سے بہت دور چلا گیا۔ شہاب الدین مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر دریا نے سرستی کے کنارے دونوں افواج کا آمنہ سامنا ہوا۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو ابتدا میں ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ ہندوؤں کا پلڑا ایسا بھاری تھا کہ سلطان کے غوری، افغانی اور غلٹی امیر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

شہاب الدین نے جانا بازی کا مظاہرہ کیا اور باقی ماندہ فوج اور قطب الدین کی جانا بازی اور رفاقت سے ڈر کر ہٹ کر لڑتا رہا۔ قطب الدین کی جانا بازی اور رفاقت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے تو جیسے مرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اکیلا دشمن کی صفوں میں داخل ہوتا اور صفوں کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔ ایک بجلی تھی کہ کوندری تھی۔ ایک طوفان تھا جو اٹھ رہا تھا۔

اس جنگ کے دوران کھانڈے راؤ نے اس پر کھوار کا

معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہ انتظار کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ انتظار بھی ایسا جس کی حواالت کا اسے علم نہیں تھا۔

شہاب الدین اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تیار یاں کرتا رہا اور ایک سال کے اندر اندر ایک عظیم الشان لشکر تیار کر لیا۔ جب لشکر کی تیاری مکمل ہو گئی تو اس نے غزنی کو خیر باد کہا۔ یہ لشکر منزلیں طے کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ ملتان میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد وہ لاہور پہنچا۔ قطب الدین بھی ایک لشکر کے ساتھ اس سے آکر مل گیا۔ شہاب الدین نے اپنے ایک امیر کو امیر، رائے مختورہ کے پاس بھیجا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

”میں اس وقت لاہور میں ہوں اور تمہاری راجنیتی کو ختم کرنے کے لیے یہاں پہنچا ہوں۔ اگر تم اس ذلت سے بچنا چاہتے ہو تو اسلام قبول کر لو۔ تمہارے توسط سے امیر کے باشندوں کو بھی میری یہی دعوت ہے۔ اگر تم ایسا کر لو گے تو میں تمہاری سلطنت تمہارے پاس رہنے دوں گا۔“

اس خط کے جواب میں رائے مختورہ نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک عجیب و غریب فلسفہ لکھا کہ اب جنگ کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا تھا۔

رائے مختورہ نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنی مدد کے لیے خطوط لکھے۔ ان راجاؤں نے رائے مختورہ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا اور اپنے اپنے لشکر لے کر اس کی مدد کو چل پڑے۔ تمام راجاؤں نے مختورہ کے گرد جمع ہو گئے۔ رائے مختورہ تین لاکھ راجپوتوں اور افغانوں کا لشکر لے کر شہاب الدین کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا اور دریائے سوا کی گتے کنارے، ترائن کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ یہاں سے اس نے شہاب الدین کے نام یہ خط لکھا۔ ”ہم ہندو راجاؤں کی کیفیت تو تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے وہ تمہیں اور تمہاری فوج کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہے لیکن ابھی مختلف انواع کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو اپنے سپاہیوں پر رحم کھاؤ۔“

”اگر تم اپنے ارادے سے باز آ کر واپسی کا ارادہ کر لو گے تو ہم تم سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں گے۔ ہم تم کو لوٹ جانے کا نیک مشورہ دیتے ہیں ورنہ یاد رکھو کل صبح ہم اپنے سپاہیوں کی مدد سے جنگ کو میدانِ حشر بنا دیں گے۔“

شہاب الدین نے یہ خط پڑھ کر ایسا مصلحت آمیز خط لکھا کہ ہندو کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔

اور ہمدردی کے جذبات سے بھر پور ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر خود عمل کرتا لیکن کیا کروں میں اپنے بھائی کا حکومت ہوں اور اسی کی ہدایت پر عمل کرتا ہوں۔ اگر مجھے اتنی فرصت ملے کہ کسی کو اپنے بھائی کے پاس بھیج کر آپ کی قوت کا حال بیان کر سکوں اور اپنی کمزوری کی روداد بیان کر سکوں تو مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہو سکتی ہے کہ پنجاب، سرحد اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی ہندوستان آپ کے پاس رہے۔“

اس خط کو پا کر رائے مختورہ پر مسلمانوں کی کمزوری واضح ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ شہاب الدین اپنے بھائی کی طرف سے ہدایت آنے سے قبل حملہ آور نہیں ہوگا۔

ہندو اپنی طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر مسلمانوں کی طرف سے غافل ہو گئے اور عیش و عشرت میں وقت گزارنے لگے۔

جب شہاب الدین نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ ہندو راجا پوری طرح غفلت میں مبتلا ہیں تو اس نے راتوں رات لشکر مرتب کیا اور علی الصبح میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ ہندو ابھی ضروریات سے فارغ ہوئے تھے کہ شہاب الدین نے جنگ شروع کر دی۔

اک بلائے ناگہانی تھی جو ہندوؤں پر نوٹ پڑی تھی۔ وہ پریشان تو ہوئے لیکن سچ ہو کر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ وہ اتنی بہادری سے لڑ رہے تھے کہ مسلمان لشکریوں کے قدم اکھڑے جا رہے تھے۔

مصر کے وقت تک جب اس لڑائی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو شہاب الدین اور قطب الدین نے مل کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ ہندوؤں کے قدم اکھڑ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچا پلٹ گیا۔ کھانڈھے باؤں اور بہت سے دوسرے ہندوستانی راجا ہلاک ہو گئے۔ رائے مختورہ اپنی بچی فوج لے کر بھاگ نکلا لیکن ابھی تھوڑی ہی دھڑکتا تھا کہ مسلمان لشکریوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اسے بعد میں قتل کر دیا گیا۔

اس فتح کے بعد شہاب الدین امیر میں داخل ہوا۔ امیر اور اس کے نواح پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی گیا۔ دہلی کے راجا نے اس کا دوستانہ استقبال کیا اور قیمتی تحائف بطور نذرانہ پیش کیے۔

جب شہاب الدین غزنی واپس جانے لگا تو اس نے قطب الدین کو ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اب اس کا ہندوستان میں رہنا مقدر تھا۔

اسنے بڑے مرتبے پر فائز ہونے کے بعد قطب

الدین کو خوشی ہوئی چاہیے تھی لیکن غزنی سے دوری کا مصب تھا، فاخرہ سے دوری۔ وہ نکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہ کہنے کی جرأت کر سکا۔

”سلطان معظم! میں تو آپ کے قدموں میں رہنے کا عادی ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ آپ کی جدائی مجھے خوش نہیں رکھ سکے گی۔“

اس کے جواب میں شہاب الدین نے تسلی دی۔ ”یہاں کا انتظام تمہارے سوا کوئی نہیں سنبھال سکتا اور پھر یہ جدائی عارضی ہے۔ میں بہت جلد ہندوستان آؤں گا اور تم سے ملوں گا۔“
فاخرہ سے ملنے کا خیال پھر خواب و خیال ہو گیا۔

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فاخرہ اپنے کمرے میں تھی۔ کبھی بیٹھ جاتی کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی تھی پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اس نے قطب الدین کے نام خط لکھنا شروع کیا۔

”غفلت مآب قطب الدین!

میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ دشمنوں کو پامال کر کے اپنے اگلے قطب الدین دوستوں کو تو بے قرارت کر دو۔ میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ میں کب تک انکار کرتی رہوں گی۔ میں نے خود کشی کا پورا سامان کر لیا ہے۔ اگر تم اب بھی نہیں آئے تو میری صورت نہ دیکھ سکو گے۔ اس خط کا فوری جواب دو ورنہ میں خود کشی کر سکتی ہوں۔“
صبح اٹھ کر اس نے اپنے آپ کو لازم کو اعتماد میں لیا اور اسے دہلی کی طرف دوڑا دیا۔

وہ جب تک جاتا اور واپس آتا، فاخرہ و شادی کے لیے مجبور کیا جانے لگا۔ مجبوراً اسے اپنی ماں کو اپنی جگہ سے ہٹا کر اپنا پڑا۔ ماں نے سن کر سر پر پیٹ لیا۔ ”قطب الدین اب ہندوستان کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا انتظار مت کرو۔“
”ہندوستان بھی اسی دنیا میں ہے ہاں۔“

”یہ دنیا اتنی چھوٹی نہیں جتنی تم سمجھتی ہو۔ قطب الدین، سلطان کا زور بڑھ رہا ہے۔ قطب الدین اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اختیار نہیں۔ وہ اگر با اختیار ہوتا تو کب کا تم سے ملنے آ جاتا۔“

ماں سمجھاتی رہی لیکن فاخرہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ فاخرہ کا ملازم لوٹ آیا تھا اور قطب الدین کا یہ پیغام لایا تھا کہ وہ فاخرہ کو بھولا نہیں ہے۔ بہت جلد غزنی آئے گا۔

یہ تو فاخرہ کو بھی معلوم تھا کہ قطب الدین اسے بھولا نہیں ہے۔ اس کا سوال تو یہ تھا کہ وہ اس سے شادی کب کرتا ہے۔ یہ پیغام اسے صرف یہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت جلد غزنی آئے گا۔ کب آئے گا، یہ پھر بھی معلوم نہیں تھا۔ فاخرہ کے لیے یہ پیغام ہی بہت تھا۔ اس نے ماں سے صاف کہہ دیا کہ وہ قطب الدین سے شادی کرے گی ورنہ نہیں کرے گی۔ اس کا یہ

شہاب الدین کی واپسی کے بعد قطب الدین نے دہلی اور میرٹھ کے قلعوں پر حملہ کر کے ان دونوں علاقوں کو رائے پتھو را اور کھانڈے راؤ کے رشتے داروں کی حکومت سے نکال کر اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا۔ میرٹھ پر قبضہ ہوتے ہی دہلی کون سا دور تھا۔ آگے بڑھا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ راجپوتوں نے بہادر دہلی کا مظاہرہ کیا اور لڑنے کے لیے باہر نکل آئے۔ فریشتین میں زبردست جنگ ہوئی۔ راجپوت شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ خالی ہو گیا۔ قطب الدین نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ محاصرے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ راجپوت جب بہت تنگ آ گئے تو انہوں نے قطب الدین سے امان طلب کی اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے دہلی کو اسلامی مقبوضات میں شامل کر کے اسلامی قانون رائج کر دیا۔

کچھ عرصے بعد ہندوستان کے درو یوار جنگ کے شور سے پھر کو نیچے لگے۔ شہاب الدین پھر ہندوستان میں قدم رکھ رہا تھا۔ قطب الدین کو معلوم ہوا تو وہ بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ اس نے اس نے قنوج کا راستہ اختیار کیا۔ قطب الدین اس کے ہراؤ میں شامل تھا۔

راجا جے چند والی بنارس اس کے مقابلے پر صرف آرا ضرور ہوا لیکن وہ قطب الدین کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس کے ساتھ کوہ پیکر ہاتھیوں کی قطاریں تھیں لیکن وہ ان سب کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شہاب الدین کے لیے قطب الدین نے راستہ صاف کر دیا تھا۔ وہ بے آسانی بنارس میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ایک ہزار مندروں کو اس غرض سے مسمار کر دیا کہ مسلمانوں کے رہنے کے لیے مکان بنائے جاسکیں۔ شہاب الدین نے ہندوستانی علاقوں کی حکومت قطب الدین کے سپرد کی اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

☆☆☆

جو ہاتھی بھی بادشاہ کے سامنے سے گزرتا، وہ ٹل ہان کے اشارے پر بادشاہ کو سلام پیش کرتا۔ ان ہاتھیوں میں ایک سفید ہاتھی بھی تھا۔ جب یہ ہاتھی بادشاہ کے سامنے سے گزرا تو ٹل ہان نے اسے اشارہ کیا تاکہ وہ بادشاہ کو سلام کرے لیکن اس ہاتھی نے اشارے کی کوئی پروا نہیں کی۔ ٹل ہان نے ہاتھی کو طرح طرح سے سلام کرنے پر مجبور کیا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑاڑا ہالکے غضب ناک ہو گیا۔

”قطب الدین! اسے تم ہی درست کرو گے۔“ شہاب الدین نے یہ کہہ کر ہاتھی قطب الدین کے حوالے کر دیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب قطب الدین اس کے سامنے آیا تو یہ شریر جانور بالکل قابو میں آ گیا اور اشارے کے بغیر ہی اسے سلام کرنے لگا۔

یہ ہاتھی زندگی بھر قطب الدین کے ساتھ رہا۔ جب قطب الدین کا انتقال ہوا تو یہ ہاتھی بھی مر گیا۔ شہاب الدین قطب الدین کو القاب فرزند دی دینے کے بعد ایک مرتبہ پھر غزنی روانہ ہو گیا۔ قطب الدین ایک مرتبہ پھر قاخروہ سے دور ہو گیا۔ بہت دور... بہت دور۔

قطب الدین دادا خاں دہلی کی طرف واپس ہوا۔ ابھی اس نے تھوڑی سی راستہ سے چلنا تھا کہ اسے معلوم ہوا دہلی اور اجمیر دونوں جگہوں پر جنگ کے خطرہ محسوس ہوئے ہیں۔ اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھ کر دہلی و اجمیر نے سرکشی دکھائی تھی۔ سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ چھت رائے نامی ایک راجپوت لشکر جہاز کے راجہ دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے اپنے شہر سے روانہ ہو چکا تھا۔ یہ لشکر دہلی کے قریب پہنچ چکا تھا اور آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچا رہی تھی۔

یہ خبریں سن کر قطب الدین چھت رائے کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسے ہر قیمت پر دہلی کو قبضے سے بچانا تھا۔ چھت رائے قطب الدین کی آمد کی خبر ملی تو وہ اجمیر کی طرف بھاگ گیا۔ قطب الدین نے اس کا تعاقب کیا اور اجمیر پہنچ گیا۔ اجمیر کے راجا بھیراج نے شہر سے نکل کر قطب الدین کا مقابلہ کیا لیکن قطب الدین کی کموار نے اس کا قلع قمع کر دیا۔ اجمیر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور ہندوؤں کا یہ مرکزی شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمان فرماں روا کا صدر مقام بن گیا۔

شہاب الدین جب پہلی مرتبہ ملتان آیا تھا، حاکم بھیم راج سے اس کی دشمنی اسی وقت سے چل رہی تھی۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ بہت خوف زدہ تھا اور مسلسل

صاف جواب سن کر اس کے والدین نے قاخروہ کے بجائے اس کی بڑی بہن کا رشتہ ناصر الدین قباج سے طے کر دیا۔

قاخروہ کا انتظار قطب الدین کی مشکلوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ قطب الدین نے آٹا بھی چاہا تو غزنی نہ آ سکا۔ ایک موقع وہ آیا کہ جب قطب الدین نے غزنی جانے کی پوری تیاری کر لی۔ اس نے قاخروہ کو خط بھی تحریر کر دیا کہ وہ اس سے ملنے بہت جلد غزنی آئے گا لیکن عین وقت پر اسے اپنے ایک قلعے کی حفاظت کے لیے ہانسی جانا پڑ گیا۔ ایک راجپوت سردار جس کا نام جیتواں تھا، ہانسی کے قلعے کے نیچے خیمہ زن ہو گیا۔ ہانسی کا مسلمان صوبے دار مقابلے کی جرأت نہ کر سکا اور قلعہ بند ہو کر قطب الدین کو مدد کے لیے پکارا۔

قطب الدین کو غزنی جاتے جاتے ہانسی جانا پڑا۔ قطب الدین نے ہانسی پہنچ کر جیتواں کو شکست دی۔ جیتواں فرار ہو گیا۔ اس رخ کے بعد اس نے غزنی جانے کا پورا ارادہ کر لیا لیکن اس وقت بھی اس کی قسمت آڑے آگئی۔ اسے معلوم ہوا کہ سلطان شہاب الدین غزنی سے ہندوستان کی طرف آرہا ہے۔ قطب الدین اپنے آقا کے استقبال کے لیے آگے بڑھا اور کچھ دور جا کر مسلمانوں سے جا ملا۔ اس نے ایک سو عربی گھوڑے، ہاتھیوں کی ایک ٹلائی اور ایک تقری زنجیر اور پچاس ہزار سوار اس ہم کے لیے پیش کیے۔ شہاب الدین نے بھی خوش ہو کر اسے خلعت سے نوازا کیا اور اسے لشکر کا پیش رو مقرر کیا۔

قطب الدین بادشاہی لشکر کے آگے آگے روانہ ہوا۔ شہاب الدین بھی اپنے لشکر کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چلے لگا۔

قطب الدین ابھی تھوڑی دور ہی چلا ہوا کہ بنارس کے راجا جے چند کے لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا۔ قطب الدین نے جے چند کے لشکر کو شکست دے کر بھاگ دیا۔ جے چند نے جب یہ خبر سنی تو وہ خود میدان جنگ میں آیا اور قطب الدین سے لڑائی شروع کر دی۔ مسلمان سپاہیوں نے دشمن کی فوج پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ ایک تیر بجے چند کی آنکھ میں لگا۔ یہ تیرا ایسا کاری تھا کہ جے چند اپنے ہاتھی سے نیچے گر گیا اور وہیں ختم ہو گیا۔ اپنے راجا کا جے چند دیکھ کر دشمن کے سپاہی میدان سے بھاگ نکلے۔ اس رخ کے بعد شہاب الدین بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے دشمن کی بربادی پر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے لشکر کو لے کر بنارس میں داخل ہوا۔ بنارس میں دربار عام منعقد ہوا تو کسی نے اس کی خدمت میں ہاتھیوں کی ایک قطار پیش کی۔

اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا تاکہ دیگر راجاؤں کی مدد سے مسلمانوں سے مقابلے کے لیے نکلے۔

☆☆☆

بیم راج کے محل میں اس کی رانی اور بیٹی رتنا سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ بیم راج کو آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی جبکہ اس وقت اس کی کشتی سے محسوس کی جا رہی تھی۔ رام دیو آیا بیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا بیٹا نہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ وہ رتنا کا ہاتھ تھامنے کے لیے ہند تھا بلکہ رانی کو اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی رتنا سے نہیں کی گئی تو وہ اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ رانی یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو رتنا اس کا پوتا ساتھ دے گی۔ اسی لیے اس نے کوئی خاص بات زبان سے نہیں نکالی تھی بلکہ یہ کہہ کر بات ٹال دی تھی کہ وہ راجا سے پوچھے بنا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔

رام دیو اچھ کی اس رانی کا بیٹا تھا جس نے سلطان شہاب الدین کی شادی اپنے رانی سے کروادی تھی۔ رام دیو کو اپنے رشتے دار بیم راج کے پاس بھیجا دیا تھا۔ یہیں اس کا اور رتنا کا عشق پروان چڑھا۔ رام دیو کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے بیم راج سے مایوس ہونے کے بعد اپنا گروہ تیار کر لیا اور مسلم علاقوں میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔ بیم راج اس کے گروہ کو ڈاکوؤں کا گروہ کہتا تھا اور اس کی حرکتوں سے تنگ تھا۔ رام دیو نے گھر بھی چھوڑ دیا تھا۔

بیم راج گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ اس کے آتے ہی رانی اسے دھڑکے کرے میں لے گئی۔ ”آپ نے آج بہت دیر کر دی۔“

”تم میرے ارادوں سے واقف تو ہو۔ میں ہندوستان کی زمین پر مسلمانوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ میں آہستہ آہستہ اپنی طاقت بڑھا رہا ہوں۔ اب میرے پاس اتنا لشکر ہو گیا ہے کہ ان مسلم آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں اور سینا پتی (سہ سالار) جیتواں لشکر گاہ کی طرف گئے تھے۔ وہیں دیر ہو گئی۔“

”ایک جنگ گھر میں بھی چھڑی ہوئی ہے، پہلے اس کا مقابلہ تو کر لو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”رام دیو آیا بیٹھا ہے۔“

”وہ تو آتا ہی رہتا ہے۔“

”آپ کے اس مرتبہ بڑے دن میں پھیرا کیا؟“

”آپ کو رانی ماں نے بتا تو دیا ہوگا کہ کس کیوں آیا ہوں۔“

”بتایا تو ہے لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ تم اس طرح کی بات کر سکتے ہو۔“

”آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اس طرح بات کروں۔ آپ کو شادی مجھ سے کیوں نہیں کر دیتے؟“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں بیٹوں کی طرح سمجھا ہے لیکن مجھے دل میں مسلمانوں کے لیے نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اسے تو ٹھنڈا ہونے دو۔“

”میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔“

”تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ شہاب الدین غزنوی واپس چلا گیا ہے۔ اس وقت اس کا لے پالک قطب الدین ایبک ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں کا حکمران ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ میں یہ علاقے اس سے آزاد کروالوں۔ اس کے بعد رتنا کی شادی تم سے ہو جائے گی بلکہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ تم اپنے گروہ کے ساتھ ان معرکوں میں میرا ساتھ دو کیونکہ تمہارے اور میرے مقاصد ایک ہی ہیں۔“

رام دیو نے یہ شرط مان لی اور یہ طے ہو گیا کہ

”اب کے اس کے چور دوسرے ہیں۔ کہتا ہے اگر رتنا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دیا تو وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا۔“

”اس کی یہ جال ہو گئی، اس نے کیا رتنا کو اپنی بہن سمجھ لیا ہے جس نے رانچیتوں کی ناک کنوا دی اور شہاب الدین کے ساتھ غزنی بھاگ گئی۔ میری بیٹی وہ ہاتھ توڑ دے گی جو اسے زبردستی اٹھا میں گے۔“

”دھیرج مہاراج دھیرج۔ اتنے غصے میں مت آؤ۔ رام دیو کے ساتھ ذرا دھیان سے بات کرنا۔ مجھے تو لگتا ہے وہ دونوں کچھ طے کر چکے ہیں۔ اگر رام دیو نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اس کا ساتھ ضرور دے گی۔“

راجا بیم کا غصہ جھاگ کی طرح چبھ گیا۔

”رام دیو کو میرے پاس بھیجو، میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔“

”ذرا احتیاط سے بات کرو۔“

”تم بھیج دو۔“

رام دیو کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر ذرا بھی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کی گستاخی کی حدوں کو چھو رہی تھی لیکن بیم دیو اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ بڑے پیار سے بیٹھ گیا۔

”رام دیو! اس مرتبہ بڑے دن میں پھیرا کیا؟“

”آپ کو رانی ماں نے بتا تو دیا ہوگا کہ کس کیوں آیا ہوں۔“

”بتایا تو ہے لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ تم اس طرح کی بات کر سکتے ہو۔“

”آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اس طرح بات کروں۔ آپ کو شادی مجھ سے کیوں نہیں کر دیتے؟“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں بیٹوں کی طرح سمجھا ہے لیکن مجھے دل میں مسلمانوں کے لیے نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اسے تو ٹھنڈا ہونے دو۔“

”میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔“

”تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ شہاب الدین غزنوی واپس چلا گیا ہے۔ اس وقت اس کا لے پالک قطب الدین ایبک ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں کا حکمران ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ میں یہ علاقے اس سے آزاد کروالوں۔ اس کے بعد رتنا کی شادی تم سے ہو جائے گی بلکہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ تم اپنے گروہ کے ساتھ ان معرکوں میں میرا ساتھ دو کیونکہ تمہارے اور میرے مقاصد ایک ہی ہیں۔“

رام دیو نے یہ شرط مان لی اور یہ طے ہو گیا کہ

نے درباریوں سے پوچھا۔
 ”وہ غلام کس سوداگر کے پاس ہے؟“
 ”حضور، حاجی جمال نامی سوداگر ہے جو اسے غزنی لایا ہے۔“

”اس سوداگر کو کل صبح دربار میں پیش کیا جائے۔“
 حاجی جمال کو حکم دے دیا گیا۔ حاجی جمال کے پاس دو غلام تھے۔ آتش اور ایک دوسرا۔ وہ دونوں کو لے کر سلطان کے دربار میں پیش ہو گیا۔
 سوداگر نے دونوں غلاموں کی قیمت دو ہزار دینار بتائی۔ شہاب الدین نے ایک ہزار دینار کے عوض دونوں غلاموں کو خریدنے کا خیال ظاہر کیا۔

حاجی جمال نے اس قیمت پر دونوں غلاموں کو بیچنے سے انکار کر دیا اور اس بے رحمی سے جواب دیا کہ بادشاہ کو غلاموں کو خریدنے کے حکم جاری کر دیا۔ ”کوئی شخص ان غلاموں کو خریدے۔ جو خریدے گا وہ اپنے نجات کا خود ذمہ دار ہوگا۔“
 کس کی بات تھی کہ جو اس حکم کے خلاف کام کرتا۔ ہر دولت مند آدمی کی خواہش تھی کہ وہ آتش کو خریدے لیکن بادشاہ کے خوف سے کسی کو اس سے منہ موڑنے کی ہمت نہ تھی۔

انہی دنوں نہروالا کے حاکم راجا بھیم کو شکست دینے کے بعد قطب الدین غزنی آیا۔ غزنی پہنچے ہی اس نے آتش کے حسن کا شہر سنا۔ اسے اشتیاق ہوا کہ وہ اس غلام کو خریدے۔ اس نے شہاب الدین سے اجازت طلب کی۔
 ”آقاے محترم! میں نے سنا ہے غزنی میں ایک غلام لایا ہوا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اس غلام کو میں خرید لوں؟“
 غلام تو واقعی قابل دید ہے لیکن اس کے پیچھے قصہ کیا ہے ہمیں معلوم ہے؟“

اس کے بعد شہاب الدین نے سوداگر کے ساتھ پیش آنے والا پورا معاملہ دہرایا۔
 ”آقاے محترم! کوئی صورت نکالے، میں اس غلام کو ملاحظہ کر چکا ہوں۔ بادشاہ میں اسے خریدنے کی پیشکش بھی کر چکا ہوں۔ کوئی صورت نکالے کہ میں جھوٹا نہ پڑوں۔“
 ”جان غریز! یہ پہلا موقع ہے کہ تم مجھ سے کچھ طلب کر رہے ہو۔ میں تمہیں مایوس نہیں کر سکتا لیکن اپنے فرمان کا بھی مجھے پاس ہے۔ میں اعلان کر چکا ہوں کہ غزنی میں کوئی ان غلاموں کو نہ خریدے اور تم اس وقت غزنی میں ہو۔ یہ سودا یہاں نہیں ہو سکتا۔ ہاں ایک صورت ہے، حاجی جمال ان غلاموں کو لے کر دہلی چلا جائے۔ جب تم دہلی واپس جاؤ

غزنی میں مسلمانوں پر جو حملہ کیا جائے گا، رام دیو اس میں شریک ہوگا۔ فتح اور شکست ہر دونوں صورتوں میں رہتا کی اس سے شادی کر دی جائے گی۔

قطب الدین بھی بھیم راج کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اسے بھیم راج کے ارادوں کی خبر مل گئی۔ اس سے پہلے کہ بھیم راج اپنے ارادوں پر عمل پیرا ہوتا، قطب الدین نے خود پہل کر دی۔ اس نے آگے بڑھ کر بھیم راج کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ راجا بھیم کا سپہ سالار قلعے کے نیچے ٹھہرا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا۔ قطب الدین نے اس کا تعاقب کیا اور تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر اسے پکڑ لیا۔ جیتواں ایسا بدحواس ہو گیا کہ اس نے راجا بھیم کا بھی انتظار نہیں کیا اور لڑائی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میدان جنگ میں قطب الدین کے ہاتھوں مارا گیا۔

جیتواں کی موت کی خبر سن کر راجا بھیم بھاگ گیا اور اپنی سلطنت کے کسی سرحدی مقام پر پناہ گزیں ہو گیا۔ قطب الدین نے غزنی واپس بہت سامان غنیمت سمیٹا اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہاں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ تعمیر کروایا اور کھرام کو اس پر تاج عطا کر دیا۔

اب اس کی فتح پر مبنی کارنامے ایسے شاندار تھے کہ اس نے نہایت فخر سے شہاب الدین کو خط روانہ کیا۔ جس وقت وہ شہاب الدین کو خط تحریر کر رہا تھا، قاضی کا خیال آنا لازمی تھا۔ لہذا اس نے لکھ دیا کہ وہ غزنی آ رہا ہے۔ حکومت کی انتظامیاں مالی غنیمت کی صورت میں سمیٹ کر وہ غزنی روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین کو ترکی غلاموں سے عشق تھا۔ سوداگروں کو اس کی سرحدی کا علم تھا لہذا دور دور سے غلام اس کی خدمت میں لاتے اور غلام واکرام سے سرفراز ہو کر جاتے تھے۔

آتش نام کا ایک غلام مختلف سوداگروں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا غزنی پہنچا۔ غزنی پہنچتے ہی اس کے حسن و جمال کی شہرت ہو گئی۔

”سلطان معظم! ایک غلام فروخت کے لیے غزنی لایا گیا ہے۔ ایسا حسین ہے کہ جو سف ثانی جیسے کہا جائے۔ جانے کس کے ہاتھوں فروخت ہو اور اس کے حسن کی توہین ہو۔ ایسا بے مثال ہیرا تو خزانہ شاہی میں ہونا چاہیے۔“

درباریوں کی زبان سے یہ تعریف سن کر بادشاہ کو شوق ہوا کہ اس کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ اس

ہوا کہ وہ نم لے ہوش ہو گیا۔ فاخرہ نے سیاہ چادر سمیٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اب قطب الدین کا کمرہ طبیعوں سے بھر جائے گا۔ اس کے ملازم اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔

اس کے جاتے ہی یہ خبر پھیلنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی عورت قطب الدین کے پاس آئی تھی اور اس کے بعد قطب الدین کی طبیعت خراب ہو گئی۔

یہ خبر شہاب الدین تک بھی پہنچ گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قطب الدین کے پاس آنے والی لڑکی کوئی اور نہیں تاج الدین یلدوز کی بیٹی فاخرہ بیگم تھی۔ وہ کیوں آئی تھی؟ کیسی کیوں آئی؟ یہ ایسے سوال تھے جن کے جواب قطب الدین نہیں دے سکتے تھے۔

تاج الدین یلدوز ان دنوں کرمان سے غزنی آیا ہوا تھا۔ فاخرہ کو بتائی نہیں تھی کہ شہابی حکم آگیا۔ شہاب الدین نے تاج الدین کو طلب کیا تھا۔ فاخرہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ راز کھل سنا تھا وہ پہچان لی گئی تھی۔ وہ کمرے میں بس بول کر آنے والے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

تاج الدین بادشاہ سے ملاقات کر کے واپس آیا تو بہت خوش تھا لیکن جب اس نے یہ کہا کہ وہ ملال مار رہا ہے اور سب کو اس کے ساتھ چلنا ہوگا تو فاخرہ کی خوشی کا نور ہو گیا۔ ”پاپا جانی! ہم ابھی تو کرمان سے آئے ہیں۔ اب کرمان جارہے ہیں۔ سلطان کو آخر غزنی میں ہمارا رہنا کیوں پورا نہیں؟“

”ابھی تو وقت بتائے گا کہ ہم کرمان کیوں جارہے ہیں۔ فی الحال تو چلنے کی تیاری کرو۔“

”کیا ہم غزنی میں دن بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے؟“

”میں نے کہا تھا چلنے کی تیاری کرو۔“

اس کے بعد کچھ عرصے کی انتظار نہیں تھی۔ فاخرہ چپ ہو گئی۔ اب وہ پوری طرح سمجھ گئی کہ بادشاہ اسے قطب الدین سے دور کر دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے اسے غزنی سے کرمان بھیجا جا رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ کرمان پہنچ گیا۔

قطب الدین تیزی سے رو بہ صحت ہو رہا تھا۔ شہابی طبیب کے علاج نے اس کی بیماری کو دور کر دیا۔ اب تو اتنی بحال چلنے کے لیے اسے صرف آرام کی ضرورت تھی۔

اسے معلوم ہو چکا تھا کہ فاخرہ کو شہابی حکم کے مطابق کرمان بھیج دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی لیا جاسکتا تھا کہ بادشاہ اس شادی پر رضامند نہیں۔

تو ان غلاموں کو خرید لو۔“

قطب الدین کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوداگر کو حکم دیا کہ وہ دونوں غلاموں کو لے کر دہلی چلا جائے اور اس وقت تک اس کا انتظار کرتا رہے جب تک کہ وہ غزنی سے دہلی نہ پہنچ جائے۔

☆☆☆

تاج الدین یلدوز کے مکان پر اداسی پہرہ دے رہی تھی۔ قطب الدین کی بیماری کی خبریں یہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ ایک روز تو یہ خبر آگئی کہ اب قطب الدین کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں۔

قطب الدین غزنی پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی بیمار پڑ گیا تھا۔ اتنی مہلت مل ہی نہیں تھی کہ بادشاہ سے فاخرہ کے سلسلے میں کوئی بات کرتا۔

قطب الدین پر غنودگی کا عالم طاری تھا۔ حکمائے وقت ابھی ابھی اس کے لیے نئی دوا میں تجویز کر کے کمرے سے باہر نکلے تھے۔ قطب الدین نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سیاہ چادر میں لپٹا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اور اس کے سر ہانے آکر بیٹھ گیا پھر اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ ایسا لمس تھا کہ اس کے ہونک کر پوری آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آواز نے کئی دن بعد زندہ کر دیا تھا۔

”اگر مجھے پوری طرح ہوش ہے تو تم فاخرہ ہی ہو؟“

”ہاں میں ہی وہ بد نصیب ہوں جو تمہیں اس حال میں دیکھنے کے لیے زندہ ہے۔“

”ابھی تو میں ہوں کہ اٹھ کر تمہارا استقبال بھی نہیں کر سکتا۔“

”آپ کو جو وجہ رحمت بھی نہیں ملی کہ اپنی آمد کی اطلاع ہی دے دیتے۔“

”میں تمہارے پاس کرمان آنے ہی والا تھا کہ بیماری سے ملاقات ہو گئی۔“

”طبیعوں کا کیا کہنا ہے؟“

”وہ کہتے ہیں جب تک فاخرہ سے تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تم ٹھیک نہیں ہو سکتے۔“

”ان سے آپ نے یہ نہیں کہا کہ آپ فاخرہ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتے؟“

”یہ نہ کہو فاخرہ۔“ قطب الدین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بعض اوقات آدمی جو کہنا چاہتا ہے، وہ کہہ نہیں پاتا۔“

قطب الدین کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فطرت کا ایسا غلبہ

”مگر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ معاملہ شادی کا ہے؟“
 ”میں نے تاج الدین سے کہہ دیا ہے اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم تاج الدین کی بیٹی فاخرہ بیگم سے شادی کر لو۔“
 ”آقا کے سن، میری جان آپ پر شمار۔“
 ”تمہاری وفاداریوں کا یہ ایک چھوٹا سا انعام ہے۔“
 قطب الدین نے بادشاہ کے حکم کے مطابق فاخرہ سے شادی کر لی۔ چند دن کرمان میں گزارنے کے بعد ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

قطب الدین نے برسوں کے انتظار کے بعد اپنی محبت حاصل کی تھی۔ اسے وہ اپنی تقدیر کی فتح قرار دیتا تھا۔ اس کے دہلی پہنچنے ہی اس فتح کا عظیم الشان جشن منایا گیا شہر کو دہلی کی طرح سجایا گیا اور دولت اس بے دردی سے لٹائی کہ دہلی کے لوگوں نے اس کا نام قطب الدین لکھ بخش رکھ دیا۔
 ”فاخرہ بیگم! آپ ہماری زندگی میں داخل تو ہو گئی ہیں لیکن آپ نے نادانوں میں کانٹوں کے بستر پر قدم رکھ دیا ہے۔“

”جس بستر پر سوئیں گے اسی پر تو ہمیں سونا ہے۔“
 ”شاید یہ بستر بھی ایک ہو جائے۔“
 ”ہمیں آپ سے اس کے وفا کی توقع نہیں۔“
 ”یہ بے وفائی کا نہیں فرض فلتا ہے۔ ہم جس ملک میں ہیں، وہاں شخص ایک علاقے کی حکومت چلا سکتا نہیں کیا جاسکتا۔“
 ”مجھے مزید فتوحات کے لیے دہلی سے باہر جانا پڑے گا۔“
 ”مجھے ان فتاحوں کا علم ہے۔ آپ مجھے چاہتے ہیں۔“

قطب الدین بیانہ کے قلعے کی تسخیر کی تیاریاں کر رہا تھا کہ غزنوی سے شہاب الدین کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس نے بیانہ جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور شہاب الدین کے استقبال کے لیے ہانسی کی طرف روانہ ہوا۔ ہندوستان کے راجاؤں میں ان دنوں ہانسی کی ہوئی تھی۔ ایک طرف قطب الدین نے ناطقہ بند کیا ہوا تھا۔ دوسری جانب شہاب الدین جب چاہتا ہندوستان پر چڑھ دوڑتا تھا۔

دہلی سے ہانسی تک راستے مخدوش تھے۔ مسلمان فکریوں کے کھوڑوں کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ اس کے چہیتے غلام قطب الدین ایک نے قلعہ بیانہ کی ہم کو خیر باد کہہ دیا ہے اور اب وہ اس کے استقبال کے لیے ہانسی کی طرف آرہا ہے۔ وہ قطب الدین کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہیں رک

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ایک اور شاہی حکم آ گیا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں اس کی ضرورت ہے وہ فوراً دہلی چلا جائے۔ قطب الدین کو فاخرہ سے کہا ہوا اپنا ایک فقرہ یاد آ گیا۔ اس نے کبھی کہا تھا، میں باقی بن سکتا ہوں بے وفائیں۔ کیا باقی بننے کا وقت آ گیا ہے؟
 اس نے بغاوت کی پہلی منزل طے کی۔ وہ غزنوی سے ہندوستان جانے کے لیے روانہ ضرور ہوا لیکن کرمان پہنچ کر رک گیا۔ تاج الدین اس کا اس طرح استقبال کر رہا تھا جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ قطب الدین اس کے گھر آ کر قیام کرے گا۔

”فاخرہ! میں شہاب الدین سے بغاوت کر کے آ گیا ہوں لیکن اس کا اعلان ہندوستان جا کر کروں گا۔“
 شہاب الدین سے شادی کے لیے کچھ کہنا بے کار ہے۔ کیا تم اپنی والدہ سے کہہ سکتی ہو کہ وہ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر لیں۔ میں صرف ایک دن یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔“
 ”یہ معاملہ اتنا بڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“
 آپ کو اب جان سے باغی ہو گئی۔

”وہ میرے دشمن ہیں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“
 ”میں نے یہ معلوم ہو جانے کو کہ وہ تیار ہیں یا نہیں۔ اگر وہ انکار کر دے تو میں خاموشی سے چلا جاؤں گا۔“

”آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں؟ آپ کی اطلاع کے لیے میں جو موجود ہوں۔ اسی جان ضرور میری مدد کریں گی۔“
 فاخرہ نے اپنی ماں سے بات کی تو شکرگزاری کے سوا اس سے ہوش پر کوئی اور لفظ آئی نہ سکا۔ اس نے قطب الدین کو یہ کہہ کر ڈال دیا کہ اسی جان موقع دیکھ کر اب اسے بات کریں گی۔ یہ سنا کر قطب الدین کو معلوم ہو جائے گا۔
 اسے معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ صبح ہوئی نہیں تھی کہ شہاب الدین اپنے محافظوں کے ساتھ کرمان پہنچ گیا۔
 ”قطب الدین! میں نے تمہیں ہندوستان جانے کا حکم دیا تھا؟“

”کرمان، ہندوستان کے راستے میں ہی پڑتا ہے۔“
 ”یہ پہلا موقع ہے جب کوئی کام تم نے نہیں کیا۔“
 ”مجھے بغیر کیا ہے۔“

”اس لیے کہ میں آپ کی زبان سے انکار سننے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔“
 ”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں وہاں تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا، جہاں تم چاہتے ہو؟“

رواندہ ہوئے اور اجیر سے تین کوس کے فاصلے پر مقیم ہو گئے۔
ہندوؤں کی افواج نے لڑائی کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رکھا۔ راجپوتوں کے لشکر غول در غول وہاں پہنچ رہے تھے اور ہندوؤں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قطب الدین کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ ان پر غلبہ حاصل کرتا بلکہ انہیں ظاہر ہونے لگا کہ یہی حال رہا تو اجیر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ شہاب الدین کو یہ خبریں پہنچیں تو اس نے اپنے نامور امیروں کی سربراہی میں ایک لشکر قطب الدین کی مدد کے لیے غزنی سے روانہ کیا۔

ایک طرف یہ لشکر جانا غزنی سے ہندوؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا اور دوسری طرف سردی کے موسم نے راجپوتوں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر دیے۔ یہ عالم دیکھ کر ان لوگوں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور ان کے لشکر کا ہر گروہ ایک ایک کوس کے اپنے اصلی مقام پر روانہ ہو گیا۔ غزنی سے نکل آ جانے کی وجہ سے قطب الدین ایک کے ہاتھ مضبوط ہو گئے۔ اس نے اس لشکر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ طے کر لیا کہ وہ ہندوؤں کا پوری طرح صفایا کر دے گا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن کجرات کا راجا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اسی کی گوثال کا ارادہ کیا۔

حاکم نہروالا بھی نہایت ہوشیار و دلالت ہو رہا تھا۔ وہ بھی قطب الدین ایک کی ہر حرکت پر نظر رکھتے ہوئے تھا۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ قطب الدین نے اجیر سے نہروالا کی طرف کوچ کیا ہے۔ غزنی کا لشکر بھی اس کے ساتھ ہے۔ لہذا خود شہاب الدین ہندوستان میں موجود ہے لہذا زبردست تیاری کی ضرورت ہے۔ اس وقت بھی اس کے راج محل میں کردہ پیش کے ہندو راجاؤں کا ایک اجلاس جاری تھا جس میں یہ معاملہ لیے جا رہے تھے کہ اس مرتبہ قطب الدین کو شکست ہوگی تو مسلمان علاقوں کے حصے بخرے کس طرح کیے جائیں گے۔

قطب الدین ایک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ نہروالا کے راجا نے دیگر راجپوتوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا ہے۔ خبروں نے آکر اطلاع دی کہ راجپوت لشکر ہو گڑھ قلعے کے نیچے مسلمانوں سے معرکہ آرا ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

قطب الدین دشمن کے لشکر سے مقابلے کے لیے آگے ضرور بڑھا لیکن معروف راستے کو چھوڑ کر پرچ پھاڑی راستوں میں داخل ہو گیا۔ راجپوت یہ تصور بھی نہیں کر سکتے

گیا۔ قطب الدین اپنے لشکر سمیت اس سے ملا۔ شہاب الدین نے اسے گھوڑے اور خلعت سے سرفراز کیا۔
”قطب الدین، میرے بیٹے! تم نے قلعہ بیانہ کی تسخیر کا ارادہ کیوں ہمتی کر دیا؟“
”اس لیے کہ آپ کی آمد اور میرے آگے بڑھنے کا مقصد ایک ہی تھا۔ اب آپ تشریف لے آئے ہیں تو میری کھوار آپ کی کھوار سے کیسے سبقت لے جاسکتی ہے۔ یہ اتفاق ہی تو ہے کہ آپ کا اور میرا مقصد ایک ہی ہے لہذا ہم دونوں مل کر قلعہ بیانہ فتح کریں گے۔“

آقا اور غلام دونوں قلعہ بیانہ فتح کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس مقصد میں دونوں کامیاب ہو گئے۔ شہاب الدین بیانہ ہی میں رک گیا اور قطب الدین نے گوالیار کی طرف کوچ کیا۔

بیانہ کی فتح کی شہرت گوالیار تک پہنچ چکی تھی لہذا وہاں کا راجا قطب الدین کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے جتنی تحائف قطب الدین کی خدمت میں ارسال کیے اور سالانہ خراج کی ادائیگی پر غلطے کو رفع و دفع کیا۔ گوالیار سے نکلنے کے فوراً بعد شہاب الدین غزنی روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اجیر اور اس کے...

گرجپٹ کے راجاؤں نے قطب الدین ایک سے نکلنے کی ضمان لی۔ ہندوؤں کا ایک مشترکہ لشکر تیار ہو گیا جس کا مقصد اجیر کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنا تھا۔ نہروالا کا راجا بھی اس لشکر کی سربراہی کر رہا تھا جو پہلے بھی قطب الدین ایک کے ہاتھوں شکست اٹھا چکا تھا۔

قطب الدین ایک دہلی سے روانہ ہوا اور وہاں راجا نہروالا کے پہنچنے سے پہلے ہی راجپوتوں سے جنگ شروع کر دی۔ ابھی نہروالا کا راجا پہنچا بھی نہیں تھا۔ قطب الدین کو امید تھی کہ راجا نہروالا کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہ شہروان کے راجپوتوں پر غلبہ حاصل کر لے گا۔ آہم بھی یہی بتا رہے تھے۔ مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ ان کا ایک قطب الدین کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا۔

قطب الدین کے گرتے ہی مسلمان سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ان سپاہیوں نے بڑی مشکوک سے قطب الدین کو ایک دوسرے گھوڑے پر سوار کیا اور اجیر کی طرف روانہ ہوئے۔

راجپوت اپنی فتح کی خوشی منائی رہے تھے کہ حاکم نہروالا بھی پہنچ گیا۔ اس وقت ضروری تھا کہ اجیر تک قطب الدین کا پہنچا کیا جاتا۔ دونوں لشکر مسلمانوں کے تعاقب میں

بہار میں شامل تھے، یوریش شروع کر دیں اور مالی غنیمت جمع کرنے لگے۔ اس کی فتوحات کو دیکھتے ہوئے لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ گھوڑے، ہتھیار اور مسلح لشکری اس کے گرد جمع ہو گئے۔

اس کی شہرت بڑھی تو ہندوستان میں جہاں بھی غلطی ترک پڑے ہوئے تھے، محمد بختیار خلجی کے پاس جانے کے لیے بہار کا رخ کرنے لگے۔ ایک دو سال اسی حالت میں گزر گئے پھر وہ پورے بہار کو اپنے ماتحت لانے کے لیے تیاریاں کرنے لگے۔

بختیار خلجی نے دو سو سواروں کو ساتھ لیا اور بہار نام کے قلعے کے دروازے پر پہنچا اور اچانک جنگ شروع کر دی۔ اتنی دیر ہی سے لڑا کہ کچھ ہی دیر میں قلعہ فتح کر لیا۔ اس قلعے سے بختیار خلجی کو بے انتہا مالی غنیمت ہاتھ آیا۔

☆☆☆

قطب الدین ایبک کا لُجّر پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس حملے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ یہاں کے راجا سلطان محمود غزنوی کے باجگوار تھے لیکن موجودہ راجا نے خراج دینا بند کر دیا تھا اور بغاوت پر اتر آیا تھا۔

کا لُجّر کا راجا مقابلے پر آمادہ ضرور لیکن شکست کھا کر قلعہ بند ہو گیا لیکن اپنے انجام پر غور کرتا رہا تو افسوس کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اس نے بہت مجاہد ہو کر اپنے بزرگوں کی پیروی کی۔ قطب الدین کی خدمت میں تہانیت بھیج کر صلح کا ارادہ کیا۔ جس طرح اس کے بزرگ سلطان محمود کے باجگوار تھے اسی طرح وہ بھی قطب الدین کا اطاعت گزار ہو گیا۔

اس نے قطب الدین کو پیغام بھیجا کہ وہ معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے کل اس کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ جانے کیا مصیبت تھی کہ یوں اس کی زندگی میں بھی نہ آیا۔ اسی رات راجا کا انتقال ہو گیا۔ قطب الدین نے راجا کے انتقال کے بعد راجا کے وکیل کو پانچ لاکھ دینار اسے معاہدہ یاد دلایا۔ وکیل سلطنت کا جواب آیا لیکن اسے چاہیے ہو وہ۔

”اگر راجا نے غلطی کی تھی تو ضروری نہیں کہ میں بھی وہی غلطی دہراؤں۔ اگر تم میں طاقت ہے تو بزرگ شمشیر قلعہ فتح کر لو۔“

وکیل سلطنت کا یہ غرور صرف اس لیے تھا کہ قلعے کا چشمہ لبریز تھا اور اہل قلعہ کو پانی حاصل کرنے میں کسی قسم کی وقت محسوس نہ ہوتی تھی لیکن یہ عالم زیادہ دیر نہ رہ سکا۔ قطب الدین کی قسمت کا ستارہ بندی پر تھا۔ اچانک قلعے کا چشمہ خشک ہو گیا۔ اہل قلعہ پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترسے گئے۔ جب زندگی کے لالے پڑے تو قطب الدین

تھے کہ قطب الدین ان پہاڑی راستوں سے گزر کر آئے گا۔ وہ بالکل غافل تھے کہ مسلمان سپاہیوں کے گھوڑے ان کے لشکروں کے سروں پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ جتنی دیر میں وہ سنبھلے مسلمانوں کی تلواروں نے انہیں کم کرنا شروع کر دیا۔

جنگ اتنی ہولناک تھی کہ کہتے ہیں گھوڑے سے وقت میں مسلمانوں نے دشمن کے پچاس ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنی پچھلی شکست کا شاندار انتقام لیا۔ یہاں سے وہ سحرات کی طرف بڑھا اور بلا خوف و خطر شہر میں داخل ہو گیا۔ خوب جی بھر کے شہر کو لوٹا۔ نہروال کی حکومت اپنے ایک امیر کے سپرد کی اور خود اجیر ہوتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہ اتنی بڑی اور شاندار فتح تھی کہ اس نے دہلی میں ایک عظیم الشان جشن فتح منعقد کیا۔ اس کا مقصد ظاہر داری نہیں تھی بلکہ دشمنوں پر اپنا خوف مسلط کرنا مقصود تھا۔

☆☆☆

بختیار خلجی نامی شخص غور کا رہنے والا تھا۔ اس لیے شہاب الدین غوری کا دور اس سے دور نہیں تھا۔ اس طالع آزمائے سلطان شہاب الدین غوری کے دربار کا رخ کیا۔ عام طور پر یہی مشہور تھا کہ وہ بہادر اور لبر افراد کی تلاش میں رہتا ہے لیکن بختیار خلجی کے ساتھ نہیں ہوا۔ سلطان شہاب الدین کو اس کی عجیب و غریب ہیئت اور شکل و صورت پسند نہ آئی۔

محمد بختیار خلجی دربار غزنوی میں جگہ نہ پاسکا۔ کہا جاتا ہے کہ بختیار خلجی کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ جب وہ سیدھا کھڑا ہوتا تھا تو سر تک آتے تھے۔ اس کی انگلیاں اس کی پندلیوں کو چھو لیتی تھیں۔

یہ شخص مایوس ہو کر غزنوی سے ہندوستان چلا آیا۔ دہلی پہنچا تو یہاں بھی وہی صورت پیش آئی جو غزنوی شہر میں سلطان شہاب الدین غوری کے سامنے پیش آئی تھی۔ یہاں بھی اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھتے ہوئے کسی نے بھی اسے لشکر میں کسی اچھے عہدے کی پیشکش نہیں کی۔ یہ ترک بہادر دہلی سے بدول ہو کر ہدایوں چلا گیا۔ وہاں کے جاگیردار سپہ سالار حسن نے اس کے لیے کچھ روزینہ مقرر کر دیا۔ یہاں رہتے ہوئے اس کی ملاقات ہدایوں کے حاکم

حسام الدین سے ہوئی۔ اس دوران اس نے اچھا گھوڑا اور اسلحہ حاصل کر لیا تھا اور چند مقامات پر جواں مردی بھی دکھائی تھی لہذا حسام الدین نے کچھ حوالے اس کے سپرد کر دیے۔ آدمی تھا بہادر ذرا جو سہارا ملا تو ان علاقوں میں جو

Medora

Perfumed Talc



خوشبو جو دل کو پہنائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish



میڈورا پرفیومڈ ٹالک
کی تازگی جگاتی
خوشبو سہ
ملتا آپ کو ملکتا فریش
احساس جو ہر لمحہ بہر
آپ کو ملے گا



8 مختلف و نفرب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Cherish, Joy, Season, Passion

Salute, Dignity, Greetings

MEDORA OF LONDON

سے امان طلب کی اور یوں قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔
قطب الدین نے کانچر کے خزانے پر قبضہ کر لیا۔
کانچر کو فتح کرنے کے بعد قطب الدین نے کانچر کے
دار السلطنت مہوہ پر حملہ کیا۔ اس قلعے کی تسخیر کے بعد مسلمانوں
کا لشکر بدایوں کی طرف روانہ ہوا۔ اس شہر کو بھی فتح کر لیا۔

ان فتوحات کے بعد وہ آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا
تھا کہ بہار سے محمد بختیار خلجی نے اس کی خدمت میں قیمتی
ترین تحائف پیش کیے۔ قطب الدین اس کی بہادری کے
قصبے ستارہ تھا۔ اب اس کی وفاداری سے متاثر ہوا اور اسے
انعامات سے نوازا۔

بختیار خلجی نے قطب الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی
توجہ اور مدد شامل حال رہی تو وہ بہار فتح کر کے دکھائے گا۔
اب اسے کسی زحمت کی ضرورت نہیں۔ قطب الدین نے
آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور وہی واپس آ گیا۔ قطب
الدین نے لکھنؤ کی علاقہ اسے تفویض کر کے اسے فتح
کرنے کا حکم دیا۔

بختیار خلجی بہار کو پہلے ہی فتح کر چکا تھا لہذا اس کی
شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کے ارادوں کی خبر جب
رائے لکھنویہ تک پہنچی جس کا دار السلطنت لکھنؤ ہے تو اس
نے 22 نجومیوں کو طلب کیا تاکہ وہ بختیار خلجی کے بارے
میں معلوم کریں۔

نجومیوں نے حساب کتاب لگا کر جو کچھ بتایا اسے
کر راجہ لکھنویہ کے ہوش اڑ گئے۔

نجومی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس ملک کو ترک یعنی
مسلمان رہا کریں گے۔ وہ وقت قریب آ گیا ہے کیونکہ وہ
بہار پر قابض ہو چکے ہیں۔ آئندہ سال یہ تمام علاقے ان
کے قبضے میں چلے جائیں گے۔

”جو شخص مجھ پر ملجھاملہ کوڑے کا تمہاری کتابوں
میں اس کی کوئی نشانی بھی لکھی ہے اسے لکھنویہ نے پوچھا۔

”ہاں ایک بہت واضح نشانی لکھی ہوئی ہے۔“
نجومیوں نے بتایا۔ ”وہ شخص جب سیدھا کھانا جو کھانے
ہاتھ چھوڑے گا تو اس کے ہاتھ کی انگلیاں اس کے گھٹنوں
سے پٹکی ہوں گی۔“

رائے لکھنویہ نے کچھ آدمی اس علامت اور نشانی کی
تحقیق کے لیے بھیجے۔ جب یہ معتبر اشخاص واپس آئے تو سر
پٹنے کے لیے یہ اطلاع ان کی زبانوں پر تھی۔

”یہ تمام نشانیاں بختیار خلجی میں موجود ہیں جو بہار فتح
کر چکا ہے اور اب لکھنویہ یعنی رائے لکھنویہ کی مملکت کی طرف

بڑھنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

لکے یہ ستنے ہی اکثر برہمن اور ساہوکار وہاں سے چلے گئے۔
رائے لکھنویہ نے اپنی مملکت کو چھوڑنے میں مصلحت نہ سمجھی۔
اس پیش گوئی کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ بختیار
خلجی نے لشکر تیار کیا اور بہار سے نکل کر لکھنویہ کی طرف پیش
قدمی کرنے لگا۔

اٹھارہ ہزار جنگجو سپاہیوں کا لشکر جب آگے بڑھا اور لکھنویہ
کے قریب پہنچے تو ہوا تو رائے لکھنویہ کی پریشانی لازمی تھی۔
اب اسے یقین ہو گیا کہ پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ گیا
ہے تو وہ تنہا شہر میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ خزانہ، حرم، نوکر چاکر،
درباری عورتیں سب کچھ بختیار خلجی کے قبضے میں چلے گئے۔

بختیار خلجی نے بادشاہت اختیار کی اور اپنے نام کا
خبط و سک جاری کر دیا۔ اس نے نہایت نفیس تحفے قطب
الدین کو ایک کی خدمت میں ارسال کیے۔

☆☆☆

غیر مسلم حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد شہاب
الدین ہندوستان کے مرکزی واپس جا رہا تھا۔ جب وہ
دریائے سندھ کے کنارے پہنچا تو ایک مقام پر مقیم ہوا تو کچھ
کھنکھروں نے اس کا پیچھا کیا۔ شہاب الدین نے ان کے
عزیزوں کو قتل اور خود ان کو کمرے سے بند کر دیا تھا اور وہ
اسے قتل کرنے کے درپے تھے۔

شہاب الدین ایک مقام پر خیمہ زن تھا جسے کھنکھروں
کسی طرح شامی خیمے تک پہنچ گئے۔ یہ قاتل شامی خیمے کے
داخل ہو گئے۔ ایک کھنکر نے آگے بڑھ کر دربان پر
چاقو سے حملہ کیا اور بھاگ نکلا۔ دربان کے زخمی ہوتے ہی
چاروں طرف شور مچ گیا۔ شامی خدمت گار بادشاہ کو تنہا چھوڑ
کر زخمی دربان کے پیچھے جمع ہو گئے۔

قاتل کے سامنے کچھ ہی چپے ہوئے تھے۔ انہوں
نے جب یہ دیکھا کہ شامی خیمہ خالی ہے اور تمام شامی محافظ
زخمی دربان کے گرد جمع ہیں تو وہ بادشاہ کی خواب گاہ میں
داخل ہو گئے۔ اس وقت صرف تین ترک غلام تھے جو
بادشاہ کے سرہانے کھڑے تھے۔ وہ حملہ آوروں کو دیکھ کر
بدحواس ہو گئے اور حملہ آوروں کو لالکارنے کی جرأت تک نہ
کر سکے۔ حملہ آوروں نے بادشاہ پر حملہ کر دیا۔

باکیں گہرے زخموں نے بادشاہ کو ہمیشہ کے لیے ختم
کر دیا۔

شہاب الدین کی موت کی خبر پھیلنے ہی اہل لشکر اس
کے خزانے کو لوٹنے پر آمادہ ہو گئے۔ قریب تھا کہ انتشار پھیل

ہے اور میرے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ میں اسے
چھوڑ کر غزنی آنا پسند نہیں کروں گا۔ میرے چچا نے تاج
الدین یلدوز کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ آپ لوگ اس کے سر
پر تاج شاہی رکھ کر مرحوم کی وصیت کو پورا کریں۔“
ان امراء کو خط لکھنے کے بعد سلطان محمود نے تاج
الدین یلدوز کے نام خط آزادی اور حکومت غزنی کا فرمان
ردانہ کیا۔

سلطان محمود کا فرمان پاتے ہی تاج الدین نے غزنی
کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور غزنی کے آس
پاس کے شہروں پر قبضہ کر کے سلطنت کے مختلف کاموں میں
مشغول ہو گیا۔

قطب الدین ایک غزنی سے دور دہلی میں بیٹھا
اس خبر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ تاج الدین جو
اس کا سربراہ تھا، غزنی کا حکمران بن گیا تھا۔ یہ نئی تبدیلی
اس کے لیے خوش آئند تھی لیکن ایک کا نیا بھی دل میں ٹھنک
رہا تھا کہ وہ خود مختار ہے۔ تاج الدین کے دل میں ذرا
بھی کدورت آئی تو اسے غزنی واپس بلا لے گا۔ وہ اس
مسئلے پر اپنی بیوی قاخوہ سے بھی کئی مرتبہ بات کر چکا تھا۔
وہ بھی اسے تسلی دیتی رہی تھی لیکن شاہی مسئلے تسلیوں سے حل
نہیں ہوتے۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر تاج الدین نے اسے
معزول کرنے کی جسارت کی تو وہ اس کا حکم ماننے سے
انکار کر دے گا۔ تاج الدین اس کا آقا نہیں تھا کہ اس کا
سربراہ نہیں بند کر کے مان لیتا۔

سلطان محمود بن غیاث الدین اس کشمکش سے غافل
نہیں تھا۔ اسے بھی احساس تھا کہ یہ طوفان کسی وقت بھی اٹھ
کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے قطب الدین کو ”ملک“ سے
”سلطان“ بنادیا۔ آزاد خیال اور مختاری کے فرمان کے ساتھ
چڑ اور بادشاہی کے دیگر لوازم بھی اس کے لیے ہندوستان
بجھوا دیے۔

وہ ان نوازشات کو وصول کرنے لاہور تک آیا۔ یہیں
اس نے اپنی تخت نشینی کی رسومات ادا کیں۔ اپنی خود مختاری
کا اعلان عام کر کے لاہور سے دہلی واپس آ گیا۔

تخت نشین ہوتے ہی تاج الدین یلدوز نے
ہندوستان کی طرف الجھائی ہوئی نظر ڈالنی شروع کر دی تھی لیکن
یہ سوچ کر مطمئن بھی تھا کہ ہندوستان بھی اسی کی مملکت کا حصہ
ہے جہاں اس کا ایک کارندہ حکومت کر رہا ہے۔ اب جو
قطب الدین کی خود مختاری کی خبریں اس تک پہنچیں تو اسے

جاتا اور سب ایک دوسرے سے لڑ پڑتے۔ شہاب الدین
کے وزیر مود الملک نے بڑی مشکل سے حالات کو قابو میں
کیا۔ غوری امراء اور سرداروں سے بات چیت کر کے شاہی
غزنانے کی حفاظت کی کمپیں لے لیں۔ غزنانے کی حفاظت
سے مطمئن ہو کر مود الملک نے بادشاہ کی لاش کو بڑے ترک
واحتشام سے اٹھایا اور غزنی کی طرف روانہ ہوا۔

اس وقت امراء اور فوجی سرداروں میں دو مختلف
انجیال گروہ تھے۔ ایک ترکی امیروں کا گروہ تھا اور دوسرا
گروہ غوری امراء پر مشتمل تھا۔

ترکی امیر شہاب الدین کے پیچھے سلطان محمود کو جانشین
مقرر کرنا چاہتے تھے جبکہ غوری امراء بہا الدین کی تخت نشینی کے
حق میں تھے۔ ہندوستان سے غزنی تک کے راستے میں یہ
اختلاف اتنا بڑھا کہ گواریں نیام سے باہر آ گئیں۔

مود الملک کی دوراندیشی اور مصلحت کوئی ایک مرتبہ
پھر کام آئی۔ اس نے کئی کسی طرح سب کو آمادہ کر لیا کہ وہ
کرمان ہوتے ہوئے غزنی جا رہیں گے کیونکہ وہاں شہاب
الدین کا غلام تاج الدین یلدوز موجود تھا جس کو شہاب
الدین نے اپنے آخری زمانے میں جیلوں شاہی سے سرفراز
کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بعد تاج الدین ہی
اس کا جانشین ہو۔ یہ بات اتنی مشہور ہوئی تھی کہ اس کی
بیٹیوں تک کو معلوم تھی۔

جب یہ فکر کرمان کے قریب پہنچا تو تاج الدین یلدوز
سلطان کی سواری کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا۔
سواری پر نظر پڑتے ہی تاج الدین نے اپنے آقا کے آداب
اور سلام کے لیے سر ہونکھائی۔ آقا کے دیدار کے بعد بصد
اشتیاق سواری کا پرہیز تو سلطان کی جیتی جاگتی تصویر کے
بجائے خون میں لتھڑی ہوئی لاش نظر آئی۔ لاش پر نظر پڑتے
ہی اپنا گریبان بھاڑ ڈالا۔ فریاد و فغان کا شور برپا ہوا۔ اسی
شور میں یہ قافلہ آگے بڑھا اور غزنی میں داخل ہوا۔

شہاب الدین کی لاش اس عمارت میں دفن کی گئی جو
اس نے اپنی بیٹی کے لیے بنوائی تھی۔

تدفین سے فارغ ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر جانشینی
کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ترکی اور غزنوی امراء کی خواہش تھی کہ
شہاب الدین کے پیچھے سلطان محمود بن غیاث الدین کو فرمان
رو بنایا جائے۔ ان امراء نے اس مضمون کا ایک خط بھی
سلطان محمود کی خدمت میں روانہ کیا لیکن سلطان محمود اس
جانشینی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے خط کے جواب میں لکھا۔
”مجھے اپنا آبائی وطن فیروز کوہ ساری دنیا سے پیارا

ہندوستان فتح کرنے کا خیال آیا۔

اسے معلوم تھا کہ تخت نشینی کی رسومات ادا کرنے کے بعد قطب الدین ایک لاہور سے دہلی واپس چلا گیا ہے۔ یہ پنجاب پر قبضہ کرنے کا ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے پنجاب پر حملہ کر دیا اور وہاں کے حاکم کو شہر سے نکال کر خود لاہور پر قابض ہو گیا۔

قطب الدین نے فوراً لشکر تیار کیا اور لاہور پہنچ گیا۔ عجیب منظر تھا۔ شہاب الدین کے پروردہ یہ دونوں غلام آزاد ہوئے ہی ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوئے تھے۔

تاج الدین کی بہادری ضرب الشمل تھی لیکن قطب الدین کے ستارے بھی عروج پر تھے۔ تاج الدین کو اس جنگ میں بری طرح شکست ہوئی۔ وہ میدان جنگ سے فرار ہو کر توران و کرمان کے راستے پہاڑی علاقے میں جا چھا۔

قطب الدین نے اسی پر انکشاف نہیں کیا بلکہ غزنی پہنچا اور وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہاب الدین کی جانشینی کا حق اس طرح ادا کرے گا کہ غزنی کی سلطنت اس کے ہاتھ میں آئے گی۔ تاج الدین جو سلطان شہاب الدین کی آنکھ کا تار بنا ہوا تھا پہاڑی علاقوں میں چھپنے پر مجبور ہو جائے گا۔ قطب الدین بس اتنی رعایت کر لیا تھا کہ اسے چھپا رہے دے۔

قطب الدین کو اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس کی طرف سے بے خبر ہو کر بزم عشرت سجائے بیٹھا اور تاؤ بوش میں دن رات بسر کر رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ خطرہ سر پر مچھلا رہا ہے۔ اہل غزنی قطب الدین کے مقابلے میں تاج الدین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ قاخرہ بیگم بھی باپ کی مظلومیت پر رنجی رہتی تھی۔ دیگر رشتے دار آتے تھے تو قاخرہ کو ملن ملن کرتے تھے۔ قاخرہ خود چاہتی تھی کہ غزنی کی حکومت باپ کو مل جائے اور وہ شوہر کے ساتھ ہندوستان چلی جائے۔

قطب الدین کے امراء میں سے بہت سے تھے جو تاج الدین کو برسرِ اقدار دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ تاج الدین کو قطب الدین کے مقابلے پر آنے کی دعوت دیں۔ البتہ قطب الدین کو بادہ نوشی کے

راستے پر لے آئے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے غفلت کے راستے پر جا رہا تھا۔ حسیناؤں کے جھرمٹ اسے سرپٹ دوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس کی عیش پرستی کی خبریں برابر تاج الدین تک پہنچ رہی تھیں پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ چند اکابر امرانے تاج الدین سے ملاقات کی اور اسے غزنی پر حملے کی دعوت دی۔ تاج الدین پہلے ہی تہیہ کیے بیٹھا تھا۔ اب یہی خواہوں کا خط پاتے ہی اس نے ایک زبردست لشکر تیار کیا اور غزنی پر حملہ کر دیا۔ قطب الدین عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ جب اس نے دشمن کو سر پر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلیں لیکن اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اتنے زبردست دشمن سے جنگ کرنے کی تیاری کرتا۔

وہ اس وقت اسی محل میں قیام پذیر تھا جہاں اس کی محبت پر وان چڑھی تھی۔ اس کے پائیں باغ میں بیٹھ کر اس نے قلعہ سے گھنٹوں باتیں کی تھیں۔ اسے اس محل کے اس خفیہ راستے کا بھی علم تھا جس سے ہو کر وہ قاخرہ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس نے یہی خفیہ راستہ اختیار کیا۔ کچھ دیر کے لیے شامی محل گیا اور سیدہ حلالہ کو پہنچا۔

لاہور پہنچ کر وہ خود کو خطرہ محسوس نہ کرتا لیکن تاج الدین کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا کہ وہ کہیں لاہور پر حملہ نہ کر دے۔

اس خطرے کا تقاضا تھا کہ وہ لاہور میں قیام رکھے تاکہ دشمن لاہور کی طرف بڑھنے سے باز رہے۔ اس کی موجودگی نے یہ رنگ ضرور دکھایا کہ تاج الدین کو لاہور کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی لیکن ایک دشمن ایسا ہے جس سے کی گنجائش نہیں اور وہ ہے موت۔ موت اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ ایک روز فرشتہ اجل کو موقع مل گیا۔ وہ چوکان لاکھ محل جو گھوڑے پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے (بھیل رہا تھا کہ اتفاقاً گھوڑے سے گر پڑا۔ گھوڑے کی زین گھوڑے کی پیٹھ سے چمک کر قطب الدین کے سینے پر آگری۔ اس سے اسے سخت چوٹ آئی اور اسی چوٹ کی تاب نہ لا کر اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

ہندوستان پر بیس سال تک حکومت کرنے کے بعد یہ عظیم فرماں روا، جرأت و بہادری اور سخاوت کا یہ شہنشاہ صحت ہوا۔

نارغ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین،

تاج الماثر، حسن بن احمد نظامی، طبقات ناصری، منہاج سراج

ماخذ

ایفائے عہد

کاشف زبیر

اچھے... اور اپنے گھر کا خواب پر انسان دیکھتا ہے کیونکہ وہ کسی پناہ گاہ کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا مگر جب زندگی کو نہ کوئی پناہ ملے اور نہ ہی کوئی گاہ اپنی ملکیت ٹھہرے تو ایسے میں درپردری انسان میں بیت سا زہر بھر دیتی ہے... وہ بھی درد بھٹکتے ہوئے ایسے عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا موت سے قبل جس سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ اب اگر اس نے مطلوبہ شخص کو بھی موت کے منہ میں دھکیلا تو کیا غضب کیا۔

قسطوں میں مکالمات فراموش کرتے والوں کی زندگی کا تادان

میاں عبد الغفور نے زندگی میں بہت سے وقت دیکھے تھے۔ بھی مشکل بھی آسان وقت۔ مگر اس وقت کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا جو اس وقت ان پر زور پڑا تھا۔ انہیں بس اتنا یاد تھا کہ وہ رات گئے اپنی تیسری ٹیکسٹ بک بیڈ کے فلیٹ سے نکل کر نیچے پارکنگ میں آئے اور اپنی گاڑی کو ریموٹ سے کھول دیا۔ وہ پتے پر پہنچے تھے کہ عقب میں کچھ حرکت محسوس ہوئی اور اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتے ایک کپڑا آکر ان کے رخسار پر جم گیا اور اس سے انہی تیز بونے لگوں



میں انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا... یہ فلیٹ ایک بہترین اپارٹمنٹ کمپلیکس کے ساتویں فلور پر تھا اور یہ شہر کا پوش علاقہ تھا۔ یہاں کی خاص بات یہ تھی کہ پڑوسی پڑوسی کو نہ تو جانتا تھا اور نہ ہی اس کے معاملے میں دخل دیتا تھا، اس لیے جب انہوں نے اس ابھرتی ہوئی ماڈل سے شادی کی اور اسے یہاں فلیٹ لے کر دیا تو انہیں اطمینان تھا کہ بات میگزین میں رہے گی۔ مزید رازداری کی خاطر وہ ڈرائیور اور اپنے گاؤں کے بغیر ہی آتے تھے۔

چینی گزیا سی مونا ایک ایڈ میں کام کرنے آئی اور میاں صاحب کے دل میں اتر گئی۔ ایڈ ان کے ہی نئے پروجیکٹ کا تھا۔ چار اور پانچ کمروں کے اس سپر گھڑی پروجیکٹ میں ایڈ کے مطابق دنیا جہاں کی سہولتیں تھیں اور اس کی ابتدائی قیمت ہی ہوش رہا تھی۔ میاں صاحب نے آغاز میں کچھ ہلکے پروجیکٹ کیے تھے مگر اس کے بعد ان کا ہر پروجیکٹ ٹھکنے سے مہنگا ہوتا چلا گیا تھا۔ قیمت کی مناسبت سے میاں صاحب نے ایڈ تیار کرنے والی کمپنی سے ماڈل بھی ہوش رہا لیا کہ ایڈ دیکھنے والوں کا دھیان قیمت کی طرف کم جائے مگر میاں صاحب نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایڈ دیکھنے والوں سے پہلے ان کے ہوش اڑ جائیں گے۔ وہ ایسے بے چہن ہوئے کہ مونا سے معاہدے کے دوران اس کی ہر شرط پڑھ لیتے تھے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں رہا کہ مونا نے ہر معاملے میں اپنے مفاد کا زیادہ خیال رکھا تھا۔ چند پروجیکٹس سے حاصل ہونے والی بے حد بے ایمانی کی تو کچھ حیثیت ہی نہیں تھی۔ مونا نے ان سے شائع نام کا جھگڑا حاصل کیا تھا مگر ان کی واحد شرط کے مطابق اسے ان فلیٹ میں رہنا تھا جو میاں صاحب نے اسے منہ دکھائی میں دیا تھا۔ مونا کا خیال تھا کہ اس نے انہیں ممکنہ حد تک لوٹ لیا ہے مگر جس جگہ رات کے بعد میاں صاحب کو یہ سودا بہت سستا لگا تھا اس کے بعد وہ جب مونا کے فلیٹ سے نکلتے تو خود کو ایسا سرشار اور جوان محسوس کرتے کہ کبھی جوانی میں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی پڑوسی میں وہ مارے گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے خود کو اُنکی اجازت اور ویران جگہ پایا جہاں ہر طرف تعمیراتی لمبا بکھرا ہوا تھا۔ یہاں سیلن اور بدبو بھی اور کیزے کھوڑے اور چوہے دوڑ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں ایک چوہے کی وجہ سے کھلی جو ان کے منہ میں ٹھکنے پر بھند تھا اور وہ بروقت ہوش میں آگئے تھے۔ ان کے حرکت میں آتے ہی چوہا اچھل کر ان

کے منہ سے ہٹ گیا اور میاں صاحب کے کھلے منہ سے کھنٹی کھنٹی چٹ نکل گئی۔ وہ اچھل کر بیٹھ گئے۔ یہاں ایک طرف چھوٹی سی ایئر کنڈیشنر لائٹ رہی تھی۔ میاں صاحب آڑے تر بیٹھے بلے پر پڑے تھے اور انہوں نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ کنکریٹ اور بلاکوں سے بنا ہوا کمر تھا جس کا فرش کچا تھا۔ یہاں ایسی ویرانی اور وحشت تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد اندر ان کا دل جیسے بیٹھنے لگا تھا۔

”میں..... میں کہاں ہوں؟“

یہ سوال انہوں نے خود سے کیا تھا کیونکہ وہاں ان کی سننے والا اور کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے کانچے ہاتھوں سے لائٹ اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا تو انہیں ایک طرف دیوار میں سوراخ دکھائی دیا اس پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں، یہ سلاخیں اصل میں تعمیراتی سربا تھا۔ وہ اس کی طرف جھپٹے اور سلاخیں ملائے کی کوشش کی مگر وہ بہت مضبوطی سے کنکریٹ میں جکڑے تھے۔ دیکھنے میں وہ بہت صحت مند اور مضبوط دکھائی دے رہے تھے مگر وہ جانتے تھے کہ تقریباً ساٹھ برس کی عمر اور بے انتہا زندگی نے انہیں اندر سے کتنا کھوکھلا کر دیا تھا۔

کچھ دیر اس جگہ کا معائنہ کرتے رہے، جب وہ سوچنے کے قابل ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ یقیناً انہیں تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ اس شہر غدار میں اب کسی دولت مند کا اغوا ہونا تعجب انگیز بات نہیں رہی تھی۔ ان کے ہاتھ باندھے ہوئے کوئی نہیں کرتا کہ اس شہر کے ہر کاری بھی اس عزت سے محروم نہیں رہے کہ وہ کسی نہ کسی کو بھتا ادا کرتے ہیں۔ شب ہی اللہ کے نام پر ہاتھ پھیلانے کی جرات کرتے ہیں۔

اب ایسا لگ رہا تھا کہ بالآخر ان کے حاسدوں کے دل میں ٹھنڈ پڑنے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر یہ خیال آنے کے چند منٹ بعد انہیں دوسرا خیال آیا کہ اگر تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو اس سسٹان اور اجازت جگہ یوں قید کرنے کی کیا تک تھی۔ کمرے کے واحد سوراخ کے سامنے بھی اسی طرح کنکریٹ کی دیوار تھی۔ سلاخوں کے درمیان بس اتنا فاصلہ تھا کہ وہ اپنا بازو کہنی تک پہنچا کر دیکھ سکتے تھے۔ میاں صاحب بچپن سے کچھ کاہل اور سست واقع ہوئے تھے۔ تمام غیر ضروری جسمانی حرکات سے وہ شروع سے پرہیز کرتے آئے تھے۔ خاص طور سے ورزش سے پرہیز تھا۔ جب سے انہوں نے بلڈر کا

شعبہ اپنایا تھا تب سے شادی ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اپنا بتایا ہوا کوئی پروجیکٹ پورا دیکھا ہو۔ وجہ وہی تھی کہ انہیں زیادہ چلنا پھرنا پسند نہیں تھا۔

دن بھر میں ان کی سب سے لمبی واک دو پار ہوتی تھی جب وہ پہلی بار کار سے اتر کر دوسری منزل پر واقع اپنے دفتر تک جاتے تھے اور شام کو وہاں سے واپس کار تک آتے تھے۔ بعض اوقات انہیں بولنے سے بھی سستی آتی تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ نو عمری میں ایک بار انہیں کتے نے صرف اس لیے کاٹ لیا تھا کہ انہوں نے بھاگتے میں سست روی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس زمانے میں کتے بچکانے کے چودہ انجکشن لگتے تھے اور وہ بھی پیٹ میں۔ اگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ صرف سستی کی وجہ سے چلانے سے رہ جاتے۔ انہوں نے ... ممکن حد تک سلاخوں سے صرف ہونٹ باہر کیے اور حلق پھاڑ کر چلائے۔ ”مدد..... کوئی ہے۔“

ان کے حلق سے نکلنے والی تھکی تھی اس نے خود انہیں حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کے حلق سے ایسا گر جدار اسٹیریو سا آواز نکل سکتا ہے۔ آواز کی بازگشت نے خود ان کے کانوں کا استحصال کیا تھا اور ان کے کان کے پردے جھنجھٹا گئے تھے جو آج تک شہر و دیہات کی سمیع خراش اور پیغمبر و کفن پھاڑ قسم کی آواز سے بے حس نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کم سے کم نصف ٹونڈیشن کے درجے میں ان کی آواز صاف سنی گئی ہوگی اور لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے ہوں گے۔ اس لیے پہلی آواز کے بعد وہ دیر چپ ہو کر دم سادھ کر اور کان لگا کر سنتے رہے کہ ان کی زبان کے پکارنے کی آواز آئے گی اور شاید انہیں پھر ان کی رہنمائی کے لیے ایک دوبار آواز نکالنی پڑے۔ مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی اور بدستور سناٹا طاری رہا تو انہیں اپنے کانوں پر شبہ ہوا کہ شاید انہیں کوئی نقصان ہوا ہے ان کی اپنی ہی آواز سے۔ اس لیے انہوں نے ایک پتھر اٹھا کر دیوار پر مارا اور اس کی آواز بالکل واضح سنی یعنی ان کے کان بالکل صاف تھے۔ میاں عبدالغفور شروع سے خود کو درست سمجھتے تھے۔ ان کی یہ سوچ ان کے بزنس میں بہت کام آئی تھی اور وہ اسی وجہ سے اتنے اوپر پہنچے تھے مگر یہ سوچ فی الحال ان کے کام نہیں آئی اور ان کا یقین درست ثابت نہیں ہوا کہ ان کی گرجدار آواز سن کر لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑیں گے اور بالآخر انہیں اس قید خانے سے نکال لیں

گئے۔ انہوں نے دوسری بار آواز نکالی اور جب اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا تو ان کا دل ڈوبنے لگا اور تیسری بار نکالنے پر ان کی آواز بھی ڈوبی ہوئی نکلی تھی۔

بچپن سے میاں صاحب کو جس کام سے سب سے زیادہ چڑھتی وہ گالیاں دینا تھا۔ ان کے خیال میں گالی دینا صرف اخلاقی کمزوری ہی نہیں بلکہ یہ وہ سب سے بیکار کام بھی تھا جو ایک باشعور انسان کر سکتا ہے۔ میاں صاحب ایسے تمام کاموں کے سخت خلاف تھے جن سے کوئی مالی منفعت نہ ہو۔ مگر اس وقت وہ بھول گئے تھے کہ انہیں گالیاں دینا سخت نا پسند ہے۔ پہلی بار مدد کے لیے پکارتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اس شخص کو گالیاں دے رہے تھے جس نے انہیں اس اجازت جگہ بند کیا تھا۔ دوسری بار آواز دیتے ہوئے وہ ان لوگوں کو گالیاں دے رہے تھے جو ان کی آواز سن کر بھی نہیں آئے تھے اور تیسری بار چلاتے ہوئے وہ خود کو گالیاں دے رہے تھے کہ ان کی آواز سنی گئی کیوں تھی کہ کسی کے کان تک نہیں جا رہی تھی۔ یمن پر چلانے کے بعد ان کی سانس جواب دے گئی اور وہ باقاعدہ اپنے آپ گئے۔ کوئی درجن بھر سانس لینے کے بعد وہ ذرا بہکے ہوئے۔ یعنی ان کا ذہنی انتشار کم ہوا تھا۔ انہیں پہلی بار خیال آیا کہ اس جگہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ ممکن ہے ایمر جنسی لائٹ کے علاوہ بھی یہاں کچھ ہو۔

کمر بارہ باکی تیرہ کا تھا اور اس کا فرش کہیں سے لٹپٹا ہوا کہیں سے اونچا تھا۔ چھت کی تیم اور اس کے کناروں پر لگے ہوئے پلرز خامسے چوڑے تھے۔ میاں صاحب کو لگا کہ وہ کسی بڑی بلڈنگ کے گراؤند فلور والے حصے میں تھے۔ یہ ٹولڈا تھے بڑے پلرز اور تیم صرف بڑی عمارتوں میں ہوتے ہیں تاکہ اوپر کی منزلوں کا بوجھ سنبھال سکیں۔ یہ دیکھ کر میاں صاحب کی امید پھر سے تازہ ہونے لگی کہ وہ کسی بڑی عمارت میں ہیں جو ظاہر ہے شہر میں یا آبادی میں ہونی چاہیے۔ ایک طرف چند ٹوٹی اینٹیں ایک دوسرے کے اوپر جمع تھیں اور ایمر جنسی لائٹ سب سے اوپر والی اینٹ پر رکھی تھی۔ میاں صاحب نے اسے یہیں سے اٹھایا تھا۔ وہ اس تک آئے اور اب وہ فرش پر روشنی ڈال رہے تھے۔ پہلے انہوں نے اس کاغذ کو نظر انداز کر دیا تھا مگر جب دوسری بار اس پر روشنی ڈالی تو انہیں لگا کہ کاغذ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ انہوں نے کاغذ اٹھایا۔ یہ کسی بچے کی اسکول کی کاپی سے پھٹا ہوا صفحہ تھا اور اس پر پچیس

سے لکھا ہوا تھا۔

صرف ان کا پرس تھا۔ پرس میں ان کی رقم اور دوسری تمام چیزیں موجود تھیں۔ رقم اچھی خاصی تھی۔ تقریباً پچیس ہزار روپے۔ اس کے علاوہ کارڈ اور ڈیٹ کارڈ بھی تھے۔ مگر کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا تھا البتہ ان کی کلائی کی گھڑی بھی غائب تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں بند کرنے والے نے انہیں وقت کی آگاہی سے بھی روک دیا۔ وہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ کتنی دیر سے اس جگہ قید ہیں اور اس وقت باہر کیا وقت ہوا ہے۔ اپنی کھل تلاشی لے کر وہ مایوس ہو گئے تھے۔ انہوں نے پھر سے کانڈ پر لکھی تحریر پڑھی۔

جب وہ انہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی وہ ان سے کوئی مالی منفعت چاہتا تھا تو پھر اس نے انہیں اس خوفناک جگہ کیوں قید کیا تھا؟ انہوں نے یہی سوچا کہ انہیں کس وقت لے کر لایا گیا اور کس وقت لے کر لایا گیا ہے۔ موسم مناسبت تھا اور یہاں سٹین بھی تھی اس لیے ان کا منہ اتنا خشک نہیں ہوا تھا۔ مگر انہیں پیاس لگ رہی تھی۔ انہوں نے نیچے کھانے پینے کا بھی لکھ دیا اور جب کانڈ ڈالنے جا رہے تھے تو پھر انہیں اس بار انہوں نے ایمر جنسی لائٹ کا بھی لکھا کہ اگر اس کی بیٹی ختم ہوگئی تو وہ اندھیرے میں رہ جائیں گے اور انہیں اندھیرے سے بہت خوف آتا ہے۔ انہوں نے کانڈ سوراخ سے باہر ڈال دیا۔ وہاں بیٹھنے کی کوئی ڈھنگ کی جگہ نہیں تھی۔ مگر انہوں نے ایک جگہ موجود صاف بجری کا ڈھیر اس طرح کر لیا کہ وہ بلا تکلیف اس پر بیٹھ سکتے تھے اور ان کا لباس بھی گندہ نہیں ہوتا۔

اس شہر میں ان کے پاس نصف درجن محل نما ہنگلے تھے اور اس کے علاوہ بے شمار دولت اور جائیداد تھی۔ روپے میسے اور آسائش کی فراہمی بھی مگر وہ اس وقت مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے تھے اور اس پر خوش تھے کہ ان کے جسم کو تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ پھر انہیں اپنی اولادوں کا خیال آیا کہ وہ ان کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر رہی ہوں گی۔ ان کی بڑی بیگم سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ سب جوان اور شادی شدہ تھے۔ سوائے چھوٹی بیٹی کے جس کی چند مہینے پہلے شادی ہوئی تھی سب صاحب اولاد تھے۔ دوسری بیگم کا اسکور بیٹوں میں بٹھرتا تھا اور اس سے تین بیٹے تھے مگر بیٹی ایک ہی تھی۔ یوں چار کی گنتی برقرار رہی تھی۔ تیسری بیوی سے انہوں نے اولاد کا بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ دو

”سب سے پہلے تو میں معافی چاہوں گا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ بڑے آدمی ہیں۔ مشکل میں رہنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ شاید آپ نے برسوں سے کوئی مشکل شاید ہی دیکھی ہو۔ اس صورت میں یہاں رہنا آپ کے لیے یقیناً آسان کام نہیں ہوگا مگر میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ صبر اور تحمل سے کام لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جلد آپ اس مشکل سے نجات حاصل کر لیں گے بس آپ کو ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ شاید آپ کے ذہن میں آ رہا ہو کہ میں نے آپ کو یہاں کیوں بند کیا ہے۔ تو میں اس کے لیے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصد آپ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے کسی مالی منفعت کے لیے آپ کو یہاں قید کیا ہے تو یہ بات بھی غلط ہے۔ جلد آپ یہ بھی جان جائیں گے کہ آپ یہاں کیوں ہیں۔ آپ کو اگر کچھ کہنا ہے تو اس صفحے کے پیچھے لکھ کر سوراخ سے باہر پھینک دیں۔ لکھنے کے لیے پینل بھی پاس ہے۔“

تحریر اس سے آگے بھی جی نہیں مہیاں صاحب نے جلدی سے پہلے پینل تلاش کی اور وہ اس کے پیچھے پڑی مل گئی۔ یہ بھی کسی بچے کی اسکول پینل تھی۔ سب مہیاں صاحب نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ ”یہ لائٹ پورٹی طرح جارح ہے مسلسل استعمال کریں گے تو میں سمجھنے چل سکتی ہے مگر آپ احتیاط سے کام لیں، میں آؤں گا مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

مہیاں صاحب کے ہاتھ میں کانڈ کا نپٹہ لگا۔ اب ثابت ہو گیا کہ کسی جان بوجھ کر کسی مذموم ارادے کے ساتھ انہیں یہاں قید کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا اور جب تک انہیں ایسی لائٹ کے ساتھ گزارہ کرنا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر لائٹ چلا کر دی کہ کہیں یہ بند ہو جائے تو انہیں تاریکی میں رہنا پڑے۔ انہیں تاریکی سے گھبراہٹ ہوئی تھی۔ اچانک انہیں ایک خیال آیا اور وہ تاریکی میں اچھل پڑے۔ انہوں نے جلدی سے لائٹ آن کی اور اس بار گھبراہٹ میں نہیں بلکہ امید کے ساتھ آگے بڑھی اور پھر انہوں نے اپنی تلاش لی۔ ان کے پاس تین عدد موبائل فون ہوتے تھے۔ ایک جدید ترین آئی فون اور دو عام سے فون جن کی لمبی بیٹری تھی اور وہ ان کی مدد سے کاروباری گفتگو کرتے تھے۔ مگر ان کے جیبوں سے تینوں موبائل غائب تھے۔

بہویوں سے ان کی آٹھ عدد اولادیں تھیں اور انہیں مزید کی خواہش نہیں تھی۔

ان کے پانچوں بیٹے جوان تھے اور ان میں سے چار ان کے ساتھ بزنس میں شامل تھے۔ پانچویں نے تعلیم کو ترجیح دی تھی اور وہ آرکیٹیکٹ تھا۔ میاں صاحب نے اسے اپنا بزنس کرا دیا تھا۔ اب وہ اپنی فرم چلا رہا تھا۔ بیگم اول اور دوم ایک ہی بڑے سے بنگلے میں اوپر نیچے کے فلور پر مع اولاد اور ان کی اولاد کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ میاں صاحب انصاف سے ایک ایک دن دونوں کے ساتھ رہتے تھے۔ شروع میں دونوں بیگمات نے مشکل کی تھی جیسے نئی بننے والی مشینیں کچھ مشکل کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ یوں آپس میں شیر و شکر ہو گئیں جیسے ذرا پرانا ہونے پر مشین کے کھانچے آپس میں فٹ بیٹھ جاتے ہیں اور وہ روانی سے چلنے لگتی ہے۔ بہوؤں کے آنے کے بعد انہوں نے اپنے اختلافات کا رخ ان کی طرف موڑ دیا تھا۔ ایک مختصر وقت کے لیے ان کا اتحاد اپنی ساس کے خلاف بھی وجود میں آیا تھا جو بڑے بیٹے سے ناراض ہو کر میاں صاحب کے پاس چلی آئی تھیں۔ ایک سال وہ میاں صاحب کے پاس رہیں اور اس دوران میں دونوں بیگمات اپنی رہنمائی بھولی رہیں۔

میاں صاحب نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں سے خود تک رہیں گی، کیونکہ جس دن انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے اپنے بھٹڑے اولاد تک منتقل کیے ہیں اس دن وہ بچوں کو پرہیز کرنے کے لیے کسی بورڈنگ اسکول بھیج دیں گے۔ کیا یہ سب سے پہلے انہوں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری کی تھی اور سب سے بڑے برخوردار کو شمالی علاقے میں ایک اسکول بھیج رہے تھے مگر دونوں بیگمات نے رد وحو کر پانچویں کو ذکر انہیں روک لیا اور یقین دلایا کہ اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ ان کے بچے ماؤں سے قطع نظر آپس میں شیر و شکر تھے۔ چاروں کے ساتھ کام کرتے تھے اور میاں صاحب کی دی ہوئی دوسے داریاں خوش اسلوبی سے نبھا رہے تھے۔ میاں صاحب نے انہیں اس طرح تربیت دی تھی کہ ان کے بعد انہیں بھٹڑے سنبھالنے اور چلانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چاہے وہ مل کر بزنس کرتے یا الگ الگ کرتے۔

گھر کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد انہیں وہی شوق چرایا جو اکثر ضرورت سے زیادہ دولت مند ہو جانے والے مردوں کو چراتا ہے اور انہوں نے تیسری شادی کر

لی۔ اس وقت وہ جوان ہی تھے یعنی چالیس برس کے تھے۔ اتفاق سے یہ بھی ماڈل تھی۔ یہ تیسری شادی تین سال چلی اور بالآخر ان کا اس سے دل بھر گیا تو انہوں نے انہماک و تفہیم سے طلاق دے دی۔ تیسری بیوی جاتے وقت بھی خوش تھی کیونکہ میاں صاحب نے اسے دل کھول کر دیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی یہ شادی خفیہ رہی تھی۔ وہ مہینے میں دو تین بار چند گھنٹوں کے لیے تیسری بیوی کے پاس ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی خوش تھی کہ اس کی ڈیوٹی یہیں تک محدود تھی۔ وہ چاہتے تو اس سے کہیں کچھ بچے میں کوئی عورت عارضی طور پر حاصل کر لیتے۔ مگر اس معاملے میں وہ حدود اللہ کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک صرف اسی عورت کے پاس جانا جائز تھا جو ان کی منکوحہ ہو اور باقی سب ان کے لیے حرام تھیں۔

دوسری بار تیسری شادی انہوں نے ایک سال بعد کی اور یہ سب سے زیادہ عرصے رہنے والی تیسری شادی تھی۔ یہ لڑکی ماؤں کی بیٹی تھی بلکہ میاں صاحب کے دفتر میں کام کرتی تھی اور اس زمانہ کا دل آگیا۔ انہوں نے پیش قدمی کی اور حیران ہوئے کہ وہ تو آمان گئی۔ اصل میں اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا خود اس کی بہن کی شہتے کی خالہ کے گھر پرورش پائی تھی اور اب پڑھ لکھ کر نوکری کر رہی تھی مگر اسے اپنے خالو کی طرف سے خدشہ تھا جو صرف خالہ کے ذریعے اس کی وجہ سے اب تک کل کر اپنی خواہش کا اظہار نہیں کر سکے تھے ورنہ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی عزت محفوظ رکھے اور اس کی شادی کسی شریف آدمی سے ہو جائے۔ میاں صاحب کو وہ شریف ہی سمجھتی تھی کیونکہ میاں صاحب اپنے دفتر میں کام کرنے والی تمام عورتوں اور لڑکیوں کی عزت کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کروااتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دفتر کا ماحول خواتین کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ اسی وجہ سے سمعیہ مان گئی تھی۔

سمعیہ ان عورتوں میں سے تھی جو بیوی بن کر رہنا چاہتی ہیں اور میاں صاحب جب اس کے پاس جاتے وہ تن من سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میاں صاحب اسے مہینے میں چند دن دے دیں مگر ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا اور وہ رفتہ رفتہ فرسٹ ہوئی چلی گئی اور اس شادی کا خاتمہ بھی اسی وجہ سے ہوا۔ میاں صاحب اولاد نہیں چاہتے تھے اور وہ اولاد کی خواہش مند تھی۔ بالآخر دونوں نے محسوس کیا کہ یہ گاڑی اب مزید نہیں چل سکتی اس

لیے اس بار بھی افہام و تفہیم سے طلاق کا فیصلہ ہوا اور میاں صاحب نے اسے بھی بہت کچھ دے کر رخصت کر دیا۔ ویسے بھی وہ اسے بہت کچھ دے چکے تھے اور اب وہ ساری عمر بیٹہ کرکھاتی تب بھی اس کے لیے کافی تھا۔ تیسری بار انہوں نے ایک غلط عورت کا انتخاب کر لیا جو ان کی بیوی بن کر بیٹہ بیچے دوسرے مردوں سے ملتی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ میاں صاحب اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ ہر تیسری بیوی کی نگرانی کراتے تھے۔ پہلی دو بیویوں نے ان سے بے وفائی نہیں کی تھی۔ تیسری نے کی تو انہوں نے منع ثبوت اسے طلاق نامہ پیش کیا اور وہ جو ان سے لے چکی تھی اسی پر اکٹفا کر کے چلی گئی۔

البتہ چوتھی بار تیسری بیوی انہیں سب سے ہونٹتی رہی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ سب سے زیادہ حسین تھی اور انہیں اس عمر میں ملی تھی اس لیے انہیں زیادہ قیمت بھی مگراں نہیں گزری تھی۔ میاں صاحب کو باری باری سب کا خیال آ رہا تھا کہ ان کے یوں نکاح ہونے پر دوسروں کا کیا رد عمل ہوگا؟ ان کے بیٹے کی دوزخ کر رہے ہوں گے ان کے اور اپنے روابط استعمال کر رہے ہوں گے۔ پولیس میں رپورٹ کرادی ہوگی۔ ان کی کار ریفرینگی کھڑی مل گئی ہو گی اور پولیس اس کی مدد سے انہیں لے کر آئے گا پتہ چلانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ اگر کار ایمرٹنٹ کی باہر نکلتے ہیں تو یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ وہ کس کار ایمرٹنٹ میں جاتے تھے۔ یہ بات تو گاڑڈز بھی بتا سکتے تھے۔ ان کے بعد پولیس تیسری بیوی تک پہنچ جاتی اور ان کا پول مکمل کر لیا۔ اس وقت انہیں پول ملنے سے زیادہ یہ فکر تھی کہ وہ یہاں سے کیسے آزاد ہوں گے؟

انہوں نے غور کیا کہ انہیں نقصان پہنچانے کی غرض سے انہیں لانے کی تردید کر دی تھی۔ پھر اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا، اس نے انہیں سلی بھی دی تھی کہ وہ جلد یہاں سے رہا ہو جائیں گے۔ بس انہیں ڈرائیو سے کام لینا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ڈی ہوش ہو کر کوئی کام نہ کر سکتا۔ مقصد نہیں کرتا مگر خاصی دیر سوچنے کے بعد انہیں انہیں اپنے انہوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایسی جگہ قیام کیا جہاں شاید کوئی جانور بھی رہنا پسند نہ کرے۔ الفاظ کے برعکس اس کا عمل کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے کوئی عطا تھا اور اس نے انہیں ذہنی اور جسمانی اذیت دینے کے لیے ایسی جگہ قید کیا ہے اور پھر وہ اسے استہزاء اور انداز میں انہیں تسلیاں بھی دے رہا ہے کہ وہ انہیں کوئی تکلیف نہیں

پہنچائے گا اور وہ جلد آزاد ہو جائیں گے۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ ان کا ایسا کونسا دشمن ہو سکتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کبھی براہ راست دشمنی نہیں پالی تھی۔

حالانکہ بلڈر کا کام جھگڑے والا ہے اس میں شریف آدمی مشکل سے ہی کامیاب ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب سے قبضے کی بھار آئی یہ کاروبار سارے کا سارا بد محاشوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ان کی وجہ سے کتنے بلڈر اپنے پروجیکٹ اور محورے چھوڑ کر چلے گئے مگر چند ایک بلڈر جو شروع سے صاف کام کرتے آئے تھے، وہ اب بھی کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک میاں صاحب بھی تھے۔ انہوں نے شہر کے اچھے علاقوں میں کوئی درجن بھر پروجیکٹ بنائے تھے۔ انہوں نے کامیابی کا ایک گر پکڑ لیا تھا۔ مگر چیز اچھی بناؤ قیمت خود ملے گی۔ ان کے شروع کے چند پروجیکٹ کامیاب ہوئے تو ان کا نام بنا چلا گیا اور جب وہ کوئی نیا پروجیکٹ لانچ کرتے تو وہ ہاتھوں ہاتھ بک ہو جاتا تھا۔ جب تک پروجیکٹ بناؤ فائل ٹرانسفر سے ہی خاصا کمایا لیتے تھے اور جس میں بھی لیز ہونے تک کماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کمائی کے کئی گھر تھے۔ سوراخ کے پاس آہٹ ہوئی تو وہ چونکے اور جلدی سے اٹھ کر روشنی کا رخ اس طرف کر لیا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ وہاں ایک منزل وارٹر کی بوتل ایک چھوٹا پلاسٹک شا پر تھا اور کانڈ میں کچھ لینا ہوا اور ویسی ہی ایک کھانسی لائٹ رکھی ہے جیسی ان کے پاس تھی۔ وہ جھپٹ کر سوراخ کے پاس آئے اور چلائے۔

”کون ہے میری بات سنو۔“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا خاصی دیر تک پکارے پر بھی جواب نہیں ملا تو انہوں نے تسلیم کر لیا کہ آنے والا جا چکا تھا۔ انہوں نے بے تابی سے پانی کی بوتل اٹھائی اور اس کا ڈھکن کھول کر ایک ٹھونٹ پیا۔ پانی سادہ تھا کیونکہ بوتل کھلی ہوئی تھی اور پانی اس میں پانی نہیں سے بھر کر لایا گیا تھا مگر وہ انہیں بہترین منزل وارٹر سے بھی اچھا لگا تھا۔ وہ پہلے ٹھونٹ کے بعد مزید پینے جا رہے تھے کہ انہیں کچھ خیال آیا اور وہ رک گئے۔ انہوں نے ڈھکن لگا کر بوتل احتیاط سے رکھی اور شا پر کا جائزہ لیا اس میں ایک سادہ سا پتھر تھا جو عام ٹھیلوں پر ملتا ہے اور انہوں نے زندگی میں کی یہ برگر نہیں کھایا تھا۔ نئی امریکی لائٹ پوری طرح چارج تھی اور اس کے نیچے اسی طرح کا ایک پرچہ رکھا تھا جس پر انہوں نے والے نے پہلے بھی پیغام لکھا تھا۔

ہیں۔ اگر میرے پاس آپ کے سوال کا کوئی جواب ہوا تو میں ضرور دوں گا۔ اب آپ کہانی پڑھیں اور پھر مجھے بتائیں کہ آپ کو کیسی لگی۔ ہاں ایک بات ذہن میں رکھیے گا کہ ضروری نہیں ہے کہ یہ صرف کہانی ہو۔“ اس سے آگے کہانی تھی۔

”راشد حامد ایک متوسط طبقے کے خاندان کا سربراہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں کلرک کے طور پر کام کرتا تھا۔ محدود تنخواہ تھی اور وہ حرام کھانے کا قائل نہیں تھا اس لیے گزراہ مشکل سے ہوتا تھا۔ بیوی اور دو بچے ایک چٹنا اور ایک مٹی تھی۔ دونوں بچے اسکول جاتے تھے۔ مکان کرائے کا تھا۔ بجلی، گیس کے بل اور دوسرے اخراجات اتنے تھے کہ مہینے کے آخر میں چھٹی روٹی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ راشد صبح دفتر میں پہنچنے سے پہلے بچوں کو اسکول چھوڑتا کیونکہ اس کی اتنی تنگبختی نہیں تھی کہ انہیں اسکول دین لگوا کر دیتا۔ دوپہر میں اس کی بیوی جا کر بچوں کو لے آتی تھی۔ ان کی واحد بچت وہ مٹی کی چھوڑا لیتے تھے اور اس سے جو رقم اکٹھی ملتی اس سے دیگر اخراجات پورے کر لیے جاتے تھے۔ عام طور سے یہ بچت عید پر کام آتی تھی۔ پھر ایک دن راشد کی بیوی سارو نے اس سے کہا

”ہم کب تک اس طرح کھائے کے مکان میں رہتے رہیں گے؟“

”تو کیا کریں؟“

”اپنے مکان کے لیے کوشش کریں۔“

”کیسے کریں، تم جانتی ہو ہماری مالی حالت کیا ہے؟“

”مات کوشش کریں، ہم جو کمٹی ڈالتے ہیں اس سے

کوئی فلیٹ کب کرایہ لیتے ہیں۔“

یہ کوئی میں سنا چکے کی بات ہے۔ اس وقت زمین و

جائداد اور فلیٹوں کی قیمت کی طرح آسمان کو نہیں پہنچی

تھی مگر کم قیمت میں بھی راشد کوئی فلیٹ نہیں لے سکتا

تھا۔ اس کی حیثیت ہی اتنی نہیں تھی۔ تب سارو نے بی

مشورہ دیا۔ ”ہم کوئی فلیٹ کب کرایہ لیتے ہیں۔ قسطوں میں رقم

دیتے رہیں گے تو اس سے آسانی ہو جائے گی۔“

راشد کو یہ مشورہ مناسب لگا اور اس نے جائزہ لیا کہ

اس کی حد کے مطابق اسے فلیٹ کہاں مل سکتا ہے۔ اسے

زمین لینے کا خیال بھی آیا مگر ایک تو شہر میں زمین نایاب اور

مہنگی تھی اور اگر وہ زمین لے لیتا تو اس کے پاس مکان تعمیر

کرانے کے وسائل نہیں تھے۔ اس لیے اسے اور سارو کو

انہوں نے کاغذ اٹھایا تو اس پر تحریر خاصی زیادہ نظر آئی اور صفحے کے دونوں طرف تھی۔ وہ چیزیں لے کر اپنی جگہ آگئے۔ انہیں بھوک لگ بھی رہی تھی مگر ان کا فی الحال یہ برگر کھانے کا سوڈا نہیں تھا۔ انہوں نے کاغذ پر ایمر جنسی لائٹ کی روشنی ڈالی اور پڑھنے لگے۔

”میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے

پوچھا کہ میرا مقصد کیا ہے تو میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ

رہا ہوں کہ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے، نہ مال، نہ دولت

اور نہ کچھ اور درکار ہے۔ جہاں تک آپ کی جان ہے تو میں

اسے بھی کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ

آپ جس جگہ قید ہیں وہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔

یہاں آپ کو بہت سی تکالیف ہیں اور شاید آنے والے وقت

میں ہوں گی۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں آپ

کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کاش میرے پاس

اس سے بہتر کوئی جگہ ہو تو میں آپ کو وہاں رکھتا مگر میری

مجبوری ہے۔ آپ جہاں جہاں ہیں میں آپ کو ہر ممکن

سہولت دوں گا۔ مگر یہ بتانا میرے لیے بھی دشوار ہے کہ

آپ یہاں سے کب نکل سکیں گے مگر آپ نے صبر و تحمل

سے کام لیا تو مجھے یقین ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔“

”فی الحال آپ کے لیے پانی، کھانے اور ایک اضافی

ایمر جنسی لائٹ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جب آپ کی پانی

ایمر جنسی لائٹ کا چارج بالکل ختم ہو جائے تو اسے سوار

کے ساتھ ڈال دیجیے گا۔ اگلی بار میں آپ کو ایک ایمر جنسی

لائٹ لے دوں گا تا کہ آپ بالکل اندھیرے میں نہ

رہ جائیں۔ آپ کو ان چیزوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ

میں ایک عام آدمی کی آدھی ہوں کاش کہ میں آپ کے

لیے اس سے زیادہ کچھ کر سکتا مگر مجھے امید ہے آپ ان

سے گزراہ کر ہی لیں گے۔“

”مجھے یہ احساس بھی ہے کہ آج صبح سے شام تک

نہایت مصروف رہنے والے شخص کے لیے یہاں وقت

گزاری کس قدر دشوار ہوگی جب کہ آپ کے پاس کرنے کو

کچھ نہیں ہے۔ کاش میں آپ کی وقت گزاری کے لیے کچھ

مہیا کر سکتا۔ بہر حال پھر بھی اپنی سی کوشش کی ہے اور میں

کاغذ پر آپ کے لیے ایک چھوٹی سی کہانی شروع کی ہے

امید ہے اس کا اولین حصہ آپ کو پسند آئے گا۔ اگر پسند

آئے تو کاغذ پر ہی اپنی رائے لکھ کر باہر بھیج دینیے گا میں

اس کا اگلا حصہ آپ تک پہنچا دوں گا۔ یہ کہنے کی ضرورت

نہیں ہے کہ آپ اپنے دل کی بات بھی مجھ سے لکھ کر کر سکتے

فلٹ ہی مناسب لگا تھا۔ شہر میں وہ فلٹ جو جھیل کے آخری
یا درمیانی مراحل میں تھے ان میں کوئی فلٹ دستیاب نہیں
تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان میں اسے کوئی چھوٹا فلٹ مل
جائے تو جلد کرائے کے مکان سے چھٹکارا حاصل کر لے گا
اور کرائے کی جو بچت ہوگی اس سے باقی رہ جانے والی رقم
ادا کر دے گا مگر اسے کہیں کوئی فلٹ دستیاب نہیں
ہوا۔ مجبوراً اسے ایک نئے بننے والے پروجیکٹ میں فلٹ
بک کرانا پڑا تھا۔ یہ زیادہ بڑا فلٹ نہیں تھا۔ محض چھ سو
اسکوائر فٹ پر دو بیڈ روم کا فلٹ تھا۔ جس میں دو باتھ روم
اور ایک چھوٹا سا کچن تھا لیکن ان کے لحاظ سے یہ کافی
تھا۔ البتہ فلٹ دوسرے فلور پر ملا تھا کیونکہ گراؤنڈ اور
فرسٹ فلور کے سارے فلٹ بک ہو چکے تھے۔

ابھی بات یہ تھی کہ فلٹ ویسٹ اوپن تھا اور خوب ہوا
آتی تھی۔ کل قیمت دو لاکھ تیس ہزار روپے تھی، اس میں اتنی
ہزار کا قرض بھی تھا۔ بلڈر کو ایک لاکھ چالیس ہزار روپے
پانچ سال میں ادا کرنے تھے۔ یعنی ہر سال اٹھائیس ہزار
روپے اور ہر مہینے تقریباً سوا دو سو روپے ادا کرنے تھے۔
ان کی کل بچت مشکل سے پندرہ سو روپے تھی جو اصل میں
کمپنی کی صورت میں جمع ہو جاتی تھی۔ یہاں تک پہنچ کر کہانی رک گئی تھی اور بچے کھاتا تھا۔

”باقی آئندہ۔“ میاں صاحب جب آخری الفاظ پر پہنچے تو
انہیں احساس ہوا کہ وہ کتنے انہماک سے کہانی پڑھ رہے
تھے۔ کہانی کا طرز بیان سادہ مگر پراثر تھا اور سب سے بڑھ
کر کہانی ان کے اپنے شعبے کے بارے میں لگ رہی تھی اس
لیے وہ روانی کے پڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے کاغذ پر
کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کچھ
پانی اور پینا اور پھر تنکپا لے ہوئے شاپرے سے برگر نکالا جو اگرچہ
... ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر مزے کا تھا۔ انہوں نے سوچا نہیں تھا
کہ عام سافٹیوں پر بیٹھیں روکے میں لٹنے والا یہ برگر
اتنے مزے کا بھی ہو سکتا ہے۔ اکثر وہ سڑکوں اپنے نچلے
درجے کے ملازموں کو برگر سے لُچ کرتے دیکھتے تھے اور
ترس کھاتے تھے کہ بے چارے سستے کے پکڑ چکا ہو
چیزوں سے پیٹ بھر رہے ہیں۔ برگر ختم کر کے انہوں نے
ایک ڈکاری اور دو بارہ بوتل منہ سے لگا کر تو ایک ہی سانس
میں نصف بوتل خالی کر دی۔

میاں صاحب خوش خوراک تھے۔ صبح ناشتے میں
تھے ہوئے دیسی انڈے، بھنی ہوئی کچلی اور دیسی مٹی میں بنے
پراٹھے ان کی خوراک تھے۔ دوپہر میں وہ ہلکا پھلکا لیتے

تھے۔ کبھی پیرا سنگوالیا اور کبھی کلب سینڈویچ لے لیے۔ البتہ
رات کا کھانا وہ ڈنٹ کر کھاتے تھے۔ عموماً مشن ہوتا اور اس
کے ساتھ چکن سے بنی کوئی ڈک کوئی ڈش ہوتی تھی۔ چپاتی کے
ساتھ انہیں سادہ چاول بھی مرغوب تھے۔ کئی سال سے سینے
میں جلن کے مریض تھے اس لیے رات سونے سے پہلے
دودھ سوڈا لیتے تھے۔ شام کی چائے میں میوے، رول،
بسکٹ اور اسی طرح کی اشیا لازمی ہوتی تھیں۔ دوپہر
میں کبھی بھوک کا زیادہ احساس ہوتا تو وہ ملک شیک بھی لیتے
تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ برگر ان کے لیے ایسا
ہی تھا جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اس سے صرف اتنا ہوا
کہ انہیں تسلی ہو گئی کہ ان کے پیٹ میں کچھ گیا ہے۔ البتہ
انہوں نے پانی زیادہ پی لیا تھا اور اس غلطی کا خمیازہ انہیں
جانتا پڑا تھا۔

انہوں نے کچھ دیر بعد کاغذ کے بچ جانے والے
حصے پر لکھا۔ ”ان چیزوں کے لیے شکریہ۔“ کہانی ابھی لگی
تھی مگر میں اس طرح کے نہیں رہ سکتا۔ خدا کے لیے مجھے
یہاں سے نکالو۔“

پھر انہوں نے تنکپا لے ہوئے بچے لکھا۔ ”میرا اتنے
کم میں گزارہ مشکل ہے۔ امید ہے کہ سب زیادہ پانی اور
کھانے کو لاؤ گے۔“

پھر کچھ سوچ کر بچے لکھا۔ ”سنو میں کہیں ایک لاکھ
روپے دوں گا اگر تم مجھے یہاں سے نکال دو۔ تم نے میرا
آئی فون لیا ہے اس کی مالیت پچاس ہزار ہے اور یہاں
روکے میں کڑی کی مالیت اتنی ہزار ہے۔ تم یہ بھی رکھ لو اور ایک
لاکھ سی لاکھ مجھے یہاں سے نکال دو۔“

انہوں نے کاغذ فوری باہر نہیں ڈالا تھا بلکہ انتظار
کرتے رہے جب تک کہ بعد چلی ایمرجنسی لائٹ کی روشنی
بالکل ہی جواب دے دی تو انہوں نے اسے کاغذ کے ساتھ
باہر ڈال دیا۔ اب انہوں نے وہی ایمرجنسی لائٹ جلا کر
اس طرح رکھی کہ اس کا رخ سوراخ کی طرف تھا۔ میاں
صاحب دیکھنا چاہتے تھے کہ آنے والا کس طرح چیزیں
لے کر جاتا ہے اور کس طرف سے آتا ہے مگر وہ اسے نہیں
دیکھ سکے۔ انہوں نے بجری کا ایک چھوٹا سا کرسی نما حصہ بنا
لیا تھا جس پر ان کی تشریف اور کمر کا کچھ حصہ لگا ہوا تھا اور
بائی کمرہ کھردری دیوار پر لگا کر بیٹھے تھے۔ گھنے بالوں کی
وجہ سے ان کا سر دیوار کے کھردرے پن سے محفوظ تھا۔ اس
آرام دے پوزیشن کی وجہ سے انہیں جانے کس وقت نیند
آگئی۔ خاصی دیر سونے کے بعد وہ بیدار ہوئے تو انہیں

صاحب واپس اپنی جگہ آ بیٹھے اور سوچتے سوچتے پھر کسی وقت سو گئے۔

اگلی بار جاگے تو ایک بار پھر ان کا گھا خشک ہو رہا تھا اور اس بار انہوں نے باقی ماندہ پانی پی لیا مگر اس سے پیاس صرف کچھ دیر کے لیے دبی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پیاس کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا تو انہوں نے سوراخ سے منہ لگا کر چلا کر پانی کے لیے فریاد کی۔ مگر کئی پکاروں کے بعد ان کے گھٹے کی خشکی میں اضافہ ہو گیا اور دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ واپس اپنی جگہ آ بیٹھے۔ انہیں یقیناً یہاں آئے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ نہ جانے کب سے یہاں تھے۔ ان کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔

پچیسے پچیسے ان کی پیاس بڑھ رہی تھی ان کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ انہیں شروع میں اس آدمی کو بڑی پیشکش کرنی چاہیے تھی۔ مگر وہ اسے راضی کر لیتی۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنی بہت ہی کم قیمت لگائی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اربوں کے مالک ہیں اور انہوں نے اپنی جان اور آزادی کی کتنی حقیر قیمت لگائی

مثانے میں دباؤ محسوس ہو رہا تھا اور ان کا گھا خشک تھا۔ جب سے انہیں ہوش آیا تھا یہ پہلا موقع تھا جب یہ مسئلہ ہوا اور انہیں یہ سوچ کر عجیب سا لگ رہا تھا کہ وہ اسی کمرے کو باجھ روم کے طور پر استعمال کریں گے جہاں وہ جانے کتنی دیر سے بند ہیں اور مزید کتنی دیر انہیں یہاں بند رہنا تھا۔ وہ خاصی دیر برداشت کرتے رہے مگر بالآخر معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہوا اور انہوں نے کمرے کے آخری کونے کو استعمال کیا۔

میاں صاحب نے شلواریں پرواسٹ پہن رکھی تھی، برسوں سے یہی ان کا لباس تھا۔ انہیں کسی قدر محسوس کا احساس ہوا تو انہوں نے واسٹ اتار دی تھی۔ انہوں نے روشنی میں سوراخ کے باہر ممکنہ حد تک دیکھا۔ تب انہیں ہکا چلا کہ سوراخ کے نیچے کوئی دو فٹ کی جگہ تھی۔ آنے والا اسی طرف سے آتا ہوگا۔ انہیں یہ خیال بھی آیا کہ انہیں اسی سوراخ سے لایا گیا ہوگا تو اس پر یہ سلاخیں فوراً تو نہیں لگائی جاسکتی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ سلاخیں سینٹ جبری کے بجائے کسی اور چیز سے پہلے فکس تھیں۔ انہوں نے ممکنہ حد تک قوت صرف کر کے انہیں ہلاک کی کوشش کی مگر وہ انہیں جنبش دینے میں قہقی ناکام رہے تھے۔ ایک بار کرمیاں

ہندو مہینے کے نئے آہنگ
نیل کے شہر کے دلچسپ رنگ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

انگاریے • سماج کی کوئی گویاں اور پھر جدت کی ترجمان ایک سنسنی خیز کہانی کا آغاز

دکھ سکھے شہر کے ماحول کی ایک دلانی اور نوحی دنیا کی جھلک... ہر ایک

کو اپنی تلاش کا مدار پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شہریت

مغربی دنیا کی تہذیبی اصول کی عکاس اور محبت کی پڑوہ قابل فراموش کہانیاں

سروزی کی کہانیاں

ایسٹ پیکی کے باوجود رشتوں کو نبھانا پڑتا ہے۔ غلام قادر

قلم سے احساسات و جذبات سے بھرپور کردار نگاری

سوچ اور فکر کی تبدیلیوں کے تناظر میں لکھی گئی تحریر کے

تائے بانی، سلیم فاروقی کے انداز بیان میں

بھٹی کہانی

دوسری کہانی



آپ کے تہرے...
مشوئے...
اور نئی دلچسپ باتیں...
کھائیں

تھی۔ اس سے زیادہ تو وہ مہینے میں صدقہ خیرات کر دیتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اسے بڑی پیشکش کریں گے۔ مگر یہ پیشکش کتنی ہونی چاہیے۔ پانچ لاکھ..... نہیں دس لاکھ، پھر انہیں یہ بھی کم لگے تو انہوں نے اسے دو گنا کرتے ہوئے بیس لاکھ کرنے کا سوچا۔

جیسے جیسے پیاس بڑھ رہی تھی اسی لحاظ سے وہ دل ہی دل میں قیمت بڑھا رہے تھے۔ جب وہ پچاس لاکھ تک پہنچے تھے تب انہیں سوراخ کے دوسری طرف آہٹ محسوس ہوئی اور سب سے پہلے پانی کی ایک بوتل اندر آئی۔ وہ اس طرف جھپٹے اور ٹھوکر کھا کر ٹر پڑے۔ ان کے دائیں گھٹنے پر اچھی خاصی چوٹ آئی۔ جب تک اٹھ کر ٹنگڑا تے ہوئے سوراخ تک پہنچے تو برگر کا شاہرہ اور ایمر جنسی لائٹ بھی اندر آ چکی تھی۔ یہ دونوں چیزیں سوراخ کی منڈیر پر ٹنگ گئیں البتہ پانی کی بوتل بڑی مٹی وہ نیچے گر گئی اور انہوں نے اسے اٹھاتے ہوئے جگت میں کہا۔ ”میری بات سنو ابھی مت جانا.....“ انہوں نے بوتل کھولتے ہوئے ایک گھونٹ لیا اور پھر چلا کر بولے۔ ”سنو میں اب پچاس لاکھ دوں گا، مجھے یہاں سے نکال دو..... تمہیں خدا کا واسطہ ہے..... میری بات سنو.....“

وہ سلاخوں سے چمٹ گئے تھے اور بڑھتی ہی کے ہاتھ میں تھی انہوں نے یہ احتیاط رکھی تھی کہ اس میں ایک قطرہ پانی نہ جھلکے پائے۔ وہ باہر دیکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر نیچے کی طرف لے گئے کسی سرسراہٹ ہوئی اور جب تک وہ نیچے دیکھتے کاغذ اندر آئے والا ہاتھ غائب ہو گیا تھا اور وہ اس کی بہت معمولی سی بھٹک دیکھ سکے تھے۔ میاں صاحب ایک بار پھر چلتے رہ گئے تھے مگر جانے والا جا چکا تھا۔ انہیں کچھ دور سے ہلکی سی آہٹ مل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں سے دور جا چکا تھا۔ میاں صاحب نے بوتل سے پہلا گھونٹ بے تالی سے لیا۔ انہیں انہوں نے پورے ہاتھ سے پانی ان کے خشک منہ کو تر کیے بغیر حلق سے اتر گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اب چومنے کے انداز میں بوتل سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے اور پھر اس کا ذمکن لگا کر واپس رکھ دیا۔

انہوں نے کاغذ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور پھر شاہرہ اور ایمر جنسی لائٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ آنے والی ایمر جنسی لائٹ پوری طرح چارچ تھی اور یہ خاصی چلنے والی

لائٹ تھی۔ ان کے پاس جو لائٹ تھی وہ اب تک کام کر رہی تھی مگر چاس کی لائٹ مدہم پڑ چکی تھی۔ شاہرہ میں پہلے کی طرح ایک ہی برگر تھا۔ اب تک پیاس نے پریشان کر رکھا تھا اس کی طرف سے سکون ملا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ شدید بھوکے تھے۔ انہیں پہلا برگر کھائے ہوئے شاید چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے پانی کی طرح برگر میں بھی احتیاط کی اور نصف کھا کر باقی نصف شاہرہ میں ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ سب سے آخر میں وہ کاغذ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اسے جب سے نکال کر انہوں نے ایمر جنسی لائٹ کی روشنی اس کی طرف کی اور پڑھنے لگے۔

”میاں صاحب! مجھے آپ کی فکر اور پریشانی کا احساس ہے۔ اسی وجہ سے آپ میری بات پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بار بار مجھے روئے میسے اور چیزوں کا لالچ دے رہے ہیں۔ حالانکہ میں اللہ کی قسم کھا کر آپ کو کہہ چکا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک روئے کا بھی لالچ نہیں ہے۔ نہ اب اور نہ بعد میں، میں آپ کو ٹھیک ٹھاک اور صحت مند رکھنے کی بھی پوری کوشش کروں گا۔ یعنی آپ کو اتنا پانی اور خوراک ملتی رہے جس سے آپ ٹھیک رہیں۔ شاید آپ کا اضافی وزن کھل جائے مگر میں آپ کو ٹھیک دیتا ہوں کہ یہ بھی آپ کے لیے ہی اچھا ہوگا۔ آپ نے جو اضافی پانی اور خوراک کی درخواست کی ہے مجھے کہتے ہوئے بہت حسرت کی سی لگ رہی ہے کہ فی الحال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کو ایک لیٹر پانی اور ایک برگر میں گزارہ کرنا ہوگا۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ آپ کو برگر کے بجائے کچھ اٹھایا کر سکوں۔“

”مجھے تسلیم ہے کہ آپ کو یوں اغوا کرنے اور یہاں لا کر قید کرنا بلا مقصد نہیں ہے۔ میرا مقصد وہ ہرگز نہیں ہے جو آپ کے ذہن میں آ رہا ہے۔ آپ نے لاکھوں کی پیشکش کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ ارب پتی ہیں۔ اگر میں اس سے دس گنا اور تاوان مانگوں تب بھی آپ دیں گے مگر یہ میرا مقصد نہیں ہے۔ اس کا یقین آپ کو بہر حال آجائے گا۔ جہاں تک یہاں سے آپ کی رہائی کا تعلق ہے تو میں کچھ کہوں گا آپ کو کچھ صبر سے کام لینا ہوگا۔ صرف صبر سے کام لے کر آپ یہاں سے نکل سکیں گے۔ آپ کو بے صبری کرنے، شور شرابے یا ہوش کھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہاں نقصان ہو سکتا ہے اس لیے حوصلہ رکھیں اور زندہ رہنے کی کوشش کریں، مجھ سے آپ کے لیے جو ہو سکتا ہے

نرم و ملائم Smooth شیوا
دے مجھے Confidence گھر ہو یا پھر کھیل کا میدان

My Secret to Win!



شیونگ کریم

میں ضرور کروں گا۔ میں نے یہ کہانی اسی لیے لکھی ہے کہ آپ اسے پڑھ کر اپنا کچھ وقت پاس کر سکیں۔ آپ کو اس کا پہلا حصہ اچھا لگا اس لیے دوسرا حصہ پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔

کہانی حصہ دوم۔ ”راشد اور سائرہ اگرچہ جانتے تھے کہ ان کی اتنی حیثیت نہیں ہے لیکن انہوں نے پھر بھی فلیٹ بک کرا لیا۔ انہیں جو الائنمنٹ فائل بنا کر دی گئی اس میں بے شمار شرائط تھیں۔ مگر فلیٹ بک کرانے والے پروجیکٹ منیجر نے نہایت شیریں لہجے میں انہیں بتایا کہ یہ قواعد و ضوابط و شرائط قطعی رسی کا دروازی ہیں اور وہ ان کے لیے دل و جان سے سب کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہوگی کہ انہیں وقت سے پہلے قبضہ مل جائے اور جہاں تک ادائیگی کا تعلق تھا انہیں پریشان ہونے کی یا نکل ضرورت نہ تھی۔ سمجھ لیں کہ ان کے پاس جو روپیہ تھا وہ کمپنی کے پاس ہی تھا وہ اپنی سہولت کے مطابق آرام سے ادائیگی کر سکتے تھے۔ اس پر راشد نے اس شق کی طرف توجہ دلائی کہ لیٹ پیمنٹ پر سر چارج لگے گا۔ تب بھی منیجر نے انہیں پوری تسلی دی مگر یہ کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ دونوں میاں بیوی بکنگ کے بعد خوش خوش واپس آئے۔ سب سے پہلے ہوا تھا کہ وہ ہزار روپے مہینہ دس گے اور سال میں ایک ہزار کی ایک قسط دیا کریں گے۔ یہ اگرچہ طے شدہ رقم سے کم تھی مگر منیجر نے انہیں اطمینان دلا یا تھا کہ وہ باقی رقم قبضے کے وقت دے سکتے ہیں۔ اس وقت انہیں لگا کہ فلیٹ بس ان کے لیے تیار ہے۔ سائرہ نے راشد سے کہا۔

”آپ کو سو سالہ انکریمنٹ ملے گا ہم اسے بھی جمع کرتے رہیں گے اور جب تک قبضے کا وقت آئے گا تب تک ہم بقایا رقم بھی جمع کر لیں گے۔“

راشد نے کچھ کہا نہیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جتنی تنخواہ بڑھتی تھی اس سے زیادہ مہنگائی میں امانت ہو جاتا تھا اور ان کی چادر پاؤں سیڑھوں کے باوجود دن بھر ان میں ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے میں یہ سوچنا خواب ہی ہوتا کہ وہ انکریمنٹ کی رقم سے فلیٹ کی آخری ادائیگی کر سکیں گے۔ راشد نے محسوس کیا کہ اسے ہی اس سلسلے میں کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی کا آٹھ سے شام پانچ بجے تک ہوتی تھی۔ دوسرے ملازم چار بجے اٹھ جاتے تھے اور افسران تو لچ کے بعد غائب ہو جاتے تھے مگر راشد ان چند ملازموں میں سے تھا جو اپنا وقت پورا کر کے اٹھتے تھے۔ بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے وہ چھ بجے تک گھر پہنچتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کہیں پارٹ

ٹائم کام کر لے تو اسے کچھ اضافی آمدنی ہو جائے اس سے وہ فلیٹ کی قسطیں اور دوسری ادائیگیاں آسانی سے کر سکے گا۔ اسے اضافی آمدنی کی ایک ہی صورت نظر آئی تھی پھر اس نے سائرہ سے مشورہ کیا تو وہ فکر مند ہو گئی۔ ”آپ پہلے ہی تجھے ہارے آتے ہیں۔“

”کیا کریں بچوں کے بھی خرچے ہیں اپنا دل مار سکتے ہیں بچوں کا نہیں۔“

”مگر ملازمت ملے گی کہاں؟“

”کوشش کرتا ہوں جانے والوں سے بات کرتا ہوں کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔“

راشد نے ملازمت تلاش کی اور سچ بچ اسے مل بھی گیا۔ ایک کامیٹک شاپ میں شام کے وقت سٹریٹس کی سرحدت تھی۔ سات سے رات دس بجے تک وہاں بہت رش ہوتا تھا۔ اس لیے ایک اضافی آدمی رکھا تھا۔ دکان کے مالک دونوں صاحبی راشد کو جانتے تھے اور ان کے کردار سے بھی واقف تھے اس لیے اسے رکھ لیا۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی صرف ہزار روپے لیکن یہ بھی قیمت تھی۔ پھر انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کے آنے سے سیل میں فرق آیا تو تنخواہ بڑھا دیں گے، ورنہ اسے اسی تنخواہ پر کام کرنا پڑے گا۔ ایک مہینے بعد انہوں نے تنخواہ پودہ سو روپے کر دی تھی۔ اس میں سے ایک ہزار کی انہوں نے مٹی ڈال لی اور باقی کھر کے خرچ میں شامل کرنے لگے۔ اس کے کچھ

احراجات میں آسانی ہوئی تھی۔ اس طرف سے اطمینان کے باوجود دونوں میاں بیوی فالتو کمزور حالت روک کر فلیٹ کے لیے ادائیگی کا بندوبست کرتے رہے۔ منیجر کے اطمینان دلانے کے باوجود انہیں فکر تھی کہ ادائیگی کمپنی کی دی ہوئی میعاد میں کر دی جائے تاکہ ان پر کوئی تھکاوٹ نہ پڑے۔ چار سال میں انہوں نے تقریباً پوری ادائیگی کر دی تھی۔ کچھ معمولی سی رقم رہ گئی تھی جو وہ قبضے کے وقت ادا کر دیتے۔ اس وقت تک اپارٹمنٹ کا اسٹریکچر تیار ہو گیا تھا اور لگ رہا تھا کہ سال بھر میں فلیٹ تیار ہو جائے گا۔ فلیٹ بک کرانے کے پانچویں سال ان کی بیٹی سائرہ جو صرف دس سال کی تھی اسے کچھ شش ہو گیا۔ اگرچہ راشد کو سرکاری علاج کی سہولت میسر تھی مگر سرکاری اسپتال میں جس طرح علاج ہوتا ہے وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ پھر بھی کیا کرتے راشد کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ کسی نجی اسپتال میں سائرہ کا علاج کراتا۔ وہ کئی دن اسپتال میں داخل رہی اور اسے ذرا بھی

فرق نہیں پڑا۔ مجبوراً راشد نے اسے ایک نئی میٹھے اسپتال میں داخل کرایا اور صرف داخل کرانے میں اس کی جمع ہوئی ختم ہو گئی۔ دفتر سے لون کی درخواست کی اور بڑی مشکل سے اسے لون ملا۔ ماٹروہ کا علاج شروع ہوا مگر جب تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ دودن اسپتال میں داخل رہ کر خالق حقیقی سے جا ملی۔ راشد اور سائرہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ہفتے میں ان کی ہنسی کھلتی ہوئی دینا سے جا چکی تھی۔

ابھی وہ اس صدمے سے بھی نہیں سننے تھے کہ کہنی کی طرف سے آخری ادائیگی کا نوٹس آ گیا۔ راشد کہنی کے دفتر پہنچا اور اس نے پوچھا کہ جب فلیٹ مکمل ہی نہیں ہوا ہے تو آخری ادائیگی کا نوٹس کس لیے اور تم بھی اس کے علاوہ کس جس کا اس سے معاہدہ ہوا تھا۔ تب اسے بتایا گیا کہ یہ رقم اصل میں یونٹوں کی مکمل شدہ رقم تھی اور اسے معاہدہ دکھایا گیا جس کے آخر میں باریک سا لکھا تھا کہ جب کہنی یونٹوں کی مکمل شدہ چارجز طلب کرے گی تو الاٹنی کو اس کی ادائیگی لازمی مقررہ مدت میں کرنی ہوگی۔ یہ صورت دیگر ایسے ہر صورت جرمانہ بھرتا پڑے گا۔ یہ جرمانہ ہزار روپے ماہانہ تھا۔ مکمل شدہ چارجز چھ مہینے ہزار روپے کے طور پر راشد مقررہ مدت میں اسے لکھا کہ وہ اتنی جلدی ادائیگی نہیں کر سکتا۔ اس نے نیچر کو اپنی بیٹی کی موت کا بتایا تو وہ متاثر ہوا تھا۔ اس نے راشد کو ٹیلی دی کہ وہ آرام سے ادائیگی کرے۔

راشد دھمکیاں کیوں نہ ہو وقت اسے بھر دیتا ہے۔ چھ مہینے اتنا ان کا بوجھ بھی ہلکا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ دفتر سے لیا ہوا لون مکمل کیا اور قرض ادا ہوا تو انہیں دوبارہ فلیٹ کی بقیہ رقم کی ادائیگی کی فکر ہوئی۔ تب سائرہ نے راشد سے کہا۔ ”ہمیں فلیٹ کو دیکھنا چاہیے اب تو پانچ سال چار مہینے ہو گئے ہیں اسے مکمل ہو جانا چاہیے۔“

وہ دونوں فلیٹ دیکھنے جانے لگے تو حیران رہ گئے۔ تقریباً ایک سال پہلے فلیٹ کی طرح اسٹریکچر کی صورت میں کھڑا تھا اب بھی وہی حالت تھی اور اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جی ہوئی مٹی، بند راجتے اوہ وہاں کی ویرانی بتا رہی تھی کہ گزشتہ ایک سال سے کچھ ہند ہے۔ وہاں موجود چوکیدار نے تصدیق کی کہ سائٹ پر ایک سال سے کام رکا ہوا ہے اور اندر کے راستے بھی ہلاک لگا کر بند کر دیے گئے ہیں تاکہ بے گھر اور جرائم پیشہ لوگ یہاں اپنا مسکن نہ بنالیں۔ چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ مہینے میں ایک بار مالکان اور کہنی والے آتے ہیں اور سائٹ کا معائنہ کر کے چلے جاتے ہیں مگر ابھی تک کام شروع ہونے کے

کوئی آثار نہیں ہیں۔“

یہاں تک پہنچ کر کہانی رک گئی اور نیچے لکھا تھا کہ اگر میاں صاحب کو یہ حصہ بھی پسند آیا تو وہ آگے کہانی لکھے گا۔ انہوں نے جو کہنا ہے وہ منٹے پر لکھ کر اسے باہر ڈال دیں۔ ساتھ ہی ڈسچارج ہو جانے والی امیر جنسی لائٹ اور پانی کی خالی ہو جانے والی بوتل بھی باہر ڈال دیں۔ انہوں نے کاغذ جیب میں رکھ لیا اور سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں لگا کہ جیسے راشد کی جو کہانی ہے اس کا تعلق ان سے بھی ہے۔ اگرچہ انہیں یقین نہیں تھا کہ سچ کچھ ایسا ہی ہے مگر کہانی جس انداز میں آگے جا رہی تھی اس سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ خاصے غور و خوض کے بعد انہوں نے مکمل سنہالی اور کاغذ نکالا۔ اس پر لکھنا آسان نہیں تھا۔ کہنی کوئی جگہ نہیں بنی تھی۔ انہوں نے پہلے ران پر رکھ کر لکھا تھا مگر ان کی نرم ران پر رائٹنگ بڑی مشکل سے آئی تھی اس لیے انہوں نے امیر جنسی لائٹ استعمال کی اور اس کے شیشے پر لکھنے لگے۔ اس سے انہیں آسانی ہوئی تھی۔

”اب مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔ دیکھو اگر تمہیں مجھ سے کوئی تکلیف ہوئی ہے تو میں دل سے معافی مانگتا ہوں۔ میں ہر طرح کی تلافی کے لیے بھی تیار ہوں۔ تم مجھ کو ایک موقع تو دو۔ میں اپنی ہر خطا مان لوں گا۔ جو تم جا ہو گے، میں ویسا ہی کروں گا مگر ایک بار مجھ سے بات نہ کرو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ تم مجھے ایک بوتل پانی اور ایک برگر دے رہے ہو اور شاید اسی میں مجھے چوبیس گھنٹے گزارنا پڑے گا۔ مگر مجھے تم سے اب کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں ایک بار مجھ سے بات کر لو۔ ہاں تمہاری کہانی اچھی اور اچھی ہے جیسے میں بھی اس کا ایک کردار ہوں اور شاید اسی وجہ سے میں یہاں بند ہوں۔ اگر تم مجھے کسی بھی خواہش کے عوض آزاد کر دو تب بھی میں اسے تمہارا احسان سمجھوں گا۔“

میاں صاحب نے پانی کی خالی بوتل اور امیر جنسی لائٹ جس کا چارج ختم ہو گیا تھا باہر ڈال دی اور اس کے ساتھ ہی کاغذ بھی تھا۔ اب انہیں ایک مسئلہ اور لاحق ہو گیا تھا۔ یہ بھی حاجت تھی مگر دوسری طرح کی اور اس کے نتیجے میں اس محدود جگہ جو سرائے بھٹی سٹی اس کے تصور سے ان کا دل بٹھنے لگا۔ وہ واش روم میں بھی جاتے تو پہلے آؤ فرینڈز اچھی طرح چھڑک لیتے تھے تاکہ مکندہ بد بو ان کی طرح نازک پرنا گوار نہ گزرے۔ جب معاملہ برداشت سے باہر ہونے

لگا تو انہوں نے لمبے سے بڑی تلاش کے بعد ایک نکڑی برآمد کی اور پھر اس کی مدد سے ایک کونے میں گڑھا کھودا۔ دل پر جبر کر کے وہ گڑھے میں فارغ ہوئے اور پھر جلدی سے اس پر مٹی ڈال کر اسے بند کر دیا۔ کچھ دیر کے لیے بدبو آئی لیکن پھر سکون ہو گیا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ مسئلہ بھی احسن انداز میں حل ہو گیا۔ اگرچہ اس بار بھی انہیں طہارت نہ ہونے کی وجہ سے الجھن ہوئی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ معاملہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔

برگر کا دوسرا حصہ انہوں نے اس وقت کھایا جب بھوک سے ان کے پیٹ میں کچھ ہونے لگا تھا، اسی طرح وہ پانی بھی بہت احتیاط سے استعمال کر رہے تھے جب پیاس برداشت سے باہر ہونے لگتی تو وہ چند گھونٹ لے لیتے تھے۔ انہوں نے برگر کھا کر اس کا شاہرہ پیمہ کا تو اس کی بو پر چوہے چلے آئے۔ میاں صاحب خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے چوہوں کو نکلنے کے کڑے مار کر بھاگایا۔ مگر یہ سوچ کر انہیں ہلکی سی آگئی کہ لڑکی نے انہیں یہاں سے نہ نکالا اور وہ یہیں مر گئے تو یہی چوہے ان کی لاش کھا کر اسے ڈھانچے میں بدل دیں گے۔

جب پانی کی بوتل اور دوسری ایمر جی لائٹ بھی ختم ہونے لگی تو انہیں اندازہ ہوا کہ مزید چوتیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور شاید وہ شخص آنے والا ہے۔ وہ بے تابی سے اس کے منتظر تھے۔ وہ یقیناً پہلے چلے سے آکر چیزیں اور کاغذ لے جائے گا۔ اس کے بعد وہ دوسری چیزیں اور پھر اپنا لکھا ہوا کاغذ لاتا ہوگا۔ وہ منتظر رہے اور پانی و روشنی دونوں ختم ہو گئے۔ بیڑی ختم ہو گئی۔ لائٹ بند ہو گئی اور اب وہ اندھیرے میں تھے۔ خوفزدہ ہو کر انہوں نے خود سے بلند آواز میں بات کرنا شروع کر دی۔ وہ خود کو تسلی دے رہے تھے کہ رہائی اب زیادہ دور نہیں ہے۔ انہوں نے جو بات کی ہے وہ اس شخص کے دل پر یقیناً اثر کرے گی۔ پھر پولیس بھی ان کی تلاش میں ہوگی وہ بھی یہاں تک آسکتی ہے۔ باتوں کے ساتھ وہ مسلسل بیڑوں کو بھی حرکت دے رہے تھے انہیں خوف تھا کہ کہیں چوہے نہ ان پر چڑھ آئیں۔ جب وہ ساکت اور خاموش ہوتے تو انہیں لگتا کہ آس پاس کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ پھر سوراخ سے روشنی جھلکنے لگی تو وہ اٹھ کر اس کی طرف لپکے اور گرے بغیر سوراخ تک پہنچ گئے۔

”خدا کے لیے۔“ انہوں نے چلا کر کہا۔ ”مجھے

یہاں سے نکالو، میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔“ مگر جواب میں پہلے پانی کی ایک بوتل اندر آئی، پھر برگر کا شاہرہ اور آخر میں ایمر جی لائٹ آئی، کاغذ اسی پر رہ بیٹھ سے لپٹا ہوا تھا۔ لائٹ روشن تھی۔ میاں صاحب نے ایک مردانہ ہاتھ دیکھا۔ یہ کمزور اور معمولی سا ہاتھ تھا جیسا کہ غریب غراب کا ہوتا ہے۔ صاف ستھرا تھا مگر گوشت سے عاری اور محنت کرنے والا ہاتھ تھا۔ وہ چلاتے رہ گئے اور وہ شخص چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میاں صاحب نے تقریباً روتے ہوئے ایمر جی لائٹ اٹھا کر اسے اینٹ پر رکھی اور پھر پانی کی بوتل اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ بھوک مٹی مکران کا برگر کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے انہوں نے اسے ایسے ہی کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اور رکھتے تو چوہے چلے آتے۔ انہوں نے ایمر جی لائٹ کے گرد لپٹا ہوا کاغذ اتار اور اس کا رہ بیٹھ بھی احتیاط سے رکھ لیا کہ کہیں کام آسکتا تھا۔ پھر انہوں نے رتھ پڑھنا شروع کیا۔

”میاں صاحب! مجھے خوشی ہے کہ آپ صورت حال کو سمجھ رہے ہیں اور شاید یہی مجبوری بھی سمجھ رہے ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی ذات کے لیے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اس لیے آپ کے سامنے آنا اور بات کرنا بیکار ہے۔ میرے لیے جب تک ممکن ہے میں آپ کے لیے کھانے پانی کی فراہمی جاری رکھوں گا۔ لیکن ہے مجھے بھی دیر سویر ہو جائے مگر آپ حوصلہ نہ ہاریے گا میں ضرور آؤں گا اور آپ کو یہ چیزیں ضرور ملیں گی۔ جہاں تک کہانی کی بات ہے اس کا آخری حصہ اس کاغذ میں موجود ہے پہلے آپ یہ پڑھ لیں اس کے بعد آپ جو سوال کہیں گے میں اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔“

اس سے آگے کہانی میں میاں صاحب نے اسے رکھ دیا۔ ابھی ان کا موڈ نہیں تھا کیونکہ اپنی بات کا جواب نہ پا کر موڈ پورا ہی خراب ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید کسی نفسیاتی مریض کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ٹھیک ہے اس شخص کے ساتھ زیادتی ہوئی ہوگی۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے مگر سب تو ایسا رد عمل نہیں دکھاتے۔ یہ بھی یقیناً پاگل ہو گیا ہے اور ان سے انتقام لینے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے برگر کھایا اور تھوڑا پانی پیا۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے ان کا خاصا وزن گھٹ گیا تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے جو کچھ ان کو

تھا مگر اب وہ جلد اسے شروع کرے گا اور فلیٹ ایک سال کے اندر مکمل کر کے الاٹمنٹ کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ ایک مہینے بعد راشد نے سائٹ کا چکر لگایا تو اسے کام بدستور دیکھا یہی نظر آیا۔ مزید دو مہینے بعد اس نے پھر چکر لگایا تو بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔

وہ اور سائرہ پھر کمپنی کے دفتر گئے تو وہاں تو منیجر ملا اور نہ ہی کمپنی کا مالک تھا۔ منیجر کے بارے میں پتا چلا کہ وہ نوکری چھوڑ کر جا چکا تھا۔ جب کہ مالک اپنا علاج کرانے کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ منیجر کا تقرر نہیں ہوا تھا اور باقی عملہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ جب جاتے انہیں اسی قسم کی کہانیاں سننے کو ملتیں۔ یہ مشکل ایک بار کمپنی کے مالک سے بات ہوئی تو اس نے پھر وہی وعدہ کرتے ہوئے جلد پروجیکٹ فٹش کرنے کی یقین دہانی کر دی مگر کام وہیں رکا رہا۔ سال گزرا اور پھر سالوں گزرے۔ وہ بھی کتنے چکر لگاتے، تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ راشد اپنی کمپنی میں لینا چاہتا تھا مگر جب اسے بتایا گیا کہ ادا کی ہوئی رقم کا تیس فیصد کاٹ کر باقی رقم تین قسطوں میں واپس کی جائے گی اور ہر قسط چھ مہینے بعد دی جائے گی تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ سائرہ نے بھی یہی کہا کہ اب انہیں فلیٹ ہی چاہیے، چاہے وہ دس سال بعد ملے یا بیس سال بعد۔

بچی کے بعد اب ایک ہی بیٹا عبدالواحد تھا جو ان کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اس نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا مگر اسے ایک عام سے سرکاری کالج میں داخلہ ملا تھا۔ بچے کی کالج میں داخل کرانے کی سکت نہیں تھی۔ راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ اس سرکاری کالج میں اس کا بیٹا کس صحبت میں رہے گا اور کتنا بگڑ جائے گا۔ واحد کے لال دانت تو پہلے ہی نظر آ رہے تھے۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ وہ سگریٹ پینے لگا تھا اور کالج کا بیشتر وقت کالج کے بجائے اس کے سامنے ایک بدنام ہوٹل میں گزارتا تھا۔ پڑھائی میں دلچسپی کا یہ حال تھا کہ پہلے ہی سال وہ سوائے ایک پرچے کے باقی تمام پرچوں میں ٹپل ہو گیا تھا۔ راشد نے اسے فوری کالج سے اٹھالیا۔ کیونکہ اس کالج میں جا کر وہ بگڑ گیا تھا۔ سائرہ نے اسے مشورہ دیا کہ اسے کسی نئی اور اچھے کالج میں داخل کرانے جہاں اسے اچھی صحبت مل سکے اور وہ تعلیم میں دلچسپی لے۔ راشد نے ایسا ہی کیا۔ مگر چھ اچھے نئی کالجوں کی میسین اچھے پرائیویٹ اسکولوں سے کم نہیں تھیں اور دیگر اخراجات بھی خاصے تھے مگر بیٹے کا مستقبل بنانے

اپنی تو نہ پر پھنستا ہوا لگتا تھا اب وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ان کے کپڑے مکمل طور پر مٹی سے لتھڑ گئے تھے اور جب وہ انہیں ہاتھ لگاتے تو کپڑے کی نرمی کے بجائے مٹی کا کھردرا پن محسوس ہوتا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں اور بال بھی مٹی میں اٹ گئے تھے۔ مگر اب ان کی توجہ اس طرف کم تھی۔ خاصی دیر بعد انہوں نے نہ جانتے ہوئے بھی کاغذ نکالا اور کہانی کا باقی حصہ پڑھنے لگے۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا ہوگا۔

”راشد اور سائرہ پروجیکٹ بنانے والی کمپنی کے دفتر گئے۔ انہوں نے منیجر سے بات کی کہ پروجیکٹ اب کیسے دیکھنا چاہیے اور اس میں مزید کوئی کام نہیں رہا ہے، جبکہ انہیں چار مہینے پہلے قبضہ دینا چاہیے تھا۔ اس پر منیجر نے رکھائی سے کہا۔ ”لوگوں نے رقم نہیں دی ہے اسی لیے پروجیکٹ پر کام رکا ہوا ہے۔“

راشد نے کہا ”لیکن ہم تو تقریباً ساری رقم دے چکے ہیں۔“

”آپ نے کنکشن جا بڑا ادا نہیں کیے ہیں۔“ منیجر نے یاد دلایا۔

”ان کا فلیٹ کی قیمت سے کیا تعلق ہے۔“ راشد نے کہا۔ ”آپ باقی رقم لیں اور مجھے بھی الاٹمنٹ دیں۔ جب قبضہ کا وقت آئے گا اور کنکشن لگیں گے تو میں اس کی رقم بھی دے دوں گا۔“

”ہمیں بجلی، پانی اور گیس کی کمپنیوں کو ابھی ادا کرنی ہے۔“

”معاف کیجئے گا میں نے معلوم کیا ہے یوٹیلیٹی کنکشن کا بلڈر کی قیمت سے تعلق نہیں ہوتا ہے اور جو قیمت بلڈر ملے کرتا ہے اسے لینے کے بعد وہ الاٹمنٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے۔“

”ہمارے پروجیکٹ مکمل ایسا نہیں ہے۔ مکمل ادا لگی کے بغیر کسی قسم کا الاٹمنٹ نہیں دیا جائے گا۔“ منیجر نے صاف انکار کیا۔ اس پر راشد اور سائرہ نے کمپنی کے مالک سے ملنے کو کہا تو ان کی ملاقات اس سے بھی کم ہو گئی اور اس نے راشد اور سائرہ کو یقین دلایا کہ پروجیکٹ مکمل ہوگا اور انہیں قبضہ دے دیا جائے گا۔ اس کے واجبات کی ادا لگی پر اصرار نہیں کیا اور انہیں یہ یقین بھی دلایا کہ ان پر کوئی جرمائدہ عائد نہیں کیا جائے گا۔ اس سے ملاقات کر کے وہ دونوں کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ اس نے یقین دلایا تھا کہ مالی مسائل کی وجہ سے کام رکا ہوا

کے لیے اس نے یہ کڑوا محسوس پینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں چھ مہینے کی فیس ایک ساتھ جاتی تھی اس نے کسی نہ کسی طرح پہلے سسٹر کی فیس ادا کر دی۔

انہیں فلیٹ بک کرائے دس سال ہونے کو آئے تھے اور دو سال سے وہ سائٹ پر بھی نہیں گیا تھا مگر اب اسے خیال آیا کہ جا کر دیکھے ہو سکتا ہے کہ فلیٹ ممل ہو گیا ہو اور وہ اسے حاصل کر کے وہ رقم بچا سکتا تھا جو ہر مہینے کرائے میں جا رہی تھی اور اب یہ انچھی خاصی ہو گئی تھی۔ اگر یہ بچ جاتی تو وہ بہ آسانی واحد کے تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتے تھے۔ راشد دفتر سے آتے ہوئے پروجیکٹ کی سائٹ پر پہنچا تو وہ حیران رہ گیا۔ پروجیکٹ نہ صرف مکمل ہو گیا تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا یہاں لوگ رہ رہے تھے۔ بالکونیوں پر گرلز تھیں اور پیشتر بالکونیوں میں کچھ نہ کچھ رکھا ہوا تھا۔ نیچے دکانیں بھی مکمل تھیں اور مین گیٹ پر گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے تصدیق کی اور بتایا کہ فلیٹ ایک سال پہلے آباد ہوئے تھے اور اب تو ستر فیصد فلیٹوں میں لوگ آچکے تھے یا انہوں نے کرائے پر دے دیے تھے۔ راشد خوش ہوا مگر ساتھ ہی فکر مندی بھی ہوا کہ انہیں کیوں علم نہیں ہوا۔ ڈیڑھ سال پہلے انہوں نے یہاں تھپل کیا تھا اور اس پتے کی تبدیلی کی اطلاع کہنی کو نہیں دیا تھا شاید اسی لیے وہ انہیں مطلع نہیں کر سکی۔ اس نے گھر آ کر سائٹ کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی اور اگلے ہی دن وہ دونوں کہنی کے دفتر گئے مگر جب انہوں نے اپنی فائل پیش کی اور نئے منیجر نے اس کا رڈ چیک کیا تو معذرت خواہ لہجے میں بولا۔

”آپ کی الاٹ منٹ منسوخ ہو چکی ہے۔“
”منسوخ ہو چکی ہے مگر کیوں؟“ وہ بے تاب ہو گئے تھے۔
”جب ہم پوری رقم ادا کر چکے تھے۔“

”آپ نے کلشن جلد پر قبضہ کر لیا ہے تھے اور آپ کو دو بار نوٹس جاری کیا گیا مگر آپ نے وصول نہیں کیا اور وہ واپس آ گیا۔ قواعد کے مطابق آپ کی الاٹ منٹ منسوخ کر دی گئی۔“

دفتر کے ریکارڈز میں دونوں خطوط بھی تھے جنہیں پھر پڑ کہنی کی طرف سے وصول نہ کرنے کی اسٹیبلشمنٹ کی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر منیجر سے اور پھر کہنی کے مالک سے لڑتے رہے مگر اس نے بتایا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تنگ آ کر راشد نے پوچھا۔ ”میں نے جو رقم دی تھی اس کا کیا ہوگا؟“

کہنی کے مالک نے اطمینان سے جواب

دیا۔ ”ابھی ہمارے پروجیکٹ میں کچھ فلیٹ سٹل ہونے سے رہ گئے ہیں جب ان کی سٹل بھی مکمل ہو جائے گی تب آپ کی رقم آپ کو نہیں فیصد کوٹنی کے بعد یک مشت واپس کر دی جائے گی۔“

سائٹ نے کہا کہ جو فلیٹ رہ گئے ہیں ان میں سے کوئی بے دیا جائے تو کہنی مالک نے بتایا کہ اب ان فلیٹوں کی قیمت بڑھ کر ساڑھے سات لاکھ ہو گئی ہے اور وہ بھی یک مشت ادا کرنے ہوں گے۔ سائٹ سے سات لاکھ ان کی اوقات سے بہت زیادہ تھے۔ انہوں نے ایک لاکھ چالیس ہزار ادا کیے تھے اور اب اسے ایک لاکھ بارہ ہزار واپس ملنے جب کہ دیکھا جائے تو روپے کی قیمت آدھی رہ گئی تھی۔ لیکن یہ رقم مل جاتی تو وہ انٹر ہونے تک اسے بیٹے کے تعلیمی اخراجات سے بے نیاز ہو جاتے۔ ان کے بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ راشد نے کہنی کے مالک کو اپنی مجبوری بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ ان کے بقایا جات ابھی ادا کر دے مگر مالک نے معذرت کر لی اور ساتھ ہی اسے تسلی دی کہ فلیٹ بہت تیزی سے سٹل ہو رہے ہیں اس لیے وہ جلد ان کی رقم ادا کر سکے گا۔ انہیں اس کچھ عرصے انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ مہر کر کے واپس آئے۔ انکی واحد کی اگلی فیس دینے میں چند مہینے باقی تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان چند مہینوں میں انہیں رقم واپس مل جائے گی۔ دیکھا جائے تو قصور ان کا بھی تھا جو انہوں نے کہنی کو پتے کی تبدیلی سے آگاہ نہیں کیا اور یوں فلیٹ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب ان کی رقم واپسی میں بھی بلڈر آنا کافی کر رہا تھا۔

ایک مہینے بعد راشد نے چکر لگایا تو اسے بتایا گیا کہ اب بھی سارے فلیٹ سٹل نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے کچھ عرصے اور انتظار کرنا ہوگا۔ دوسرے مہینے وہ پھر مالک سے ملا اور اس نے راشد کو پھر وہی دلا سادیا کہ وہ حوصلے اور مہر سے کام لے لے اس کی رقم جلد اسے مل جائے گی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے حالات کا رونا بھی رویا کہ اگر اس کی جیب اجازت دیتی تو وہ دے دیتا۔ اس پروجیکٹ نے اسے برباد کر دیا تھا۔ ایک مہینے بعد جب راشد کے اگلے سسٹر کی فیس جمع کرانے کا مرحلہ آیا تو وہ پھر گیا۔ اس بار بھی اسے شہلا دیا گیا۔ اس نے کالج سے مہلت حاصل کی اور یہ مہلت بھی گزر گئی اسے رقم نہیں ملی۔ اب وہ جاتا تو اسے منیجر سے بھی ملنے کا موقع نہیں ملتا

تھا اور کمپنی کے مالک کے ہارے میں اسے پتا چلتا کہ وہ ان دنوں دفتر نہیں آ رہا ہے۔

فیس جمع نہ کرانے پر کالج نے واحد کا داخلہ منسوخ کر دیا اور وہ جو ایک بار پھر پڑھائی اور بہتری کی طرف مائل تھا، مایوس ہو گیا۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتا اس نے پھر باہر جانا شروع کر دیا اور کچھ عرصے بعد اس نے پھر ان ہی آوارہ گرد دوستوں کو اپنا لیا جن سے چچا چھڑانے کے لیے اسے کالج میں داخل کرایا گیا تھا۔ جب ماں باپ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ الٹا ان سے جھگڑتا کہ وہ کیا کرے۔

تھک آ کر راشد نے اسے کام پر لگانا چاہا مگر اس نے بھی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں کام پر لگتا چند ہفتے کام کرتا اور پھر کسی بہانے گھر بیٹھ جاتا۔ آوارہ گردی بڑھی تو وہ غلط کاموں میں پڑ گیا۔ نشر کرنے لگا اور جب اسے گھر سے رقم ملنا بند ہوئی تو اس نے چوریاں شروع کر دیں۔ راشد کو اس کے کرتوتوں کا پتا چلتا تو اس نے واحد کو گھر سے نکال دیا۔ گھر سائرہ اور راشد پر اس کی بربادی کا گہرا اثر ہوا تھا۔ سائرہ بیمار رہنے لگی اور پھر اچانک ہارٹ ایکٹ کا شکار ہو کر دنیا سے گزر گئی۔ آج راشد اکیلا ایک سوکھ دنیا میں اس کا واحد سہارا خود ہے سہارا ہو کر کہیں لالہ لعل کی حالت میں پڑا ہے اور ہو سکتا ہے اس دنیا سے ہی لڑ جائے۔ بے شمار پتھر لگانے کے بعد بھی اسے رقم نہیں ملی اور گھر سے رقم کی ضرورت ہی نہ رہی۔

یہ کہانیاں صاحب نے کہانی ختم کر کے گہری سانس لی۔ یہ کہانی ان کے لیے اجنبی نہیں تھی وہ خود بارہا ان مراحل سے گزر چکے تھے۔ جب انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا تو کامیابی کا ایک خاص گودور یافت کیا۔ یعنی وہ پروجیکٹ اچھے بناتے تھے۔ مگر ان پروجیکٹ تاخیر کا شکار کرتے تھے۔ لوگوں سے ملنے کے پروجیکٹ مکمل کر لیتے اور اسٹرکچر بنا کر پھر کام روک دیتے اور اس بہانے کو پیش کرتے کہ لوگوں سے پوری رقم نکلوائیں۔ جن سے پوری رقم مل جاتی بعد میں وہ ان کو الٹ منٹ دیتے تھے مگر جو ادائیگی میں دیر کرتے، ان سے کچھ نہیں کہتے تھے اور جب مارکیٹ چڑھتی اور وہ پروجیکٹ تیزی سے مکمل کرتے تھے ان لوگوں کی الٹ منٹ منسوخ کر دیتے جو ادائیگی بروقت نہیں کر پاتے تھے اس طرح تقریباً ستر فیصد پروجیکٹ دوبارہ ان کے قبضے میں آ جاتا۔ وہ کئی گنا داموں پر فلیٹ سیل کرتے اور لوگوں کی رقم تاخیر سے خاصی کاٹ کر ادا کرتے تھے۔

ویثریات

”ویٹر! دو کھنٹے ہو گئے ہیں، آخر کھانا کب تکے گا؟“

”سر! بس باورچی لکڑیاں لینے گیا ہے، آجائے تو فوراً تازہ کھانا پکا کر پیش کر دیا جائے گا۔“

”ویٹر! بل لاؤ۔“

”سر! آپ ملا کر یا علیحدہ دیں گے؟“

”ویٹر! کھانا کھانے کے بعد مجھے چکر کیوں آ رہے ہیں؟“

”بھئی ہو سکتا ہے سر، بل تو ابھی میں نہیں لایا۔“

”سر!۔ البیلی، کراچی“

ایک آدمی زور زور سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اندر سے آواز آئی۔ ”کیا تم بھائی شدہ ہو؟“

آدمی نے کہا۔ ”ہاں میں شادی شدہ ہوں۔“

آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے تم نے پہلے ہی بہت سزا دی ہے تم اندر آ جاؤ۔“

اتنے میں ایک دوسرا آدمی بھاگتا ہوا آیا اور دروازہ زور سے کھٹکھٹا۔ ”کیا تم شادی شدہ ہو؟“

آدمی بولا۔ ”ہاں میں نے دو شادیاں کی تھیں۔“

اندر سے آواز آئی۔ ”تم جا سکتے ہو کیونکہ یہ جنت ہے پاگل خانہ نہیں۔“

سر!۔ ناصر علی صدیقی عباسیہ ٹاؤن رحیم یار خان۔

اپنی بات کر چکے ہو اس لیے اب کاغذ پھسل کی ضرورت نہیں ہے۔ میری پھسل کا سکہ گھس گیا ہے میں بھی دوبارہ نہیں لکھ سکوں گا۔“

میاں صاحب نے کاغذ بند ہو جانے والی ایمرجنسی لائٹ پر برہینڈ سے لپیٹ کر اسے اور خالی بوتل کو سوراخ کے باہر ڈال دیا تھا۔ اب وہ تن بہ تقدیر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے روشنی بھی بند کر دی تھی۔ اب انہیں تاریکی سے خوف نہیں آرہا تھا، وہ خود کو ذہنی طور پر آمادہ کر چکے تھے کہ اس جگہ سے ٹھکانا انہیں بھی نصیب نہیں ہوگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئے اور جب ان کی آنکھ کھلی تو سوراخ کی مندر پر پانی کی بوتل، تازہ چارج کی ہوئی ایمرجنسی لائٹ اور برقرار کا شہر موجود تھا۔ انہوں نے پہلے اطمینان سے کھایا پیا اور پھر کاغذ نکھول کر دیکھا اور پڑھنے لگے۔ اس نے لکھا تھا۔

”میاں صاحب آپ بھر غلط سمجھ رہے ہیں، میں پھر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں آپ کو یہاں ہمیشہ کے لیے قید نہیں رہنا چاہتا لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ آپ کی رہائی میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاں میں آپ کو یہ یقین ضرور دلاتا ہوں کہ آپ آزاد ہوں گے۔ آج نہیں تو کل یا آنے والے کسی دن بھی آپ یہاں سے نکل کر اپنے گھر جا سکیں گے۔ اس کے لیے آپ کو بھرپور قفل سے کام لینا ہوگا۔ اگر آپ خود کو نقصان نہ پہنچائیں تو یہاں زندہ اور سلامت رہیں گے۔ جہاں تک کہانی کی بات ہے لوگوں نے بڑے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے اور آپ کی کچھ وقت کراہی کا سامان بھی کیا ہے۔ مگر اب آپ کو اپنا وقت خود کاٹنا ہوگا اور انتظار کرنا ہوگا۔ جیسے بہت سے لوگوں نے بہت سا انتظار کیا تھا۔ آپ نے ٹھیک کہا آپ کو اب جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے جس جب آؤں گا تو آپ نے جو کہنا ہو زبانی بھی کہہ سکتے ہیں“

میاں صاحب نے کاغذ توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور زیر لب بولے۔ ”جموٹ بولتا ہے کیا مجھ جیسے جموٹے کو جموٹ کی پہچان بھی نہیں ہے؟“

☆☆☆

یہ بہت بڑا پروجیکٹ تھا، اس سنگمل نادر پر مشتمل پروجیکٹ میں نیچے دو فلور پر مشتمل شاپنگ مال تھا جو گراؤنڈ اور پانچواں فلور پر تھا۔ اس سے اوپر دو فلور کی پارکنگ تھی اور پھر دس فلور گھڑی ایپارٹمنٹس کے لیے مخصوص تھے۔ عمارت عرصے سے تقریباً مکمل حالت میں کھڑی تھی مگر

اسی وجہ سے وہ آغاز میں قیمت بھی زیادہ نہیں رکھتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ بنگلہ کرا لیں اور جب وہ پروجیکٹ میں تاخیر کرتے تو اس کی قیمت خود بہ خود مزید گر جاتی اور وہ اس کا اور بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ گری ہوئی قیمت اور تکمیل میں تاخیر سے بہت سے لوگ فلیٹ منسوخ کرا دیتے تھے اور وہ ان کی رقمیں کاٹ کر قسطوں میں دیتے تھے۔ اپنے پیسوں کے لیے آنے والوں سے ایسے وعدے کرتے جو عام طور سے پورے نہیں ہوتے تھے۔ شاید ان کے وعدوں کا کوئی شکار اس حد پر آ گیا تھا، اس نے انہیں اس جگہ قید کر دیا اور اب ان سے وہی مکمل مکمل رہا تھا جو وہ اس کے ساتھ مکمل چکے تھے۔ یہ سوچ کر ہی ان کا دل بیٹھنے لگا کہ کہانی والا راشد ہی اصل میں انہیں یہاں قید کرنے والا ہے۔ اس کا تو گھر ہی اجڑ گیا اور وہ اس کا ذمہ دار انہیں سمجھ رہا تھا۔ اس صورت میں وہ انہیں کبھی یہاں سے آزاد نہیں کرے گا۔

پیٹ میں ہونے والی اشتعلیت وہ رہ کر انہیں یاد دلا رہی تھی کہ وہ جموٹ کے تھے انہوں نے برگر کال کر کھایا۔ بے دلی کے باوجود وہ پورا برگر کھا گئے۔ وہ سوچتے رہے اور پھر انہوں نے کاغذ کے ٹکڑے جانے والے جیسے پر لکھنا شروع کیا۔ اب پھسل کا سکہ بھی آخری حد تک صحت مند تھا اور اس سے لکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی مگر انہوں نے کسی نہ کسی طرح تحریر مکمل کر لی۔ انہوں نے لکھا۔

”میں نے تمہاری کہانی پڑھی اور اب میں سمجھ گیا ہوں۔ راشد تم ہی ہو اور تم نے میرے پروجیکٹ میں فلیٹ بنگلہ لے لیا تھا۔ مجھے تم یاد نہیں ہو لیکن پروجیکٹ میں جانتا ہوں۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا جیسا تم نے لکھا ہے۔ میں نے قفل کی دس سال میں جا کر اسے فٹس کیا تھا اور اس وقت تک اس کی ویلیو کئی گنا بڑھ گئی تھی، اس لیے میں نے اسے بہت اچھی قیمت پر بیچا تھا۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی اور تمہارا ایسا نقصان ہوا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی لیکن تم میرے ساتھ جو کر رہے ہو اس کا بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے جذبہ انتقام کی تسکین ہو جائے۔ تم مجھے اسی طرح پھانسی قید رکھو گے، چوبیس گھنٹے میں ایک بوتل پانی اور ایک برگر دے دو گے تاکہ میں مروں نہیں، زندہ رہوں اور اذیت سے گزرتا رہوں۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے جموٹے وعدے کر رہے ہو جیسے وعدے میں نے بھی تم سے کیے تھے۔ نہ میں اپنے وعدے پورے کر سکا اور نہ تم کرو گے۔ تم

بلڈرز اور متعلقہ سرکاری حکام کے مخصوص مسائل کی وجہ سے اب تک اس کے الائیو کو قبضہ نہیں دیا گیا تھا۔ میزبان فلور کے اندر کا کچھ حصہ ابھی نامکمل تھا اور وہاں کام ہوتا تھا مگر باقی ساری بلڈنگ مکمل ہو گئی تھی۔ صبح کا وقت تھا کچھ دیر میں دو گاڑیاں وہاں آکر رکیں اور ان سے اس پروجیکٹ کا مالک اور دوسرے افراد اترے۔ انہیں دیکھ کر مین گیٹ پر موجود چوکیدار دوڑا آیا۔ اس نے سلام کیا اور پروجیکٹ منیجر نے اس سے کہا۔

”کیا حال ہیں بابا..... آج سے پروجیکٹ پر کام شروع ہو گیا۔ کچھ دیر میں مزدور اور سامان آنے والا ہے۔“ چوکیدار خوش ہو گیا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے سرکار۔“ ”کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“ مالک نے پوچھا۔ ”نہیں سرکار مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ ہوتا تو آپ کو فوراً فون نہ کرتا۔“

منیجر کے ساتھ آنے والا سائٹ سپروائزر چوکیدار کے ساتھ پروجیکٹ کے مکمل ہونے پر آیا، اس نے اینٹوں سے بند ہونے والی جگہوں کے بارے میں کہا۔ ”ان سب کو آج ہی مکمل ہونا ہے۔ صبح سویرے پروجیکٹ کا افتتاح ہے، اس وقت تک سب فنش ہو جائے گا۔“ ”کیوں نہیں جی۔“ چوکیدار بولا۔ ”میری ضرورت ہے تو میں ادھر بیٹھ جاتا ہوں اور نذر وازے پر جاتا ہوں۔“ ”ہاں تم دروازے پر جاؤ اور جب بندے آئیں تو ان کو یہاں بھیج دینا۔“

چوکیدار جو سفید بالوں اور ڈائریکٹر والا بوڑھا آدمی تھا، وہ گیٹ کے ساتھ بنی اپنی چوکی میں آیا۔ وہاں اس کا سامان بھی تھا۔ وہ جگہ چیل گھنٹے وہیں رہتا تھا۔ اس نے اپنا تھیلہ اٹھایا اور اس کے ساتھ وہاں رکھی دو اینٹر جنسی لائٹیں اٹھائیں اور وہاں سے نکل گیا۔ اس کا رخ سڑک کی طرف تھا اس کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ آدھے گھنٹے بعد مزدور اور دوسرے لوگ آئے۔ سپروائزر نے انہیں سب سے پہلے بند جگہیں کھولنے کا حکم دیا اور خالی جگہوں پر لگائی ہوئی لائٹیں نکالی جانے لگیں۔ لگاتار دو دوسرے لوگ اس وقت اپارٹمنٹس کا جائزہ لینے لگے گئے ہوئے تھے۔ دو گھنٹے بعد جب مزدور اندر کی دیواریں توڑ رہے تھے تو انہیں ایک دیوار میں موجود سوراخ پر سر یا لگا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسے توڑ رہے تھے کہ دوسری طرف ایک برہنہ آدمی دکھائی دیا جب انہوں نے وہاں روشنی ڈالی تو وہ چیختے چلاتے لگا تھا۔

وہ روشنی سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا اور چلا رہا تھا مگر اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بالکل وحشی ہو رہا تھا۔ یہ حیرت انگیز انکشاف تھا کہ پروجیکٹ کے اندرونی حصے میں ایک آدمی قید تھا، اس کی اطلاع فوری مالک کو دی گئی۔ وہ بھاگا ہوا آیا۔ اس دوران میں اس آدمی کو باہر نکال لیا گیا تھا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ کوئی اس کی طرف جاتا تو وہ اچھل پڑتا تھا اور... یہ مشکل اسے پہنچ کر باہر نکالا گیا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا اور وہاں شدید بدبو بھی کیونکہ وہ جانے کب سے وہاں قید تھا اور پورا کمر آلائش سے بھرا ہوا تھا۔ مالک نے چوکیدار کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا کیونکہ وہی یہاں کا درے دار تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ غائب تھا۔ یہاں آنے کے لیے راستہ تھا جو دو دیواریں توڑ کر بنایا گیا تھا اور یہ حصہ بالکل اندر کا تھا اس لیے اگر قید آدمی چوچتا تب بھی اس کی آواز نہ سنیں جاسکتی تھی۔

معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہاں قید شخص اصل میں معروف بلڈر میاں عبدالغفور تھا جو سات مہینے پہلے غائب ہوا تھا اور اس کے بارے میں شبہ تھا کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کر لیا گیا ہے۔ کسی نے اس کے گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا۔ کئی مہینے گزرنے کے بعد اس کے گھر والے اس کی زندگی کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔ دو دن بعد ایک معروف نجی اسپتال میں میاں صاحب نے پہلی بار ہوش و حواس میں پولیس کو اپنا جان بچا دیا اور انہوں نے یہ کہا کہ وہ بالکل نہیں جانتے کہ انہیں کس نے وہاں قید کیا تھا اور وہ کیا چاہتا تھا۔ پولیس نے چوکیدار کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس پتے پر نہیں ملا جو اس نے یہاں ملازمت کرتے وقت لکھوایا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ ایکسپائر ہو چکا تھا اور اس نے دوبارہ شناختی کارڈ بھی نہیں بنوایا تھا۔ میاں صاحب کو ذہنی اور جسمانی طور پر ٹھیک ہونے میں تقریباً ایک مہینہ لگا تھا اور وہ ایک مہینے بعد پہلی بار دفتر آئے تو ملازمین نے ان کا استقبال کیا تھا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی انہوں نے اپنے بیٹوں اور کمپنی کے اہم افسران کو میٹنگ میں طلب کر لیا اور ان سے کہا۔

”جاری پروجیکٹس پر پوری طرح کام شروع کر دیا جائے۔ ہمیں بہر صورت الائیو کو مقررہ وقت پر قبضہ دینا ہے۔“

سودائے جنوں

چھٹا حصہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امت مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروف عمل ہیں۔ اس رپ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور پر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چہرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے بیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور نا اہل سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی جنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی بولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت و پاں گلی گلی دیواڑوں پر دستک دہتی گھوم رہی ہے... آج بھی کچھ پاگل لوگ مصریوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بارے کا انجام...

اجلی رنگت اور کردہ چہروں والی شیطانی قوتوں کا بربریت کا لرزہ خیز منظر





زندہ سلامت نکل جائیں اور یہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔“ عابد نے نظریں سیکڑ کر غور کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ حالات کی گتھی اور یقینی موت سے بچنے کے لیے وہ دشمن کے ساتھ مفاہمت پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ محاورنا نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار تھے، ممکن تھا کہ بعد میں غنیم کی صورت دھوکا دی بھی کی جاسکتی تھی، لیکن اس وقت اہم سوال اپنی اپنی زندگی بچانے کا تھا۔

”یہ موت کتنی بھیاںک ہوگی۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جلدی بولو۔“

اسے سوچتا یا کر کوچ جن نے دوبارہ عابد کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔ ”مجھے منظور ہے، لیکن دھوکے کی صورت میں تمہیں۔۔۔ بھی نہیں بخشوں گا۔“ عابد نے کہا۔

”میں ایسی بھیاںک موت نہیں مرنا چاہتا اور اس وقت مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔ اسے بچانے کی خاطر میں اپنے جانی دشمن سے بھی سمجھوتا کرنے کو تیار ہوں۔ کیا اب مجھے اپنا کام شروع کر دینا چاہیے؟“

اس نے آخر میں استفسار یہ کہا تو عابد بر ماتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”شروع کر سکتے ہو، بشرطیکہ اس میں دھوکا نہ ہو۔“

کوچ جن نے اس سے اس قدر مزید تمہید دینے کی ضرورت نہ سمجھی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”لو، سب سے پہلے یہ پکنا لوٹا کر، مزہر ملی گیس سے بچے رہیں۔“ اس نے باری باری ان کی طرف دیکھ کر

ہلکے اچھالے، جسے بچ کر کے عابد اور ناعمہ نے اپنے

چہروں پہ چڑھالے۔ عابد، کوچ جن کی طرف سے ایک نئے

کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اسے بہ دستور اپنی نظروں

میں لیے ہوئے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایسے فیصلہ کن اور سنگین

لمحات تھے، جہاں ایک ہل کی بھی غفلت، ہل کے ہل انہیں

قعر قعر میں دھکیل دے گا۔

سب سے آخر میں کوچ جن نے ماسک پہنا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک دیوار گیر آئرن کیبنٹ کھولی۔ عابد چند قدم اس کے پاس سرک آیا تا کہ اس کی حرکات و سکنات کا پوری تسلی کے ساتھ جائزہ لے سکے۔ وہ کیبنٹ دراصل ایک

خندیل تھا۔ وہاں کچھ سوچ، ہٹن اور چھوٹے چھوٹے لیور نصب تھے۔ کوچ جن چند لمحوں کے ساتھ کھینچا رہا، پھر اس کی طرف مڑا اور بولا۔

”میں نے کبلی سے چلنے والی ایک کشتی کا سسٹم آن کر دیا ہے مگر ایک قباحت ہے۔“

وینچن آفیسر کوچ جن کو شاید صد سے نئے پاگلوں کی طرح خود کلامیہ انداز میں بڑبڑانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ایک عام آدمی سے زیادہ اسے آبدوز کی متوقع تباہی کا اندازہ تھا۔ مگر عابد کے بشرے پر بھی اس کی متوحش بڑبڑاہٹ سن کر تشویش کے گہرے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ silos کے جمبر سے بہ دستور نارنجی دھواں خارج ہو رہا تھا اور سب کی دہشت زدہ سی نظریں اس فرش بوس آدمی پر مرکوز تھیں جس کے منہ سے نیلے رنگ کا جھاگ خارج ہو رہا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑے فرش پر گرا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ باقی لوگ بدحواس ہو کر بھاگنے لگے جبکہ عابد نے دیکھا کہ کوچ جن اور اس کا ساتھی والٹ کے ایک کونے کی طرف لپکے تھے۔

عابد نے ناعمہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عابد کا اندازہ تھا کہ اس نازک اور دشمن تر صورت حال میں فقط کوچ جن ہی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جو اسے تحفظ دے سکے۔

اس کی عقابانی نظروں نے دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے جس جمبر میں مجھے تھے اس کی

پیشانی پہ ”ایمر جنسی انٹریٹ لاجسٹک سل“ درج تھا اور اس کے دروازے سے قدرے مسرعب کر ہی اندر داخل ہوا

جاسکتا تھا، لہذا جیسے ہی کوچ جن کو اس نے اپنے افسر کے عقب میں اندر داخل ہوا تو اس نے جلدی سے اپنے عقب

میں جمبر کا دروازہ بند کرنے کی کوشش چاہی مگر جب عابد بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک لات بند ہوتے

دروازے کو رسید کر ڈالی۔ دروازہ اس آدمی کے منہ پر

”بجایا“ اس کے مطلق سے ”اوغ“ کی آواز برآمد ہوئی

تھی۔ عابد اسے مزید دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا، ناعمہ اس کے عقب میں تھی۔ کوچ جن کے مضروب ساتھی کو عابد نے مزید

سنہیلنے کا موقع دیا۔ جب اپنی ہوی کن کا کندا اس کی پیشانی پر رسید کر دیا، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ عابد نے دیکھا، سامنے

فولادی ہینکروں سے ”کیپٹین گیس ماسک“ جھول رہے تھے۔ یہ مخصوص قسم کے تھوڑا سا ماسک تھے جس کے

”تھوڑے“ پر گول فلٹر لگا ہوا تھا۔ یہ ماسک کسی قسم کی زہر ملی گیس کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے پہنے جاتے

تھے۔ کوچ جن نے رک کر خوف زدہ سی نظروں سے عابد کی طرف دیکھا اور اسی لہجے میں اس سے بولا۔

”وو۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ م۔۔۔۔۔ مجھے مارنے سے تم بھی نقصان میں رہو گے۔ اس آبدوز کو تباہ ہونے سے اب کوئی نہیں بچا سکتا، بہتر یہی ہے کہ اس کے تباہ ہونے سے پہلے ہم

چاہتا تھا لیکن اس کی حالت کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے اور ایک کمانڈر کی حیثیت سے لیلیٰ نے اسے اپنے ہمراہ مشن میں ساتھ لے جانے سے یکسر منع کر دیا۔ ناچار محسن کو اپنی لیڈر کے حکم پر سر جھکا کر پڑا۔ اگرا ب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ محسن اور بازندہ کو بیت صفانہ کے ٹھکانے تک کون لے کر جاتا؟ بالآخر قرعہ قائل لیلیٰ کے نام نکلا۔ اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اس پر محسن نے اعتراض کرتے ہوئے لیلیٰ سے کہا۔

”عزیزی لیلیٰ! یہ مناسب نہ ہوگا کہ محض میری وجہ سے آپ کے اس اہم مشن کا ایک کمانڈر کم پڑ جائے۔ آپ لیڈر کی وجہ سے ہمارے سر پر نکلنا ہوا فوری خطرہ مل چکا۔ پھر ہوگا کہ میں اور بازندہ خود ہی بیت صفانہ کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔“ لیلیٰ نے اس سے اختلاف کیا اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگی۔

”نہیں عزیز! آپ ہمارے وطن اور اس گروپ کا سرمایہ ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو صحت کا ملہ عطا فرمائے بعد صحت یابی کے آپ اس سے زیادہ اہم مشن میں ہمارے کام آسکتے ہیں، اسی لیے میں آپ کا یہ خیر و سلامت بیت صفانہ پہنچنا زیادہ مناسب ہوگا۔“

اس کے بعد محسن اور بازندہ کو حوالہ بیت زاوراہ دے کر ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ لیلیٰ کے ہمراہ بیت صفانہ کی جانب رخصت کر دیا اور خود اب یہ چار مجاہدوں کا نوہم مشن لیلیٰ کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیت صفانہ کی رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو رہی تھی اس وقت یہ چاروں حیوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور اب ان کے یہاں پہنچ کر پہلے سے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہی سب تھا کہ یہ چاروں ایک مقام پر رکے اور کاغذی نقشہ کھول کر بٹھ گئے۔ لیلیٰ اور باقر نقشے پر جھکے ہوئے تھے جبکہ علی اور سلمان اور عبداللہ ان کے قریب دائیں بائیں کھڑے چوکس نظروں سے گرد و پیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں انفراریڈ دوربینوں والی بھاری گیس ٹھیس، جن کی مدد سے وہ گاہے بگاہے دور و نزدیک تاریک صحرا کا جائزہ بھی لیتے تھے۔

چند منٹوں تک نقشے کا معائنہ کر چکنے کے بعد یہ آگے روانہ ہو گئے۔

انڈر اسٹیٹ میں داخل ہونے کے لیے انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا، اس مقام پر ڈیوڈ اسٹار کی ایک سینٹرل کمانڈ پوسٹ تھی۔ ان کی معلومات کے مطابق یہاں ایک کیپٹن ریک کا اسرائیلی افسر اس اہم پوسٹ کی کمانڈ

”وہ کیا؟“ عابد نے اس کی طرف محورنے کے انداز میں دیکھ کر پوچھا۔ وہ بولا۔

”ہم میں سے کسی ایک کو یہاں رکنا پڑے گا۔“

”اس لیڈر کا پلگ ان سسٹم خراب ہو گیا ہے، اسے اس وقت تک دباؤ رکھنا پڑے گا جب تک کہ وہ الیکٹرونک پاور بوٹ اس آبدوز سے الگ نہیں ہو جاتی۔“

عابد مجھے کا شکار نظر آنے لگا۔ بولا۔ ”کون یہاں رکنا پسند کرے گا؟ جبکہ یہ آبدوز کسی بھی وقت جنہی قبر میں بدلنے والی ہے۔“

”ابھی تاہی پھیلنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اگرچہ اس کی ابتدا ہو چکی ہے لیکن ایسا تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ ایسے موقع پر نہ تم مجھ پر بھروسہ کرو گے نہ میں جبکہ مجھے الگ رکھ کر تم دونوں جلدی سے کوئی ایک فیصلہ کر لو۔“ کوچ جن نے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ عابد اور ناظم دم بہ خود سے کھڑے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تقدیر نے ایک بار پھر ان دونوں کو ایک عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔

یہ بالکل ویسا ہی امتحان تھا جیسا حیدر کی زندگی میں ان دونوں کو پیش آچکا تھا۔

☆☆☆

ان سب کی خوشی و دیدنی تھی۔ اپنے سینئر اور بہادر ساتھی محسن کی صحت و سلامتی پا کر لیلیٰ اور باقر سمیت ان کے تینوں ساتھی، علی اور سلمان، عبداللہ اور لیلیٰ احمد کے حوصلے بلند ہونے لگے تھے۔ کچھ جب محسن نے انہیں بازندہ کے متعلق بتایا کہ یہ سب اسی کی بی بی لیری اور بلند حوصلے کے رہن منت ہے تو وہ سب بازندہ کی بی بی متاثر ہوئے اور اس کا تہ دل سے شکر یہ بھی ادا کیا ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتایا کہ بازندہ اب مسلمان ہو کر ان کے ساتھ ایک مجاہدہ کے روپ میں شامل ہو چکی ہے تو وہ سب اسے پرستش کرتے ہوئے دیکھنے لگے اور ان سب کی آنکھوں سے اس کے لیے عقیدت و احترام جھلکنے لگا۔

لیلیٰ کا اب خیال تھا کہ محسن چونکہ کافی زخمی تھا، اسی لیے اسے بیت صفانہ کے ٹھکانے پر چھوڑنا زیادہ بہتر تھا۔ وہاں اس کے خاطر خواہ علاج و معالجے کے لیے انتظامات بھی موجود تھے۔ جبکہ محسن ان کے اہم مشن میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ تو دوبارہ ابھی اور اسی وقت ان کے ساتھ ”چار کینڈہ تہائی“ آپریشن میں بھی شریک ہونا

کر رہا تھا۔ ڈیوڈ اسٹار سمیت پوری اسٹیٹ کا داخلی و خارجی چارج اسی پوسٹ پر انحصار کرتا تھا۔

”اس پوسٹ کو تباہ کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے مگر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مکار دشمن نے اس اہم پوسٹ کو ایسے خاص ٹیکنیکل خطوط پر استوار کیا ہے کہ اس کی تباہی سے ہمارا گورنلارٹ پر ٹل ہو کر رہ جائے گا۔“ لیٹی نے سینڈ میپ کے رول کو دوبارہ پھیلاتے ہوئے پُر فکر لہجے میں بتایا۔ باقر یہ غور نقشے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی اس کا ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ابھی اس نے لیٹی کی مشورہ طلب گفتگو پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ البتہ علی ارسلان لیٹی سے بولا۔

”اسٹیٹ میں داخلے کے لیے ہمیں ضرورت ہے کہ بڑی ہے کہ ہم اس پوسٹ پر حملہ کریں؟ اسے چھیننے کے لیے بھی تو ہم نسبتاً کوئی اور محفوظ راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟“ اس کی بات پر لیٹی ایک عجیب سی مسکراہٹ سے بولی۔ ”ہماری (زبیدہ اور حسن وغیرہ کی) پچھلی مہم کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہم نے (انہوں نے) اس پوسٹ کو کنٹرول نظر انداز کر دیا تھا اگرچہ ہمارا حملہ کامیاب تھا لیکن اس پوسٹ کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہم جیتی ہوئی بازی ہار بیٹھے تھے۔ اس پوسٹ نے بروقت اطلاع دے کر ہمارے ہاتھوں سے نئی ٹمک بلائی تھی اور یوں ہماری جیتی ہوئی بازی ہار میں بدل گئی تھی۔ کیونکہ یہ پوسٹ ایک طرح سے ہائی کمانڈ اور ڈیوڈ اسٹار کے درمیان مل کا کام کرتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، اس پوسٹ کو تباہ کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ڈیوڈ اسٹار پر حملہ کرنے کی ہماری مہم اِکارت ہو جائے گی۔“

”لیٹی! لیٹی! نے اشدات میں اپنا سر ہلایا۔ باقر جس کے ابھی تک اس گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا مگر وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا، پُر خیال لہجے میں بولا۔ ”گو یا ہم اس نتیجے پہنچے ہیں کہ ابھی ڈیوڈ اسٹار پر حملے سے زیادہ اس پوسٹ کو تباہ کرنا از بس ضروری ہوگا لیکن ہمارا حملہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اسے تباہی کا نشان بنانے کے بجائے خاموشی سے غیر فعال کر دیا جائے۔“

”ہاں! یہ پری پلاننگ انتہائی ہوشیاری اور خاموشی کے ساتھ انجام دینا ہوگی ہمیں، ورنہ اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ ہماری اصل مہم ”مارگٹ ڈیوڈ اسٹار“ کی کامیابی کا انحصار اسی پری پلان پر ہے۔“ مذکورہ کمانڈر پوسٹ کی اہمیت بتانے کے بعد لیٹی نے پیش قدمی کا حکم دیا۔

خاموشی رات اپنے جوبن پر تھی۔ آسمان پر ستاروں کی قدیمیں روشن تھیں۔ حدنگاہ پھیلا ہوا صحرا خاموش تھا اس کی فضا خشک ہو رہی تھی۔ یہ چاروں اپنے اپنے گرد و پیش پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی مطلوبہ منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ ایک حد کر اس کرنے کے بعد لیٹی نے اپنے ساتھیوں کو ریڈیو وائزلیس استعمال کرنے پر پابندی لگا دی تھی۔ وہ ایک طرح سے ریڈ زون میں داخل ہو چکے تھے اور کسی بھی قسم کے لاسلی رابطے کے سلسلے کچھ کیے جاسکتے تھے۔ اسرائیل نے سینٹرائٹ سمیت دیگر جدید ٹیکنالوجی امریکا کے تعاون سے ہی حاصل کی تھی۔ ان چاروں کفن بہ دوش مجاہدوں کا یہ پیدل سفر ایک مقام پر رک گیا۔ لیٹی نے انفراریڈ دوربین سے ایک ذرا گرد و پیش کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے باقر کو مخصوص اشارہ کیا۔ باقر نے فوراً مطلوبہ سمت کی طرف دیکھا۔ وہاں چند ننھے دھبوں کے علاوہ ایک بڑا اور دوسرا نسبتاً چھوٹا دھبہ دکھائی دیا۔

”کیا یہ اس کے پری پلان مارگٹ کے قریب ہیں؟“ باقر نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے لیٹی سے سرکوشی میں کہا۔ اس کی دانہ جوش سے مترشح تھی۔ ”ہاں!“ لیٹی کا مختصر جواب تھا۔ باقر نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور پھر یہ لوگ آگے بڑھے۔ حسن علی کی معلومات کے مطابق جس راستے پر یہ کمانڈ پوسٹ کی جانب بڑھ رہے تھے، وہاں ایک مورچا تھا۔ جس کے اندر پانچ انتہائی تربیت یافتہ اسٹیمپوشنر تعینات تھے۔ جو دور سے ہی لیٹی اسکوپ ویژن کے ذریعے کسی بھی مشکوک شے کو حرکت کرتے دیکھ کر خاموشی سے گولی کا نشانہ بنا ڈالتے تھے۔

مطلوبہ مقام کے قدرے قریب پہنچ کر لیٹی نے سب کو ریت پر ریت چلنے کا حکم دیا اور اب انہوں نے آگے کا اختتامی سفر جو کہیں کی وقت ان کے لیے ”آخری سفر“ بھی ثابت ہو سکتا تھا، اسی طرح مکث کر ہی بیٹنے اور کہنیوں کے بل طے کرتا تھا۔ آگے لپٹی تھی اس کے بالکل برابر میں علی ارسلان تھا۔ لیٹی کے پیچھے عبداللہ اور اس کے برابر میں باقر تھا۔ یہ چاروں اسی طرح دو دو کی صورت میں آگے پیچھے ایک ہی ڈائریکشن میں ریختے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔

ان کے پاس صرف دو لیٹی اسکوپ تھیں جن پر سائنسری جڑھے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے میں حصن کا احساس نسبتاً زیادہ ہوتا تھا اور منزل بھی کافی دوری پر معلوم ہوتی تھی مگر یہ ایک صبر آزمائش ہوتا تھا اور اس کے

”جیسے چار سر دکھائی دے رہے ہیں۔ دشمن کی نظریں اسی مقام پر ثبت ہیں۔“
تھوڑا وقت مزید گزر گیا۔ مور چاند شاید مطمئن ہو گئے تھے۔ لیلیٰ نے پھر انہیں دھیرے دھیرے پیش قدمی کا حکم دیا۔ پھر ایک مطلوبہ مقام پر لیلیٰ نے باقر کو بھی اپنی ٹیلی اسکوپ سیدھی کرنے کا کہہ ڈالا اور خود بھی اپنی آنکھ لگا دی۔ تب معافی اسے باقر کی جوش سے تھمتائی ہوئی سرکوشی سنائی دی۔

”لیلیٰ! مجھے دو افراد ایک جگہ میں آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، مجھے اجازت دو میں انہیں موت کے گھاٹ.....“
”نہیں!“ لیلیٰ نے اسے منع کر دیا۔ ”انہیں آنے دو، وہ یقیناً اسی طرف آئیں گے۔ وہ شاید اپنا کوئی شبہ دور کرنا چاہتے ہوں گے۔“

لیلیٰ نے اس کے جواب پر ہلکا سا ہنسی کر کے تھے، اس سے کوئی چند فرلانگ کے فاصلے پر وہ مور چاہا۔ گویا یہ چاروں اس وقت موت کے ہاتھ پا رہے تھے۔ کسی بھی وقت ان پر فائرنگ کی جاسکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں اسرائیلیوں نے اریب قریب کی خود و جہاز یا ان کا کٹ ڈالی تھیں تاکہ قریب آتا کوئی دشمن ان کی آڑ نہ لے سکے، لیکن وہ صحرا میں تقریباً روز بننے والے ان چھوٹے بڑے ٹیلوں اور ہولودس کو برابر کرنے میں بہر حال ناکام ہی رہے تھے۔ ان کی آڑ اب ان چاروں کو منیر آچکی تھی اور شاید اسی ”غرائی“ نے انہیں اپنی کھانڈ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، باقر لیلیٰ کی چال کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ پھر بھی اس نے اسے ہوشیار کرنے کی غرض سے اپنا آواز میں کہا۔

”لیلیٰ! میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو، مگر یہ مت بھلا دینا کہ ان دونوں کو ہم اپنی آسانی سے ہٹا کر لیں گے، ان دونوں پر مورچے میں بیٹھے ہوئے ان کے باقی تین ساتھی نظر ضرور رکھے ہوئے ہوں گے۔“
”مگذا تم نے بالکل صحیح کہا ہے۔“ لیلیٰ نے توصیفی لہجے میں کہا اور آگے بولی۔

”میرے ذہن میں بھی یہ بات ہے۔ انہیں آنے دو۔ جب یہ قریب آجائیں گے تو علی اور عبداللہ ان دونوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے، جبکہ میں اور تم ان کے باقی ساتھیوں کو ہٹا کر لیں گے۔“ پھر وہ ہلکی سرکوشی میں علی اور سلطان سے مخاطب ہو کے بولی۔ ”تم سن رہے ہو نا، لیلیٰ؟“
”جی ہاں، عزیز ی لیلیٰ! میں سمجھ گیا۔“ وہ جواباً جوش سے تھرائی ہوئی آواز میں بولا تو لیلیٰ نے اپنے منصوبے کی

نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلنے کی امید ہوتی تھی۔ پھر یہاں تو معاملہ اسٹائپڈر شوٹنگ کا تھا۔ جس کا نشانہ بھی خطا نہیں ہوتا تھا کچھ پتا نہیں تھا کہ کس وقت خاموش گولی ان میں سے کسی ایک کو یا پھر تینوں اوپر چاروں کو چاٹ سکتی تھی۔
لیلیٰ اپنے ساتھیوں کو بڑی احتیاط سے آگے لیے بڑھ رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ تھوڑی دیر کو رک بھی جاتی تھی اور پھر پیش قدمی شروع کر دیتی۔

وہ اپنے مطلوبہ ٹارگٹ کے کافی حد تک نزدیک پہنچے تو لیلیٰ نے یہاں کچھ دیر توقف کیا۔ اس نے پہلے ہلکی سرکوشی میں تینوں کو اپنی جگہ ساکت رہنے کا حکم دیا اور خود دو تین آنکھوں سے لگائی اور جیسے ہی اس نے دو تین اپنی آنکھوں سے لگائی اس کا دل اچھل کر قلع میں آٹھا لگا۔ کمانڈر پوسٹ کے مورچے سے اس نے ایک شعلہ سالپکا دیکھا اور لیلیٰ کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے خود کو دائیں جانب سرکا دیا۔
ٹھیک اسی مقام پر ”زٹ“ کی سنسناتی ہوئی آواز ابھری۔ جدھر محض کچھ سینکڑوں فاصلے پر موجود تھی۔ دو تین ٹکالنے کی اضافی حرکت لیلیٰ کو بھی ہلکا سا ہلائی تھی۔ اسی خدشے کے پیش نظر اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کو ”بے حس و حرکت“ رہنے کی تلقین کی تھی اور صرف خود یہ حرکت کرتا تھا۔ سب کے چہروں پر یکجہت سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کے من میں تیزی سے دھڑکنے لگے تھے، کچھ پتا نہیں تھا کہ دشمن کی کوئی کب اور کسے چاٹ جاتی؟

”لیلیٰ! تم ٹھیک ہو؟“ باقر نے ہولے سے سرکوشی کی۔ اس کی آواز میں تشویش بکھورے لے رہی تھی۔
”جی ہاں لیلیٰ نے اسے خاموش اور سب کو اپنی جگہ ساٹا رہنے کی تلقین کی تھی اور خود اس نے حرکت کے دوران ہی اپنی دو آنکھیں اسکوپ کن (اسٹائپڈر) سیدھی کر لی تھی۔ اب اس کی ایک آنکھ ٹیلی اسکوپ کے ساتھ چپکلی ہوئی تھی۔ جس پر انفراریڈ ٹیلیسکوپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہلکی سرکوشی میں اپنے ساتھیوں کو ذرا کیسی ہی بے ڈالی۔

”دشمن نے صرف حرکت کرتی ہے۔ ہر گولی چلائی ہے۔ ہماری مزید ذرا سی بھی حرکت ان کے آپسٹھالے کو درست ثابت کر سکتی ہے کہ اس نے دور صحرا میں کسی ریپتھکے پتے پر جانور کو نہیں، بلکہ انسان کو دیکھا ہے۔“

”اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگلا فائر نہیں ہوگا؟“ باقر نے پوچھ لیا۔
”میں یہی دیکھنے کے لیے انہیں نظروں میں لیے ہوئے ہوں۔“ لیلیٰ نے جواب دیا۔

وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا۔

”مگر ایک بات دھیان میں رہے کہ تم دونوں نے صرف اس صورت میں ہی فائرنگ کرنا ہوگی، جب ہمارے نشانے چوک جائیں، کیونکہ ٹیلی اسکوپ گن سے قریب آتے ہوئے دشمن پر اس قدر جلدی دوبارہ گولی نہیں چلائی جاسکتی تب تک وہ سنبھل جاتے ہیں، تب تم دونوں اپنی گنوں سے ان پر برسٹ فائر کر دینا۔“ علی اور عبداللہ نے اثبات میں اپنے سر ہلا دیے۔

پھر انہوں نے تیزی سے مگر نہایت محتاط انداز میں اپنی پوزیشنیں بدل ڈالیں۔ چند منٹ بھر اپنی جگہ یہ بے حس و حرکت رہے، کچھ نہ ہوا تو ٹیلی نے باقر کو ارٹ رہنے کا حکم دے ڈالا اور پھر یہ چاروں دم سادھے ان دونوں دشمنوں کے ذریعہ قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔

اب ان کی پوزیشن اس طرح تھی کہ ٹیلی اور باقر جنہوں نے بروقت مورچہ بند تین دشمنوں کو یکے بعد دیگرے خاموشی سے نشانہ بنانا تھا، ذرا پیچھے ہٹ گئے، جبکہ علی اور عبداللہ آگے کی طرف آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ٹیلی اور باقر کا نشانہ چونکنے کی صورت میں انہوں نے جیب میں ان کی ہارٹس آتے ہوئے ان دو دشمنوں کو مار کر مارتا تھا، جب وہ ان کی فائرنگ ریٹ میں آ جلتے۔ وقت اب گویا بھاری سلی کی طرح سرے سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ اور باقر نے اپنی اپنی گن کی ٹیلی اسکوپ سے آگے نہ بڑھ کر مورچے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ان میں طے تھا کہ یہی انہیں تینوں شکار دکھائی دیں گے یہ بیک وقت دو کو نشانہ بنائے گا۔ بعد تیسرے کو بھی اڑا دیں گے۔ اس دوران انہوں نے جیب کو بھی نظروں میں لیا ہوا تھا۔ جس میں دو اسرائیلی سوار، اسرافیل ہی چلے آ رہے تھے اور منصوبے کے مطابق علی اسرافیل اور عبداللہ نے انہیں اپنی رائفلوں سے نشانہ بنانا تھا۔

معا ٹیلی کو قریب، باقر کی خاموشی سنائی دی۔ ”مورچے میں دو شکار تو بہ دستور دکھائی دے رہے ہیں لیکن تیسرا نہیں نظر آ رہا۔ جبکہ جیب قریب آئی جا رہی ہے، گولی چلانے میں زیادہ انتظار نہیں کیا جاسکتا۔“

”مورچے والے ہمارے دونوں شکار، اپنے اپنے والے دو ساتھیوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں، تیسرا شاید علی اور جبکہ مصروف ہو۔“ ٹیلی جواب دہی۔ ”گولی چلانا پڑے گی، ریڈی۔ ون۔ نو۔ تھری۔ شوٹ۔“

دونوں کی رائفلوں نے بیک وقت جھٹکا لیا۔ ان کی

آنکھیں ہنوز ٹیلی اسکوپ لینس پر تھیں، تب ہی انہوں نے مورچہ بند ان دونوں دشمنوں کے سر غائب ہوتے دیکھے، ان کا نشانہ ٹھیک لگا تھا۔

”باقر! تم اسی پوزیشن میں رہو گے، اور ان کے مورچہ بند تیسرے ساتھی کو نظر آنے کی صورت میں ہٹ کرو گے۔ میں اب ذرا ان جیب والوں کی خبر لیتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ٹیلی نے اپنی ٹیلی اسکوپ کے اینگل سیکشن میں، تیزی سے ان کی طرف آتی ہوئی جیب کو زوم کیا۔ اس کی حتی الامکان سلی سبھی تھی کہ علی اور عبداللہ کو فائرنگ کا موقع نہ ملے اور یہ معاملہ وہ اپنی اسٹائپر سے ہی ”خاموشی“ کے ساتھ فٹالے۔ یہ صورت دیگر رائفلوں کی گن گرج ان کے گوریل مشن کو مشکل میں ڈال سکتی تھی۔

جیب کی ونڈ اسکرین سے ٹیلی کو وہ دونوں اگلی نشستوں میں براہمان نظر آ گئے۔ ٹیلی نے ہل کے ہل فیصلہ کیا کہ اپنے ذریعہ کو نشانہ بنانے کے بجائے ساتھ بیٹھے ہوئے اس کے ساتھی کو ہٹ کرے اور پھر اس نے سبکی کیا۔ لیٹی پر اس کی اگلی ذرا تھری اور پھر اس نے جیب کی ونڈ اسکرین پر کھڑی جیب والی بیٹھے اور جیب کو لہراتے ہوئے محسوس کیا۔ اپنے برابر میں تھے اگلی کا ہولناک حشر دیکھ کر ذرا نیور کا ہاتھ یقیناً اسٹیرنگ پر ہوا تھا۔ ونڈ اسکرین ڈبل فریم والی تھی۔ تربیت یافتہ ہونے کے باوجود، ذرا نیور کے لیے یہ سب غیر متوقع ہی تھا۔ سبھی سب تھا کہ جیب تک وہ سنبھلا، ٹیلی اسے دوسری گولی داغ چکی تھی۔ اب ٹیلی نے اپنی آنکھ ٹیلی اسکوپ سے ہٹائی، چاروں نے دیکھا کہ اس کی شالی کی طرح ڈوٹنگ ہوئی الٹ گئی اور ریت پر خاں دور تک اس کی گتیاں کھاتی، ایک مقام پر دھنسن گئی۔ اس کے چاروں ہاتھوں پر تھے۔

”آگے بڑھو جلدی۔“ ٹیلی کی جوش میں ڈوٹی آواز ابھری تھی، اور پھر یہ چاروں مورچے کی طرف لپکے۔ ٹھوڑی دیر بعد ہی کمانڈ پوسٹ کے اہم مورچے پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا، مگر ہنوز پانچواں دشمن ان کے لیے معما بنا ہوا تھا وہ ابھی تک انہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ جبکہ حسن علی کی معلومات کے مطابق کمانڈ پوسٹ کے اس اہم مورچے پر پانچ اسرائیلی اسٹائپر شوٹر ز تعینات تھے۔

☆☆☆

جزل آنرک فرمائش کی جنون میں، اپنے ہی اگلی اسرائیلی افسروں کو بے دریغ ہلاک کر ڈالنے کی شکایت لے کر جب موساد کے ہارٹ شمعون نے ہگانہ کے آنر ز مین

تھی اور یہی سڑک تقریباً چار گھنٹہ کے بعد سانپ کی طرح مل کھاتی ہوئی نیچے جنگل میں اترتی دکھائی دیتی تھی۔

بارق شمعوں کا طیارہ اسی دن دسے پر اترتا تھا۔ پائلٹ کو اندر موجود رہنے کا حکم دینے کے بعد جب وہ مختصر قد بچوں والی خود کار سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترتا تو اسی وقت ایک نو سینئر فورسویل وہاں آن پہنکی۔ یہ چھوٹی گاڑی ایسی ہی تھی جو عموماً کالف کے میدان میں نظر آتی ہے۔ اس میں صرف ڈرائیور اسٹیز تک سنبھالے بیٹھا تھا۔ بارق شمعوں جلدی سے اس کے برابر میں خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔

آنے سے پہلے بارق نے آئزر مین کو اطلاع کر دی تھی۔ وہ یہاں اس سے پہلے بھی دو تین بار آچکا تھا۔ باسوائے خفیہ ایجنسی کے چند اعلیٰ اسرائیلی افسران کے، کسی کو آئزر مین ہیری کی اس ذاتی رہائش پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح مملکتی اداروں کے صرف صدر اور وزیر اعظم ہی یہاں آ سکتے تھے، یا پھر..... وہ جو اس کے ”خاص“ مہمان ہوتے تھے مگر یہ سب ملاقاتیں لازماً پہلے سے طے شدہ ہوتی تھیں۔ جب تک آئزر مین ہیری سے ملاقات کے لیے اس سے ٹیلیفونک یا ایڈٹیکس ہو پاتا، کوئی دوسرا آنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ خواہ وہ ”نگرینا پرین“ ہی کیوں نہ ہوتا۔ فقط اسرائیلی صدر اس پابندی سے مستثنیٰ تھا۔

نو سینئر احاطے کے بھانگ سے اندر داخل ہوئی تو سامنے دھاک بھٹائی وائٹ کیسل کی عظیم الشان حکومت مزید واضح ہو گئی۔ یہاں بھی چند مسلح افراد چوکس کھڑے تھے۔ وقت دن کا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا، کبھی کبھار بادلوں کی ٹکڑیاں فضاے بسیط میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیچے جنگل میں عجیب سی خاموشی طاری تھی۔

سامنے ایک ایسا بیضوی سوئٹنگ پول تھا جس کے شفاف پانی سے ہلکے بزرگ کا فرش صاف نظر آتا تھا۔ قریب ایک بڑی سی چھتری تلے تین لوٹنگ چیئرز اور ایک اسی طرح کی میز بچھی ہوئی تھی جبکہ پول کے بالکل کنارے ذرا فاصلے سے دو آرام دہ لاؤنج چیئرز بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں دو بیسیں بدن حسینا بھی مختصر ترین کپڑوں میں نیم دراز تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سن گلاسز تھے، ایک حینہ اپنے مرمیس نیم عریاں جسم پر آفرین لوشن کا مساج کر رہی تھی۔ ایک چھپیلی کھانگہ بارق پر ڈالی تھی، بارق آگے بڑھا تو اسے پول کے شفاف پانی میں ایک تیرتے ہوئے ”فلوٹنگ ایزی لاؤنج“ میں آئزر مین ہیری (جو نیوز) صرف ٹیکر میں نیم دراز دکھائی دیا۔ اس کے گرد بیٹھنے تک شفاف پانی میں کھڑی

ہیری سے ملاقات کی ضمانی تو اسے خود بھی یہ حقیقت معلوم نہیں تھی کہ ہیری کا بھی یہی دتیرہ تھا، اپنے کاز کے سلسلے میں ہیری بھی اپنے لوگوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں تھا۔

بہر طور، بارق شمعوں اپنے ذاتی فور سینئر طیارے سینٹائیس لیومد کی طرف روانہ ہو گیا، جیسا کہ مذکور ہوا۔ ہنگامہ کے چھٹے آئزر مین ہیری کی پرنٹیش اور محل نما رہائش گاہ یروشلم کے جنوب میں لیومد نام کی پہاڑیوں میں واقع تھی۔ یہ رہائش گاہ ”وائٹ کیسل“ کے نام سے موسوم تھی۔

وائٹ کیسل ایک قدیم و جدید فن تعمیر کا شاہکار ہی نظر آتی تھی۔ اس کا رنگ براؤن تھا اور یہ نسبتاً سطح مرتفع پر واقع تھی اور اس کے گرد و پیش اور وقوع کو بڑی بڑی چٹانیں مٹیوں کے ذریعے خاصے بڑے رقبے تک، بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ سطح مستوی میں تبدیل کروایا تھا۔ نیچے پام، اسٹراہیری، خوش رنگ پھولوں اور بانس کا گھنا جنگل نظر آتا تھا۔

”وائٹ کیسل“ کی عمارت خاصے بڑے رقبہ اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔

یہ واقعی ایک کیسل کی شکل کی ہی عمارت تھی جس کے چھٹا ور تھے۔ دو ٹاور دیویدیکل مین کیلئے کے ذرا پیچھے دائیں بائیں بنے ہوئے تھے اور گیٹ کے دو طرف گول ستونوں کے اوپر چٹھاڑتے ہوئے درندوں کے پتھر کے مجسمے تھے جبکہ گیٹ کی پیشانی پر بڑا سا قدیم طرز کا گھڑیاں لگی تھیں۔ قلعہ ذاتی دو ٹاور اور پر عمارت کے وسط میں اور آخری ایک ٹاور عمارت میں ایسا دو ٹاور، جو نسبتاً طویل بھی تھا۔

کیسل کے اطراف میں گھاس کا میدان اور خوب صورت باغ تھا اور بلند بالا، تراشیدہ تنوں والے درخت تھے سامنے ایک ایسی ہی چوڑی سڑک تھی جو بیک وقت چھوٹے سے رن دے کی بھی نظر پیش کرتی تھی۔

یہ جگہ بادی انکسر میں تھی، جگہ مہاراجے کی تاریخی عشرت گاہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ ایک طرف دو بھاری گاڑیوں کے علاوہ نئے ماڈلز کی تین گاڑیاں سفید رنگ کی آہنی ریلنگ کے عقب میں کھڑی تھیں۔ انکی میں ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی مرسیڈیز بھی شامل تھی۔ کچھ مخصوص شخصیت وردیوں میں مسلح افراد چوکس کھڑے نظر آتے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ کیسل کے گرد پانچ فٹ بلند چار دیواری بھی تھی اور اس کے اندر کے مناظر کی انگ ہی ”شان“ تھی۔ احاطے کی دیوار کے گیٹ سے گرینائٹ کی ایک پختہ روش نکل کر سامنے رن دے جیسی سڑک سے جا ملتی

چار نیم عریاں حسینا میں اسے لمھانے میں مصروف تھیں۔ ایک نے شراب کی بڑی سی بوتل تھام رکھی تھی۔ کچھ کے ہاتھ میں ادھ بھرے پیگ بھی تھے، جبکہ آئزرمن کے ہاتھ میں بھی ایک پلوریس پیگ جھنگر ہاتھ اور اس کے ساتھ نیم دراز ایک سانولے رنگ کی مگر پرکشش حسینہ بھی لیٹی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ میں بھی شراب کی ادھ بھری بوتل تھی۔ وہ آئزرمن کے ساتھ بوس و کنار میں مصروف تھی۔

بارق ہولے سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ ہنسی کی پھلجھڑی سی چھوٹی اور آئزرمن اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنے تیرتے ہوئے فلوئنگ کے گرد کھڑی طرح دار حسیناؤں کو اشارہ کیا اور وہ یکدم دایمیں بائیں ہو کر چل پریوں کی طرح پانی میں تیرتی ہوئی دور چلی گئیں۔ جبکہ وہ سانولی حسینہ ہنوز اس کے ساتھ چپکی رہی، اس کے گداز ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

”ہنسی ڈارلنگ! جیت اسے منٹ۔“ آئزرمن نے بڑی محبت سے اس سے کہا۔ وہ کچھ زیادہ منہ چڑھی تھی۔ تاہم اپنے آتشیں لبوں کا ایک آخری بوسہ اسے دے کر اس نے ”فلوئنگ“ سے بڑے قیامت خیز انداز میں لڑھکنی کھائی اور شفاف پانی میں جل پرنی کی ساقی ہوئی دور نکل گئی۔

”بھٹو! میں آتا ہوں۔“ آئزرمن نے بارق سے کہا اور وہ واپس پلٹ کر چھتری تے بھیجی کرسیوں میں سے ایک پر اتر جان ہوا۔

اس کے ذرا بعد آئزرمن بھی وہیں آکر اس کے سامنے والی کرسی سنبھال کے بیٹھ گیا۔ ایک سنہری بالوں والی دلکش لڑکی اپنے پیچھے سیم تن جسم کو ہوشربا بل دیتی، وہاں آن دمگی۔ اس نے ایک ٹرے تمام رکھی تھی، جس پر دو خالی پیگ اور ایک واٹن کی بوتل کی گادہ ان کے درمیان بھی میز پر رکھنے کے بعد اسی طرح قیامت خیز چال کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ آئزرمن ہنسی سے بہ نور بارق شمعون کے سپاٹ چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک بھیجی ہوئی ہیکاری خارج کر کے بولا۔

”جنرل آئزرمن فرمائش کی گئی آخر کس کے ہاتھ میں ہے؟“ ”اوہ!“ آئزرمن نے کچھ سمجھنے والے انداز میں اپنی بھوس اچکا گئیں۔ پھر بولا۔ ”ایسا کیا کرو یا اس نے؟“ بارق شمعون نے دانستہ پہلے جنرل فرمائش کی ناکامیوں

کے قصوں سے آغاز کیا اور بولا۔ ”جیوتانی حملے اور اہم فلسطینی مجاہدوں کے زعمہ ہج کے نکل جانے پر وہ شاید اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے، ذرا ذرا سی فلسطینی پردہ ہمارے اہم افسروں کو بلا دروغ گولی مار رہا ہے۔ اپنی ناکامیوں کا بدلہ اسے اپنے ہی ساتھیوں کے بجائے دشمنوں سے لینا چاہیے۔“

اس کی بات سن کر آئزرمن ہیری کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بڑی سنگ دلانہی مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ اب پوری طرح سے بارق شمعون کے آنے اور اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ اسی وقت ہنسی نام کی وہ متناسب الاعضا جسم کی مالک ”بلیک کوئن“ ٹائپ دو شہزادہ مختصر ترین لباس میں بیوس، پینل نیل سینڈل پہنے تھری چپکی، ان کے قریب آگئی۔ بارق اس وقت اپنے اور آئزرمن کے درمیان کسی شے سے فرد کی موجودگی نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ نیل نے دونوں کے لیے ایک ایک پیگ بنایا، انہیں تھما یا اور اسی طرح تھری چپکی خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ بارق نے بے اختیار ہنسی سانس لی۔ وہ اب آئزرمن کے بولنے کا منتظر تھا اور اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ وحشی کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ بھرنے لگا۔

”جنرل فرمائش کی ناکامیاں اپنی جگہ لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

بالآخر آئزرمن نے کہا۔ ”جنگ کی لحاظ میں کون سا مہرہ کب ناکارہ بنتا ہے، خود میں بھی اسے جانتا ہوں۔ کائنات میں ہوں، ورنہ وہ دیگر کارآمد مہروں کے لیے رکاوٹ کا باعث بننے لگتا ہے۔ جنرل آئزرمن فرمائش میرے اسی متولے چل رہے ہیں۔ میرے اس کیسل میں ایک تہ خانہ ہے، یعنی ایک پورا سلاخہ لاکس ہے، اس میں تمہیں دشمنوں سے زیادہ اپنوں کی نشان گیری ملے گی۔“

پھر اس نے ایک نظر قلعہ نما عمارت کو دیکھا اور فوراً بارق شمعون کے چہرے پر ہنس گاڑ کر بولا۔ ”بارق! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یہاں اپنی لکھ نما عمارت کو عشرت گاہ بنائے بیٹھا ہوں؟“

”نہیں، یور ہائٹس! ایسی بات تو نہیں۔ پوری یہودی قوم آپ پر فخر کرتی ہے۔“ بارق شمعون فوراً مودبانہ انداز میں کہا مگر آئزرمن نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی اور آگے بولا۔

”یہ وائٹ کیسل ہے۔ یہ صرف آئزرمن ہیری جونیر کی رہائش گاہ ہی نہیں بلکہ اس کا دفتر بھی ہے اور ہیڈ کوارٹر بھی۔ مجھے یہاں سے نہ صرف پورے اسرائیل کے چپے چپے کی خبر

جَلَمَ پُورے



صوفی سرسوپ

سپیشل کوالٹی

ہر پاؤڈر "سپیشل کوالٹی" کی طاقت سے خاکف!
کیونکہ صوفی سوپ، بنا ہے قدرتی اجزا
سے اور نکالے وہ اڑیل داغ بھی،
جو کسی پاؤڈر کے بس کا روگ نہیں!



کپڑے دھونے کیلئے بہترین صابن

ہمارے کام آتے رہیں گے، جبکہ صدر کے وفاداروں کو جن کے امریکی افواج اور ان تک آئے ہوئے باغیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتروادو اور ان باغیوں میں اپنے آدمی بھی ہونے چاہئیں۔“

فوج نے اثبات میں جواب دیا تو آزر رہمن نے لحظہ بھر کے خاموش وقفے کے بعد دوبارہ تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

”آپریشن ڈارک اسالٹ کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“

”وہ بھی خاطر خواہ انداز میں جاری ہے۔ اس سلسلے میں فرانس اور ڈنمارک کے کچھ اخباری مالکان کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔“

”کچھ زیادہ سے زیادہ اس اہم مشن پر توجہ رکھی جائے۔“ آزر رہمن چیخا نہ لہجے میں بولا۔ ”بلکہ کوشش کرو، جو ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اسے وہاں کی حکومت کی طرف سے ایوارڈ کی دلوایا جائے۔ یہ مسلمانوں کے دینی جذبات سے ٹھیلنے پر کسی سہاگا والا کام ہوگا۔ اپنی افرادی قوتوں کو بھی بروئے کار لاؤ، بالخصوص عراق اور پاکستان میں۔ اس سے تمام مسلم ممالک اندوہنا و اشتعال کا شکار ہوں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمدردی و نیاس کی زد میں آئے گی۔“ آزر رہمن کی بکواس سن کر وہ کسی طرف سے فوجی فوج نے اثبات میں ہی جواب دیا تھا۔

اس سے بات کرنے کے کچھ ہی سیکنڈوں بعد شن بیٹہ کی مادام ہیڈ وساس سے مؤدبانہ انداز میں مخاطب بھی۔ اس نے اپنی ایک ساری رپورٹ دے دے پھٹنے کے بعد آخر میں ایک اصرار بھی کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا ”مارگنڈ پرسن“ ڈائیکٹریل اپنے دو فیلوز، حماد اندال اور جینی کے ساتھ عراق گیا تھا اور وہیں وہ پھنس گئے ہیں۔

یہ اطلاع آزر رہمن کے لیے خاصی سسنی خیز اور چونکا دینے والی تھی۔ اس اہم اطلاع پر وہ کئی ثانیے کے لیے اپنے پتلے پتلے بدایت ہونٹ بھیچے، پرسوج انداز میں بیٹھا رہ گیا، جبکہ دوسری جانب مادام ہیڈ وساس خاموشی کے ساتھ اس کے بولنے کی منتظر رہی، اس کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اسے درمیان میں نوکے یا کچھ بولنے کی کوشش کرتی، چنانچہ جب آزر رہمن کی دوسری طرف سے آواز ابھری تو وہ اسی طرح الٹ بھی۔

”یہ بہت اہم خبر ہے، لیکن اس میں تشویش کا بھی

لمتی ہے بلکہ امریکا سمیت ہمارے مارگنڈ ممالک میں اس وقت کون کہاں اور کس ٹیکل پر کھانا کھا رہا ہے اس کی بھی۔“

”اس میں کوئی شک نہیں، یورپائس!“ باریق کا لہجہ ایسا اچکی نہ صرف مؤدبانہ ہو گیا تھا بلکہ وہ اپنے اندر اب ایک نامعلوم سے خوف کا ہلکا ہلکا ارتعاش بھی محسوس کرنے لگا تھا۔

اب وہ اندر ہی اندر یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ اس نے یہاں آکر غلطی کی تھی۔

”وائٹ کیسل کے بطن سے تمہاری موساد جیسی نہ جانے کتنی ایجنسیاں یہاں ترتیب پاتی ہیں اور مکزکی کے جال کی طرح ہمارے وسیع تر مفادات کے لیے پوری دنیا میں پھیلا دی جاتی ہیں۔“

”نو ڈاؤٹ، مہر!“ باریق کو اپنی پیشانی پر ننھی ننھی ہونٹوں کا احساس ہونے لگا، اس دوران اس نے دھمکی کے چند ٹھونٹ بھر لیے۔

”باریق! تم مجھ سے جو کہنے آئے تھے وہ میں سن چکا۔ لیج کر دے میرے ساتھ؟“ آزر رہمن نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا، باریق جانتا تھا کہ آزر رہمن مختصر اور مدلل بات کرنے کا عادی تھا، لہذا اس کے یہ کہنے کا صاف مطلب تھا کہ وہ اب یہاں سے دُفع ہو جائے گا۔

”میری یہ خوش قسمتی ہوتی لیکن میں آپ کا قیمتی وقت مزید برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اب اجازت لوں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

باریق شمعون کے جانے کے تھوڑی دیر بعد آزر رہمن وائٹ کیسل میں اپنے کمرائے خاص کے اندر تنہا موجود تھا۔ یہ کمرائے خاص بڑا تھا۔ یہاں سے وہ اپنی ہنگامہ آرمی اور اس کے دو کاؤنٹر انٹیلی جنس شن بیٹہ اور الیا بیٹہ کو ہدایات جاری کیا کرتا تھا۔

ایک بڑی سی میسر پر کیمپوز اور دیگر کیوبیکیشن کے آلات نصب تھے۔ ایک لمبے ہی آلے پر اس نے امریکی خارجہ میں کس بیٹھی اپنی کاؤنٹر انٹیلی جنس الیا بیٹہ کے زونل چیف فوجاگ سے رابطہ کیا۔

اس نے اسے خاطر خواہ رپورٹ دے دیے ہوئے بتایا۔

”امریکا اور اس کے اتحادی عراق پر نوٹ پڑے ہوئے ہیں۔ مگر میں واضح سن اور وائٹ ہاؤس کو آپ کی فوجی دے چکا ہوں کہ پہلے عراق میں بغاوت کا بیج پھونکنے دیا جائے۔ اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔“

”گڈ!“ آزر رہمن بولا۔ ”لیکن خیال رہے ہی آئی اے کے ساتھ جن عراقی جرنیلوں نے وفاداری نبھائی ہے انہیں نکالنے کا بندوبست پہلے ہونا چاہیے، یہ آگے بھی

کے علاوہ دیگر اسرائیلی خفیہ ایجنسیز کے ہیڈ کوارٹر کی سی سی فوٹیج نظر آنے لگیں، گویا وہ یہاں آرام سے بیٹھان کی... کارکردگی اور ہونے والی اہم خفیہ سیکورٹی سٹیشن اور سپر کمپیوٹر کی مدد سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سب مناظر بھی جو وہاں پیش آچکے تھے اور وہ بھی جو گزر چکے تھے۔ اور اس کی اس ”حرکت“ کا کسی کو علم نہ تھا۔ ان سب کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے تھوڑی دیر بعد وہ ایک ایسی رابطے کے ذریعے ہات لائن پر اس کی صدر کو تیل پیدا کرنے والے کے دوسرے نمبر پر اسلامی ملک عراق پر قبضے کی حتمی مبارکباد دے رہا تھا۔

☆☆☆

پارمو کی بندرگاہ پر اترنے سے ذرا سی دیر پہلے زبیدہ اپنے بچے کی نشاوری کے بعد چک سے جاتی تھی۔ چک زبیدہ کو یوں کہہ سکتے تھے کہ بندھا چلا آتا دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وعدے کے مطابق دونوں نے اکٹھے ناشتا کیا تھا۔ اس کے بعد اپنے مختصر ملازمین کے ساتھ پارمو کی بندرگاہ پر گئے۔ زبیدہ کے سامنے ایک بڑے بڑے کے مطابق اسے راج کر رہے تھے اور یہ بین بین کچھ کچھ کا سامنی روج بھی کر رہا تھا۔ ایک مقررہ وقت پر اور چک کی ایک کے مطابق، روج نے چک اور ڈچی (زبیدہ) کو جو ان کو لانا تھا ابھی اسے چک کی جانب سے ایسا کوئی گرین سگنل نہیں ملا تھا۔ ادھر چک کے لیے ایک اہم مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس نے ایک طرف زبیدہ کو مجبوراً ”کوانڈو ڈاکر“ کے لیے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور دوسری طرف اسے اپنے سامنی روج سے متعلق بھی آگاہ کرنا تھا، لہذا ایک ہوٹل میں دونوں نے قیام کیا۔

گزشتہ شب چک اور روج نے ڈچی (زبیدہ) کو ”کوانڈو ڈاکر“ کے لیے اپنے ”رام“ کے رکھنے تک اپنا ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ اگرچہ اس میں کچھ باتیں بھی تھیں، مثلاً ڈچی ڈاکر اس کے دوران ان سے بدول بھی ہو سکتی تھی کہ وہ کرمٹل اور ٹینکوں کے درمیان پھنس گئی ہے، مگر تب تک ڈچی کے لیے پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا لیکن کوانڈو میں چونکہ وہ مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر ہوگی اس لیے ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائے گی۔ ڈاکر اس کے بعد ان کی ایک ”فینشن“ ختم ہو جائے گی اور جب اگر ڈچی نے گزیر کرنے کی کوشش کی تو دونوں اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیں گے۔ وہ ان کے ساتھ ہوگی، ایک کمزور چڑیا پر قابو پانا ان کے لیے کیا مشکل ہوگا؟ لیکن اس سارے لائحہ عمل کی

ایک پہلو ہے۔ خیر! میں دیکھتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی بھاری بھر کم... کرسی سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا... کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ یہاں سے وہ وائٹ کیسل سے باہر اور نیچے ترائیوں کے دلکش جنگلاتی اور پہاڑی مناظر کا نظارہ کرتا رہا، پھر پلٹ کر کمرے کے دروازے سے باہر نکلا اور ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ بھی چھوٹا نہ تھا مگر یہ ذرا مستطیل نما تھا مگر سوائے گنتی کے فرنیچر کے اور کچھ نہ تھا، البتہ دائیں بائیں دو شیٹ کے دروازے نظر آتے تھے۔ یہ دروازے نہیں بلکہ لفٹ کے خلا تھے جو کمپسول کی شکل کے تھے۔ دونوں کا کام ایک ہی تھا، یعنی اوپر نیچے لے جاتا۔ وہ ایک لفٹ میں داخل ہو گیا اس کے ذریعے وہ نیچے گراؤنڈ فلور اور پھر وہاں سے انڈر گراؤنڈ اتر گیا۔

لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی خانے نما کمرے میں ہی کھلا تھا۔ کمرہ صاف ستھرا اور چمکا رہا تھا۔ یہاں دیواروں پر بڑی بڑی تصاویریں آویزاں تھیں۔ ان میں کچھ تو آئینہ من کے پرکھوں کی تھیں اور ایک تصویر خاص کے دادا آئینہ میں تیری کی تھی جبکہ باقی تصویریں، کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھیں جن کا تعلق جنگ عظیم کے دور سے تھا۔ ان میں یہودیوں کی خاصی تعداد کو نظر کے سامنے دوڑا تو حیران رہ گیا تھا۔ دوسری تصویر میں سارے یہودی قیدی برہنہ دکھائی دے رہے تھے جبکہ تیسری تصویر میں ان سارے یہودی قیدیوں کو ایک بڑے سے سیلن زدہ ہال میں کچھ اس طرح دکھایا گیا تھا کہ ان کی ہر کوئی زہریلی ٹیس چھوڑی گئی تھی اور انہیں ایک دوسرے کے اوپر گرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اگلی تصویر میں ان سب کی لاشیں کھردرے فرش پر آڑی تر جمی گری پڑی تھیں۔ آخر میں کچھ دیر تک ان تصاویر کو سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں مگر یقیناً پائے گئے ان تصویروں کو سنبھالنے کی وصیت کر رکھی تھی۔“ اس کے بعد وہ سر جھٹک کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔

یہاں دیواروں پر دو بڑی اسکرینیں نصب تھیں، ان کے سامنے الگ الگ دو بڑی میزیں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر بھی مختلف ٹیبل اور اسی قسم کے کیونیکشن کے آلات نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک میز کے سامنے والی بھاری بھر کم کرسی پر براجمان ہو گیا اور ایک بیٹن دبا کر اس نے ایک اسکرین روشن کر دی۔ اس میں موساد اور ڈیوڈ اسٹار

نوبت ہی نہ آسکی تھی، کیونکہ گزشتہ شب جب زبیدہ نے چھپ کر ان دونوں کی گفتگو سنی تھی تو اس نے بھی اپنے منصوبے کو مزید آسان بنانے کی غرض سے ترمیم کر ڈالی تھی۔ لہذا پارلر سوئی بندرگاہ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں مختصر اقامت کیا گیا تو چک اس سے بولا۔ ”ڈوسی! میں تمہیں ایک خوبصورت جزیرے کی سیر کروانا چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھو یہ میرے کام کی مجبوری بھی ہے، لیکن مجھے یقین ہے تم بالکل بھلا پوریت محسوس نہیں کرو گی۔“ اس کی بات سن کر زبیدہ کو اپنے وجود میں سسکی کا احساس ہونے لگا۔ منزل گویا خود چل کر اس کی جانب آرہی تھی۔ وہ بولی۔

”بیکراں سمندر میں پھیلے جزیروں کی سیر تو میرا ایک دیرینہ خواب ہے۔۔۔۔۔ کب اور کون سے جزیرے کی طرف جانے کا ارادہ ہے تمہارا؟“

چک کو تسلی ہوئی، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”بہت جلد اور شاید آج ہی۔“

کہتے کہتے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو زبیدہ نے ایک دلکش سی سکراہٹ اس پر نچھاور کرتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔ ”مگر کیا ڈوسی تم کو کوئی اعتراض نہیں؟“

”میری ایک مجبوری ہے۔“ اس کا تم مجھے تھوڑا فیور دے سکتی ہو؟“

”یقیناً!“ زبیدہ نے بے یک جنبش کہا تو وہ بولا۔

”دراصل میں جس کمپنی کے لیے کام کرتا ہوں وہ

میں نے جو بعض امراء کی ذاتی ملکیت بھی کہلاتے ہیں۔ وہ

اپنے جزیرے میں کچھ تعمیراتی کام کروانا چاہتے

ہیں۔ کو انڈیا کی پٹنہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ کمپنی کو

انہوں نے ایک تعمیراتی ٹیم کا دیا ہے، بس اسی سلسلے میں ان

سے مذاکرات کے لیے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھی بھی

تھا، مگر بد قسمتی سے اس کی طبیعت دھستے میں خراب ہو گئی۔ وہ

ساتھ نہ آسکا، مگر مجھ سے اس نے یہ گزارش بھی کی کہ میں اس

کی خبر کمپنی کو نہ ہونے دوں۔ وہ میرا لکڑیگ تھا اور ایک

دوسرے کا خیال رکھنا ہمارا ویسے بھی فرض تھا لہذا میں

اکیلا ہی آگیا، لیکن مذاکرات میں کم از کم دو افراد ہونا

ہونا ضروری تھا، اسی لیے میری نظر انتخاب روڈ پر

پڑی۔ میں اسے کچھ کمیشن دوں گا۔ مذاکرات کے بعد میں

اس کی چھٹی کروں گا، پھر صرف تم اور میں ہوں گے اور سیر

سپانے ہوں گے۔“ وہ آخر میں زبیدہ کی طرف دیکھ کر

چالاکی سے مسکرایا تو زبیدہ نے بھی ایک گہری سانس خارج

کرتے ہوئے اپنے ترمیم شدہ منصوبے کے مطابق چک سے کہا۔

”بہت درد سہی والا کام ہے تمہارا۔ خیر۔۔۔ ایک

بات بتاؤ چک! کیا تم اپنے اس کام سے خوش ہو؟“

”بیر گز نہیں۔“ اس نے فوراً لنگی میں اپنا سر ہلایا۔

”اگر تم میرا ہمیشہ کے لیے ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو

میرے ذہن میں ایک منصوبہ آتا ہے۔“

اس کی بات سن کر چک کی آنکھوں میں یکدم ایک معنی

خیز چک! ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”ڈوسی

ڈارلنگ! تم مجھے اپنا غلام سمجھو، تمہاری طرح میں بھی تو تنہائی

کا مارا ہوا ہوں اور سچ پوچھو تو مجھے بھی ایک سچے ہمسفر کی

ضرورت ہے۔“

طوعاً و کرہاً ڈوسی، یعنی زبیدہ کو بڑی گرجبوشی کے ساتھ

اپنا ہاتھ مٹانے کے لیے اس کی طرف بڑھانا پڑا تھا۔ جسے

چک نے کوہ قہارم لیا۔ زبیدہ نے آنکھوں سے اپنا ہاتھ دوبارہ

مٹھ لیا اور اپنے سر سے پردانستہ گہری سنجیدگی طاری کرتے

ہوئے بولی۔

”چک! اپنی بات سنو۔ یہ کہ میں اب اپنی اس تنہا

زندگی سے آگاہ ہو چکی ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں مگر

اصل میں میری کوئی میر ڈالنا نہیں ہے۔ میں اب اس

رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اپنے

ہسپینڈ سے طلاق کی صورت میں مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ مگر میں

نے اس کا بھی حل سوچ لیا ہے۔ بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو۔“

اندھا کیا جاوے، دو آنکھیں۔۔۔۔۔ چک جھٹ سے

بولا۔ ”ڈوسی ڈارلنگ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ویسے

منصوبہ کیا ہے تمہارا؟“

زبیدہ بولی۔ ”تمہیں ایک ڈراما کرنا ہوگا، مجھے انخوا

کرنے کا تم میرے ہی سیل فون سے میرے شوہر کو فون کر

کے تاوان کی صورت میں بھاری رقم کا مطالبہ کرو گے، جو

امریکن ڈالر کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ

مجھے تم سے رہائی دلانے کے لیے بہ آسانی ایک بڑی رقم

دے دے گا۔ اس کے بعد میں اس بزرگ شخص پر لعنت بھیج

کر تمہارے ساتھ نکل جاؤں گی جہاں تم چاہو گے۔“

چک پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے

لگی۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں بھی ہو رہا تھا کہ یہاں تو ساری

تدبیریں خود ہی سیدھی ہوئی جارہی تھیں۔ اس کا منصوبہ تو

اب بغیر کسی سقم کے خود ہی آسان ہو چلا تھا۔ اس کے خیال

کے مطابق یہ سونے کی چڑیا خود ہی ان کی مشکل آسان

طرف روانہ ہو گیا۔

اب روجر بھی ان کے ہمراہ تھا مگر وہ بار بار جانے کیوں زبیدہ کو ذرا پر تشکیک نظروں سے دیکھنے لگا رہا تھا جبکہ زبیدہ کو بھی اس کی طرف سے کچھ کھٹک سی ہونے لگی تھی۔ اس دوران وہ واش روم جانے کے بہانے سے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خفیہ ٹراسمیٹر پر اپنے ساتھیوں کو ایک ایک پل کی خبر سے بھی آگاہ کرتی جا رہی تھی۔

چک کے اصل ٹھکانے سے مراد وہ مقام تھا، جہاں سے انہوں نے کوائڈ کی جانب روانہ ہونا تھا۔ اس دوران زبیدہ نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے مافیائی پاس چیک ڈوکر سے اپنے سیل فون پر مؤدبانہ انداز کی گفتگو بھی کئے جا رہا تھا اور دوسری جانب سے ملنے والی ہدایت پر عمل کرنے کا بھی فیصلہ کر رہا تھا۔

وہ مقام ایک کھاڑی تھی، جو نسبتاً ایک ویران جگہ پر تھی۔ جلی علاقہ ساحلی تھا۔ قریب ایک چوٹی ہٹ بنا ہوا تھا۔ یہ خاص طور پر ہٹ تھا۔ یہ ظاہر بھی نظر آتا تھا کہ یہ تفریح کرنے والوں کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ سامنے حدنگاہ بیکراں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ایک بوٹ بھی یہاں لنگر انداز نظر آتی تھی۔ ہٹ میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ یہ چاروں بہ ظاہر عام اور غیر مسلح نظر آتے تھے لیکن درحقیقت یہ چاروں انتہائی تربیت یافتہ اسرائیلی فوجی تھے جو یہاں تعینات کیے گئے تھے۔ ممکن تھا ایسے کی اور بھی کچھ فاصلے پر واقع ہوں۔ یہ اندازہ زبیدہ نے یہاں سے ہی کر لیا اور اس کی گفتگو کو سن کر لگا تھا۔

کیونکہ ہٹ کے باہر ہی انہیں ذرا دیر کے لیے کھڑے رہنے کو کہا گیا تھا، اس کے بعد اندر آنے کا حکم ملا تھا۔

ایک کمرے میں ان کے ساتھ سوالات کیے گئے تھے۔ زبیدہ اندر سے بیٹھا تھی مگر بہ ظاہر وہ خود کو ایک عام سی عورت ظاہر کیے ہوئے تھی۔

”یہ کون ہے؟“ زبیدہ کے متعلق ایک سوال پوچھا گیا تو اس کا چک نے ہی جواب دیا۔

”یہ میری گرل فرینڈ ہے، ڈیسی۔“

”مگر ہماری معلومات کے مطابق صرف دو افراد کو مذاکرات کے لیے آنا تھا، تیسرے کی منجائش نہیں رکھی گئی تھی؟“ ایک نسبتاً دراز قامت اور کرخست چہرے والا ان کے ساتھ سوالات کر رہا تھا، یہ اعتراض اس نے ہی اٹھایا تھا۔

”اس میں منجائش رکھنے کی کیا بات ہے؟“ چک نے منہ بتایا۔

کرتے ہوئے ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لیے تیار تھی۔ ظاہر ہے، قلم لینے کے بعد چک کا ارادہ ڈیسی کو بھی بڑے آرام سے دھوکا دینے کا تھا۔ اس نے محبت جتانے کے لیے ریشہ خلی ہونے کی کوشش کرتے ہوئے زبیدہ کو بے اختیار اپنے قریب کر کے اس کا بوسہ لینے کی کوشش چاہی تھی مگر زبیدہ بڑی چالاک اور ایک ادا کے ساتھ اسے طرح دے گئی اور بولی۔

”نو ڈیز! ابھی مجھے یہ سب ذرا آگ دردمسوس ہوگا۔“

پہلے معاملہ طے ہو جانے دو اس کے بعد تو.....“ اس نے دانستہ معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا جملہ ادھر اور اچھوڑا تو چک کو بھی محتاط ہونا پڑا۔

نظریہ ضرورت اور وقت کی جال کو بکھتے ہوئے

منصوبے کو بڑی چابک دستی کے ساتھ ٹھیک وقت پر آگے بڑھانا زبیدہ کے ذہن کا کمال ہی تھا۔ وہ یہ سب پہلے بھی چک سے کہہ سکتی تھی مگر اس طرح کی جلد بازی چک یا اس کے ساتھی روجر کی قسم کے شے میں ڈال سکتی تھی جبکہ روجر پہلے ہی اپنے ساتھی کے اس منصوبے سے کچھ غیر مطمئن بھی نظر آ رہا تھا۔

زبیدہ کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ ان دونوں مافیائی...

گشتوں کی سوچ جرائم سے شروع ہو کر جرائم ہی ختم ہوتی ہے لہذا وہ اسے تیار حلو سمجھ کر کھانے کی کوشش کر رہی تھی اور جب تک وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی راہ ہموار کر چکی ہوئی۔

اس گفتگو کے بعد چک اب ڈیسی کی طرف سے سوچا گیا تھا کہ اب یہ سونے کی چڑیا کہیں نہیں جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی کوائڈ روانہ ہونے کا قصد کر ڈالا اور

اپنے بارے میں کئی ڈیسی کو جج بتا دیا کہ اس کی اپنی

حقیقت کیا تھی اور وہ خود بھی اس جرائم پیشہ زندگی سے تنگ

آچکا تھا۔ محض خانہ پری کے لیے وہ کوائڈ جانا چاہتا تھا تاکہ

پاس کو مطمئن کر سکے وغیرہ، نیز اپنا مقصد یہ اس قدر آسان

جانا دیکھ کر اس کے ذہن میں اب اپنے ساتھی روجر کے لیے

نئی فکروں نے سراٹھایا تھا، وہ اسے بھی راستے سے ہٹانے کے

بارے میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا، وہ ڈیسی کو اب

روجر... کو بھی چونا لگانے کی سوچ رہا تھا اور اکیلا سب بڑے

کرنے کے لالچ میں مبتلا ہو گیا تھا، جبکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ

تقدیر اسے چونا لگانے کے لیے پر تو لے چکی تھی۔

دونوں دو پہر تک مذکورہ ہوٹل میں رہے۔ دونوں نے

اکٹھے لچ کیا، پھر چک، ڈیسی کو لے کر اپنے اصل ٹھکانے کی

"ہم لوگ دوستانہ ماحول میں خدائے کرت کرنے آئے ہیں۔ چوری چھپے نہیں آئے ہیں اور خود کو مکمل طور پر تمہارے حوالے کر چکے ہیں، تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو، ہمارے پاس ماسوائے دو عام پیسٹولوں کے اور کچھ نہیں ہے۔"

لے کر تھکے اسرائیلی کے باقی تینوں ساتھیوں نے اپنی بھاری گینیں نکال لی تھیں۔

"اس طرف آ جاؤ تم تینوں۔" اسی لیے قد والے نے سپاٹ لہجے میں تمکھانہ کہا۔ اس وقت ان کی دم ان کے ہاتھ میں تھی اور یہی وجہ تھی کہ چک اور روجر کو یہاں روانہ کرنے سے پہلے ان کے پاس چیک ڈوکر اس نے انہیں سمجھا کے بھیجا تھا کہ وہ ان سے کسی معاملے میں بھی دباؤ کا شکار نہ ہوں۔ لہذا جب انہیں ایک دوسرے کمرے میں لایا گیا تو چک کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ وہاں انہیں ایک اسکینر سے گزارا گیا۔ چک اور روجر تو کھینچ کر دیے گئے تھے مگر زبیدہ کی کلینر کے سلسلے میں ایلاوم بن اٹھا تھا اور پھر وہی معاملہ کھڑا ہو گیا، یعنی زبیدہ کو چاکر کی سرانیلیوں نے "مفلوک" قرار دے ڈالا۔

"تمہاری ساتھی ادھر رہے گی، دوئوں جاسکتے ہو۔"

"ہرگز نہیں، میری گرل فرینڈ کے پاس اسے خود سے علیحدہ نہیں کر سکتا، یہ صورت دیگر ہم بھی نہیں جانتے۔"

چک نے بگڑ کر کہا، روجر ابھرا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھی چک سے کہا۔ "میرا خیال ہے معاملے کو ختم کر کے الجھانے کی ضرورت نہیں چک! ڈیسی کو یہاں چھوڑ دینے میں کوئی قحاحت نہیں۔"

"تمہارا خاموش رہو، روجر! یہ میرا اور میری گرل فرینڈ کا معاملہ ہے۔" چک نے اس سے ناگواری سے کہا۔

اسی دوران لے آئی کی ایک ساتھی عورت نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کچھ کہا تھا، جس پر اس نے ہولے سے اپنے سر کو تھمبی جنبش دی تھی۔ پھر وہ چک کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مجھے اس کے لیے خصوصی اجازت لینا پڑے گی۔" اور چک نے فقط اپنے سر کو ہولے سے اٹھاتی جنبش دی تھی۔

وہی عورت جس نے لے کے کان میں سرگوشی کی تھی وہ اپنے ایک ساتھی مرد کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ یہاں چند ثانیے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ ان تینوں کو ایک لمبی سی نچا کر سیوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے دو مذکورہ دو ساتھی، دوسرے کمرے میں شاید ہائی کمان سے لاسکی رابطہ کرنے کی غرض سے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی واپسی ہوئی، لے نے فوراً ان کی طرف دیکھا تھا۔ چک بظاہر بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زبیدہ البتہ وزیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے پاس اگرچہ سوائے ایک خفیہ ٹرانسمیٹر کے کوئی اور شے نہیں تھی، جو اس نے اپنے بالوں میں "ہیمز پن" کے طور پر لگا رکھی تھی جو اسکینر میں نہیں آسکتی تھی، جبکہ اسکینر صرف خفیہ آتش گیر ہتھیار کو ہی ٹریس کر سکتا تھا۔

انہوں نے آپس میں کچھ کھسر پھری، اس کے بعد ان تینوں کو روانگی کی اجازت مل گئی۔

زبیدہ نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تینوں اسی بوٹ میں سوار ہو گئے۔ ان کے ہمراہ لے کے دو مرد، عورت میں سے ایک کھل سوار ہوا تھا۔ بوٹ مکمل سمندر کی جانب تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ زبیدہ نے کھلیاں طور پر ایک بات محسوس کی تھی کہ چک اور روجر کے ساتھ سرانیلیوں کا رویہ بڑا اگڑ اور روکھا سا تھا۔ وجہ ظاہر تھی کہ یہ جہاز جو ابھی ان کے درمیان طے پانے جا رہا تھا، وہ بھی چھوٹی نوعیت کا ہی تھا۔ یعنی بلیک میلنگ اور راز کو راز میں رکھنے کا محفل بتاتا۔

بہر طور کو انڈو آئی لینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے زبیدہ اپنے وجود میں ایک پر جوش سی سنسنی محسوس کرتے لگی تھی اور اب وہ کسی ایسے موقع کی منتظر تھی کہ اپنے بانی سامعین سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے انہیں گائڈ لائن دینے کی کوشش کرے۔ جلد بازی بنانا یا کام بگاڑ سکتی تھی، اسی لیے احتیاط کا واسطہ بنے ہوئے تھی۔

اب بوٹ اب گہرے پانیوں میں آچکی تھی۔ کو انڈو تک مزید کتنا دور باقی تھا، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ بوٹ خاصی رفتار کے ساتھ حرکت کر کے پانی کو چیرتی اور اپنے پیچھے جھاگ کی موٹی لکیر چھوڑتی آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اوپر نکلا آسمان تھا جہاں آبی پرندوں کے جھنڈ فضا میں "قاس قاس" نکھیر رہے تھے۔

سہ پہر کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ زبیدہ کے محتاط انداز سے کے مطابق، بوٹ کا سفر تقریباً نصف گھنٹے تک جاری رہا تھا، پھر اس نے ایک قوس کی صورت میں گول موڑ کا نا اور مزید لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد انہیں سامنے کسی جزیرے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ایک موٹی لکیر کی صورت میں کو انڈو آئی لینڈ کا ساحل، دھیرے دھیرے قریب آتا جا رہا تھا۔ پام اور

میں جنرل واحد بھی شامل ہے، صدر اور اس کے بیٹوں کو طویل عرصے تک بے وقوف بنائے رکھا۔ جس پر اندھا اعتماد کیا جاتا تھا، کمال مکاری سے انہوں نے پہلے صدر اور اس کے بیٹوں سے دوست دشمن کی شناخت کی تیز چھین لی۔ اب آپ جیسے دوست دشمن ٹھہرے ہیں آقا! جب حکمرانوں سے یہ شناخت چھین جائے تو تباہی و بربادی مقدر ہو جاتی ہے۔“

سعد بے یہ سب بتاتے ہوئے رو ہانسا اور ہاتھا۔ وہ حویلی کے پائین باغ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، یہاں اندھیرے اور روشنی کا سنگم تھا۔ شامل اندال سوچ میں پڑ گیا۔

”آقا! سوچنے کا وقت.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک گیٹ پر ساعت ٹھکن دھماکا ہوا۔ ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا۔ پھر ابھی یہ لوگ سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ گولیوں کی خوفناک ترتر اہٹ ابھری۔ سعد بے پھلتی ہو کے کھڑا نکلی اندر کی جانب دوڑا تو عقب سے ایک ترتر آتے ہوئے سٹ نے اس کا بھی تعاقب کیا۔ کچھ گولیاں اسے لگیں۔ مگر پھر اٹھ کر اندر گرتا پڑتا دوڑا اور پھر کرا۔ اس اثنا میں دھماکے اور گولیوں کی ٹھن گرج سے جاگ پڑے تھے اور اٹھ کر باہر نکلتے تھے۔ شامل چلا چلا کر سب کو کسی راستے سے ہلانے کا کہے جا رہا تھا اور پھر اس نے بھی دم توڑ دیا۔

حماد اندال، ڈاکٹر کمال احمد اور جینی سی کے گھر میں تھے لیکن جلد ہی حماد اور کمال نے خود پر قابو پایا۔ حویلی کے قلعہ دار سب پھرے دار، بافیوں اور لٹیروں کی مقدور ہجر قلعہ دار کے باوجود ڈنرے رہے اور اہل خانہ کو نکل بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔

بالآخر باقی برامریکا اور اس کے اتحادیوں کا حملہ ہو چکا تھا۔

عالمی افق پر ایک نیا پھر خون مسلم کی سرفی پھیلنے لگی تھی۔ سازش اغیار ایک مار پھر انہوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث پروان چڑھنے لگی تھی۔

امریکا در پردہ ”اسرائیل“ کی ہٹا کے لیے خون مسلم سے اس کی پرورش کرنے لگا تھا اور امریکا کا یہ من چلا بچہ کس طرح اپنے گریٹر اسرائیل پر وگرام میں اپنے ”آوارہ باپ“ کی طاقت کو مسلمانہ کے خلاف استعمال کر رہا تھا۔

عراق پر مکمل قبضے کے بعد، ایک کے بعد دوسرے اسلامی ملک پر قبضہ کرنا امریکا کے وسیع پروگرام میں شامل ہے۔ وہ غلط جس میں کم و بیش ایک ارب نفوس رہتے ہیں اور

تاریخ کے لائے، جہنم دار درختوں کی ایک قطاری ساحل کے ساتھ ساتھ نیم قوس کی صورت دور تک چلی گئی تھی۔ گھٹا جنگل اور اس کے پس منظر میں سبزے سے ڈھکی پھاڑی چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

مزید قریب پہنچنے پر انہیں ساحل پر ایک بند جیب کھڑی دکھائی دی جس کے گرد چار سب افراد کھڑے ان کی بوٹ پر نظر س جمائے، چوکس کھڑے تھے۔ یہ اسرائیلی خفیہ اسپائی اسیشن تھا جدھر اسرائیلی بحیروم سے ملحقہ اور اریب قریب کے اسلامی ممالک پر برتری حاصل کرنا چاہتا تھا اور ان کی جاسوسی قیاس و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہاں سے سمندر کے راستے فلسطینی حریت پسندوں کو جانے والے امدادی جہازوں کو بھی وہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔

اسرائیل کے اس ناپاک اور منحوس خفیہ منصوبے نے ایک عرصے سے مجاہدین اور فلسطینیوں کو جانے والی امداد کو روک رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ زبیدہ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے اس مشن کی وجہ سے کابھی طرح سے اعزازہ تھا اور انہوں نے اسے اپنی جانوں پر کھیل کر بھی کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کا عزم میم کر رکھا تھا۔

موٹر بوٹ ابھی ساحل سے کچھ نیکل میل دور تھی کہ اچانک عرصے پر کھڑے چک اور دھڑکے کی سیل فون پر ایک وقت سیل فون کی مخصوص بپ بگی۔ دونوں نے ہی اپنے سیل فون نکال کر اسکرین پر آنے والے پیغام پر نگاہ ڈالی اور پھر دوسرے ہی لمحے ان دونوں کے چہرے دھلے ہوئے تھے۔ اندھ سفید پڑ گئے۔ اور ادھر اسی وقت اسرائیلی جوڑے کو بھی ان کے خفیہ وایج ٹرانسمیٹر پر کوئی خفیہ پیغام موصول ہوا تھا۔ ان کے بشروں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوتی چلی گئی۔ جبکہ زبیدہ ان کی یہ کیفیات دیکھ کر بری طرح ٹھکی گئی اور ان کے بل اسے یوں لگا جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہو۔

☆ ☆ ☆

رات کے اس پہر سعد بے کے منہ میں خبر لانے کی اگرچہ کم از کم شامل اندال کو پوری امید تھی لیکن اس قدر جلدی یہ سب ہونے کی توقع قطعاً نہیں تھی۔ پہلے تو سعد بے کی بات پر شامل کو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ مگر اب مزید دیر کی کوئی گنجائش بھی نہیں بچی تھی۔

”معزز آقا! بغداد پر ایک بار پھر تاریخ کا وہ بے رحم کلہاڑا چل چکا ہے، جو انہوں کی غداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امریکی سی آئی اے کے راتب خور جرنیلوں نے، جن

آگئی اور اس پختہ اسلامی بیداری سے ہی مغربی ممالک سخت خائف ہیں۔ چنانچہ دہشت گردی کے عنوان سے امریکا اور اسرائیل دراصل اس اسلامی بیداری کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ صرف مسلمان ہی اسرائیلی وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ ہی کسی غیر مسلم کی حکمرانی قبول کرتے ہیں۔

اسی اسلامی بیداری کے فعال ہونے کا خدشہ اسرائیل کا پہلا وزیر اعظم بنی غورین اس طرح کرتا ہے۔ ”مجھے ڈر ہے کہیں اسلامی بیداری کی یہ لہر اسرائیل اور اس کے ہمنواؤں کو لے نہ ڈوبے۔“

عہد اور سیف کا یہودی نژاد امریکی مصنف اپنی کتاب میں اس خطرے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ”اسرائیل کے قیام میں اس بات کو یقینی سمجھا گیا ہے کہ ایک عرب ملک دن عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر لیں گے۔ اس ماحول کو سازگار کرنے کے لیے عرب ممالک کے شدت پسندوں کا خاتمہ ناگزیر ہے۔“ ”مغرب کے لیے اسلام کا خطرہ اشتراکیت سے بڑھ کر ہے۔ اشتراکیت جس کی ہے اس کا خیر مغربی ممالک سے اٹھا ہے اور اس میں کسی مروجہ برچک آسکتی ہے، لیکن اسلام کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے صرف کھواری زبان استعمال ہو سکتی ہے۔“

اسرائیل کی خفیہ تنظیم کا سربراہ ارون بلومبرگ لکھتا ہے۔ ”میرے خیال میں عرب اپنی موجودہ طاقت کے ساتھ اسرائیل کے لیے خطرہ نہیں ہیں، ہاں اگر بنیاد پرستوں کا انقلاب کے نتیجے میں ان ممالک پر قابض ہو جائے ہیں تو عرب ایک سنجیدہ خطرہ بن سکتے ہیں، لیکن عرب ممالک کے موجودہ حکمران ہمارے دوست ہیں اور ان سے اس ابھرتے ہوئے خطرے کو دبانے کی امید کی جاسکتی ہے۔“

صدر جمی کارٹر نے اپنے ایک بیان میں اسلامی بیداری کے خطرے پر یوں اظہار خیال کیا تھا۔ ”دنیا بھر میں اسلامی تنظیموں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو دانت پاؤں نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی پیش بندی کے لیے امریکا اور اس کے دوست مسلم حکمران مشترکہ طور پر حکمت عملی مرتب کریں، تاکہ دنیا میں کسی جگہ اسلامی انقلاب رونما نہ ہو سکے۔ امریکا کسی صورت میں اسلام کے شدت پسندانہ عمل کو برداشت نہیں کرے گا۔“

☆☆☆

رات کے چھلے پہر یہ مختصر سا قافلہ، آہوں اور سسکیوں کے ساتھ دو گاڑیوں میں سوار، بغداد سے بعتوبہ کی

جسے ”عالم اسلامی“ کہا جاتا ہے، اس کا سیاسی نقشہ بالضرور تبدیل ہونا چاہیے۔ اب سابقہ ”سائیکس پیکو“ معاہدے کے مندرجات تبدیل ہوں گے۔ اگرچہ خود سائیکس پیکو معاہدے کے تحت جو مسلم اکثریت والے ممالک آزاد ہوئے تھے، وہ فوجی، سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے اس طرح برطانیہ، فرانس اور امریکا نے تقسیم کیے تھے کہ یہ کمزور ممالک ان کے ”مقاصد“ کے سامنے بھی نہ جم سکیں۔

امریکا کا دوسرا مقصد خام تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا ہے۔ تیسرا مقصد اسرائیل کی بقا کی ضمانت اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے، نیز دریائے نیل سے دریائے فرات تک کی اراضی تک اسرائیل کی رسائی کرنا۔

عراق میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 112 بلین بیرل خام تیل پایا جاتا ہے، جو سعودی عرب کے بعد دوسرا اہم منبع ہے۔ امریکا اپنے ”خشک کنوئیں“ خلیج کے تیل سے بھرنا چاہتا ہے اور اس کو جو تیل کو کسی شدید ضرورت کے علاوہ استعمال نہیں کر سکتا، صنعت کاری پر وہ اکیلا قابض ہو جائے اور تمام ممالک صنعتی مواد کے لیے اس کے محتاج ہوں۔ خام تیل کے حصول کے لیے دنیا بھر اقدام کرنے پر تیار رہتا ہے۔

امریکا نے اس اظہار میں بھی خیالات بیان کیے ہیں کہ خام تیل جہاں بھی پایا جاتا ہے وہ دراصل اس کی ملکیت امریکا کے لیے امریکا نے ہی عرب ممالک کو دیا تھا۔ اس لیے اس کے لیے اس کے قیام کی داغ بیل ڈالی تھی۔ عرب ممالک میں دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کے بجائے امریکا نے گردن دیا کرتا تھا۔ بعد ازاں صیہونی عقل، امریکا کے عیسائیوں پر ایسی حاوی ہوئی کہ آقا اپنے ہی غلام کے ماتحت ہو گیا۔

دنیا کے طول و عرض میں اسلامی بیداری کی لہر نے بے شمار غافل مسلمانوں کو جھوڑا بیدار کر دیا ہے۔ ان گنت اسلامی تنظیمیں اپنے طریقہ کار کے مطابق دنیا بھر میں فعال ہیں اور ان سب کا ہدف ایک ہی ہے ان کو عزت اسلامی خلافت کا قیام ہے اور اسی منزل میں صیہونیوں کو اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ اور وہ اسی لہر کو پوری قوت کے ساتھ دھکا دیتے جا رہے ہیں۔ دونوں ملکوں کا بس اس بات پر ایمان ہے کہ فریقین کے درمیان مسئلہ جغرافیائی حد بندی کا نہیں بلکہ ایک کے وجود اور دوسرے کے نابود ہونے کا مسئلہ ہے۔

اسلامی بیداری کی ابتدا بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے شروع ہوئی، پچاس کی دہائی میں اس میں پچھلی

طرف کا مزن تھا۔

میں ہوتا تھا۔ اگرچہ دیگر وفادار وقت کی چال کو سمجھتے ہوئے بٹھ پارٹی کے علاوہ بھی مخالف پارٹی سے راہ درسم رکھے ہوئے تھے۔ لہذا وہ جانتے تھے کہ صدر کے بچے وفادار کون تھے اور انہیں ہی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا۔ جبکہ اس کے سرسبز حیدر آبادی کا خیال تھا کہ شائل اندال کو ہلاک کروانے میں عاقبت نااندیش جرنیلوں کا ہاتھ تھا۔ عراق میں امریکی اور اس کے سپر اتحادی ملکوں کے حملے کے نتیجے میں عراق میں چھپے لیروں کو بھی بغداد کی آڑ میں لوٹ مار کرنے کی کھلی چھوٹ مل چکی تھی۔ ان میں زیادہ تر امریکی فوجی اور عراق میں بسنے والے غیر مسلم بھی تھے اور وہ لوگ بھی جو عراقی صدر کے مخالف دھڑے سے تعلق رکھتے تھے اور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔

بہر طور اس مختصر قافلے کا سفر جاری تھا اور ان کی منزل بعتو بہ تھی۔ حیدر آباد اور ڈاکٹر کمال وغیرہ بڑی مشکلوں سے حویلی کے خفیہ راستے سے فرار ہو کر کے نکلے تھے اور سیدھا، جمشید حادی کے گھر پہنچے تھے۔ چونکہ شائل اندال کی وفاداری پر ”مہر تفلک“ ثبت کر دی گئی تھی اسی لیے اس سمیت اس کے عزیز رشتے داروں پر بھی غائب نازل کیا جانے والا تھا۔ اسی لیے جمشید حادی کو بھی سب سے پہلے چھوڑ کر ان کے ساتھ نکلنا پڑا تھا، یوں بھی اس وقت بغداد کے حالات کچھ اس طرح پر تھے کہ سردست کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔

عراق کے آسمان پر جنگ کے بادل برسنا شروع ہو چکے تھے۔ امریکا اور اس کی بڑی اور فضائی انواع و اقسام کے طیاروں سمیت سرزمین عراق پر تیزی سے قابض ہونے لگے تھے۔ یہاں کو دانستہ گل کھلانے کے مواقع فراہم کیے جا رہے تھے اور جس نولے کو جہاں موقع مل رہا تھا وہ اس بستی گولڈن میں ہاتھ دھو رہا تھا۔ بلکہ اب تو ان لیروں میں بھی کوئی تیز نہیں رہی تھی۔ امریکی، اس کے اتحادی بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ مارا آئین بھی تھے۔ اس کے بعد بڑے لیروں (امریکا اور برطانیہ) کی ہڈی آنے والی تھی جو عالمی سطح پر بڑے دھڑے کے ساتھ عراق کے تیل پر ہاتھ صاف کرنے والے تھے۔

بہر طور ان کا ارادہ بعتو بہ سے اربل اور پھر موصل نکلنے کا تھا۔ موصل میں حیدر آباد کا تھیال تھا، بڑی مشکل سے ٹیلی فون کا رابطہ ہوا تھا۔ ام کلثوم کا اپنے بھائیوں سے۔ ماں باپ کو عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے، دو بھائی اور ایک بہن زندہ تھے، تینوں شادی شدہ تھے اگرچہ وہاں بھی حالات ٹھیک نہیں تھے لیکن نسبتاً کچھ بہتر تھے، وہاں قبائلی سسٹم تھا

ڈر، خوف، ہراس، عصمت دری اور قتل عام جیسے اندیشہ ان کے... ہم رکاب تھے۔ ایک سرخ آندھی تھی جس نے گویا آن کی آن میں پورے عراق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ایک گاڑی چھوٹی بندوبست تھی جبکہ دوسری کار۔ وین آگے تھی اور اس میں احمد حادی اور اس کی ہونے والی بیوی حبیبہ (حماد اندال کی بہن) اس کا باپ جمشید حادی اور ماں حماد اندال کی ماں ام کلثوم (جو اب بیوہ ہو چکی تھی) دو ملازم سوار تھے جبکہ کار میں حماد اندال، ڈاکٹر کمال احمد، بیٹی اور ایک عمر رسیدہ ملازم سوار تھے۔ ان سب کے چہرے متوجش اور ستے ہوئے تھے، سب سے زیادہ حماد دھکی تھا۔ اس کے لیے یہ سب کسی اچانک نازل ہو جانے والی قیامت سے کم نہ تھا۔ اس کی آنکھیں جنور ڈبڈبانی ہوئی تھیں، وہ چشم تصور میں بار بار اپنے باپ کی خون سے لت پت لاش دیکھ رہا تھا۔ وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کمال اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ جو اسے باپ کا ہاتھ اور تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا تھا، مجرد حقیقت وہ خود بھی کم پریشان نہ تھا۔ تشویش اس کے چہرے سے بھی غائب طور پر مترشح تھی۔ جبکہ عقبی سیٹ پر بیٹھی بیٹی کو تو جیسے کشتہ لگا گیا تھا۔ اس کا حلق تک سوکھ کر کاٹا ہو رہا تھا، کمال سے زیادہ وہ تشویش زدہ ہو رہی تھی، وہ غیر ملکی تھی اور فرنگ بھی، اسے ان حالات کا کب تجربہ تھا؟ اس کے برابر میں عمر رسیدہ ملازم ریاض بیضا تھا۔ بیٹھی تھی اگلی گاڑی میں موجود افراد کا تھا، سب سے زیادہ متاثر حماد اس کی بہن اور ماں ہوئے تھے، اسی لیے دیکھی بھی زیادہ وہ بھی تھے۔ حبیبہ کے تو آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔ باپ کے ان طعنے، بہانہ انداز میں جاں بحق ہونا، اسے بری طرح غم زدہ کر کے پڑے تھا۔ وہ اپنے باپ سے بے حد محبت کرتی تھی، اس کی لاپرواہی بھی کسی تھی۔

اس کی ماں ام کلثوم بھی درود کے ایک آنکھیں سرخ کیے بیٹھی تھیں۔ اسے اس کی سحرمن یعنی احمد حادی کی ماں حاجراں نے سنبھالا ہوا تھا۔ جبکہ حبیبہ کو اس کا ہونے والا شوہر احمد تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ شادی کا سہارا کے پہلے ماتم میں بدل گیا تھا۔

حویلی میں ہلا بولنے والوں سے متعلق حماد اندال اور اس کے سرسبز حیدر آبادی کی رائے کچھ مختلف تھی۔

حماد کے مطابق اس کے باپ کو منافقت کی سیاست نہیں آتی تھی۔ شائل اندال کا شمار صدر عراق کے وفاداروں

سے زیادہ تم پر حبیبہ پر اور تمہاری ماں پر قیامت ٹوٹی ہے۔
انگل کا اس طرح مرڈر ہونا، مجھے واقعی بہت دکھی کر گیا ہے۔
”آئی ایم سو سوری۔ ایکسپریس ملی سو ری حماد!“

کمال نے بھی آذر کوئی کے ساتھ حماد کے دکھ کو شیئر کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ بولا۔ ”جینی صحیح کہہ رہی ہے حماد! ہم سے زیادہ اس وقت تم لوگوں پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔“ تھوڑے وقفے کے بعد کمال نے دوبارہ اس سے کہا۔

”کیا سمجھتے ہو حماد! تم لوگوں نے موجودہ صورت حال میں جو لائحہ عمل تیار کیا ہے، وہ کس حد تک سودمند اور محفوظ ہو سکتا ہے ہمارے لیے؟“ جو بادہ ایک گہری ہرکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

”یقیناً، امید تو یہی ہے کیونکہ موصل ہمارے لیے بہت حد تک محفوظ رہے گا بلکہ وہاں سے تم دونوں کو بڑا آسانی عرصہ کا پورا آشوب جنگی فضا سے باہر بھی نکالا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ موصل سے ایک براہ راست ملکی ترکی کی سرحد بہت قریب ہے۔“

حماد کی اس بات پر جینی اور کمال کو قدرے ڈھارس ہوئی تھی، تاہم کسی فوری خیال کے تحت ڈاکٹر کمال نے اس سے پوچھا۔

”کیا ہمیں، میرا مطلب ہے جینی، اور مجھے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنا پڑے گی؟“

”نہیں،“ حماد نے جینی میں اپنا سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم دونوں کے لیے ایسا کوئی مسئلہ ہو۔ مجھے امید ہے میرے دوستوں یہ کام با حسن و خوبی انجام دے ڈالیں گے۔“

”اور تم لوگ کیا اوجھری رہو گے؟ عراق میں؟“ کمال نے پوچھا۔

”ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ لائحہ عمل تو موصل پہنچنے کے بعد مکمل پائے شاید۔“

اسی وقت احمد حمادی نے انہیں آواز دے کر بلا لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی اندیشوں اور خوف و ہراس کی فضا میں ان کا سفر دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ اب یہ سب بیٹرول کی قلت کی وجہ سے ایک ہی گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔

☆☆☆

”وقت نہیں ہے، جلدی فیصلہ کرو۔“ دفعتاً کوچ جن کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

عابد اور ناعزہ دونوں، کبھی بھی ایک دوسرے کے سلسلے میں کسی بھی لمحے کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ بجز اس کے

اور وہاں کے سردار مل جل کر درمیانی راہ نکالے ہوئے تھے اور اپنے علاقے کی از خود حفاظت کے ساتھ ساتھ مفاہمت پر بھی عمل پیرا تھے۔ تاہم ابھی ان کی منزل دور تھی۔ ان کے پاس زاہد راہ کی کمی نہیں تھی، البتہ فیول ان کے پاس محدود تھا اور اصل پریشانی کی وجہ یہی تھی ان کے لیے۔

تھوڑی دور اور سفر کرنے کے بعد، بالآخر فیول بچانے کی یہی تدبیر نکالی گئی کہ بیک وقت دو گاڑیوں میں سفر کرنے کی ”عیاشی“ کے بھانے ایک ہی گاڑی پر سفر کیا جائے چنانچہ یہی کیا گیا، ایک تاریک مقام پر گاڑیاں اس مقصد کے لیے روک دی گئیں۔ کار سے حماد اور ڈاکٹر کمال وغیرہ اتر کے وین میں آ بیٹھے اور کار کا جتنا بھی بچا بچا فیول تھا، وہ ایک ریڑ.... پائپ کے ذریعے وین کی ٹینگی میں منتقل کیا جانے لگا۔ یہ کام دونوں جوان ملازم کرنے لگے۔

اس ضرورت کے پیش نظر اس مختصر قافلے کو سچ تاریک صحرائی میں چھوڑ کے لیے رکنا پڑا تھا۔ صحرائیں رات اتری ہوئی تھیں، شکر تھا کہ تیز ہوا میں نہیں چل رہی تھیں ورنہ ریت کا طوفان ان کے لیے الگ مسئلہ کھڑا کر دیتا۔ کمال، حماد اور جینی اس کار کے قریب، جیسے یہ لوگ یہیں چھوڑ کے آگے روانہ ہو گئے، تھے، کھڑے آہیں میں باتیں کر رہے تھے۔ جینی کو زیادہ پریشانی لاحق تھی، لیکن چونکہ اس وقت کبھی پریشان اور تشویش زدہ نہ تھے، اس لیے وہ اپنی فکر کو ظاہر کرنے سے گریز کرنے کی ہی کوشش کر رہی تھی لیکن ڈاکٹر کمال سے اس کا ہراس اور ڈولیدگی کبھی نہ گئی۔ اس کی وجہ اس کا احساس حماد کو بھی تھا لیکن جب کمال نے جینی کو تسلی دینی چاہی تو بے اختیار جینی کا سن ڈبڈبا گیا اور وہ رو پڑی۔ بالکل ترغور پریشان سا ہو گیا، البتہ حماد نے ہی جینی سے اذراہ کیا۔

”جینی! بڑا بڑا مسئلہ، کھو، یقین کر دو خود مجھے اپنی اور اپنے لوگوں سے زیادہ تمہاری اور کمال کی ہی فکر لاحق ہے کیونکہ تم دونوں ہمارے مہمان تھے مگر بد قسمتی سے ہم بھی اس وقت بے خانماں و برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں خود بھی تم دونوں سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”نہن... نہیں... تم میرا یہ مطلب نہیں سمجھتے“ جینی قدرے خود بھی شرمندہ سی ہوتے ہوئے فوراً بولا۔ ”درحقیقت میں کبھی ایسے جنگی حالات سے نہیں گزری تھی اور پھر یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور دل دہلانے والے انداز میں ہوا تھا کہ میرا ذہن ابھی تک اس لرزہ خیز حقیقت کو قبول ہی نہیں کر رہا کہ یہ سب واقعی ہو چکا ہے۔ دیکھا جائے تو ہم

غور سے پڑھیں کہیں آپ بھی تبخیر معدہ گیس ٹریبل کے شکار تو نہیں؟

بد ہضمی۔ پیٹ کا بڑا ہو جانا۔ دل کی گھبراہٹ
دماغ کی بے چینی۔ سر کو چکر۔ قبض کی پر اہلم۔
جسم کی تھکاوٹ۔ جوڑوں کا درد۔ سینے میں
جلن اور خوراک کا ہضم نہ ہونا۔ طبیعت کا ہر
وقت مایوس رہنا۔ سستی سے بیزاری چہرے
کا بے رونق ہو جانا اور وزن کا بڑھ جانا یہ
سب تبخیر معدہ گیس ٹریبل ہی کی تو علامات ہیں
شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ اگر آپ بھی
تبخیر معدہ گیس ٹریبل کے شکار ہوں تو آج ہی
فون پر رابطہ کریں۔ گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک
دیسی طبی یونانی قدرتی جزی بوٹیوں والا ہم
سے تبخیر معدہ گیس ٹریبل کو دس منگوا لیں۔

دارلشفاء المدنی

ضلع حافظ آباد پاکستان

0333-1647663

0301-8149979

اوقات رابطہ

صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

کہ کوئی تیسرا فرد درمیان میں نہیں آ جاتا۔ یہاں بھی کچھ
یہی صورت حال تھی۔ اگر یہاں معاملہ صرف نائمہ کا ہوتا تو
عابد بلا تامل خود کو ہر خطرے کے لیے پیش کر دیا کرتا تھا
لیکن اب اگر وہ خود یہاں ایمر جنسی ایگزٹ لاجسٹک سٹیل
کے جیکل پر کھڑے ہونے کی ذمہ داری سنبھالتا اور نائمہ کو
کوچ جن اور اس کے ساتھی کے ساتھ بھیج دیتا تو بھی اس
میں خطرہ تھا کہ وہ نائمہ سے دھوکا کر سکتے تھے۔ اگرچہ نائمہ
انہیں گن پوائنٹ پر ہی لیے ہوئے ہوتی، باوجود اس کے
عابد اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ بہر حال ان کے
مقابلے میں اتنی تربیت یافتہ نہ تھی، دونوں مکار یہودی
اسے "ہاتھ" دکھا سکتے تھے۔

یہی عمل اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ خود ان دونوں کے
ساتھ الیکٹریک پاور بوٹ تک رسائی حاصل کرے اور نائمہ
یہاں جیکل بورڈ پر اپنی مختصر ڈیوٹی انجام دے اور بعد میں
نائمہ بھی ان سے آن لے۔ یہاں بھی کھڑے رہنا، نائمہ
کے لیے خطرے سے کم نہ تھا۔ کلائنٹ اس میں کم خطرہ تھا۔
کسی متوقع خطرے سے بچنے کی نظر عابد نے کوچ جن
سے درشت لہجے میں کہا۔ "اس مارے کو رکھ دھندے میں
کتنا وقت لگ جائے گا؟ یعنی میں کس وقت اسے اپنی ساتھی
(نائمہ) کو دوبارہ اپنے ساتھ دیکھوں گا؟" اس نے بھی
"صرف دس منٹ کا ٹھیل ہوگا، یا اس سے بھی
کم۔" کوچ جن نے جواب دیا۔

"تم وہاں لگے ایک انٹرکام کے ذریعے اپنی ساتھی کو
بلا سکتے ہو۔"

اس نے عابد نے نائمہ کو چند ضروری ہدایات دیں اور
جب عابد نائمہ سے جدا ہونے لگا تو اچانک نائمہ نے اپنے
نرم و نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عابد نے چونک کر
اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"عابد! ایک وعدہ کرو مجھ سے۔ اگر خدا خواستہ ہم پر
کوئی ایسا کڑا وقت آئے تو تم، میری فکر کرنے کے بجائے
صرف اپنے مشن کو ہی ترجیح دو گے، مجھے نہیں۔" وہ وعدہ عابد!
وقت کم ہے۔" یہ کہتے ہوئے اگرچہ نائمہ کی آواز ہی جلد سے
تے مرتضیٰ تھی، مگر آہنگ سے ایک عزم مصمم کی سختی
نمایاں تھی۔ عابد کا اندر جمیر جمیر سا ہونے لگا، مگر پھر جیسے
دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر اور اس کا نرم و نازک ہاتھ
ہولے سے چھپتا کر بولا۔

"ہاں انا نائمہ، میں وعدہ کرتا ہوں۔" اس کے بعد...
اس نے اسے گن تھا کر پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

سہس ڈائجسٹ

دکھانے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ اب وقت صرف اسی قدر ہی باقی بچا تھا کہ جس قدر جلدی ہو سکے اس جہنمی آبدوز سے باہر نکلا جائے۔

عابد ان دونوں کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں تھا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ان دونوں کے پیچھے چل رہا تھا۔

☆☆☆

آبدوز میں ریڈ ایمر جنسی نافذ ہو چکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ مال و منال بچانے کے بجائے اب صرف اپنی جان بچائی جائے۔ لیکن کپتان پر ایمان اپنی اس محبوب آبدوز کو تباہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آبدوز اسرائیلی بحریہ کے لیے کتنا بڑا غرر تھی نہ صرف یہ بلکہ یورپ سے اسرائیل کے لیے بھی ایک قوی سرمائے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ یہ آبدوز محض ایک آبدوز ہی نہیں، ایک چلتا پھرتا ایٹمی بمب کی شکل میں بھی تھی۔ اس کی تباہی اسرائیلی بحریہ کا بہت بڑا نقصان تھی جس کی تلافی دونوں مہینوں میں نہیں ہو سکتی تھی۔

اسے رہ رو کر دشمنوں کے ان دونوں ساتھیوں (عابد اور ناعمہ) پر طیش آ رہا تھا جو اس کمریوں روپوں کی اہم ترین آبدوز آگوسٹ 291 کی تباہی کا باعث بنے تھے۔ اسے اب یوں لگ رہا تھا جیسے دشمنوں کا یہ جوڑا چوٹی بن کر ان کی سونڈ میں آن گھسا ہو۔

وہ انہیں ابھی تک فلسطینی حریت پسندوں کا ساتھی سمجھتے ہوئے تھا، حالانکہ ایسا تھا نہیں، اگرچہ ان کا کاز ایک تھا۔ نیز حالات کے دھارے نے ہی نہیں بلکہ اپنے فلسطینی مسلم بھائیوں کی مدد کی خاطر بھی عابد اور ناعمہ اب ان کے اس نیک مقصد میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ بلاشبہ ہر مسلم ملک کا اجتماعی فریضہ ہی تھا۔ انہوں کو اب تک فلسطینی گروپوں کو ان کے بارے میں معلوم ہونے لگا تھا اور وہ عابد اور ناعمہ کے اس بہادر ”جوڑے“ کو فلسطینیوں کا گمنام بھر دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔

اسرائیلی کپتان پر ایمان کے پاس اس وقت اس کا نائب کمیشن ہیئر نوٹ موجود تھا، جو اسے یہ بتا کر مزید طیش میں مبتلا کیے ہوئے تھا کہ اب وہ بین آفیسر سے کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ نیز مذکورہ سیل (واٹ 3) تک ان کی ابھی تک رسائی بھی ناکام رہی ہے، اس کی ہسٹ وھری کی وجہ سے جو کمانڈوز بھیجے گئے تھے، ان میں کئی، ان دونوں مجاہد جوڑے کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔

ناعمہ کوچ جن کی ہدایت کے مطابق مختل کے سامنے ایک..... لیور پکڑے کھڑی ہو گئی۔ کوچ جن کے پاس سے بھر کو سلوٹس ابھریں اور پھر غائب ہو گئیں، جنہیں دونوں نہ دیکھ سکے تھے۔

سیل سے رخصت ہوتے وقت عابد اور ناعمہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ ناعمہ اسے حوصلہ دینے کی غرض سے ہولے سے مسکرائی تھی جبکہ عابد کو اس کی مسکراہٹ کی تہ میں پیچھے کسی اندیشناک دوسرے کی تلخمت بھی چھپی محسوس ہوئی تھی۔

ان تینوں کے جانے کے بعد ناعمہ سیل میں تنہا رہ گئی تو اس کی عابد کے لیے حوصلہ افزا مسکراہٹ میں بھی کچھ تبدیلی تھی۔ عابد کے جاتے ہی پوری طرح اس کے چہرے پر ابھرتی تھی۔ عابد کی سنگت میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ ہر غم ہر خطرے سے خود کو بے نیازی محسوس کرتی تھی۔ مگر جہاں اس کا ساتھ عابد سے نہ تھا، چاہے عارضی کسی، وہ یکدم... عدم تحفظ کا شکار ہونے لگتی تھی۔ اسے خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ اب تک عابد کی سنگت میں رہتے ہوئے، نوع نوع خطرات کا مقابلہ کر رہے ہوئے وہ شاید اس کی ذات کی عادی ہو گئی تھی۔

حالات دگرگوں اور نازک گھڑیوں کی سامنے داری نے شاید اب ان دونوں کو یک جان دو قالب بنائے رکھا دیا تھا۔ حالانکہ ناعمہ نے ایک بہادر لیڈی رپورٹر کی حیثیت سے اپنے تنہا بھی، کم و بیش ایسے ہی حالات کا مقابلہ کیا تھا، وہ ایک اسٹریٹ لیول کی رپورٹر بھی مگر اب اسے کیا ہو گیا تھا؟ کہیں یہ ان کڑے وقتوں میں، اندر ہی اندر، چپکے چپکے، خاندول کے کسی گوشہ کھال میں پھنسنے والے ان نو دمیدہ جذبات کے گل و گھڑار ہونے کی کوئی علامت نہیں تھی؟ جس نے ان دونوں کو تعلق خاطر کی ایک غیر مرئی وہ خطیں جکڑ لیا تھا؟ شاید یہی کچھ تھا۔

وہ اور نہ یادہ گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔ سیل میں وہ تنہا تھی اور اس کی محدود آہنی گھاس میں ابھرنے والی عدم شائیں شائیں اسے ہولناک سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شدت کے ساتھ خنجر تھی کہ کب... انٹر کام کی آواز ابھرتی ہے اور وہ کب اس منہوس قید خانے جیسے کھنڈے سے نکلتی ہے؟

ایک ایسے ہی جھکے جھکے دروازے سے یہ تینوں یعنی عابد کوچ جن اور اس کا ساتھی، گزرتے ہوئے ایک تنگ سی سرنگ نما راہداری میں آ گئے۔ عابد کا خیال نہیں تھا کہ کوچ جن یا اس کا ساتھی، اس نازک وقت میں اسے ”ہاتھ“

آبدوز کی خرابی کو دور کرنے کے لیے سب کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔" یہ کہہ کر پریمان اپنے چٹل بورڈ کی جانب بڑھا نائب پیئر نوٹ بچنی بچنی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر جیسے وہ اس کی حرکت سمجھ گیا اور اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔

وہ پاگلوں کی طرح چیخا ہوا پریمان کی طرف لپکا۔ "تم..... تم..... ذلیل آدمی ایہ..... یہ نہیں کر سکتے۔" پیئر چلایا۔ جبکہ پریمان چٹل بورڈ پر اپنا کام ختم کر کے اس کی طرف مڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آ رہا تھا جس کی نال کار رخ پیئر کی طرف تھا۔ اگلے ہی لمحے دھماکا ہوا۔ ٹال سے دھواں خارج ہونے لگا، جبکہ پیئر نوٹ ایک کریسٹل انگیز چھچھ مار کے اپنا سینہ پکڑے فرش پر گر گیا اور گرے پڑے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اسی وقت پریمان نے ہانک پر اعلان کر دیا کہ کوئی بھی آبدوز سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس نے انگیزٹ یعنی نکاسی کے تمام دروازے بہ شمول ایئر بیسی ڈورز سیلف کوڈ زڈال کر لائے تھے۔ جان بچانا چاہتے ہو تو اس کے ساتھ آبدوز کی خرابی کو دور کرنے کے لیے اس کے سیل قایم کار رخ کرو۔

☆ ☆ ☆

بد قسمی سے یہی وہ موقع تھا جب اوجھڑ میں اس وقت عابد اور کوچ جن انجینئرک پاور بوٹ کو بلا سکیں۔ جبیر سے نکالنے کے بعد آبدوز کے "بفر روم" میں آچکے تھے۔ دونوں نے اب اپنے چہروں پر چڑھے ہوئے خوبصورت مسک (کیمیکل ماسک) اتار کر پھینک دیے تھے۔ یہاں نور و گیس کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ادھر کوچ جن کا ساتھی ایک اور لیور کو مخصوص مدت میں گرانے کے لیے اندر کھڑا رہ گیا تھا۔ اس وقت تھا جب پریمان نے آبدوز کے تمام نکاسی کے دروازے کوڈ زڈال کر لاک کر دیے تھے۔ کوچ کے اس ساسی کام پر عابد نے ہانک پر اعلان کر دیا کہ اب ہر سے کوچ کا اشارہ پا کر لیور چھوڑا اور باہر آنے کی کوشش چاہی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ دروازہ لاکڈ ہو چکا تھا۔ وہ دہشت زدہ رہ گیا اور پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

ادھر بفر روم کی بجلی ہوئی چھت سے کوچ نے ایک کام کا ریسپور اپک کر عابد کی طرف بڑھا دیا۔ عابد نے ریسپور اس کے ہاتھ سے چھت کر اندر جھبوس ناعمدہ سے رابطہ کیا کہ وہ اب لیور چھوڑ کر فوراً بفر روم کا رخ کرے۔ اس کی دہشت منائی کے لیے اس نے اسے راستہ سمجھا

"پیئر! تم کیا اب تک گھاس کاٹ رہے ہو؟" کپتان پریمان پاؤں لے کتے کی طرح اپنے نائب پر چلایا۔ "جو خرابی، وہ دو گھنٹے دشمن پیدا کر چکے ہیں، کیا اسے دور نہیں کیا جاسکتا؟" پیئر نوٹ نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔

"یہ سب تمہاری غلط حکمت عملی اور بلاوجہ کی ہٹ دھرمی سے ہوا ہے مسٹر پریمان! ہم مذاکرات کی آڑ میں کمانڈو ایکشن کر کے ان دونوں پر بہ آسانی قابو پاسکتے تھے۔ مجھے وہی آنفیسر کوچ جن نے ساری صورت حال کے بارے میں بریف کر دیا تھا۔ مگر افسوس آپ کو خطرناکی کا اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ اس وقت کوچ جن خود ان کے رحم و کرم پر تھا اور دشمن جوڑے (عابد، ناعمدہ) نے والٹ تھوڑے کا پمپ چلانے سے نہ صرف انہیں روکے رکھا تھا بلکہ اس کے ایک ساتھی نے ایٹمی ری ایکٹر کو آن آف کرنے والا کرینک بھی توڑ ڈالا تھا، جبکہ آپ سے غلطی یہ ہوئی کہ آپ ابھی تک یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ان کو بھی اپنی جان کا خوف ہوگا، جبکہ یہ مجاہد سرفروش ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے کار اور مقصد کے سامنے یہ اپنی جانوں کی بھی پروا نہیں ہوتی۔"

موقع ایسا تھا وہ کپتان پریمان اپنے نائب کی اس کڑی جوابی کارروائی کا نہایت برائی سے جواب دیتا اور یوں بھی اس کا نائب کوئی ایسی غلط بات.... نہیں کہہ رہا تھا، جھلا کر بولا۔

"کیپٹن پیئر نوٹ! یہ وقت اب آپس کی لڑائی کا نہیں ہے، کسی طرح سے اس قیمتی آبدوز کو تباہ ہونے سے بچانے کی تدبیر کرو۔"

"اب کی تدبیر کا وقت نہیں رہا سراسر! پیئر نوٹ بولا۔ "بلکہ ابھی جان بچا کر ادھر سے نکل جائیں یہی بہت ہے۔"

"انجینئرس بھانجنے کی پوری کوشش کیا منہ لے کر جاؤ گے تم اپنے ملک (اسرائیل) پوری قوم (یہودی) ہم پر لعنت پونکھ کر رہے گی۔ ہم پر مقدمہ ہو جائے گا، وولٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔" پریمان دہاڑا۔

"غلطی آپ سے ہوئی ہے، ہم سب مقدمہ سے کھانا کرنے کے لیے تیار ہیں۔" پیئر نوٹ نے یہ جواب دے کر کپتان پریمان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ اپنے نائب کی طرف بڑی ہولناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"اوہ..... اگر یہ بات ہے تو پھر کوئی بھی اس آبدوز سے باہر نہیں جائے گا۔ اور اگر اپنی جان بچانی ہے تو اس

دیا تھا جو چنداں مشکل نہ تھا۔ ابھی انہیں اس ہولناک حقیقت کا اندازہ ہی نہ تھا کہ آبدوز آگوستا 291 کے جنوبی کپتان پر ایمان نے تمام ایگزٹ ڈورز لاک کر ڈالے ہیں۔

☆☆☆

پاور بوٹ ان کے سامنے تھی، یہ ایک بند کپسول کی شکل کی چھوٹی آبدوز تھی جو ایک طاقتور بیڑی سے چلتی تھی۔ اس کے اندر صرف پانچ افراد ہی سہا سکتے تھے۔

بوٹ ایک خود کار آبائی ٹینکر کے ذریعے جھٹ کی دیوار سے نیچے اتاری گئی تھی، جس کے فرش پر سمندر کا پانی پھیلا ہوا تھا اور سامنے بھی پانی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا تھا۔

اب عابد کو نامہ کے آنے کا پوری شدت اور جتنی سے انتظار تھا، جبکہ کوچ جن کو اپنے سامی پر حیرت ہوئی کہ ان سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ ابھی تک کیوں اندر تھا؟ اس کی پیشانی پر ان گنت سلوٹس نمودار ہو گئیں اور دوسرے ہی لمحے جب اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش چاہی تو وہ ہکا بکا سارہ گیا اور پورے مختار اس کے منہ سے نکلا۔

”اوہ..... یہ کیسے ہو گیا؟“

”کیا ہوا؟“ عابد نے چونک کر اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

”دروازہ اندر سے لاک ہو گیا ہے۔“ کوچ جن نے جیسے دھماکا کیا اور یکفخت عابد کے چہرے پر ایک سناٹے اترتے چلے گئے۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔

”تنگ..... کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ مم..... میں تمہیں دلی مار دوں گا۔“ اس نے اپنے پستول کا رخ کوچ جن کی طرف کرتے ہوئے چلا کر کہا، وہ یہی سمجھا تھا کہ کوچ جن نے ہی کوئی چال لی کی ہے، مگر کوچ جن تب تک دروازے کی ایک سائیز پر تکیے جمونے سے ڈیکھتیل آپریٹر پر لگے نمبروں والے بنوں کو مچنی سے بچ کرنے میں مصروف تھا۔ مگر ہر بار اس ڈیکھتیل آپریٹر کی اسکرین پر سرخ رنگ میں ”LOCKED“ لکھا ہوا نظر آتا۔ بالآخر اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے عابد کے سامنے ایک اعصاب شکن انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دروازہ اب کبھی نہیں کھل سکتا۔ اسے کوئی اندر سے بند کر دیا گیا ہے۔“ یہ سن کر عابد کو یوں لگا جیسے اسنی آبدوز قبل از وقت ہی ایک دھماکے سے پھٹ گئی ہو۔ اس کے منہ سے بے پردہ نکلا۔

”تنگ..... کس نے..... تنگ..... کیا یہ؟“

تنگ..... کیسے..... ہوا یہ؟ کہیں..... تہ..... تم نے تو نہیں کیا کچھ؟“ الفاظ جیسے اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔ ”میرا بھلا کیا قصور ہے؟ میں تو خود تمہارے ساتھ ہوں میرا اپنا سامی بھی تو اندر رہ گیا ہے۔“ کوچ جن بولا۔ ”یہ سب اندر سے ہی کیا گیا ہے، شاید پچویشن روم سے۔“

”مگر کیوں؟ کیوں ایسا کیا گیا ہوگا؟ اس وقت تو سب کو اپنی جانیں بچانے کی پڑی ہوگی؟“

”یہ یقیناً اس پختی کپتان پر ایمان کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سب لوگ اس وقت اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہوں گے مگر پر ایمان یہ نہیں چاہتا ہوگا، وہ اپنی آبدوز کو تباہ ہونے نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم خود بھی تو اب تک اس پاگل جنوبی کپتان کے بارے میں اندازہ قائم کر چکے ہو گے۔“

”اب اس کا حل کیا ہے؟ جلدی بناؤ۔“ عابد نے اس کی بات کٹ کر غلٹ میں کہا، اس کی سانس مارے وحشت کے پھول رہی تھی، جیسے وہ طویل مسافت طے کر کے آیا ہو۔

”مم..... میری سامی اندر ہے۔ میں اس کے بغیر کبھی بھی اس منحوس دروازے سے رخصت نہیں ہوں گا۔ یہ بات ابھی طرح سے کان بول کے سن لو کوچ!“ عابد غم و غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ایک خوفناک اور متوقع اذیت ناک دکھ سے اس کی آنکھیں بھیکنے لگی تھیں اور جیسے اس کی چشم تر میں ناعمہ کا حسرت زدہ چہرہ بار بار دکھایا ہو رہا تھا۔ گویا کہہ رہی ہو۔

”الوداع میرے محبوب! ہمارا ساتھ بس اتنی سی باتیں! میرے وعدے کا پاس رکھنا، جو وقت رخصت میں آئے تم سے لیا تھا کہ عابد! ایک وعدہ کرو مجھ سے..... اگر خدا خواستہ ہم دوبارہ ایسا کڑا وقت آئے تو تم، میری فکر کرنے کے بجائے صرف اپنے مشن کو ہی ترجیح دو گے، مجھے نہیں۔ کرو وعدہ عابد! یہ تمہارے لیے ہے۔“

اور..... وقت واقعی تم تھا۔ آج اسے صبح معنوں میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ نامہ سے کس قدر شدید محبت کرنے لگا تھا۔

”اس کا کوئی حل نہیں رہا اب۔“ معا کوچ جن کی آواز اس کی دم پہ خود ساتوں سے ٹکرائی۔ ایسے میں عابد کو اس کی آواز بڑی سنگ دل، بڑی بے رحم لگی تھی۔ وہ آگے بولا۔

”یہ تان میٹوکل اور بانی کو ڈمک لاکڈ ہیں۔ اسے اب کوئی نہیں کھول سکتا، سوائے اس کے جس نے اسے لاک کیا

Dentist's Recommendation

10 PROBLEMS SOLUTION

MEDICAM

MEDICAM

■ $P_1, P_2, \dots, P_n$ are the n points of $\mathcal{P}$ ■ $\mathcal{P}$ is a k -set ■ $\mathcal{P}$ is a k -set

میڈی کیم ڈینٹل کریم جیسے۔۔۔ دانتوں کی لائف ٹائم انشورنس۔

ہے۔ دیکھو اوقت چتا جا رہا ہے۔ جلدی کرو۔“

کوچ جن گھبرانے لگا مگر عابد جیسے پاگل سا ہونے لگا تھا۔ مین لب بام، وہ ناعملہ سے اس طرح جدا ہونے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دل کیا روح تک یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ وہ اس طرح ناعملہ کو اس منحوس آبدوز میں چھوڑ کر چلا جائے جو کسی بھی وقت جہنمی بننے والی تھی لیکن ایسے میں اس کے وعدے کے الفاظ بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ اچانک کوچ جن نے اس کی کیفیات میں کم ہونے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر وار کیا۔ پستول عابد کے ہاتھ سے نکلا اور جمع شدہ پانی میں کہیں غائب ہو گیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے عابد کے چہرے پر ایک زوردار گھونٹنے کی شکل میں دکھایا۔

فرش پر سلیپ ہونے کی وجہ سے عابد سنبھل نہ سکا اور چند قدم لڑکھڑاکے پھسل کے گر پڑا۔ اس لمبے کوچ جن نے... بدعزت کپسول نما میٹر بوٹ آبدوز کی جانب پیش قدمی کی اور اس کی چھت والی دست پر جست بھری جدھر ایک حصہ سلائیڈ ہو چکا تھا۔ وہ اس کے راستے اندر داخل ہوا تو عابد نے بھی اسے فرار ہوتے دیکھ کر کھال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی طرح چھلانگ لگی۔ اسے کوچ جن اندر کنٹرول سیٹ سنبھالنے کے بعد چھت والی آبدوز بند کر رہا تھا، تب تک عابد بھی گویا اس کے سر پر تکی چکا تھا۔ دروازہ سلائیڈ ہوا مگر عابد نے اپنے جسم کو بوٹ کے منظر خلا میں اس طرح پھنسا دیا کہ دروازہ پورا نہ بند ہو سکا۔ یہ بات واضح تھی کہ جب تک دروازہ پورا بند نہ ہوگا، کپسول بوٹ کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا تھا۔

قرآن پڑھنے کے مین آخری لمحات میں اس ناکامی پر کوچ جن مارے سخت کے جنوں خیر انداز میں غرانے لگا اگرچہ بوٹ اسٹارٹ کر چکا تھا مگر پانچارہ سے کنٹرول سسٹم سے توجہ ہٹا کر عابد کے منظر کے لیے آنا پڑا۔ اس نے عابد کے ساتھ زور آزمائی شروع کر دی اور اس پر تازہ توڑ گھونٹے برسائے لگا۔ عابد کو بیک وقت دو مخالفوں پر ڈٹے رہنا تھا ایک طرف وہ دروازہ بند نہیں ہونے دینا چاہتا تھا دوسرے وہ کوچ جن سے بھی نبرد آزما ہو رہا تھا۔ وہ شاید اس کی فرار کی کوشش ناکام بنانے پر حلا ہوا تھا۔ لہذا وہ اس کے درمیان زور آزمائی جاری تھی۔ کوچ نے عابد کی گردن اپنے ایک ہاتھ سے دیوہی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پکڑے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا جس نے عابد کے وجود کو خلا میں الٹائے رکھا تھا۔ کوچ بھی

جسمانی لحاظ سے عابد کے مقابل ہی تھا۔ صرف قد سے مار کھاتا تھا، مگر جسم اس کا خاصا گٹھا ہوا تھا۔ زور آزمائی کے دوران دونوں کی غرائشیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ عابد کو کوچ کی اٹھکیوں کے ناخن اپنی گردن میں بیوست ہوتے محسوس ہو رہے تھے اور دم بھی گھٹ رہا تھا۔ پانچارہ اس نے اپنے ایک ہاتھ کو روف کی چوکت سے ہٹایا اور خود پر بھٹکے ہوئے کوچ کے منہ پر زوردار گھونٹا بڑھایا۔ اس کے طعن سے کراہ سی برآمد ہوئی، مگر اس مکار شخص نے عابد کی گردن نہ چھوڑی، البتہ اس کا ایک مقصد حل ہو گیا۔ اس حملے سے عابد کا توازن بگڑ گیا، اور کوچ نے اسے یہ آسانی اندر دھکیل دیا۔ عابد بوٹ کے اندر ایک حصے میں جا پڑا، اس نے سنبھلنے کی کوشش چاہی، اس دوران کوچ بھی اندر داخل ہو کے ایک ہٹن دبا چکا تھا۔

بہلی سرسراہٹ کی آواز ابھری تھی اور ایک بیک دو حملہ ہو چکا پندرہ ہوئے۔ ایک تو روف کا دروازہ سلائیڈ ہو کے بند ہوا دوسرے عابد بوٹ کے جس حصے میں گرا تھا، وہ ایک دم ایک شیشے کی دیوار سے پار ٹیشن ہو گیا۔ یعنی اب کوچ جن اور عابد کے درمیان شیشے کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ فوری طور پر عابد، کوچ جن کی اس چال کو نہ سمجھ سکا۔ جب وہ اپنے آگے سیٹ پر موجود کوچ پر چھپا ہوا شیشے کی مذکورہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ تب اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اسے دشمن، ایک جگہ پر محبوس کر چکا ہے۔

اسی لمحے بہلی گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری اور بوٹ میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ بفر روم کے کتبے پر چھلکتی ہوئی آگے بڑھی اور کھلے پانی میں اتر گئی۔ عابد جونیئرز کے سے انداز میں چپخنے لگا اور ساتھ ہی اپنا سر شیشے کی دیوار پر دھک مارنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ یا تو وہ شیشہ توڑ ڈالتا یا پھر اپنا سر شیشے پر پاش کر ڈالتا۔ دونوں میں کوئی ایک مرحلہ شاید قریب تھا کہ عابد والے پارٹیشن میں کوئی کیس ہی بھرنے لگی۔ عابد کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا، وہ کھانتے کھانتے بے حال سا ہونے لگا اور اس کا سر بھی چکرانے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ کنٹرول سیٹ پر بیٹھے ہوئے کوچ نے عابد کے حصے میں کوئی کیس چھوڑ دی تھی۔ جس وقت عابد کی آنکھیں، غنودگی کے باعث بند ہونے کے قریب تھیں، اس نے شیشے کے پار کوچ جن کو دیکھا جو ذرا گردن موڑے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے مکر وہ چہرے پر بڑی بھیاں تک مسکراہٹ رکھنا تھی۔ اس کے بعد عابد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

یہاں تک نہیں پہنچی تھی، اس کا اخراج ابھی سبیل قمری تک ہی محدود تھا۔ تاہم حفظ باقاعدہ کے تحت انہیں بھی کوچ جن کے اس عمل کی پیروی کرنا پڑی تھی۔ بہر طور، پارکر اس پر بھوکے شکرے کی طرح جھپٹا تھا۔

نامہ وقتی طور پر حواس باہر ہو گئی تھی، مگر پارکر کے جھپٹنے ہی اس نے خود کو اس کی گرفت سے بچانے کی سعی بھی کی تھی۔ پارکر نے نفرت سے اپنے دانت جھپٹتے ہوئے نامہ کے چہرے پر زور دار کھونسا رسید کرنے کی کوشش کی تھی، مگر بروقت ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے نامہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ پارکر کا کھونسا فرش پر پڑا اور مارے تکلیف کے اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ نامہ نے پھر اسے سنبھلنے نہیں دیا اور اسے ایک طرف دھکیل کر پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی گن اٹھانے کو دوڑی۔ پارکر نے اس کی ٹانگ دیوچ لی۔ وہ پھر منہ کے بل گرنے لگی مگر اس نے فوراً ہی جھپٹ لیا۔ اس نے خود کو کسی چوٹ سے بچانے کے لیے فوراً اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے بچایا۔ اب اس کے دونوں ہاتھوں کی برکت ہوئے تھے۔ ایک ٹانگ پارکر نے دیوچ رکھی تھی۔ نامہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے اپنے وجود کا بوجھ ڈال کر دوسری ٹانگ فرش سے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے پارکر کے چہرے پر رسید کر دی جو خاصی زور دار ثابت ہوئی۔ اس صدمہ نے پارکر کے چہرے سے بھی ربٹ ماسک (کیمیکل گیس ماسک) اتار پھینکا، اور گرفت کمزور پڑتے ہی اس نے خود کو کر اپنی ٹانگ چھڑائی اور پھر گن اٹھانے کو لپکی، جیسے ہی اس نے گن اٹھائی پارکر بھی وحشیانہ انداز میں خراتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا مگر تب تک نامہ نے گن ایک لی تھی اور ٹال اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے لٹھ کی طرح گن کھائی اور اس کا کندا پارکر کی گال پر پڑی سے ٹکرایا۔ "بھچاک" کی آواز ابھری اور پارکر کی کھوپڑی چھین گئی۔ وہ کراہ مچا چیخ کے ساتھ گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

نامہ اس اعصاب شکن معرکے کے بعد چند لمبے دیوار کے سہارے کھڑی گہری گہری سانس خارج کرنے لگی پھر احتیاط کے پیش نظر اس نے اپنا ماسک اٹھا کر اپنے چہرے پر چڑھا لیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب آخر ہوا کیا تھا؟ اس کے اندازے کے مطابق پارکر کو عابد اور کوچ جن کے ساتھ اس وقت بغیر دم میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا یہ وہاں سے کسی وجہ کے باعث واپس پلٹ آیا تھا؟ مگر کیوں؟ پھر عابد

چند منٹ بعد ہی یہ پھسول نما موٹر بوٹ آبدوز سمندر کی گہرائیوں میں سفر کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ آگوستا 291 سے دور ہوئی جا رہی تھی۔

☆☆☆

انٹراکام پر عابد کا پیغام پاتے ہی جیسے نامہ نے سکون کا سانس لیا اور لیور چھوڑ کر وہ عابد کے بتائے ہوئے آبدوز کے بغیر دم والے حصے کی طرف دوڑی تھی۔ بھاری گن اس کے ہاتھ میں تھی اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ بے رحم تقدیر، عابد اور اس کے درمیان، کیسے نازک موقع پر ایک اذیت ناک جدائی کا سفاک گلہاڑا چلا چکی تھی۔

ادھر کوچ جن کا پھنسا ہوا سامی پارکر، آبدوز کے اینجین پر کپتان پریشان کا وہ پیغام سن چکا تھا اور اس کا چہرہ بھی ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ مایوس ہو کر وہ پلٹا تو اس کے تن بدن میں عابد اور بالخصوص اس کی ساتھی نامہ کے لیے نفرت کی ایک لہریں ابھری کیونکہ انہی دونوں کی وجہ سے یہ سب لوگ ایسے خطرناک حالات کا شکار ہو گئے تھے اور دوسرے ہی لمحے اس کے سر پر خبیثانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اسے بہر حال اس بات کی خوشی تھی کہ ان دونوں اہم دشمنوں میں سے ایک دشمن بھی اسی آبدوز میں ان کی طرح جھبوس ہو چکا تھا۔

اب بغیر دم کے دروازے پر زور دہائی کرنا عبث تھا، کچھ سوچ کر وہ تیزی سے پلٹا۔ وہ نامہ پر قابو پانا چاہتا تھا، تاہم اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری گن بھی تھی۔ دفعتاً اسے سامنے مل کھائی ٹنگ اور جھکی ہوئی چھپش والی راہ داری سے کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ وہ یکدم دیوار کے ساتھ لگ کر، دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ اس کا اٹھنا درست ثابت ہوا اس نے سامنے سے نامہ کو دوڑتے ہوئے آگے دیکھا۔

نامہ کو دشمن (پارکر) کی کھیات کا اندازہ تک نہ تھا کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھتے ہوئے ہی کہ عابد نے کوچ جن اور پارکر کو اب تک گن پوائنٹ پر اپنے تالچ کر رکھا ہوگا اور اسی جھونک میں وہ ذرا موڑ کاٹ کر جیسے ہی بغیر دم کے دروازے کے قریب بڑھی پارکر نے فقط اپنی ایک ٹانگ نامہ کی راہ میں اسٹرا دی اور وہ اس سے الجھ کر منہ کے بل فرش پر آ رہی۔ بے اختیار نامہ کے حلق سے ایک چیخ خارج ہوئی۔ گن اس کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر دوڑ تک لڑھکتی چلی گئی۔ ربٹ ماسک (کیمیکل گیس ماسک) بھی اس کے چہرے سے اتر گیا۔ شکر تھا کہ ابھی وہ زہریلی نیور و گیس

اور کوچ کدھر تھے؟ وہ متفکری ہونے لگی بہر طور اس نے بغیر دم کی طرف دوڑ لگا دی۔ مگر وہاں دروازہ بند پا کر وہ کھبرا سی گئی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ بند تھا۔ اس نے عجم کوشش کر ڈالی۔ دروازہ نہ کھلا تو اس نے چلا چلا کر عابد کو بکارنا شروع کر دیا مگر جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ ہانپنے لگی۔ اس کے دل و داغ میں تشویش کی لہری اٹھی، سو طرح کے اندیشے اس کے اندر سر اٹھانے لگے۔ کیا عابد کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا ہوا اور عین آخری لمحات میں کوچ جن اس کے ساتھ کوئی چال چلنے میں کامیاب ہو چکا تھا؟ اگر بد قسمتی سے ایسا ہوا بھی تھا تو پھر خود عابد کہاں تھا؟ کہیں خدا غواست اسے کوئی جانی نقصان تو نہیں پہنچا؟ اس نے فوراً عابد کی سلامتی کے لیے زیر لب دعا مانگی۔ کلمات ادا کیے اور دوسرا خیال اس کے پر سوچ ذہن میں بیکر ا بھرا کہ ممکن ہے اسے ایسا کوئی موقع مل سکے اور وہ اس کے ساتھ کیے گئے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے خود ہی نکل گیا ہو؟ یہ سوچ کر اس کے اندر فطری طور پر ایک کنگ سی جاتی مگر صرف ایک لمحے کے لیے..... پھر اس نے پر عزم ہو کے خود کو موجودہ حالات کے لیے تیار کیا کہ اب آگے جو کچھ کرنا تھا، اسے اکیلے ہی کرنا تھا۔ مٹی اور ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔

اسے اندازہ تھا کہ اس وقت آبدوز اپنے حالات کا شکار تھی کہ عملے کو اپنی یا آبدوز بچانے کی فکر لاحق تھی اور اس کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سب لوگ تھکا دھوکے طرف مصروف ہوں گے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا، کیونکہ یہ یحیٰں کو یہ حقیقت معلوم ہو چکی تھی کہ کوچ جن آبدوز سے کوچ کر چکا تھا اور دشمن بھی نہیں پکڑے جاسکے تھے اب تک۔

نامہ خطا روی ہے چلتی ہوئی ایسے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچی جس کے اندر سے پکتان پر یحیٰں کی گونجیلی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ دم سادھے سننے لگی۔

☆☆☆

پکتان پر یحیٰں کا ایسی صورت حال اور ایسے سبب سے نمٹنا اس کی ملازمت کا حصہ تھا۔ لہذا وہ جانتا تھا کہ اسے ان پر خطر حالات کو مات دینے کے لیے اپنا سارا علم بروئے کار لانا ہو گا۔ آبدوز کے الارم بج رہے تھے، اس کی ضد اور حکم کے سامنے پورا عملہ اب اس کے ساتھ تھا۔ وہ چند ایکسپلٹ کو اپنے ساتھ لے کر سیل تھری کی طرف بھاگا۔ سیل

بہر طور پر یحیٰں نے انٹر کام یا ٹیکو فون پکڑ لیا اور جلدی جلدی اعلان کرنے لگا۔ "ٹیوب نمبر تین اور چار میں سمندر کی آواز آ رہی ہے اور یہاں ٹیکس بن رہی ہے۔ خبردار۔ کوئی بھی سیل تھری کا رخ نہ کرے۔"

آبدوز کو بے پانیوں سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی گئی جو ناکام ثابت ہوئی۔ اس کوشش میں آبدوز کو واضح طور پر ایک جھٹکا محسوس ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اٹھی بھی رہی اس وقت پر یحیٰں کا ایک اچھا ہی سرخ بن پر تھا جس پر جلی حروف میں تین لکھا تھا، اس کا سرخ رنگ کا پینڈل بھی تھا جو تین نمبر ٹیوب کا ڈھکن کھولتا تھا۔ وہ بن دبا کر ڈھکن اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران کیمیکل کے ری ایکشن سے بننے والے دھوئیں کی نشاندہی کرنے والا الارم بجنے لگا۔ میزائل روم کا عملہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ کیمیکل ٹیکس پوری آبدوز میں نہ پھیل جائے، میزائل روم کے راستوں کے ڈھکن بند کر دیے گئے۔ پر یحیٰں انٹر کام کے ذریعے پریشان عملے کو اب تسلیاں دینے لگا مگر اس کی

مکڑی اپنے جالے میں

کیوں نہیں پھنستی...؟

مکڑی کے جسم میں چھوٹی چھوٹی تلیاں یا ٹیوٹیں ہوتی ہیں جنہیں تار پٹانے والے اعضا کہتے ہیں۔ ان ٹیوٹوں میں سے وہ ترقیق مادہ نکلتا ہے جو ہوا کے سے تار یا دھاگہ بن جاتا ہے، مکڑی انہی دھاگوں سے جالافتی ہے۔ یہ دھاگے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک دھاگا لیس دار ہوتا ہے۔ کبھی، پتھر اور دوسرے کڑے مکوڑے اسی دھاگے میں پھنستے ہیں جبکہ دوسرا دھاگا لیس دار نہیں ہوتا۔ مکڑی جالے پر چلتی ہے تو اسی دھاگے پر چلتی ہے، اس لیے وہ اس جالے میں نہیں پھنستی۔ اگر کبھی غلطی سے مکڑی کا پاؤں اس لیس دار دھاگے پر پڑ جائے تو اس کا جسم دھاگے سے چپک جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے جسم سے تار جیسا ایک تار نکالتی ہے جس سے اس کا جسم دھاگے سے چھوٹ جاتا ہے۔

مرسلہ: احسان، مینا، نوالی

یاد رہے

باپ لڑکے سے کہتا ہے: "آج تمہاری منجری طرف سے مجھے پر چلا ہے۔"
لڑکا: "ابو آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں امی کو نہیں بتاؤں گا۔"

مرسلہ: کاشف حسین، کراچی

جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

☆☆☆

میرا میں سفر کرتے ہوئے..... رات کا آخری پہر آن پڑا تھا۔ میں نے زخمی امیر حسن اور نو مسلم بازو کو جس کا اب اسلامی باہر میں نے بانور کھا تھا، بیت صفائے کی طرف گامزن تھا۔

پوچھنے تک یہ تینوں اپنے محفوظ ٹھکانے تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن انہیں یہاں چھوڑنے کے کچھ گھنٹوں کے بعد اکیلا تیونائی کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

گروپ کے ساتھیوں نے حسن اور بالخصوص بازو (جواب بانوگی) کو کھلے دل سے اپنے ٹھکانے پر خوش آمدید کہا تھا۔ اپنے محدود وسائل کے مطابق حسن کا خاطر خواہ علاج کیا جانے لگا تھا اور بانو (بازو) بھی پوری تن دی کے ساتھ اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔

آواز کا کھوکھلا پن اس کی لرزتی آواز سے صاف عیاں تھا۔ جبکہ وہاں سب لوگ آنے والے ٹوٹن ک خطرے سے پوری طرح باخبر تھے۔

آبدوز صبح آپ کی طرف اٹھنے کی حالت میں تھی اور اس کا منہ اوپر کی طرف ہو چکا تھا۔ اسی لمحے آبدوز کے اگلے حصے میں سے دھاگے کی آواز ابھری۔ وہاں موجود سب کی دہشت کے مارے جنہیں نکل گئیں، ایک نے چلا کر کپتان سے کہا۔

"تم ایک پاگل جنونی انسان ہو، اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبو گے۔ ہم سب لوگ کوئی معمولی انسان یا مسافر نہیں ہیں، بلکہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے ٹاپ پروفیشنل ہیں۔ ہم زندہ رہیں گے تو ایسی جہیوں آبدوزیں بتائیں گے۔ تم اپنی دھرمی سے ہمیں ضائع کر دو گے۔ یہ ملک و قوم اسرائیل کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔"

پریمان نے اس شخص کو پہلے تو خشکیوں نظروں سے گھورا پھر کچھ سوچ کر قہر سے بولا۔ "تم لوگ بلا وجہ زور ہے ہو۔ میں پہلے بھی اس شخص کی صورت حال کا سامنا کر چکا ہوں۔ مجھے امید ہے....."۔ لیکن انہوں نے ہماری سونڈ میں ٹھس کر جو گل کھلایا ہے، میں اس پر قابو پا لوں گا، بس اتم سب میرا ساتھ دو، میرے پاس اس کا ایک اندھل ہے۔ جب جسم کا کوئی اعضاء کار ہو جاتا ہے تو اسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اس کا زہر پورے جسم کو متاثر نہ کرے۔ اب نہ ہے۔ جو میزائل خرابی کا باعث بن رہا ہے میں اسے فائر کرنے والا ہوں، جانتے ہو کہاں؟"

آخر میں اس کا لہجہ ہولناک ہو گیا۔ وہاں موجود سب اس کی طرف ایک تک دیکھنے لگے۔ وہ آگے بولا۔ "میں اس میزائل کو ایٹمی ہندو گاہ بن غازی پر داغنے والا ہوں، کیونکہ فی الوقت، فلسطینی مجاہدین کی سب سے زیادہ امداد کا ذریعہ یہی اسلامی ملک ہے اور اسی ہندو گاہ کے راستے جہازوں میں ان کے لیے امداد، دوا و دگر حیلہ یا فلسطین لائی جاتی ہے۔"

یہ سن کر سب کو کافی حوصلہ ہوا اور جب نے پریمان اور گریٹر اسرائیل کے حق میں نعرہ بلند کیا۔ دروازے سے لگی، سر تا پا سماعت بنی تاہم اس یہودی کپتان پریمان کے ناپاک عزائم جان کر ایک لمحے کو لرز اٹھی مگر دوسرے ہی لمحے تاہم نے نفرت سے ہونٹ سیکنے کر اپنے اس پختہ عزم کا اعادہ کیا کہ وہ اس یہودی کپتان پریمان کو کسی ایسے ناپاک ارادے میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ چاہے اس

جس کے مطابق حذکرہ بالا فلسطینی تنظیموں کو الگ الگ ان کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف مہمات پر روانہ کر دیا گیا تھا۔

جبکہ خود اپنے ذمے یاسر العربی نے ہگانہ کے سربراہ، بانی اور یہودی قوم کے موروثی ہیرو، آئزرمن ہیری جونیز کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، چونکہ یہ نسبتاً مشکل اور پرخطر مہم تھی، نیز اس کے مقابلے میں کھاگ اور انتہائی تربیت یافتہ فلسطینی کمانڈرز کی ٹیم کا شامل ہونا ضروری تھا، جو خود بھی ایک بڑی افرادی قوت کی حامل ہوتی، لہذا یاسر العربی نے یہ اہم ترین مہم اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔

بڑی جانفشانی اور صبر و استقامت اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر یاسر کے ایک خفیہ گروپ نے ہگانہ آرمی اور آئزرمن کے ٹھکانے ”دائنٹ کیسل“ کا پتا چلایا تھا۔ یہ جگہ نہیں اس کی دو کاؤنٹر ٹیلی جنس ایجنسیز، الیا بیت اور شن بیت کا بھی کہ وہ کہاں کہاں بیٹھ کر کل کھلاتی پھر رہی تھیں اور دونوں ایجنسیوں ہی درحقیقت ہگانہ کے دو ایسے بازو تھیں جن کے باعث ہی ہگانہ قائم تھی۔ اگر یہ دونوں بازو کاٹ دیے جاتے تو ہگانہ کو چلنے میں کافی وقت لگتا اور تب تک اس کا صفایا بھی کیا جاسکتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ”غضب خدا“ خود ان دنوں فلسطین کے اندرونی معاملات اور کچھ ہنگامی حالات جیسے مسائل میں اٹھی ہوئی تھی، جن سے یاسر العربی کو سرائفٹھانے کی فرصت نہیں رہی تھی۔ یہودیوں کو ایک سازش کے تحت فلسطینی علاقوں میں جانا اور فلسطینی عوام کے لیے خود ان کی زمین ان پر چھگ لیا اور جس کو ذرا دھماکا کر مکاری اور چال بازی سے اپنی ہی الما کے اوتھنے پونے یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کرنے پر مجبور کرنا یہ وہ عجیب مسائل تھے جس سے یاسر العربی سخت فکر مند تھے۔ اس کے لیے انہوں نے عالمی سطح پر بھی صدائے احتجاج بلند کی اور اپنے طور پر بھی وہ یہودیوں کی اس سازش کو ناکام بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

”غضب خدا“ چونکہ تحریک آزادی فلسطین میں مجاہدین کا سب سے بڑا گروپ تھا، اس پر ایسی حساب سے زیادہ مسکنے اور ذمے داریاں عائد تھیں۔ یہی سبب تھا کہ بیرونی معاملات کے مشن اور مہمات میں غضب خدا نے دیگر گروپوں کو مصروف کر رکھا تھا۔

ہگانہ کا قلع قمع کرنے کے لیے یاسر العربی خود بھی تیار تھا۔ لہذا اسی دوران جب اس کے کسی ساتھی نے اسے محسن اور بازو (ہانو) کے بارے میں بتایا کہ وہ آج کل بیت

اس دوران ہانو نے محسوس کیا کہ محسن کا چہرہ کچھ اترا اترا سا رہنے لگا تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا تھا کہ شاید بیماری کے باعث اور کچھ حالات نے محسن کے ذہن پر منفی اثر ڈالا تھا۔ بالآخر اس نے ایک روز پوچھ ہی لیا۔ بہت پیار سے اس نے محسن سے کہا۔ ”محسن! کیا بات ہے؟ تم کچھ اداس سے نظر آنے لگے ہو؟ کیا مجھ سے کچھ غلط ہو گیا ہے؟“ محسن اس کی بات پر چونکا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے ہانو کے معصوم سے دلکش چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”نہیں بھلا تم سے مجھے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔“ پھر اس کے چہرے پر پیکا پن سا اترا آیا اور وہ اسی لہجے میں آگے بولا۔ ”ہانو! مجھے بس ایک قلق سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے ساتھی اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور میں یہاں آرام کر رہا ہوں۔ یہی بات مجھے اندر ہی اندر محسن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے محسن کا چہرہ نہایت آزدہ نظر آنے لگا۔ ہانو سے اس کے اندر کا یہ دکھ دیکھا نہ گیا۔ تڑپ کر بولی۔ ”محسن! میں اللہ تعالیٰ سے ہر روز تمہاری صحت یابی کے لیے دعائیں مانگ رہا ہوں کہ اللہ آپ کو مکمل اور جلد سے جلد صحت عطا فرمائے اور آپ ایک بار پھر دشمنوں کے خلاف سر بٹک ہو جائیں اور آپ کو اس مہم میں، خود میں بھی آپ کے شانہ بشاندہ ہوں۔“

”آمین!“ محسن زیر لب بولا۔

”تم آمین!“ ہانو نے بھی دہرایا۔

☆ ☆ ☆

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، فلسطینی مجاہدوں کے کمانڈنگ اینڈ میجر گروپ ”غضب خدا“ کے سربراہ ٹیلی الوزیر کے اسرائیلیوں کے ہاتھوں بھانہ قتل (شہادت) کے بعد اب اس کی ڈوران کے نائب یاسر العربی کے ہاتھوں میں آگئی تھی، جو ایک پختہ العمر آدمی و قاصد عرب فلسطینی مجاہد تھے، اور کچھ عرصہ قبل انہوں نے تل ابیس میں ایک مسلم تاجر کے مکان کے تہ خانے میں، تحریک آزادی فلسطین کے مختلف گروپس، بشمول بی ایل ایس او، المجاہدین اور بی فرنٹ وغیرہ کی ایک اہم میٹنگ کال کی تھی۔

اس اہم میٹنگ میں اسرائیلیوں اور بالخصوص ان کی کڑی کے چال کی طرح چمکی ہوئی خفیہ ایجنسیوں موساد، ڈیوڈ اسٹار، اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس، ہگانہ آرمی اور کاؤنٹر انٹیلی جنس ایجنسیز۔ الیا بیت اور ”شن بیت“ وغیرہ کے کالے کروتوں کا راز فاش کرتے ہوئے نئی حکمت عملی بتائی تھی،

مصفانہ میں موجود ہیں تو وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یاسر العربی، محسن کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے گروپ میں ایک نڈر، جوشیلا اور بہادر نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور شبید ظلیل الوزیر کے بعد اپنے گروپ کی باگ اس کے ہاتھوں میں تھی (آج کل گروپ کی قائم مقام لیلیٰ آفندی تھی) یاسر کو یہ بھی معلوم تھا کہ محسن آج کل زخمی حالت میں تھا۔ بہر طور اس نے محسن کے نام ایک پیغام لکھا اور اپنے ایک ساتھی کو قاصد بنا کر بیت صفانہ کی طرف روانہ کر دیا۔

☆☆☆

ڈیوڈ اسٹار اسٹیٹ کی اہم کمانڈر پوسٹ پر لیلیٰ، باقر اور ان کے ساتھی، اگرچہ کامیابی سے اپنا قبضہ قائم کر چکے تھے مگر پانچویں اسرائیلی شوترز کا پراسرار "غیاب" ان کے لیے بے چینی کا باعث بنا ہوا تھا۔

"اس پانچویں دشمن کو تلاش کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔" لیلیٰ نے پر غور لہجے میں کہا۔ باقر بولا: "محسن ہے وہ یہاں سرے سے موجود ہی نہ ہو ہم بلاوجہ اس کی تلاش میں منادقت ضائع کریں۔ ہمیں اپنی ہم جاری رہنی چاہیے۔" لیلیٰ کی بات پر علی نے بھی گویا توثیق کرتے ہوئے لیلیٰ سے کہا۔

"میری مناسب رہے گا عزیز میری جگہ کیونکہ کمانڈر پوسٹ پر ہم زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے، یہ ہمارے محسن کے لیے ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لیے بھی خطرناک اقدام ہوگا۔"

لیلیٰ ہونٹ میچھے سوچنے لگی۔ پھر اس نے پیش قدمی کا حکم دیکھ ڈالا۔ کمانڈر پوسٹ کے مورچے کی منڈیروں پر اب اس کی سبکی کی سنہری کرنیں پڑنے لگی تھیں۔ یہ سب ایک درمیانے سائز کے کمرے میں موجود تھے۔ پانچویں دشمن کو انہوں نے وہاں تلاش کیا تھا، بالآخر یہ چاروں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اب اپنی اسٹینڈرڈز نہیں کھول کر اپنی کمانڈر کس میں ڈال کر چھٹی نہیں تمام لیں۔

کمانڈر پوسٹ پر قبضے کے بعد یہ سب ایک طرح سے اسٹیٹ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ علی نے خار دار بازو اٹھی جس میں خطرناک ہائی ٹینشن دھڑ دھڑ رہی تھی۔ بائیں جانب صحرائی میدان تھا جبکہ دائیں جانب جنگل تھا۔ وہ اسی رخ پر آگے بڑھے۔

☆☆☆

گزشتہ ناکام مہم سے، یہ خیر و عافیت واپسی کے بعد لیلیٰ اور باقر کو یہاں کا سارا نقشہ ازبر تھا، باوصف اس کے حسن علی کی کجبودوں کے قارم وانی رہائش گاہ سے روانہ

ہوتے وقت انہوں نے اپنا ہوم ورک بھی کر رکھا تھا اور ان کا مشن صرف ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر ہی تباہ کرنا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بڑے اسرائیلی شیطان، نہایت سفاک اور تنگ انسانیت اور ہزاروں بے گناہ فلسطینیوں کے قاتل جنرل آنزک فرناش کو بھی واصل جہنم کرنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھے اور اس بار بالخصوص لیلیٰ اور باقر نے تہیہ کر رکھا تھا، وہ اب ناکام نہیں ہوں گے، بلکہ مشن پورا کرنے کے لیے وہ اپنی جانوں پر بھی کھیل جانے سے دریغ نہیں کریں گے۔

بہر طور، یہ چاروں دن کی روشنی پوری طرح پھیلنے سے پہلے پہلے اسٹیٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ اس بار انہوں نے ہیڈ کوارٹر پر نقب لگانے کے بجائے، سب سے پہلے اسٹیٹ کا رخ کیا تھا اور یہاں وہ ایک رہائشی کالونی میں داخل ہوئے۔ یہاں انہیں کچھ مخصوص درودی پوش اسرائیلیوں کی آمدورفت دکھائی دی تھی یہاں دو کلکٹرز کی رہائشی کالونیاں تھیں، ایک آفیسرز کالونی اور دوسری اسٹاف یعنی کوارٹر کالونی تھی۔

ایک سربراہان کی علی کے تحت، ان چاروں نے سب سے پہلے ہیڈ کوارٹر کے اندر داخل ہو کر وہاں خطرناک تباہی پھیلانے والے قائم بم نصب کرنے تھے اور اسی دوران جنرل آنزک فرناش کو بھی تلاش کر کے جہنم واصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

اس بار تیونائی آپریشن کو "اسات" کے بجائے مکمل طور پر "کمانڈوز" کی صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یعنی جو کچھ کرنا تھا، خفیہ طور پر کرنا تھا۔ پانچویں چاروں جیسے چھپاتے اپنے اصل ٹارگٹ، یعنی دشمن کی عمارت کی طرف بڑھنے لگے، جو یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھی اور انہیں صاف نظر بھی آرہی تھی۔ ان کے خیال کے مطابق یہ اندر داخل ہونے کا بہترین وقت اور موقع تھا۔ لیکن ہوری تھی اور ایسے میں فطری طور پر ہر کوئی "السیا" ہوا سا ہوتا تھا۔

ڈیوڈ اسٹار کی عمارت چونکہ ایک بڑی اسٹیٹ کے اندر ہی تھی، مگر باوجود اس کے وہاں پہرا نظر آتا تھا لیکن اب لیلیٰ وغیرہ کو خاطر خواہ طریقے سے گھات مل چکی تھی۔ اسی لیے وہ محتاط روی کے ساتھ اپنی پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھے۔ کسی کے یہاں شاید تصور میں بھی نہ ہوگا کہ چار فلسطینی کمانڈوز اس وقت ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ میں دندناتے پھر رہے تھے۔ وقت متقاضی تھا کہ یہ سرعت ہیڈ کوارٹر کے اندر داخل ہوا جائے۔۔۔ یہ صورت دیگر کسی وقت بھی یہاں کمانڈر پوسٹ کے مورچے سے

متعلق اطلاع پہنچ سکتی تھی اور پھر کوئی بعید نہ تھا کہ آنا
فانا پورے اسٹیٹ میں ان کی ڈھنڈی پڑ جاتی۔

ہیڈ کوارٹر کے قرب و جوار میں کچھ چھوٹی بڑی گاڑیاں
کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ لٹلی کی عطا بی بی تیزی کے ساتھ
گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اور دفعتاً وہ چوکی۔
اس نے ایک آدمی کو ایک قریب کھڑے ٹرک کی طرف
بڑھتے دیکھا۔ یہ ٹرک نسبتاً الگ تھلک مقام پر کھڑا تھا۔ اس
سے محض چند قدموں کے فاصلے پر یہ چاروں ایک چپو ترا نما
دیوار کے ساتھ پینے کھڑے تھے۔ ٹرک کو دیکھ کر لٹلی کے
ذہن طبع میں ایک امید افزا ٹھٹک ابھری تھی۔ اس کی وجہ
یہ تھی کہ وہ آدمی ہیڈ کوارٹر کے جس حصے سے نمودار ہوا تھا
اس کا اس نے اوپر اٹھنے والا بڑا سا دروازہ دیکھا تھا۔ یہ
نہیں تھا جس کا مطلب لٹلی کی سمجھ میں بھی آیا تھا کہ یہ لٹلی
اس ٹرک کو کسی ضرورت کے پیش نظر اشارت کر کے اندر
لے جانے کا ہی ارادہ رکھتا تھا۔

چنانچہ لٹلی پیش قدمی روک کر بغور اس کی طرف بچھے
لگی، وہ آدمی اپنے حالی میں جھومتا جھومتا ٹرک میں سوار ہوا
اور اسے اشارت کرتے ہوئے تین بار ایکسپلریشن دیا کر ریس
دینے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے لٹلی کا دل یکبارگی زور سے
دھڑکا۔ ٹرک کچھ اس انداز میں دیکھ کر کیا جانے لگا کہ اس کا
رخ مذکورہ راستے کی طرف ہو گیا تھا۔ یہاں آج تک لٹلی نے
سر رات کی سرکوشی میں اپنے ساتھیوں کو جس سے اشارہ
کیا۔ ٹرک تھوڑا بیک ہوا اور تب تک یہ چاروں کمانڈر محض
دوی سے جھکے جھکے پیچھے ہوتے ٹرک کی طرف بڑھے۔ اس
دور ان انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ
ڈرائیور کی نظر ان پر نہ پڑے، کیونکہ بیک ہوتے ٹرک کا
ڈرائیور سڑک کنارے انہیں دیکھ سکتا تھا۔

ٹرک روک کر پیچھے ہی کھلے گیٹ کی طرف آگے بڑھا
یہ چاروں اس کے اندر چھار ہو چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی
ٹرک اندر تھا مگر دروازہ دوسرے ہی کھلا رہا۔ تاہم نسبتاً اب یہ
باہر کے مقابلے میں یہاں کچھ محفوظ تھے۔ پھر بھی احتیاط کا
دامن سنبھالے رکھتے ہوئے، نہایت چہرتی کے ساتھ لٹلی
کے اشارے پر عملی اور عبداللہ تیزی سے حرکت میں آئے
اور انہوں نے ڈرائیورنگ کین میں مٹ کر ڈرائیور کو غافل
کیا۔ اس کے بعد اس کے بے سدھ بڑے سے دیوار کے
کرسمیں کونے میں چھپا کے ڈال دیا، یہ جگہ بڑے سے
میراج بی کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

تیس تھا سے یہ آگے سر کے اور جلد ہی انہیں یہاں

عمارت کے اندرونی گوشے میں داخل ہونے کا راستہ دکھائی
دے گیا جو ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ بہت تیزی اور
گرہ قدمی سے انہوں نے یہ راہداری طے کی تھی۔ اس کے
بعد یہ عمارت کے اندر پوری طرح سے داخل ہو چکے
تھے۔ ان کی حتمی الامکان کوشش یہی تھی کہ کسی سے ٹاکرا
ہوئے بغیر یہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام نمٹا کے نکلے اور جزل
فرناش کو تلاش کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی
کوشش کریں۔

یہاں ابھی چہل پہل کم ہی نظر آ رہی تھی اسی لیے
بہت تیزی کے ساتھ یہ اپنا کام نمٹانے میں مصروف
ہو گئے۔ عمارت کے اہم اور خفیہ گوشوں میں خطرناک تباہی
پھیلانے والے ٹائم بم فٹ کیے جانے لگے۔ ایک موقع
پر لٹلی جب باقر کے ہمراہ ہیڈ کوارٹر کے وار روم کے اندر دو
عدد بم فٹ کر کے واپس پلٹنے لگی تو اچانک اس کی نگاہ دو
اسٹیکوں پر پڑی جو آپس میں ہتھتے اور باتیں کرتے
ہوئے اس کے سامنے داخل ہو رہے تھے اور لٹلی کو دیکھتے ہی
پہلے تو اس کے سر پہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور
دوسرے ہی لمحے انہوں نے بیک وقت اپنے ہوشروں سے
ہتھیار نکالنے کی کوشش کی لیکن لٹلی نے اپنی کمانڈر کے
کاندھے والے ہلٹ سے ایک چھرا نکالتے ہی ان کی طرف
اچھال دیا جو سیدھا ایک کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ
تورا کر گرا، دوسرا پستول نکال چکا تھا اور اس کی نال کا رخ
لٹلی کی طرف کیے ہوئے ہی تھا کہ لٹلی نے یہاں بھی بجلی کی
سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بھی اپنی آستین میں
چھپا ہوا چاقو پھینک کر ہلاک کر ڈالا۔ لٹلی کے ساتھ ہی اس کا
ٹھکانہ دونوں نے ان کی لاشوں کو کسی کونے میں دیکھا دیا۔

ڈرائیور بعد باقر اور عبداللہ بھی اپنا کام نمٹا کر ان کے
ساتھ آئے۔ ٹھیک اسی وقت انہیں وہاں افراتفری محسوس
ہوئی۔ یہ چاروں بڑی طرح فحشے اور ان کے بشروں پر
تشویش کے آثار نمودار ہو گئے مگر دوسرے ہی لمحے لٹلی نے
انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ابھی یہاں ہم پر کسی کو شبہ نہیں ہوا ہوگا لیکن کمانڈ
پوسٹ پر ہمارے قبضے کا واقعہ ضرور آشکار ہو گیا ہوگا اور
اسے جلد یا بدیر آشکار ہونا ہی تھا۔ یہ زیادہ دیر ویسے بھی چھپا
نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے کہ وہاں سے ہیڈ کوارٹر کا ہر وقت
رابطہ رہتا ہوگا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لٹلی! لیکن ابھی ہمارا کام مکمل نہیں
ہوا ہے۔ ہمیں باوجود کوشش کے جزل آنرک فرناش نہیں

دکھائی نہیں دیا ہے۔“ باقر یولا تو لٹلی نے کہا۔
 ”میں نے بھی اسے یہاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے بھی نہیں ملا۔ حالانکہ اسے ہلاک کرنے کا یہ سنہری موقع تھا کیونکہ ہمارا کمانڈو آپریشن اب تک کامیابی سے ہلکتا رہا ہے اب یہاں دیے بھی ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں آفیسر زکالونی کا رخ کرنا پڑے گا۔۔۔ آؤ۔“
 چاروں اپنے ہاتھوں میں نہیں تھامے۔۔۔ اسی راستے کی طرف لپکے جدھر سے آئے تھے۔ اسی وقت سائرن بج اٹھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ دشمنوں کو ان کی جھنک پڑ چکی تھی کہ یہ لوگ اندر داخل ہو چکے ہیں لہذا اب انہوں نے بھی ذہنی طور پر خود کو جنگ کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اسی وقت دوڑتے بھاری قدموں اور زور زور سے بولنے کی بھی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ انہیں قسماً تھی کہ یہ اپنا کام کر چکے تھے اور دشمن ان کے ”کام“ کی جھنک بھی نہیں پاسکیں گے کہ کچھ دیر بعد یہاں کسی خطرناک تباہی پھیلنے والی تھی۔ ہر ایک منٹ بعد دوسرا اور تیسرا بجھنے والا تھا۔ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کی تباہی کا مطلب اسٹائل اور موساد کا ایک بڑا جنگی نیٹ ورک سہوتاڑ ہوتا تھا۔ یہ اسٹائل کا ایک بہت بڑا نقصان ہوتا مگر انہیں جنرل آئزک فریڈمان کی بھی تلاش تھی۔ یہ چاروں اب تک بڑی مربوط پلاننگ اور ہوشیاری کے ساتھ اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی تک وہوشیاری معروف کار تھے۔ ابھی ان کے مشن کا آخری اور اہم مرحلہ باقی تھا اور وہ تھا جنرل فرناش کا خاتمہ۔

تبدیلی آپریشن کی نئی حکمت عملی کے تحت انہوں نے کسی سے مخفی اپنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اپنا کمانڈو ایکشن جاری رکھا تھا۔ یہ چاروں اب کسی سے اچھے بغیر اس عمارت سے باہر نکل جانے چاہتے تھے لیکن اب تا دیر یہ صورت حال ویسی نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی نہ کسی مقام پر ان کا سامنا اسرائیلی فوجیوں سے ہو سکتا تھا لیکن یہ سب عمارت میں مقرر یہ ہونے والے دھماکوں کے بعد ان کے لیے زیادہ مفید ہوتا، کیونکہ اس وقت اسرائیلی فوجی لنگھلاہٹ کا شکار ہو جاتے۔ مگر ہم پھنسنے کے انتھار میں لگی اور تو وغیرہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے ان کا عمارت سے اب جلد از جلد نکلنا از بس ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ ذرا دیر بعد یہاں پھیلنے والی خوفناک تباہی کی زد میں یہ لوگ بھی آسکتے تھے۔ عمارت سے باہر نکلنے کے لیے اب ان کے پاس صرف دس منٹ تھے۔

چاروں نے اپنے ہاتھوں میں نہیں تھامے ہوئی تھیں

اب کسی بھی وقت ان کا اسرائیلی فوجیوں سے دو بدو خونریز ٹاکرا ہونے والا تھا۔ ان کے اعصاب تن گئے تھے۔ ٹرک گیراج سے نکلا اور اس کا رخ طے شدہ منصوبے کے مطابق آفیسر زکالونی کی طرف تھا۔ باہر موجود اسرائیلی چیلنجرز کو دیکھ کر یہی سمجھے تھے کہ اس میں ان کے ساتھی ہوں گے مگر جلد ہی انہیں اپنا خیال رد کرنا پڑا۔ انہوں نے جلا کر ٹرک روکنے کا حکم دیا۔ عبداللہ ٹرک کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔ اسرائیلی فوجیوں نے اپنی ٹکوں کا رخ اس طرف کیا، مگر اس سے پہلے ہی ٹرک کے عقبی حصے کے آہنی جھنگے کی آڑ سے لٹلی اور باقر نے ان پر اپنی ٹکوں کے منہ کھول دیے۔ گولیوں کی بمیائیک تڑتڑاہٹ بھری اور کئی اسرائیلی فوجی کرپہ انگیز چٹخیں مارتے ہوئے گرے۔ باقیوں نے دائیں بائیں ہو کر اپنی جانیں بچانے کی کوشش جاری مگر ان پر عبداللہ کے ساتھ بیٹھے علی نے فائرنگ کر دی۔ راستہ دراز کے لیے صاف ہوا تو عبداللہ نے ٹرک کا رخ آگے کی طرف موڑ لیا۔ ان کا زیادہ دیر ٹرک میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا، لہذا ایک مقام پر لٹلی نے ٹرک روکا اور سب کو پیچے اترنے کا حکم دیا۔ یہاں سب سے پہلے انہوں نے ایک بگلا ہوا مکان میں نقب لگانے کی کوشش کی۔ چونکہ یہ کالونی اسٹائل کے اندر ہی تھا اسی لیے یہاں شاید گارڈز وغیرہ کی ضرورت نہ تھی غاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ چند اکا دکا لوگ ہی نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر چوکنے لگے۔ تاہم فائرنگ اور شور کے باعث کالونی میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔ رہی سہی کسر ان چاروں نے ہوائی فائرنگ کر کے پوری کر ڈالی۔ مگر جلد ہی کچھ بنگوں سے سب افراد کا چھٹا نمودار ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک زبردست سماعت دھماکا ہوا اور ان کے پیروں تلے جیسے زمین لرز گئی۔ کئی بنگوں کی کھڑکیوں کے شیشے چٹخنے کی سب خراش آوازیں سنائی دیں۔ سب افراد کا جھٹکا بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار

لیٹی نے اس کی طرف گھورتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔

”تم لیٹی آئندی ہونا؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے، کیپٹن میل نے اس کی طرف بڑی کینہ توڑ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو لیٹی نے مارے پیش کے اپنے ہونٹ جھپٹتے ہوئے اپنی کن کا کندا اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔ وہ تکلیف سے کراہ کر چند قدم پیچھے لڑکھڑکیا اور پشت پر دونوں ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور فرش پر گر گیا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ صوفے پر ڈری کبھی بیٹھی اس کی بیوی اور دونوں بیٹیاں دہشت کے مارے چیخ پڑیں۔

”پلیز پلیز! میرے پاپا کو چھوڑ دو۔ پلیز! انہیں مت مارو۔“ کیپٹن میل کی بیٹیاں روتے ہوئے لیٹی کی منتیں کرتی گئیں۔

لیٹی نے یک دم خوف ناک نگاہوں سے کیپٹن میل کی دونوں جوان بیٹیوں کی طرف دیکھا اور زخمی ناگن کی طرح پھسکار کے بولے۔

”کیا تم نے اس وقت بھی اسی طرح اپنے پاپا سے رورو کر کبھی نہیں کی سنا جب وہ اور ان کے ساتھی، ہزاروں بے گناہ اور نہتے فلسطینیوں کو مارا اور معصوم بچوں پر بمبار کیا اور ان سے وحشیانہ گولہ باری کیا کرتے تھے؟ وہی تو تم دیکھتے ہی ہو گے، اس وقت بھی دنیا جیسے چینلز میں یہ سب دکھایا جا رہا ہے کہ اسرائیل نے آبادیوں والی گلیوں پر نہتے بے گناہ فلسطینیوں پر کیسی قیامت منگوائی ہوئی ہے۔

”اب؟“ جواب دو اس کا بچہ جوش غیظ سے لیٹی کا خوبصورت چہرہ برسی طرح بگڑ کے رہ گیا۔ دونوں لڑکیوں سے کوئی جواب نہ بن پڑا، ان کے منہ پر جیسے ٹھنکٹھنکیاں لگ گئیں۔ مگر ان کی ماں لیٹی کیہ نہتے گلی ہسٹ کی بیوی نے ذرا ہمت کر کے مکاری سے لیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لیٹی! لیکن... ہم نے تم لوگوں کے بارے میں یہ بھی سنا ہے کہ تم لوگ عورتوں اور بچوں پر قلم نہیں کرتے، پچھلی بار کے حملے کی میں خود بھی گواہ ہوں جب.....“

”تم نے ٹھیک سنا ہے مکاری عورت!“ لیٹی نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ پھر اسے ڈرانے کی غرض سے بولی۔ ”مگر ہر بار ایسا نہیں ہوگا، اس لیے کہ تم لوگوں کے وحشیانہ ظلم و بربریت نے چنگیز خاں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ شیطان بھی تم سے پناہ مانگتا ہوگا۔ یہ جنگ کسی ایک آدمی کی نہیں ہے، ہم پر اس وقت لاکھوں بے

ہو گیا۔ ان چاروں نے ان کی یوگلا سٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر بیک وقت کئی برسٹ فائر کر ڈالے۔ وہ تیز بتر ہو گئے۔ ان چاروں نے مذکورہ ٹھکانے کا گیٹ توڑا۔ اسی وقت ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں دوسرا لرزہ خیز دھماکا ہوا اور یوں ہر ایک منٹ بعد یکے بعد دیگرے دھماکوں سے ڈیوڈ اسٹار کی یہ پوری اسٹیٹ بری طرح لرزنے لگی۔ ہر طرف بارود، شعلے اور گرد و غبار کا طوفان مچ گیا تھا۔ دونوں رہائشی کا لونیاں چونکہ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر سے تقریباً ملحقہ تھیں اسی لیے یہاں کے بنگلوں پر بھی شعلوں اور جلتے ہوئے ٹکڑوں کی بارش ہوئی۔ آگ اور شعلوں کی خوفناک تباہی اس کا لونی کو بھی اپنی زد میں لینے والی تھی جس کے باعث یہاں بھی تیزی سے آگ پھیلنا شروع ہو گئی لیٹی اور باقر وغیرہ نے اسٹیٹ کے بیویوں کی سہانی صبح غارت کر ڈالی تھی۔ ان کے تہیائی مشن کا نصف سے زیادہ مرحلہ کامیابی سے ہسکتا ہو گیا تھا۔ اب انہیں اپنے اصل شکار جزل آئزک فرناش کی تلاش تھی۔

لیٹی نے جس ٹھکانے میں پناہ بولا تھا، وہ کسی کیپٹن رینک کے ایک اسرائیلی آفیسر کا گھر تھا۔ نیم پلیٹ پر کیپٹن میل ہسٹ لکھا ہوا لیٹی نے دیکھ لیا تھا۔ یہاں وہ اپنی دونوں جوان بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ دھماکوں کی آوازوں پر وہ اپنا اسلحہ نکالنے کی کوشش میں تھا کہ یہ چاروں دروازے توڑتے ہوئے اس کے سر پر جا پڑے اور ان سب کو ایک کمرے میں لے جا کر گرگن پوائنٹ پر لے لیا۔ اسرائیلی کیپٹن کی بیوی اور دونوں بیٹیاں بری طرح ہراساں تھیں۔ کیپٹن میل ہسٹ کی آنکھوں سے تشویش کے علاوہ پر غیظ جوش کی ہر گز بھی نظر آتی تھی۔ وہ ایک ہیٹا لیس پچاس سالہ درمیانے عمر کا شخص تھا جس کا مالک تھا۔ رنگ سانولا تھا۔ آنکھیں قدورے اندر کودھنسی ہوئی تھیں جن سے غضب کا کینہ جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

لیٹی کے اشارے پر لیٹی اور سارا اللہ نے کیپٹن ہسٹ کی بیوی اور دونوں بیٹیوں کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر انہیں ایک بڑے صوفے پر بٹھا دیا اور ساتھ ہی وہ دونوں ان کے دائیں بائیں نہیں تانے چوکس کھڑے ہو گئے تھے۔ جبکہ کیپٹن میل کو لیٹی اور باقر نہتا کر چکے تھے اسے سامنے کھڑا کر دیا گیا تھا اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”کیپٹن! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جزل آئزک فرناش کا ٹھکانا بتاؤ؟ جلدی.....“



جہالت مآب

ابن اقبال

کچھ لوگ لکیر کے فقیر بن کر رہتے ہیں خوش محسوس کرتے ہیں چاہے ان کے قدموں میں دنیا جہان کی دولت بھیر ہو جائے، لوگ ہاتھ باندھ کر صبح و شام سلامی پیش کریں پاکستانی حکومت کا سربراہ ہی کیوں نہ بنادیا جائے ایک ٹھوکر میں سب کچھ خاک میں ملادینا گویا اسے اپنے لیے ایک اعزاز اور شجاعت کی علامت سمجھتے ہیں جبکہ وہ غفلت میں اکتھار حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ یہ بڑے پیدائشی لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔

جہالت مآب ایک غریب سلطان کی بے وقوفیوں کا مآثر

اس کا آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور نظریں چور اسے کے وسط میں جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی حیرت مآب منظر نے اسے سکود کر رکھا ہے۔ وہ خاک کی رنگ کے شلوار سوٹ میں لباس تھا جس پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے جوان چہرے پر صحن کے آثار تھے۔ سر کے بال گرد آلود ہو رہے تھے۔ اس کے بوسیدہ جوتے بھی گرد میں اٹنے ہوئے تھے۔ واسنے ہاتھ میں چھوٹے سا سڑکا ایک پرانا سا سوٹ کیس تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دروازہ کا سفر کر کے آ رہا ہے۔

وہ شہر کا مرکزی علاقہ تھا اور کاروباری اوقات ہونے کی وجہ سے فٹ پاتھ پر لوگوں کا اور سڑک پر ٹریفک کا۔۔۔ بے پناہ رش تھا۔ راہ گیر اس شخص کو حیرت سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے جو فٹ پاتھ پر کھڑا چوراہے کے وسط میں کسی ناویدہ منظر پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑاتے تو انہیں وہاں سے گزرتے ہوئے ٹریفک کے اور لوگوں کے کچھ نظر نہ آتا۔

لوگ اس سے ٹکراتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کاروباری علاقے میں لوگوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ وہ غیر متعلقہ باتوں میں الجھیں۔ بڑے شہروں میں لوگ مشینوں کی طرح اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ مشینیں جو صرف اپنے کام سے کام رہتی ہیں جن کی نہ آنکھیں ہوتی ہیں، نہ کان اور نہ جذبات و احساسات۔

شہر کی اب بھری پُری مصروف فٹ پاتھ پر چلتی پھرتی، جیتی جاگتی مشینوں کے درمیان ایک آدمی بھی آگیا تھا جو ابھی مشین۔۔۔ نہیں بن سکا تھا۔ وہ ان مشینوں کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

شہر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ہر گئی کتنی ہی مشین کیوں نہ ہو جائے مگر ہر آدمی مشین نہیں بن سکا۔ ہر جگہ کچھ بے فکرے ضرور ہوتے ہیں جو کسی بات کی پروا نہیں کرتے۔

مشینی انداز میں کام کرنے والوں کے اسی اندوہام میں وہاں سے کچھ من چلے بھی گزرے۔ انہوں نے جب ایک دیہاتی آدمی کو اس انداز میں فٹ پاتھ پر کھڑے دیکھا تو وہ کھڑے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی چوراہے کے وسط میں کوئی عجیب منظر تلاش کرنے کی جستجو کی۔ جب وہاں کچھ نظر نہ آیا تو انہیں من چلے نے آواز لگائی۔

”کھسکا ہوا لگا ہے۔“

”کھسکا ہوا لگا ہے، دیکھاتی ہے۔“ ایک اور

من چلا بولا۔

”شہر کی رونق دیکھ کر اسے جو اس کھو بیٹھا ہے۔ ذرا

عادی ہو جائے تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن یہ شہر آیا کیوں ہے؟“ ایک اور من چلے نے

اوپنی آواز میں پوچھا۔

”اس کی پہلی کھوئی ہے شاید، اس کی تلاش میں شہر آیا

ہوگا۔“

من چلوں کی ٹوٹی اس کے قریب سے گزرجی مگر اس

کے کانوں پر جوں تک نہیں رہی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ

اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔ اس کی محویت بدستور قائم تھی۔

شہر کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ فٹ پاتھ سے لوگ گزر رہے تھے۔ ان کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ان کے تعاقب میں ہو اور وہ اسے جل دے کر نکل جانا چاہتے ہوں۔ چوراہے کے وسط میں نصب ٹریفک سگنل مخصوص وقتوں سے اپنے رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ دفعتاً سڑک پر مخالف سمت سے ایک چمکتی بجتی کارٹر ٹریفک سگنل کی سرخ روشنی کے مقابل آکر رہی۔ کار کی عقبی نشست پر ایک ادھیڑ عمر کا توند فخص بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں فٹ پاتھ پر گزرتے ہوئے لوگوں پر پھسل رہی تھیں۔ معاً اس کی نگاہ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے اس دیہاتی پر پڑی اور گویا جم کر رہ گئیں۔ اس کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔

”گاڑی سامنے والی فٹ پاتھ سے لگا کر روک گئی۔“ ادھیڑ عمر فخص نے ڈرائیور سے کہا۔

”جی صاحب۔“ ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا اور سگنل لائٹ کے سبز ہونے ہی اس نے گاڑی مطلوب مقام پر لے جا کر روک دی۔

”اوہ کو کسے چاہیے فخص کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں سوٹ کیس ہے، ذرا اسے بلاؤ۔“ ادھیڑ عمر فخص نے کہا۔

ڈرائیور گاڑی سے اتر کر فخص کے قریب پہنچا۔

وہ ابھی تک چوراہے کو گھورے جا رہا تھا۔ اسے مخاطب کرنے سے قبل ڈرائیور نے ایک نظر پوچھا ہے پر ڈالی۔ وہاں ٹریفک سگنل اور ٹریفک کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے کندھے جھٹکے اور اس سے بولا۔

”اے، تمہیں صاحب بلا رہے ہیں۔“

اس فخص کی محویت نہیں ٹوٹی۔ اس کی نظریں بدستور چوراہے کے وسط میں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ڈرائیور کچھ دیر سے پر حیرت کے تاثرات ابھرے پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسبتاً اوپنی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”اونچا سنتے ہو کیا۔۔۔ میں نے کہا صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔“

اس بار وہ فخص چونکا۔ اس نے سفید وردی میں ملبوس ڈرائیور کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس کی نظریں تو ڈرائیور پر مرکوز تھیں لیکن اس کی آنکھوں کے تاثر سے اندازہ ہوتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ اب بھی حاضر نہیں ہے۔

”وہ جموٹ نہیں بولتے۔“ اس نے کھوئی کھوئی سی

آواز میں کہا یوں جیسے خود سے ہی مخاطب ہو۔

ڈرائیور جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اس شخص سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی آواز کھوئی کھوئی کی تھی۔

”کیا کہہ رہے ہو بھائی؟“ ڈرائیور قدرے خوف زدہ انداز میں بولا۔ ”میں تم سے کہہ رہا ہوں، جنہیں صاحب بلارہے ہیں اور تم جواب دے رہے ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔“

”ہاں، وہ جھوٹ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔“ وہ شخص دھمکے کے سے انداز میں بولا۔ ”لیکن اس بار شاید کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔“

ڈرائیور خوف زدہ انداز میں کاری کار کی طرف پلٹ گیا اور ادھیر عمر شخص سے بولا۔ ”یہ شخص تو پاگل معلوم ہوتا ہے جناب۔ میں نے اس سے کہا کہ جنہیں صاحب بلارہے ہیں، وہ جواب میں کہہ رہا ہے کہ وہ بھی جھوٹ نہیں بولتے، انہیں جھوٹ سے سخت نفرت ہے اور یہ کہ اس بار کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔“

”کیا؟“ ادھیر عمر شخص نے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے پھر وہ دروازہ کھول کر کار سے اتر گیا۔ ”ٹھیک ہے، میں خود دیکھتا ہوں۔“

نوجوان دیہاتی شخص کی نظریں کار پر مرکوز تھیں۔ اس نے کار سے ایک ادھیر عمر شخص کو اترتے دیکھا۔ اس نے جیسی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ کار سے اتر کر نوجوان کے نزدیک پہنچا۔

”تم اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہو؟“ اس نے نوجوان کے سر پر ہاتھ کر نرم لہجے میں کہا۔

نوجوان عالم بے اختیاری سے اپنے ہوش و حواس میں واپس آچکا تھا۔ ”کیا ہاں؟“ اس نے قدرے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ”مگر آپ کیون ہیں؟“

”مجھے سلمان شیرازی کہتے ہیں۔“ ادھیر عمر شخص اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”سہا داتا کیا ہے؟“

”اقبال..... اقبال سیٹلی۔“ اس نے سلمان شیرازی کا اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ملازمت کی تلاش میں شہر آئے ہو؟“ سلمان شیرازی نے مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کر دیے جانے پر ہاتھ واپس چھینتے ہوئے قدرے جھینپے ہوئے انداز میں پوچھا۔

اقبال کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نظر آئی۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے استغیاب سے انداز میں کہا۔

”اوہ، یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ آؤ، ڈرا

تفصیلی بات چیت رہے گی۔“ سلمان شیرازی اس کا ہاتھ پکڑ کر کاری طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

”لیکن.....“ اقبال سیٹلی جھجکا۔

”آؤ، آؤ..... ممکن ہے میں تمہارے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کر سکوں۔“

”ملازمت کا بندوبست تو ہو بھی چکا ہے جناب۔“

”کہاں؟“ سلمان شیرازی نے حیرت سے پوچھا۔

”سیٹل منو بھائی لوہے والے کے پاس۔“

”تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”چھوٹے سرکار نے فون پر ان سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے سیٹل کے نام ایک رقعہ بھی لکھ کر دیا ہے۔“

اس کا پتا معلوم ہے نہیں؟“

”لیکن.....“

”لیکن.....“

”لیکن.....“

”لیکن.....“

”لیکن.....“

”شاید میری بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے۔“
”اگر میں تمہیں جاہل کہوں تو تمہاری دل آزاری نہ ہوگی؟“

”ہرگز نہیں جناب..... ایک جاہل کو جاہل ہی کہا جائے گا۔“

”تمہارے خیال میں ہر شخص کا انداز فکر یہی ہوتا ہے۔ یعنی ہر ان پڑھ شخص خود کو جاہل کہے جانے پر برا نہیں مانے گا؟“

”مجھے نہیں معلوم..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں برائے نام کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”عام طور پر لوگ حقیقت سننا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ بہت احتیاط سے منتخب کرنے پڑتے ہیں۔“
”جی ہاں، چھوٹے سرکار بھی یہی کہتے ہیں کہ حقیقت سنانا ہی ہے۔“

”چھوٹے سرکار کون ہیں؟“
”جلائے گاؤں کے زمیندار کے بیٹے۔“

”گاؤں کا نام کیا ہے؟“
”چاند پور۔“
”اودھ چودھری اللہ کے لڑکے کی بات کر رہے ہو۔“
”آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟“ سیفی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہمارے تعلقات بہت پرانے ہیں۔“ سلمان شیرازی نے کہا۔ ”اودھ برسوں سے میرا جاناں نہیں ہو اور نہ میں ہر سال شکار کھیلنے کی غرض سے چاند پور ضرور جاتا کرتا ہوں۔“
”وہاں تو بہت بڑے بڑے لوگ شکار کھیلنے آتے ہیں جناب..... چودھری صاحب کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔“

”جی ہاں سے کیا حلق ہے؟“
”وہ مالک ہیں جی چاند پور کے۔ ہم ان ہی کا نمک کھاتے ہیں۔ میرے والد ان کی زمینوں پر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔“

”تم کیوں نہیں کرتے کھیتی باڑی؟“
”نہ تو کھیتی باڑی میں میرا دل لگتا ہے اور نہ ہی یہ میرے بس کا کام ہے۔“

”تمہاری عمر تیس برس سے تو زیادہ ہی ہوگی؟“
”سلمان شیرازی نے پوچھا۔

”جی ہاں، میری عمر بائیس سال ہے۔“
”اتنا عرصہ تم کیا کرتے رہے..... میرا مطلب ہے نہ تو تم نے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی زراعت کا پیشہ اختیار کیا؟“

کے بعد سے مجھے صرف سیفی کہہ کر ہی پکارا جاتا ہے۔ اب تو کوئی بھی مجھے اقبال نہیں کہتا۔“

”خیر تو سیفی میاں، یہ بتاؤ تمہاری تعلیم کیا ہے؟“
”تعلیم کہاں جناب۔“ وہ ایک مضطرب سانس لے کر بولا۔ ”والدین نے تو بہت کوشش کی مگر میرا دل ہی نہیں لگ سکا پڑھائی میں۔“

”پھر بھلا تمہیں مزدوری کے علاوہ اور کیا مل سکے گی؟“
”مزدوری کرنا تو کوئی بری بات تو نہیں ہے۔“ سیفی نے کہا۔ اس کے لہجے سے قدرے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ سلمان شیرازی سنبھالا لے کر بولے۔ ”میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اس طرح تمہاری آمدنی.....“

”وضاحتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جناب۔“ سیفی نے ترش روئی سے کہا۔ ”آپ کا لہجہ منہ سے بول رہا تھا۔ ویسے آپ بے فکر رہیے، میں ڈرائیونگ جانتا ہوں۔“

سلمان شیرازی نے اسے پُرستائش انداز میں دیکھا۔ وہ بڑی صاف کوئی سے گفتگو کر رہا تھا۔ کار میں بیٹھنے کے آداب سے واقف ہونے کا مطلب تھا کہ وہ شہری زندگی سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس میں منافقت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اکھڑ پن سے گفتگو کی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے افسوس ہے..... سچ پوچھو تو میں مزدور کو برا نہیں سمجھتا لیکن جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اس کے اثرات سے خود کو مکمل طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اس کے برعکس مجھے تمہاری صاف کوئی سے خوشی ہوئی..... اگر تمہاری گفتگو سے تو پتا نہیں چلا کہ تم پڑھے لکھے نہیں ہو؟“

”آپ بلا تکلف مجھے جاہل کہہ سکتے ہیں۔ جو شخص بھی ان پڑھ ہو وہ جاہل کہلائے گا۔“ ہلکے الفاظ استعمال کرنے سے کچھ فرق تو پڑنے سے رہا۔

”میں شہری آپ دھوا کا جانور ہوں بھی۔“ سلمان شیرازی کھسپانے انداز میں بولے۔ ”نکتہ الفاظ استعمال کرنا گراں گزرتا ہے۔“

”صرف منہ پر۔“ سیفی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”اور پیچھے پیچھے تو سب کچھ کہنا جائز ہے۔“ سلمان شیرازی نے اسے تحیرانہ انداز میں دیکھا۔

”میں معافی چاہتا ہوں جناب۔“ سلمان شیرازی کو اس طرح اپنی جانب دیکھتے پا کر سیفی گڑبڑا کر بولا۔

”جب میرے والد نے دیکھا کہ پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تو انہوں نے مجھے چودھری صاحب کی حویلی میں ملازم رکھوا دیا۔ چھوٹے سرکار مجھ سے کچھ ہی بڑے ہیں۔ انہیں میری باتیں بہت پسند تھیں۔ مجھ میں ان کی دلچسپی دیکھ کر چودھری صاحب نے مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے شہر آئے تو میں نے چودھری صاحب کی خدمت شروع کر دی۔ خدمت کیا تھی جناب، بس میرے سپرد ملازموں کی نگرانی کا کام تھا۔ چھوٹے سرکار تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تو انہوں نے پھر سے مجھے اپنا معاصی بتا لیا۔“

”تم گاؤں کے رہنے والے ہو، تعلیم یافتہ بھی نہیں ہو اس کے باوجود گفتگو بہت اچھی کرتے ہو۔“

”جی ہاں، یہ چھوٹے سرکار کی صحبت کا کمال ہے۔ انہوں نے ٹوک ٹوک کر میری زبان درست کر دی۔ پندرہ سال میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔“

”اور یہ تمہارے چھوٹے سرکار کیسے آدمی ہیں؟ جس انداز میں تم ان کا تذکرہ کرتے ہو، اس سے تو پتا چلتا ہے کہ تم انہیں بہت پسند کرتے ہو؟“

”وہ بڑے جولانی اور ہرٹن میں جسم کے آدمی ہیں جناب۔ بہت خوش اخلاق اور فنس کھ..... کچھ بہت سی چیزوں کا شوق ہے۔ شکار کا شوق تو خیر انہیں ورے میں ملا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی وہ بہت سے کھیلوں کے شوقین ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی دلچسپیاں بھی جاری رکھیں۔ وہ بڑے شوقین مزاج آدمی ہیں جناب۔“

”کھیلوں کے چھوٹے سرکار نے تمہیں کوئی کھیل نہیں سکھایا؟“ سلمان شرازی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”انہیں کھیل بہت پسند ہیں جناب، شطرنج اور برج..... برج تو تاش کا کھیل ہے اور بہت مشکل ہے اس لیے میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ شطرنج کھیلنا انہوں نے مجھے سکھا دیا ہے۔“

”اوہو، تو تم شطرنج بھی کھیل جیتے ہو..... کون سی کھیلتے ہو، دیسی یا انٹرنیشنل؟“

”چھوٹے سرکار نے مجھے دونوں ہی طریقوں سے کھیل سکھایا ہے۔“

”تم دونوں میں زیادہ اچھی شطرنج کھیلتے ہو؟“

”شروع شروع جب میں نے کھیلنا سیکھا تھا تو وہ مجھے براہ سانی ہرا دیتے تھے لیکن اب نگر کا مقابلہ ہوتا ہے۔“

”اور کیا کیا شوق ہیں تمہارے چھوٹے سرکار کے؟“

”جی وہ ہاتھ بھی دیکھتے ہیں اور.....“

”تمہارا مطلب ہے پاسٹری؟“

”جی ہاں وہی اور زانچے بھی بتاتے ہیں۔“

”کمال ہے۔“ سلمان شرازی حیران ہو کر بولے۔

”کبھی انہوں نے تمہارا ہاتھ بھی دیکھا؟“

”جی ہاں..... اور دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔ کہتے تھے، مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تمہارا ہاتھ ہے۔ یہ کسی بہت بڑے آدمی کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے چھوٹے سرکار پاسٹری سے واقف نہیں۔“

”خیال تو میرا بھی یہی ہے۔“ سیفی نے کہا۔ ”لیکن ہاتھ دیکھنے کے بعد انہوں نے میرا زانچہ بھی بتایا تھا۔ زانچہ دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ حیران ہوئے۔ کہنے لگے تمہارے زانچے میں تو راج یوگ موجود ہے۔ میں نے پوچھا راج یوگ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ راج یوگ صرف ان لوگوں کے ہاتھوں میں پایا جاتا ہے جو عسکران بنتے ہیں۔“

”کیا.....؟“ سلمان شرازی بری طرح چونکے۔

”مجھے بھی ان کی باتیں سن کر بڑے زور کی ہنسی آئی تھی لیکن انہوں نے کہا تھا کہ یہ ظاہر ہے ناممکن نظر آتا ہے لیکن یہ غلط نہیں ہو سکتا۔ تم ایک نہ ایک روز عسکران بنو گے۔“

”حیرت ہے۔“ سلمان شرازی بڑبڑائے۔

”آپ تو بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہیں جناب حالانکہ یہ بات سن کر آپ کو ہنسی آتی چاہیے تھی۔“

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ کیا تم نے نظام سے کبھی بات کی ہے؟“

”جی ہاں، میں نے بھی کہا تھا کہ یہ بے بسی نہیں سنا جسے ایک دن کے لیے بادشاہت مل سکتی ہے؟“

”چھوٹے سرکار نے بھی مجھے یہی مثال دی تھی۔“ سیفی نے کہا۔ ”کیا تمام پڑھ لکھے لوگ ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں؟“

”نہیں، ہر آدمی کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے لیکن جب امکانات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں اکثریت کا انداز فکر ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیں کہ علم نجوم واقعی کوئی چیز ہے اور راج یوگ زانچوں میں موجود ہوتا ہے تو یقیناً نظام سے کے زانچے میں یہ راج یوگ شروع سے ہی موجود رہا ہوگا..... ممکن ہے ہمیں بھی ایسا ملے؟“

”مجھے!“ سیفی ہنسا۔ ”اول تو اس کا امکان ہی نہیں ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ مجھے ایسا کوئی موقع مل سکتا ہے تو آپ یقین کریں کہ میں وہ موقع

”جی ہاں اور آپ بھی شہر والوں میں شامل ہیں۔ ممکن ہے آپ کو میری بات ناگوار گزرے۔“
”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں ہے، تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتے ہو۔ چاہے مجھے اچھا لگے یا برا۔“

”چھوٹے سرکار نے مجھے بتایا تھا کہ شہر میں چونکہ گاڑیاں تعداد میں بہت زیادہ ہوتی ہیں لہذا انہیں کنٹرول کرنے کے لیے چوراہوں کے وسط میں یا توسپای کھڑا ہوتا ہے یا پھر رنگین روشنیوں والے سنگل نصب ہوتے ہیں جن میں چلنے والی روشنیوں کے مطابق باری باری مختلف اطراف کی سڑکوں کا ٹریفک رکنا اور چلنا رہتا ہے۔“ سیفی بولتے بولتے رک گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ آگے کیا کہے۔
”سلمان شیرازی اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔
”تو تم اتنی تحویت کے عالم میں ٹریفک سنگل کو دیکھ رہے کیسے؟“ انہوں نے کہا۔

”جی نہیں بلکہ میں تو سر عام قانون کی دجیاں اڑتے دیکھ رہا تھا۔ شہر کے حکم یافتہ باشندوں کو قانون کی دجیاں نکھیر رہے تھے۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ٹریفک کے بارے میں جتنے بھی قوانین بتائے تھے، ان میں سے ایک پر بھی عمل نہیں ہو رہا تھا۔ تاریکی رنگ کی روشنی ہوشیار ہونے کی علامت ہے اور جب سبز روشنی چل جائے تو گاڑیوں کو چلنا چاہیے لیکن یہاں یہ عالم تھا کہ ہر شخص پر چند گولے کا نشانہ بن رہا تھا۔ سب کی کوشش یہی تھی کہ تاریکی بلب روشن ہونے سے پہلے ہی گاڑی چلا دے۔ چھوٹے سرکار نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہر سنگل کے سامنے سڑکوں پر سفید رنگ کی لائنیں بنی ہوتی ہیں۔ جب ٹریفک رکا ہوتا ہے تو ان لائنوں کے درمیان سے لوگ سڑک پر نہ لپکتے ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ نہ تو گاڑیاں چلانے والوں کو اور نہ ہی پیدل چلنے والوں کو ان لائنوں کا احترام تھا۔ صحت ویدی میں لمبوس ٹریفک کا ایک سپاہی چوراہے کے ایک ٹیڑھے پر ان سب باتوں سے بے نیاز کھڑا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ چھوٹے سرکار نے غلط بیانی کی تھی یا.....“ سیفی خاموش ہو گیا۔
”سلمان شیرازی مفسر ہائے انداز میں صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرش پر بچھے ہوئے دبیز قالین پر بیٹھنے لگے۔

”میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، آپ برا مان جائیں گے۔“ سیفی نے کہا۔

”ارے نہیں۔“ وہ رک کر بولے۔ ”میں نے بالکل بھی برا نہیں مانا بلکہ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔“

ضائع کر دینا ہی پسند کروں گا۔“
”لیکن ذرا بچے میں راج ہوگ کی موجودگی کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم وہ موقع ضائع نہیں کر سکو گے۔“
”جی۔“ سیفی نے آنکھیں میاڑ کر سلمان شیرازی کو گھورا۔ ”کیا آپ یہی گفتگو کرنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لائے تھے؟“

”ہاں..... ارے نہیں بھئی، لاحول ولا قوۃ..... تم نے اس طرح اچانک سوال کیا کہ.....“ سلمان شیرازی کے وسیع دھڑکنے والے سینے کے کپاؤں میں ہلچل کر رہ گئی تھی۔
”آؤ۔“ سلمان شیرازی کا سر سے اترتے ہوئے بولے۔ ”اندر سکون سے بیٹھ کر بات کر سگے۔“
”میرا سوٹ کیس جناب۔“ سیفی ڈکی کی طرف بڑھا۔
”سوٹ کیس بھی آجائے گا۔“

سیفی، سلمان شیرازی کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بیٹھا تو شاندار تھا ہی لیکن ڈرائنگ روم کی سجاوٹ قابلِ دید تھی سیفی کی آنکھیں چلی رہ گئیں۔ اس کے لیے تو چودھری اللہ دتہ کی کوئی دنیا کی سب سے خوب صورت کوشی تھی لیکن اب یہ کوئی ککرا سے اندازہ ہوا کہ چودھری اللہ دتہ کی حویلی کی تو کوئی وصفت ہی نہیں ہے۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ سلمان شیرازی کوئی بے حد امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔

”بیٹھ جاؤ بھئی، کھڑے کیوں ہو۔“ سلمان شیرازی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سیفی بڑی احتیاط سے صوفے پر بیٹھا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کے بوجھ سے کہیں صوفہ نہ ٹوٹ جائے۔
”ہاں، سیٹی بیاں۔“ سلمان شیرازی بھی ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے بولے۔ ”کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کر دے کہ وہاں فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تم چوراہے پر کیا دیکھ رہے تھے؟“

”میں بتاتا تو دوں جھجک کر بولا۔“ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کہیں ایک بار پھر آپ کی دل آزاری نہ ہو جائے۔“

”میری دل آزاری بھلا کیوں ہونے لگی۔“ سلمان شیرازی نے تحیرانہ لہجے میں کہا۔ ”اس چوراہے سے بھلا میرا تعلق ہی کیا ہے؟“

”آپ بھی تو شہر میں ہی رہتے ہیں۔“
”اوہ، گو یا وہ کوئی ایسی بات ہے جو شہر والوں کے خلاف ہے؟“

”اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟“ سیٹی نے پوچھا۔
 ”میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ شہر میں نوادرو کوئی قانون
 پسند شہری ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہوگا..... بہر حال
 اب تم آرام کرو۔ کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں..... کرو گے؟“
 ”مجھے خوشی ہوئی اگر آپ کے کسی کام آسکا۔“

☆☆☆

سلمان شیرازی کا تعلق جزیرہ ابریز سے تھا۔ نواب
 وجہ الدولہ نے انگریزوں کے دور حکومت میں یہ جزیرہ
 خرید لیا تھا۔ پچیس سال قبل اسے یہ جزیرہ اس وقت
 قلعہ غیر آباد تھا۔ نواب وجہ الدولہ نے اس جزیرے کا نام
 آب ریز رکھا تھا جو کثرت استعمال سے اب صرف ابریز رہ
 گیا تھا۔ یہ نواب وجہ الدولہ کی خوش قسمتی تھی کہ ابریز کی
 زمین بہت زرخیز تھی۔ انہوں نے وہاں آکر بسنے والوں کے
 لیے خصوصی مراعات کا اعلان کیا۔ انہوں نے ابریز کو آباد
 کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کے انتقال کے بعد بیٹے
 حمید الدولہ نے ان کا مشن جاری رکھا۔ ان کے بعد حکومت
 نے اس جزیرے کی آزادی حیثیت برقرار رکھی تھی، لہذا
 حمید الدولہ کی راہ میں کوئی دشواری حاصل نہیں ہوئی۔ اس
 جزیرے کے باشندوں نے تین بڑے پٹے اپنے لیے
 زراعت، ماہی گیری اور کاروبار۔ ملازم پیشہ لوگ بھی تھے
 ان کی تعداد کم تھی۔ ابریز کے قانون کے مطابق کسی کا پیشہ
 کچھ بھی ہو، حصول تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی تھا۔
 جزیرے کی آبادی اگرچہ چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی
 مگر وہ سب کے سب تعلیم یافتہ تھے۔

ابریز پر ہوٹل خانگی معیاد میں تھے۔ یہ ہوٹل ان
 سیاحوں کی وجہ سے قائم ہوئے تھے جن کی ایک بڑی تعداد کو
 جزیرے کی زرخیزی اور شادابی ابریز کی طرف متوجہ لاتی
 تھی۔ جزیرے میں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی
 مگر وہاں سنگل رہائش اختیار کرنے کے لیے اجازت لینا
 پڑتی تھی۔

حمید الدولہ نے کئی شادیاں کیں مگر لا دل رہے۔ لا دل
 انتقال کر گئے۔ اگر ان کے کوئی اولاد ہوتی تو اسے جزیرے
 کا نیا حکمران بنادیا جاتا لیکن ان کے لا دل انتقال کر جانے
 کے باعث یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اب جزیرے کا حکمران
 کون ہو؟ ان کی وصیت پڑھی گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے نیا
 حکمران منتخب کرنے کی ذمہ داری سپریم کونسل کے سپرد کی

ہے۔ اس کام کے لیے سپریم کونسل کو چالیس روز کی مہلت
 دی گئی تھی۔ نئے حکمران کے لیے وصیت میں صرف ایک ہی
 شرط رکھی گئی تھی کہ وہ کسی امتیازی خصوصیت کا حامل ہو۔
 سپریم کونسل جزیرہ ابریز کے سات اعلیٰ دماغوں پر
 مشتمل تھی۔ ساتوں اراکین امتیازی تھے اور انہیں صرف
 اسی صورت میں طلب کیا جاتا تھا جب کوئی انتہائی اہم نوعیت
 کا مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ حمید الدولہ کے جانشین کے انتخاب
 کے لیے سپریم کونسل نے کئی ناموں پر غور کیا مگر کوئی بھی شخص
 امتیازی خصوصیت کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا۔

سلمان شیرازی بھی سپریم کونسل کے ممبر تھے۔ سپریم
 کونسل کے اجلاس میں فیصلہ ہوا تھا کہ سپریم کونسل کا ہر ممبر حمید
 الدولہ کے جانشین کے لیے کسی موزوں امیدوار کی تلاش
 جادہ رکھے گا اور چالیسویں روز حتمی فیصلے کے لیے اس کا نام
 سپریم کونسل کے سامنے پیش کرے گا۔ اس فیصلے کے بعد
 چالیسویں روز تک کے لیے سپریم کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا
 گیا تھا۔ اس کے بعد تمام اراکین اپنے اپنے کاموں پر واپس
 چلے گئے تھے۔ وہ تمام لوگ باتو بہت بڑے کاروباری لوگ
 تھے یا پھر حکومت کے اہم عہدہ دار پر فائز تھے۔

یوں تو سپریم کونسل کے ہر ممبر نے کوئی مناسب
 جانشین تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر لیکن کامیابی
 صرف سلمان شیرازی کے حصے میں آئی۔ اس نے اقبال سیٹی
 کو شہر کے ایک معروف چوراہے پر ہونٹوں کی طرح اپنے
 پیازے کھڑا دیکھا تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ سیٹی
 دیکھنا اچھا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس سے گفتگو کر کے دیکھ
 لے۔ لیکن جب وہ اس میں ایسی کوئی صفت تلاش کرنے میں
 کامیاب ہو جائے جسے امتیازی خصوصیت قرار دے کر سپریم
 کونسل جزیرہ ابریز کا حکمران مقرر کر دے۔ سلمان شیرازی
 اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ جب تک جزیرہ ابریز
 کا نیا حکمران منتخب نہ ہو جائے سپریم کونسل کے تمام اراکین
 کی جانیں مصیبت میں پھنسی رہیں گی۔

اقبال سیٹی اسے اسی چالیسویں روز ملا تھا۔ اس وقت تک
 سلمان شیرازی تقریباً پانسو ہو چکا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ
 وہ کوئی مناسب شخص تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو سکے گا
 کیسی سیٹی سے گفتگو کر کے وہ حیران رہ گیا۔ اسے یوں محسوس
 ہوا جیسے قدرت کے فیصلے کا ہاتھ نے اس کی مدد کی ہو۔ سیٹی بلاشبہ
 حمید الدولہ کا جانشین بننے کا پوری طرح اہل تھا۔

اگلے ہی روز سپریم کونسل کا اجلاس ہونا تھا۔ سلمان
 شیرازی نے سیٹی کو اپنی شہری گلی میں ٹھہرایا اور اگلے روز صبح

کے کوئی اولاد ہوتی تو نئے حکمران کا جھگڑا نہ پڑتا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جانشین کسی ایسے شخص کو بنایا جاتا تھا جو کسی امتیازی خصوصیت کا حامل ہو۔ سپریم کونسل اس بات پر متفق ہے کہ آپ ہی ہمارے مطلوبہ فرد ہیں۔

”مجھ میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟“ سیفی نے پریشان کن انداز میں پوچھا۔

”آپ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود قانون پسند ہیں۔ ہماری نظروں سے ایسا کوئی آدمی نہیں گزرا۔“

”کیا غیر تعلیم یافتہ ہونا کوئی جرم ہے؟“ سیفی جھنجھلا گیا۔

”میں سمجھا نہیں جناب؟“ سلمان شیرازی نے کہا۔

”اس جرم میں تو آپ لوگ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں۔“

”یہ تو ایک اعزاز ہے جناب۔“

”اور اگر میں یہ اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دوں تو؟“

”تو آپ کو زبردستی یہ اعزاز قبول کرنا پڑے گا۔“

سلمان شیرازی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ان سب کے سامنے سرور کو تائیدی جنبش دی۔

سیفی حواس باختہ ہو گیا۔ ”تو وہ لوگ اس کے ساتھ مذاق کر رہے تھے یا پھر وہ بالکل غصے میں کوز بردستی حکمران

بنادینا یا کل پن نہیں تو اور کیا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ انکار کر دیتا یا یہ اعزاز قبول کر لیتا۔ وہ

ایک اجنبی جزیرے میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ یہاں کے لوگ کس قسم کے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ساتھ مذاق کیا

جائے یا نہیں اگر یہ مذاق تھا تو بے حد سنجیدگی سے کیا چاہا تھا

اور اگر وہ سنجیدہ تھے تو بھی یہ بڑی مشکل خیز بات تھی۔ وہ

لوگ یہاں مکمل طور پر بااختیار تھے جبکہ سیفی بے بس تھا۔

”ٹھیک ہے جناب، مجھے منظور ہے۔“ اس نے

بالآخر ایک طویل سانس لے کر کہا۔

”دیکھا، میں نے کہا تھا۔“ سلمان شیرازی نے

اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”آپ مجھے بتائیے کہ سیری حیثیت کی ہوگی؟“

”سپریم کونسل نے آپ کو جزیرے کا سربراہ منتخب کیا

ہے جناب۔“ سلمان شیرازی بولا۔ ”آج سے آپ جزیرہ

ابریز کے مطلق العنان فرماں روا ہوں گے۔“

☆☆☆

سیفی کو تین عدد مشیروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ

تینوں ہی محلی قسم کے لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کی بھی عمر

چالیس سے کم نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت نکلتی تھی

اور ان کے نام بڑے بڑے بادشاہوں کے نام پر رکھے

گئے تھے۔ قیصر، کسری اور پرویز۔ انہوں نے چند ہی

گھنٹوں کے اندر اندر نہ صرف سیفی کو پورے محل کی سیر

کر وادی بلکہ اسے سوٹی سوٹی باتوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

سیفی کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا

ہو۔ محل کے سارے ملازمین اس سے مؤدبانہ انداز میں

بات کر رہے تھے۔ اس وقت اس کے جسم پر شاہانہ لباس

نظر آ رہا تھا جو شاہی درزی نے ہنگامی طور پر اس کا ناپ لے

کر تیار کیا تھا۔ مشیروں کے کہنے کے مطابق مزید ملبوسات کی

تیاری کا کام جاری تھا۔ اس کے پیروں میں سنہری کام

والے سلیم شامی جوتے تھے اور وہ قصر یا مین کے دیوان

خاص میں سربراہ کے لیے مخصوص محلی زرنگار کرسی پر بیٹھا ہوا

تھ۔ تینوں مشیر اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

سیفی بہت جھنجھلا یا ہوا تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کی یہ بات یاد

تھی کہ وہ اپنے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی کوئی معمولی سی

ملازمت کرے۔ اس لیے کہ سربراہان مملکت پر کڑی

پابندیاں ہوتی ہیں۔ انہیں سرکاری بکھیروں سے اتنی فرصت

ہی نہیں ملتی کہ اپنے لیے کسی اہم وقت نکال سکیں۔

اس کا ذہن بڑی دیر سے ایک لفظ میں الجھا ہوا تھا۔

وہ لفظ سلمان شیرازی نے بولا تھا اور سیفی نے پہلے بھی وہ لفظ

نہیں سنا تھا۔ اگر وہ گاڑوں میں ہوتا تو چھوٹے سرکار سے

مطلق العنان کے معنی پوچھ لیتا مگر یہاں کس پر پوچھتا۔

دفعتاً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ مشیروں سے

پوچھ لے اور پھر وہ فوراً ہی اپنے خیال پر عمل بھی کر بیٹھا۔

”مطلق العنان کسے کہتے ہیں؟“

تینوں مشیروں نے حیرت سے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا پھر قیصر کھانکھار کر بولا۔ ”یہ لفظ اپنے حاکم کے

لیے استعمال ہوتا ہے جو مکمل طور پر بااختیار ہو اور کسی کو

جواب دہ نہ ہو۔“ سیفی نے ایک طویل سانس لی گویا وہ

اپنے افعال کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہوگا۔

”مگر آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟“ پرویز نے

دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

”تم مشیر ہو۔“ سیفی حقارت آمیز انداز میں بولا۔

”مشیر کو تو بے حد ذہین ہونا چاہیے۔ تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ

سکتے کہ جب کوئی آدمی کوئی بات پوچھتا ہے تو اس کا مطلب

یہ ہوتا ہے کہ اسے وہ بات معلوم نہیں ہے۔۔۔۔۔ یا تمہارے

خیال میں میں تمہارا امتحان لے رہا تھا؟“

”نہج۔۔۔۔۔ جناب۔“ پرویز ہلکا کر رہ گیا۔

سیفی کسی خیال میں گھوم گیا تھا۔ تینوں مشیروں کے

چہروں کی رنگت اڑ گئی تھی۔ وہ اس اندازِ گفتگو کے عادی نہ تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ بہت شائستگی سے گفتگو کی گئی تھی۔ ادب، تہذیب، جمیز اور قانون پسندی..... یہی تو جزیرہ ابریز کے باشندوں کا طرزِ امتیاز تھا۔

”ہمارا تاج کہاں ہے؟“ دلغا سیٹی نے کسی خیال کے تحت چمک کر پوچھا۔

”اس کے لیے تو باقاعدہ ایک رسم ہوگی۔ جشنِ تاج پوشی منعقد ہوگا اور عوام کے سامنے آپ کو تاج پہنایا جائے گا۔“ کسریٰ نے کہا۔

”اور وہ جشنِ تاج پوشی کب ہوگا؟“ سیٹی غصیلے لہجے میں بولا۔

”تاریخ تو جناب والا خود منتخب فرمائیں گے۔“ قیصر نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے، ہم سوچیں گے۔“

”لیکن جناب! آپ اپنے لیے کوئی لقب تو منتخب فرمائیں۔“ پرویز بولا۔

”لقب؟“ سیٹی بولا۔ ”مگر ان کا نام کافی نہیں ہوتا؟“

”نام تو عام لوگوں کے ہی ہوتے ہیں۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”اور یہ بات طے ہے کہ حکمران عام آدمیوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہ امتیاز القاب کے ذریعے عریضہ اجاگر کیا جاتا ہے۔“

”ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لقب ایسا ہو جو کسی انفرادی خصوصیت کو اجاگر کرتا ہو۔“

”اگر القاب واقعی کسی خوبی کو اجاگر کرتا ہو تو سونے پر سہاگہ ہے۔“ قیصر بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ سیٹی نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”ہم اپنے لیے جہالت، مآب کو بطور لقب منتخب کرتے ہیں۔“

”گنگ..... کیا فرما رہے ہیں حضور والا؟“

”ہم نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا ہے۔“

”لہل..... لیکن جناب لقب تو ایسا ہونا چاہیے جو کسی خوبی کو اجاگر کرتا ہو۔“ قیصر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تمہارے خیال میں جہالت کوئی خوبی نہیں ہے؟“ سیٹی فرمایا۔

”قیصر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کسریٰ اور پرویز بھی بوکھلائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”م..... میں..... گنگ..... کیا عرض کروں۔“ قیصر ہٹکا کر رہ گیا۔

”تم بتاؤ۔“ سیٹی ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کا ہجہ بدستور خراب تھا۔

”جناب والا بہتر سمجھتے ہیں۔“ کسریٰ نے جان بچرانے کی کوشش کی۔

”کیا بہتر سمجھتے ہیں؟“ سیٹی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ عالی مرتبت کے لیے کون سا لقب مناسب رہے گا؟“

”یہ ہماری بات کا جواب تو نہیں۔“ سیٹی کی آواز بلند ہوئی۔ ”ہم نے پوچھا تھا، جہالت خوبی ہے کہ نہیں؟ ہمیں اس کا جواب چاہیے۔“

”م..... مجھے نہیں معلوم جناب۔“ کسریٰ بد وقت تمام بولا۔ اس کے چہرے پر سینے کی پوندیں ابھر آئی تھیں۔

”ہوں۔“ سیٹی فرمایا۔ ”اور تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس نے بروڈ کی طرف دیکھا۔

بروڈین قیصر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ ایک صحبت میں بھنس چکے ہیں لیکن اس نے بڑی تیزی سے نہ صرف صورتِ حال کا تجزیہ کر لیا تھا بلکہ اس نے ایک ممکنہ جواب بھی گھڑ لیا تھا۔

”کسی سربراہ کے لیے چھٹا ہے ایک خوبی ہے جناب۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ سیٹی کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔

”ہمارے ملک کی پچاسی فیصد آبادی جاہل ہے۔“

”جناب۔“ اس نے محققانہ انداز میں جواب دینا شروع کیا۔ ”اور تعلیم یافتہ طبقہ صرف پندرہ فیصد ہے۔ گویا جہلاء اکثریت میں ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ اقلیت میں ہیں۔ اقلیتی طبقے کے کسی فرد کو گریز یا اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ملک کی اکثریت پر حکومت کرے لیکن ہمیشہ اقلیت، اکثریت پر حکمران رہی ہے لہذا اقلیتی جاہل برسرِ اقتدار آجائے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ اکثریت کے نمائندے کی حیثیت سے یہ لقب اختیار کر لے۔“

سیٹی ہلکی سی چمپکائے بغیر اسے گھور رہا تھا۔ ”ہم جزیرہ ابریز پر ہیں۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

”آپ درست فرما رہے ہیں جناب۔“ پرویز نے تیزی سے کہا۔ ”میں نے پورے ملک کی بات اس لیے کی تھی کہ جزیرہ ابریز بھی اسی ملک کا ایک حصہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اسے ایک آزاد ریاست کی حیثیت حاصل ہے تاہم اس کی یہ حیثیت کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ مگر اعداد و شمار میں ابریز کے اعداد و شمار بھی شامل ہوتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خود کو

”تم نے بھی اس کی مخالفت کر کے کون سا تیر مار لیا تھا۔“
 ”لڑومت بھئی۔“ کسری آکٹائے ہوئے انداز میں بولا۔
 ”ہم کوئل کراس مشکل سے نکلنے کا کوئل مل سوجنا پڑے گا۔“
 لیکن اس مسئلے کا کوئل مل انہیں نہ سوجھ سکا اور انہیں
 شامی فرمان کا اعلان کروانا ہی پڑا۔

سیٹی کے لیے اس ماحول میں گزارہ کرنا بے حد مشکل
 کام تھا۔ وہ آزاد فضاؤں کا باسی تھا اور یہاں کی مصنوعی فضا
 میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل
 بھاگنا چاہتا تھا لیکن گھوغلاسی کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں
 آرہی تھی۔

وہاں کی ہر چیز اسے وحشت میں مبتلا کر رہی تھی۔ حد تو
 یہ تھی کہ اس سے وہاں کے پُر تکلف کھانے بھی نہ کھائے
 جا رہے تھے۔ اس کی خواب گاہ بہت آراستہ و بیدار تھی۔
 نرم بیڈ پروڈیوس کے لیے لینا تو بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا
 رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے ہر صورت
 میں یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی تدبیر سوچنا تھی، ورنہ وہ
 چند ہی روز میں پاگل ہو جاتا۔

بہت رات گئے اسے نیند آئی تھی لیکن آنکھ حسب
 معمول صبح پانچ بجے ہی کھل گئی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر
 وہ تیار ہوا تو صرف چھ بجے تھے۔ اس نے ٹاپی پہنی۔ ملازم
 وغیرہ کو بلانے کے لیے وہاں یہی طریقہ رائج تھا۔
 وہ چند منٹ انتظار کرتا رہا مگر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں
 ہوا۔ اس نے دوبارہ تالی پہنی اور اونچی آواز میں بولا۔
 ”کون ہے؟“

اس بار بھی کوئی نہ آیا۔ وہ مہنگلا کر خواب گاہ سے باہر
 نکل آیا۔ دروازے پر کوئی موجود نہیں تھا جبکہ اسے بتایا گیا
 تھا کہ اس کی خدمت کے لیے ہمہ وقت ایک ملازم موجود رہا
 کرے گا۔ وہ آگے بڑھا کہ ٹاپی دیر تک قعر یا سیمین کی غلام
 مردشوں میں پکڑانے کے باوجود اسے کوئی نظر نہ آیا۔

”بہت غیر ذمے دار لوگ ہیں۔“ وہ ناگواری سے
 بڑبڑایا۔ ”مجھے تو کہا تھا کہ کل میں ہر وقت پہرے دار موجود
 رہتے ہیں لیکن یہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہے۔“

وہ مختلف راہ داریوں میں چکراتا ہوا محل کے داخلی
 پردے تک جا پہنچا۔ دروازے پر دو پہرے دار موجود
 تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور سر پر گلے ہوئے
 تیل کے ہاٹھ ان کی چندیاں چمک رہی تھیں۔ اسے دیکھتے
 ہی وہ انہیں شن ہو گئے۔

”سب لوگ کہاں مر گئے؟“ اس نے دہاڑ کر پوچھا۔

پورے ملک پر پھیلا کر گفتگو کرنے سے مرکز کریں۔“
 سیٹی خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ابھرن
 چھانک رہی تھی۔ شاید پرویز کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی
 تھی۔ اس نے سیٹی کو اپنی پچھے دار گفتگو میں ابھالیا تھا۔ سیٹی
 کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا پھر یکایک اس کی آنکھیں
 کسی خیال کے تحت چمکنے لگیں۔

”تم لوگ پرویز کی بات سے شفق ہو؟“ اس نے
 قیصر اور کسری سے پوچھا۔

ان دونوں کو اسی میں عالیت نظر آئی کہ اس نظر بے
 سے اتفاق کر لیں۔ انہوں نے اپنے سر اثبات میں
 ہلا دیے۔

”بس تو آج سے ہی ہمیں جہالت مآب کہہ کر پکارا
 جائے گا۔“ سیٹی نے حکم صادر کیا۔ وہ تینوں کچھ نہ بولے۔

”اعلان کروادو کہ ابریز کے ہر باشندے کے لیے
 منجبا ہونا لازمی ہے۔ یہ حکم فوراً ہی طور پر نافذ کیا جاتا ہے۔“
 ”جی!“ ان تینوں کے منہ سے یک وقت نکلا۔ ان
 کے منہ مارے حیرت کے محل ملے تھے۔

”روزانہ صبح گھر سے باہر نکلنے کے لیے ہر ایک کے
 لیے سر کا شیو کرنا لازمی ہوگا۔ سر پر کچھ اور کچھ کی نمائند
 ہوگی اور چٹنی کھوپڑی پر تیل کی جلی سی مالش بھی کرنی ہوگی
 تاکہ چند یا چمکتی رہے۔“

وہ تینوں اچھل پڑے۔ وہ اسے اس انداز میں دیکھ
 رہے تھے جیسے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

”کیا خیال ہے؟“ سیٹی مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ
 سے بھی اس کی ذہنی حالت ہٹ چکی تھی۔ انہوں نے۔
 بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر
 جھکا لیے۔ کچھ بولنا خطرناک کی حد تک ہوسکتا تھا۔

☆☆☆
 ”پتا نہیں ہم کس مصیبت میں کس کس تھے ہیں۔“ قیصر
 دیوان خاص سے باہر نکلتے ہی بولا۔

”مصیبت تو بہت معمولی سالفظ ہے۔“ کسری کہہ لیا۔
 ”اس کے لیے تو کوئی نیا لفظ تلاش کرنا پڑے گا۔“

پرویز کو فنی آگئی۔ ”اب دیکھو کل سے ہمیں نڈھ کروانا
 پڑے گی۔“ اس نے کہا۔

”تمہاری ہی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔“ قیصر
 جھڑکیا۔ ”تم نے لقب والے معاملے میں اس کی ہاں میں
 ہاں ملائی تھی۔ اس کے بعد سے ہی وہ شیر ہو گیا۔“

”تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔“ پرویز تمہارا نہ لہجے میں بولا۔

”جی وہ اپنے سر منڈوانے گئے ہیں۔“ ایک پہرے دار نے جواب دیا۔
”کیا؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”سب ایک ساتھ چلے گئے؟“

”جی ہاں جناب۔“ وہی پہرے دار دوبارہ بولا۔
”سب کو سر منڈانے تھے اس لیے ہائی کے پاس کافی لمبی لائن لگی ہوئی ہے۔“

اس کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ اس نے تو یہ فرمان اس لیے جاری کیا تھا تاکہ وہ لوگ پریشان ہو کر اسے معزول کر دیں لیکن انہیں تو ذرا بھی پروا معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے احتجاج کیا جائے گا لوگ تو زیادہ کریں گے اور وہ اپنی بات پر اٹل رہے گا۔ کچھ دیر وہ کھتے کے عالم میں کھڑا رہا پھر سنبھل کر بولا۔

”جاؤ، ہائی ہے کہو کہ باورچی کا سر پہلے منڈو دے۔ ہم ناشتا پہلے کریں گے۔“

وہ پلٹ کر اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ چونکہ محل کے ملازمین ہیں لہذا ان کی ہمت نہ ہوئی ہوگی کہ اس کی حکم عدولی کر سکیں۔ پہرے دار کے حامی باشندے یقیناً اس کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیں گے۔ حکیم کونسل کو اس جانب متوجہ کیا جائے گا اور اس کی جگہ نیا حکمران منتخب کر لیا جائے گا۔ یوں اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

وہ ایسے ہی پریشان کن خیالات میں الجھا رہا تھا کہ دروازے کی زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ صبح سویرے ناشتا کرنے کا عادی تھا اور یہاں تو اس کا رات کا کھانا بھی تقریباً گول می ہو گیا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں اٹھا اور خواب گاہ کھول کر باہر نکلا۔ آج باورچی اپنی چمک دار منڈی ہوئی کھوپڑی سمیت اسی صبح آتا تھا۔

”ناشتا تیار ہے حضور والا۔“ اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”چلو، جلدی کرو۔“ وہ تیز قدموں سے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ناشتا میز پر جن ویار کیا تھا۔ اس نے مختصر انداز میں میز کی طرف دیکھا جہاں انواع و اقسام کی چیزیں نظر آ رہی تھیں مگر ناشتا نہ دارو تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ جھجھلاہٹ آمیز انداز میں باورچی کی طرف مڑا۔

”گنگ..... کہاں، کیا ہے جناب؟“ باورچی بوکھلا گیا۔
”یہ۔“ وہ میز کی طرف اشارہ کر کے دھاڑا۔

”مم..... میں سمجھا نہیں سرکار۔“
”میں نے ناشتا لگانے کو کہا تھا۔“ سیٹی فیسلے لہجے میں بولا۔
”نن..... ناشتا ہی تو ہے سرکار۔“ باورچی ٹھنکیا یا۔
”اس میں کون سی چیز ناشتا ہے؟“ سیٹی آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

”یہ انڈے کا حلو ہے، ایلے ہوئے انڈے ہیں، سکے ہوئے توست ہیں، بکسن، جام، چٹلی وغیرہ۔“
”خاموش رہو۔“ سیٹی بھنا کر بولا۔ ”تم باورچی ہو؟ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ناشتا کیا ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں ہٹاؤ یہاں سے اور جا کر پرائے اور انڈوں کا آلیٹ بنا کر لاؤ۔“

باورچی سر پٹ ہو گیا۔ کچھ اور ملازم ٹنڈ کروا کے آگے آ گئے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی میز صاف کر دی۔ سیٹی خوشخوار انداز میں ان سب کو گھورتا رہا پھر تھوڑی سی دیر بعد جلدی پر انھوں اور چار انڈوں کے آلیٹ کا صفایا کر کے اس کے قریب ڈکارتی۔

چائے پی کر ان کے دیوان خاص کا رخ کیا۔ تینوں مشیر وہاں اس کے منتظر تھے۔ ان کے سر بھی منڈے ہوئے تھے اور سر پر گنگنسی کی وجہ سے ان کی کھوپڑیاں چمک رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر سیٹی مسکرایا۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے انہیں چڑا رہا ہو۔

”کیا حال ہے دوستو؟“ وہ اپنے ہاتھوں کو ہاتھ پیچھرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہیں جناب۔“ انہوں نے بیک آواز میں جواب دیا۔

سیٹی کی بڑی مایوسی ہوئی۔ ان تینوں کا ہی انداز مؤدبانہ تھا۔ وہ اپنے جانے انداز میں اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ہاتھ ہلا کر ان سے کہا۔

وہ بیٹھ گئے۔ قیصر نے ہولے سے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ”آپ اپنی آج کی مصروفیات کی تفصیل سیکریٹری کو نوٹ کروادیں جناب۔“

”سیکریٹری کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں موجود ہے جناب۔“ وہ ایک دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”اسے بلاؤ۔“ سیٹی نے بے نیازی سے کہا۔

قیصر خود ہی اٹھ کر اس دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے پر دو بار بگی سی دنگ دے کر اس نے دروازہ کھولا۔ ”آپ کو جہالت مآب یا دفر بار ہے ہیں۔“ اس نے

بڑے سکون سے کہا اور اپنی نشست پر واپس آ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد دیوان خاص میں سیکریٹری کا نزول ہوا۔ اسے دیکھ کر سیٹی سانس تک لینا بھول گیا۔ سیکریٹری کا انڈے کے مانند شفاف سردیگر لوگوں کی طرح چمک رہا تھا لیکن سیٹی کی حیرانی کا باعث اس کا لباس تھا۔ اس نے سفید سازی زیب تن کر رکھی تھی۔ بیروں میں اونچی اڑی والے سینڈل تھے اور ہونٹوں پر لب اسٹک لگی نظر آ رہی تھی۔ سیکریٹری کے ہاتھ میں پینڈ اور پینسل موجود تھے۔

”فرمائیے جناب۔“ اس نے سیٹی کی نشست کے قریب رک کر سر ملی آواز میں کہا۔

سیٹی اچھل پڑا۔ ”یہ کیا مذاق ہے؟“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ لڑی سیکریٹری ہیں جناب۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”آپ انہیں اپنی مصروفیات نوٹ کروادیں۔“

”تمہارے ہال کیا ہوئے؟“ سیٹی نے خود پر قابو پاتے ہوئے سیکریٹری سے پوچھا۔

”شاہی فرمان کے مطابق۔۔۔۔۔۔“

”ابے گدھو! یہ تم نے کیا کیا۔“ وہ مشیروں کی طرف مڑ کر دھاڑا۔

”ہم نے کیا کیا ہے جناب؟“ قیصر نے خوشگوار لہجے میں بولا۔ ”آپ ہی کا تو فرمان تھا۔۔۔۔۔۔“

”وہ صرف مردوں کے لیے تھا۔“

”آپ نے وضاحت نہیں کی تھی۔“ کسری بولا۔

”میں نے وضاحت طلب کر لی ہوتی۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”ہمیں کچھ معلوم کہ آپ کے دل میں کیا ہے۔“

”نکل جاؤ یہاں سے۔“ قصے کی زیادتی سے اس کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ بھی جا سکتی۔“ ان کے جانے کے بعد

اس نے سیکریٹری سے کہا اور مہر چکر کر سی پر گر گیا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ابریز کی ہر حرکت اب تک سچی ہو چکی ہوگی۔ اس نے ابریز کے باشندوں کو شک کرنے کے لیے یہ

حکم جاری کیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا، اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس دلدل میں لٹکنے کی وہ جتنی کوشش کرے گا، اتنا ہی اس میں دھنسا چلا جائے گا۔

وہ سوچتا رہا۔۔۔۔۔۔ سوچتا رہا اور بالآخر اس کے ذہن میں ایک خیال آئی گیا۔ اس نے اپنے مشیروں کو طلب

کر لیا۔

”ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔“ سیٹی غصیلے انداز میں بولا۔ ”ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے لیے کوئی نیا مشیر مقرر کریں گے تم لوگ نااہل ہو۔“

”ہم بھی یہی کہنا چاہتے تھے جناب کہ ہم سے اب مزید یہ ملازمت نہیں ہوسکتی۔“

”جب تک نئے مشیر کا تقرر نہیں ہو جاتا، تم ہی لوگ مشیر رہو گے۔“

”نیا مشیر کب تک مقرر ہو جائے گا؟“

”مشکل یہ ہے کہ وہ چاند پور میں ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے رابطہ کیسے قائم کریں؟“

”اس کا نام کیا ہے جناب؟“ پردیز نے پوچھا۔

”ماسٹر خیر دین۔۔۔۔۔۔ وہاں کے ہائی اسکول میں سمجھ رہے۔“

”ہائی اسکول میں فون تو ہوگا جناب؟“ قیصر بولا۔

”ہاں، ہے تو کسی مگر میں اس کا فون نمبر معلوم نہیں ہے۔“

”یہ کون سی بڑی بات ہے جناب۔“ کسری نے کہا۔

”اگر اجازت ہو تو میں معلوم کروں؟“

”کیسے معلوم کرو گے؟“ سیٹی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ٹیلی فون ڈائریکٹری کے چاند پور کا کوڈ نمبر دیکھ کر وہاں کے ایجنٹ سے معلوم کروں گا۔“ کسری نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، معلوم کرو۔“ سیٹی نے بے چینی سے کہا۔

ماسٹر خیر دین اس سے تین سال بڑا تھا۔ کسی بڑی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن سے ہی بہت گہرے دوست تھے۔ سیٹی کا دل تو پڑھائی میں لگتا نہیں تھا اس لیے وہ ان کی

چوڑی دیکھ کر مایوس ہو گیا لیکن خیر دین پڑھائی کا رسیا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اس کی مسلسل محنت رنگ لائی اور اب وہ

اسکول سمجھتا تھا۔ چاند پور جیسے قصبے میں اسکول سمجھنا بڑی بات تھی۔ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے لیکن سیٹی کے لیے وہ اب بھی خیر دین ہی تھا۔ وہی بچپن والا خیر دین یہ اور بات ہے کہ دوسروں کی طرح اس نے بھی اسے ماسٹر خیر دین

کہنا شروع کر دیا تھا۔

کسری دیوان خاص کے ایک کونے کی ٹیبل پر رکھے ہوئے فون سے الجھا ہوا تھا۔ چاند پور ٹیلی فون ایجنٹ سے اس کا رابطہ ہو گیا تھا۔ اس نے آپریٹر سے نمبر پوچھ کر ایک

پرنوٹ کیا اور فون بند کر کے سیٹی کی طرف لوٹ آیا۔ ”فون نمبر مل گیا جناب۔“ اس نے سیٹی کی طرف پرچہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں اس کا کیا کروں؟“ سیٹی نے کہا۔ ”تم یہ نمبر ملا

کر ماسٹر خیر دین سے میری بات کرواؤ..... اور ہاں، یہ بھی بتاؤ کہ اگر وہ یہاں آنے پر رضامند ہو جائے تو اسے بلا نے کی کیا صورت ہوگی؟

”اس کی فکر نہ کریں جناب۔“ کسریٰ بولا۔ ”اگر وہ رضامند ہو جائیں تو انہیں یہاں بلوایا جائے گا۔“ کسریٰ دوبارہ فون کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد مطلوبہ نمبر مل گیا۔ دوسری طرف موجود شخص کو ہولڈ کر دیا اور سیلی کی طرف مڑا۔

”نمبر مل گیا ہے جناب..... آپ بات کر لیجیے۔“ سیلی اٹھ کر فون کی طرف بڑھا۔ ”تم لوگ باہر جاؤ۔“ وہ ریسیور کسریٰ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو، چاند پور ہائی اسکول..... دیکھیے میں سیلی بات کر رہا ہوں۔ مجھے ماسٹر خیر دین سے بات کرنی ہے۔“

دوسری طرف سے انتظار کرنے کو کہا گیا۔ تینوں مشیر دیوان خاص سے باہر چلے گئے۔ سیلی ریسیور کانوں سے لگائے شکر کھڑا تھا۔

”میں ماسٹر خیر دین بات کر رہا ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد ریسیور سے آواز ابھری۔

”اوہ اے ماسٹر خیر دین، میں سیلی ہوں..... تم خیریت سے ہو؟“

”ہاں میں خیریت سے ہوں۔ کیا تم شہر کے بات کر رہے ہو؟“

”میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں ماسٹر خیر دین.....“

”کونسی مشکل میں پھنس گئے ہو؟“

”فون پر مکالمہ نہیں ہوتا تھا۔ کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟“

”تم کیسی ابھی ہوں؟ میں کر رہے ہو سیلی۔ بھلا میں تمہارے پاس کہاں آؤں گا۔ مجھے اسکول سے چھٹی بھی لینی پڑے گی۔“

”تم اسکول سے فوراً چھٹی لے لو۔ میں تمہیں خود ہی بلوالوں گا۔“

”خدا ہی جانے تم کیا چاہتے ہو۔“ ماسٹر خیر دین نے بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ”بہر حال میں کل سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لیتا ہوں..... ایک ہفتہ کافی رہے گا؟“

”کافی رہے گا ماسٹر خیر دین، بس کل صبح تیار رہنا۔“ سلسلہ منقطع کر کے اس نے مشیروں کو اندر بلا لیا۔ ”وہ راضی ہو گیا ہے۔“ اس نے ان سے کہا۔ ”میں نے اس سے

کہہ دیا ہے کہ کل صبح تیار رہے۔“

”ٹھیک ہے جناب، کل شام تک وہ یہاں جزیرے پر پہنچا دیے جائیں گے۔“

”اب ہم جزیرہ ابریڈ کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔“

”کون سی گاڑی نکھڑا دی جائے جناب..... اگر آپ پسند فرمائیں تو مکمل چھت والی کار میں سیر کا صحیح لطف آئے گا۔“ پرویز نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ سیلی بولا۔ ”اور تم ہمارے ساتھ ہی چلو گے۔“

وہ ایک شاندار کار تھی۔ اس پر خصوصی نشانات لگے ہوئے تھے۔ پرویز نے اسے بتایا کہ یہ گاڑی صرف ابریڈ کے حکمران کے لیے مخصوص ہے۔ کوئی اور یہ گاڑی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ابریڈ کی سڑکوں اور فنڈ پاتھوں پر عجیب منظر تھا۔ ہر شخص خواہ مرد ہو یا عورت، منجھتا ہوا ایک نے سر پر تیل کی پاش کر رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی چند یا میں عجیب بہار دکھائی دیتی تھی۔

ماسٹر خیر دین نے آگے کا وعدہ کر لیا تھا لہذا سیلی کے دل و دماغ سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہاں سے اس کے چمکارے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لے گا۔ وہ تھای اتنا متعلق مند آدمی۔

کافی دیر سیر کرنے کے بعد وہ قیصر کا محل کی طرف بڑھ آیا۔ راستے میں لوگوں نے اسے دیکھ کر خوشی کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ بعض مقامات پر لوگوں نے منجھتا ہوا جہالت ماب زندہ باد کے نعرے بھی لگائے تھے۔ سیلی کو ان کا انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اسے دیکھ کر کم از کم ہودھری کا تو مظاہرہ کریں۔ آخر وہ ان کو بالآخر منجھتا کر دے گا۔ اسے دار تھا۔ محل میں پہنچنے سے قبل ہی وہ پرویز کے لیے نئی ہدایات جاری کر چکا تھا جس کے تحت عورتوں کے لیے منجھتا ہوا ضروری نہیں تھا۔ دوسری ہدایت اس اعلان کے لیے تھی کہ آئندہ سے جزیرہ ابریڈ کا ہر باشندہ اسلئے جوتے پہنا کرے گا۔

پرویز کار سے اترتا تو اس نے اٹلے جوتے پہن رکھے تھے۔ ڈرائیور نے بھی فوراً اس حکم پر عمل کیا تھا۔ محل کے ملازمین نے انہیں تعجب آمیز نگاہوں سے دیکھا اور جب انہیں پتا چلا کہ یہ جہالت ماب کا نیا فرمان ہے تو انہوں نے بھی اٹلے جوتے پہن لیے۔ قیصر اور کسریٰ نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔

”ہم سمجھ گئے ہیں بھائی۔“ قیصر اسے دیکھ کر بولا۔ ”یہ

وراثت

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
”میری ساس کی پرانی کی عمر ایک سو بیس سال
تھی۔ ثانی کی عمر ایک سو پندرہ سال تھی۔ میری
ساس کی ماں ایک سو دس سال تک زندہ رہی۔ ہر
آنجنابی خاتون کی عمر میں مرتے وقت پانچ سال
کی کمی ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے میری ساس کا
دعویٰ ہے کہ وہ ایک سو پانچ سال کی عمر پائے گی۔
ڈاکٹر بھی کہہ رہے ہیں کہ اس خاندان میں طویل
عمری وراثت میں ملتی آرہی ہے۔“

دوست نے پوچھا۔ ”کیا تم ساس کی لمبی عمر
سے پریشان ہو؟“

وہ شخص لمبی آدمی کے بولا۔ ”ہاں، ساس کی
وجہ سے مجھے اور بیوی کی وجہ سے بھی۔ اگر میری
بیوی سو سال تک زندہ رہی تو میرا کیا ہوگا؟ یہ بڑی
چیلنج تو مجھے ملانے والی ہے۔“

مدرسہ۔ بکیرا بھائی، بھوتی بھتی، بہاولپور

رام کھانی

ایک صاحب رات کھانے پر بیٹھے اور بیوی
سے بولے۔ ”کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں اتنی
دیر تک کہاں رہا تھا؟“
بیوی بولی۔ ”بالکل اندازہ لگا سکتی ہوں
کیونکہ تم اپنی کہانی بھی سناؤ۔“

انتخاب۔ یا سر ملی، کراچی

پورے واقعات جاننے کے بعد بولا۔ ”اب تم مجھے یہاں
سے نکلنے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔ میں ایک لمبی بھی یہاں رہنے
کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

ماسٹر خیر دین اسے بڑے فیصلے انداز میں گھور رہا تھا۔
”جہیں پہلے ہی مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔ یہ حالتیں
پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”مم..... میں نے سوچا تھا شاید یہ لوگ نالاں ہو کر
میری جان چھوڑ دیں گے۔“

”ایک تعلیم یافتہ اور ایک جاہل میں یہی فرق ہوتا
ہے۔ تم نے جو کہیں نہیں، وہ کوئی جاہل ہی کر سکتا تھا۔“

”تو کیا میں خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟“
سینی جھنبلا گیا۔

جہالت آپ کا نیا حکم ہوگا۔“ ان دونوں نے پرویز کو کچھ کہنے کا
موقع دینے بغیر ہی اپنے اپنے جوتے اٹ لیے تھے۔

”اگر اسی طرح روز ایک فرمان جاری ہوتا رہا تو چند
ہی روز بعد ہم لوگ کارٹونوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔“
پرویز ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”اس وقت کون سا کارٹون سے کم ہیں۔“ کسری
نے جملے سمجھنے انداز میں کہا۔

”شکر کرو کہ بات صرف بالوں اور جوتوں تک ہی محدود
ہے۔“ قیصر نے کہا۔ ”اگر کہیں بات دعوتی اور بنیان.....“

”خدا کے واسطے خاموش رہو۔“ پرویز نے خوف
زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ”اگر کہیں جہالت آپ کے
کانوں میں ایسی تجویز کی ہنسک پڑے گی تو خدا جانے کیا ہوگا۔“

”ابھی تو دیکھتے رہو، کل ماسٹر خیر دین بھی تشریف
لا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی آمد سے رہی سہی کسر بھی
پوری ہو جائے گی۔“ کسری بولا۔

”ٹھیک کہتے ہو بھائی، قیصر نے بے چارگی سے کہا۔
”جزیرہ ابریز کے باشندوں کا خواب اللہ ہی حافظ ہے۔“

اگلے روز سہ پہر کے وقت ماسٹر خیر دین جزیرے پر
پہنچ گیا۔ سینی نے محل کے دروازے پر پہنچ کر خیر مقدم کیا
تھا۔ ماسٹر خیر دین کی آنکھوں میں حیرت مچی تھی، اس نے
دوسرے لوگوں کے سامنے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ سینی
اسے سیدھا اپنی خواب گاہ میں لایا۔

”پہلے تم نہاد محو کر تازہ دم ہو جاؤ پھر امینان سے گفتگو
ہوگی۔“ سینی نے کہا۔

”میں خیراں ہو کر بے ہوش ہونے کے مرے تک
پہنچ گیا ہوں اور یہاں نہانے دعوتی کی فکر پڑی ہوگی
ہے۔“ ماسٹر خیر دین ناراضی سے بولا۔

”خیرانی کس بات پر ہو رہی ہے؟“ سینی ہنس کر بولا۔
”کوئی ایک بات ہو تو بھائی،“ خیر دین نے

کہا۔ ”جو شخص مجھے لینے چاند پور پہنچا تھا، اس کا سر منڈا ہوا
تھا اور اس کے پیروں میں الٹے جوتے تھے۔ پہلے تو میں یہی
سمجھا کہ وہ کوئی پاگل ہے لیکن اس کا لباس اور بات کرنے کا

انداز میرے اس خیال کی نفی کر رہے تھے پھر اس نے مہاراجا
حوالہ دیا تو میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ اب
جزیرے پر آ کر دیکھا تو ہر ایک کا یہی حال ہے اور تمہارے

ٹھاٹ باٹ دیکھ کر تو میں انجسٹ بدعنوان ہوں۔ آخر یہ گاؤں
چھوڑتے ہی تمہاری کیا پلٹ کیسے ہو گئی؟“

سینی نے اسے اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔

”تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ جوابی کارروائی پر اتر آئے تو کیا ہوگا؟ تم اس پوزیشن میں تو نہیں ہو کہ اسکی اوٹ پٹا تک حرکتیں کرو۔“

”میں یہ بھی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میری اصل حیثیت کیا ہے۔ کہیں مجھے صرف دکھاوے کا سکران تو نہیں بتایا گیا۔“

”اور کوئی طریقہ نہیں تھا یہ معلوم کرنے کا؟“

”جو ہو گیا اسے جہنم میں جمعو گھو..... مجھے یہ بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟“

”تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں ہرگز اس کی مدد نہ کرتا لیکن یہ صرف بچپن کی دوستی ہے جس کی خاطر میں تمہاری حالتوں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔“

”تو کیا گھو خلاصی کا کوئی طریقہ تمہاری کچھ میں ہے؟“ سیفی نے اسے متوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس بارے میں غور کرنا پڑے گا۔“ خیر دین نے کہا۔

”تم یہ بتاؤ کہ پیریم کونسل کے ارکان کہاں ہیں؟“

”وہ تو ایسی چیز ہیں جسے جلتے جلتے سیفی نے بتایا۔

”کہاں واپس چلے گئے تھے؟“ خیر دین نے چونک کر پوچھا۔

”وہ ایریز کے باشندے ہیں لیکن یہاں مستقل طور پر رہتے نہیں ہیں۔ جب پیریم کونسل کا اجلاس ہوتا ہے تبھی یہاں آتے ہیں اور پھر واپس چلے جاتے ہیں۔“

”اوہ تم نے یہ بات پہلے نہیں بتائی تھی۔“

”اس بات کی اہمیت ہی کیا تھی؟“ سیفی نے بے پروائی سے کہا۔

”پھر تم نے اپنی عقل لڑائی۔“ خیر دین نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اب تمہیں پتا چل گیا۔“ سیفی شٹن کیا۔ اسے خدشہ ہوا کہ کہیں ماسٹر خیر دین کو ہراس نہ ہو جائے۔

”تم پر یہاں کس قسم کی پابندیاں ہیں؟“

”ابھی تک تو مجھے کوئی پابندی نظر نہیں آئی۔“ سیفی نے بتایا۔

”کوئی پابندی نہیں؟“ ماسٹر خیر دین حیران ہو کر بولا۔

”پھر تم یہاں کر کیا رہے ہو؟“

”کیا کروں؟“ سیفی ہنسی سے بولا۔ ”تا تو چکا ہوں۔“

”کہ ان لوگوں نے مجھے زبردستی یہاں کا سکران بنا دیا ہے۔“

”او خدا کے بندے۔“ خیر دین اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

”زبردستی سکران بنا دیا تھا تو کیا ہوا..... کوئی انہوں نے اب تمہیں باندھ تھوڑا سی رکھا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ سیفی اسے حیرت سے دیکھ کر بولا۔

”اگر اتنے ہی عقل مند ہوتے تو کب کے یہاں سے نکل چکے ہوتے۔ خیر اب میری باتیں غور سے سنو۔“ ماسٹر خیر دین اسے تفصیلات بتاتا رہا اور سیفی حیرت سے منہ پھاڑے اسے گھورتا رہا۔

”واقعی میں بہت بے وقوف ہوں۔“ خیر دین کے خاموش ہونے پر سیفی نے بڑی تنبیہ کی سے کہا۔ ”میں نے ناحق تمہیں زحمت دی۔“

”بس اب تم فوراً میرے کہنے کے مطابق عمل شروع کرو۔“ خیر دین اس کا شانہ تھپک کر بولا۔ ”اب میں نہانا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد سیفی دیوان خاص میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے تینوں مشیروں کو طلب کر لیا تھا۔

”آپ لوگ تشریف رکھیے۔“ سیفی نے ان سے کہا تو ان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیل گئے۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگ بدستور ہمارے مشیر رہیں گے۔“ ان کے پیچھے کے بعد سیفی نے کہا۔

انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گفتگو کا یہ نیا انداز ان کے لیے اچنبھے کا باعث تھا پھر کسری سنبھل کر بولا۔ ”اگر ہماری درخواست قبول کر لی جاتی تو بہتر ہوتا۔“

”آپ لوگ شاید ابھی تک ناراض ہیں۔“ سیفی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمیں افسوس ہے کہ خیر دین کی کیفیات کے باعث ہم سے کچھ زیادتی ہوئی تھی۔ ہم آپ سے اس کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں جناب؟“

”ابھی تک کہہ رہے ہیں۔ آپ لوگ ناراض نہ ہوتے تو کبھی ملازمت چھوڑنے پر اصرار نہ کرتے۔“

”ہمیں مزید حیرت نہ کریں جناب۔“ کسری بولا۔

”ہم بدستور آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔“

”اور نئے مشیر کا کیا ہوگا جناب؟“

”وہ ہمارے ذاتی مشیر کی حیثیت سے کام کرے گا۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟“

”جناب والا بہتر سمجھتے ہیں۔“ کسری سر جھکا کر بولا۔

”ہم ایک نئی دورے پر جانا چاہتے ہیں۔“ سیفی نے کہا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں۔“

”بہتر ہے جناب لیکن رسم تاج پوشی کا کیا رہے گا۔“

لوگ بڑی بے چینی سے منتظر ہیں۔

”رسم تاج پوشی کی تاریخ کا اعلان ہم واپس آکر کریں گے۔“ سیفی نے کہا۔

”اور جناب والا کی واپسی کب تک ہوگی؟“ پرویز نے پوچھا۔

”ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے ہماری واپسی تک آپ لوگ یہاں کے مختار ہوں گے۔ اپنی واپسی تک کے لیے ہم اپنے جاری کردہ دونوں فرمان منسوخ کرتے ہیں۔ اب آپ لوگ اپنی مرضی کے مطابق جوتے پہن سکتے ہیں۔“

”یہ کیا انقلاب آگیا؟“ دیوان خاص سے باہر نکلتے ہی قیصر نے کہا۔

”ہاں ہے توجرت انگیز بات..... بس اچانک ہی کا یا پلٹ ہوگئی۔“ کسریٰ بولا۔

”میرا خیال ہے۔ نئے مشیر کا کمال ہے، وہ جہالت تاب کا دوست ہے۔ انہیں سمجھایا ہوگا کہ مفت کی حکمرانی کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے۔“ پرویز نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”ممکن ہے۔“ کسریٰ بڑبڑایا۔ ”لیکن یہ سکون کہیں کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔“

”بدفالق منہ سے نکالنے سے گریز کرنا چاہیے۔“ قیصر نے صحتاندااز میں بولا۔

☆☆☆

”کہو کیا رہا؟“ ماسٹر خیر دین نے سیفی کے واپس آنے ہی پر پوچھا۔

”کام چل گیا۔“ سیفی نے کہا۔ ”کل ہم اپنے نئی دورے پر روانہ ہوئے۔“

”بہت اچھے۔“ خیر دین بولا۔ ”اس دورے پر کون کون تمہارے ہمراہ ہوگا؟“

”صرف میرا ذاتی مشیر اور میں۔“

”تو پھر ابھی سے تیاری کرلو۔“

”تیاری کیا کرنی ہے، میرا سوٹ کیس تو دے ہی پڑا ہوا ہے۔ اسے اٹھالوں گا اور جن پٹروں میں یہاں لایا تھا ان ہی میں واپس بھی جاؤں گا۔“

اس رات سیفی کو نیند نہیں آئی۔ تمام رات وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور صبح چھ بجے ہی تیار ہو گیا۔

”میرا خیال ہے نکل چلیں۔“ اس نے ماسٹر خیر دین سے کہا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ خیر دین نے

اسے گھور کر دیکھا۔ ”اتنی صبح نکلنے پر کوئی مشکوک بھی ہو سکتا ہے۔ خود کو پرسکون رکھو۔ تمہارے کسی انداز سے غفلت ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔ ہم آٹھ بجے روانہ ہوں گے۔“

آٹھ بجے تک کا وقت بھی اس نے کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیا پھر وہ قصر یاسمین سے روانہ ہو گئے۔ تینوں مشیر اور اس کی لیڈی سیکریٹری اسے الوداع کہنے آئے تھے۔ سیفی کے کہنے پر اس کے لیے ایک پرائیویٹ اسٹیمر کا بندوبست کیا گیا تھا۔ نئی دورے کے لیے اس نے سرکاری لالچ استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”آپ اپنے ساتھ کچھ سامان لے جاتے تو بہتر تھا۔“ قیصر نے کہا۔

”نہیں، نئی دورے کے لیے سامان بھی نئی ہی ہوتا ہے۔“ اس نے کہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہاں کے باشندوں کا بہت خیال رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائی۔ میں ان لوگوں کو بہت پسند کرنے لگا ہوں۔“ پھر وہ نکلنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اچھی لڑکی، مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا دور سے تمہیں اپنے بالوں سے محروم ہونا پڑا۔“

”بال کیا چیز ہیں جناب۔ آپ کے عطر پر تو بہت کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ بال تو پھر آگ آگ ہیں گے۔“

سیفی نے اسے حیرت سے دیکھا پھر بیت کہا اسٹیمر کی طرف بڑھ گیا۔ ماسٹر خیر دین اس کے ساتھ تھا۔ اسٹیمر

اٹھٹھ ہو کر آگے بڑھ گیا پھر جب تک اسٹیمر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تینوں مشیر اور سیکریٹری الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ ان کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد سیفی ماسٹر خیر دین کی طرف مڑا۔

”کہیں وہ لوگ مجھے چاند پور سے زبردستی نہ اٹھوا لیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ لوگ کسی قیمت پر بھی قانون شکنی نہیں کر سکتے لہذا بے فکر رہو۔ ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔“

سیفی خاموش ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے وہاں سے نکل آیا ہے۔ اس کا دل جزیرے کے باشندوں کے لیے مغموم تھا مگر وہ بھی مجبور تھا۔ اپنی آزادی وہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور دل ہی دل میں عزم کیا کہ آئندہ شہر کا رخ کبھی نہیں کرے گا اس کے لیے ایک ہی تجربہ کافی تھا۔

امدادِ باہمی

مرزا امجد بیگ

جوڑے آسمانوں پر بستے ہیں مگر ملاپ زمین پر ہی ہوتا ہے اور... ضروری نہیں کہ ہر ملاپ خوشگوار انداز میں ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو ایک دوسرے سے جڑے رہنے کے لیے مسلسل محاذ آرائی کرنی پڑتی ہے۔ یہی حال ان کے تعلقات کا بھی تھا جو قسمت سے ایک تو ہو گئے تھے لیکن ایک ساتھ رہنا دوبہر ہو گیا تھا کیونکہ کچھ لوگوں کو یہ ملاپ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اسی لیے اپنی دونوں آنکھیں ان پر گاڑ دیں رہنا ان کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ بہر حال جو ذوقِ اللہ کے حکم سے باندھیں گئی ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مرزا امجد بیگ نے غلاظت بھری آنکھیں پر پردہ ڈالنے کا مکمل انتظام کر لیا تھا۔

تفسارِ سر کے شکار ایک۔ جوڑے کی جگہ ہی

اور بیگ صاحب کا اندازِ بیاں

کاروبار مندا چل رہا ہوا اور یہ اپنے رزقِ روزگار میں ترقی اور بہتری کے لیے دعا کریں تو اس کا سیدھا مادہ مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ قانونی معاملات میں الجھ کر وکیل کے پاس پہنچیں، زیادہ سے زیادہ لوگ مختلف کاموں کا شکار ہو کر ڈاکٹر کے کھینک کا رخ کریں اور زیادہ سے زیادہ لوگ "اللہ" ہو کر اپنی آخری آرام گاہ کی جانب روانہ ہوں۔ بہر حال، اس موضوع پر کسی بحث و تجویس کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ اپنے انداز میں سوچتا ہے اور... کسی کی سوچ پر پہرا لگنا چاہیے یا جاسکتا۔

تھوڑی سی دیر کے بعد جو گورا چٹا شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا، اس کی عمر ستر کے آس پاس رہی ہوگی۔ قد چھ فٹ سے ایک دو انچ لگتا ہوا اور جسم دہلا چکا، ہڈیوں کا ڈھانچا کچھ ٹھیک۔ اس نے مناسب سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوگی تھی۔ ڈاڑھی، سر اور بھوؤں کے بال دودھ کے مانند سفید نظر آتے تھے۔ اس پر اس اللہ کے بندے نے سفید ہی طعنے مار تھیں بھی یا نہیں رکھی تھی۔ سر پر سفید ٹوپی بھی موجود تھی۔ نگاہ اول میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ بڑے میاں ابھی ابھی کسی مسجد سے جمنے کی نماز پڑھ کر نکلے ہیں۔ اس نے میرے چیمبر میں داخل ہونے کے بعد بڑی

ایک روز میں دفتر سے اٹھنے کی بجائے مری رہا تھا کہ میری سیکریٹری سکسی نے انٹرکام پر اعلان کیا "سرا ایک صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملاقات کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔" "اسرار کر رہے ہیں تو انہیں میرے پاس بھیج دو۔" میں نے سیکریٹری انداز میں کہا۔ "اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟" "اوکے سر" سیکریٹری نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ ماہ جنوری کے وسطی ایام تھے۔ کراچی میں جتنی اور جس نوعیت کی بھی سردی آتی ہے لہجے کے اہالیانِ کراچی... بہ خوبی واقف ہیں۔ گویا ان دنوں موسمِ سرد چلن پر تھا جس کی وجہ سے کام پر بھی اثر پڑا تھا۔ کلائنٹس کی تعداد خاصی کم ہو گئی تھی۔ میں پچھلے آدھے مہینے سے بقول ٹھنڈے، قابو چٹا کھیاں مار رہا تھا۔ ایسے میں کسی کلائنٹ کی آمد کی خبر "لوہے کی سر" سے کم نہیں تھی۔

میرے مختار اندازے کے مطابق تین چھ بعض اوقات بہت ہی ٹارک اور حساس حیثیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی وکیل، ڈاکٹر اور گورکن کے چٹے۔ اگر ان لوگوں کا



کراری آواز میں کہا۔ ”اسلام علیکم وعلیکم وکلیل صاحب!“

”علیکم السلام!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

نشست سنبھالنے سے پہلے اس نے مصافحہ ضروری جانا اور میری جانب اپنا کنگ سائز ہاتھ بڑھا دیا۔ اگر میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیتا تو میرا یہ فعل بد اخلاقی کے ذمے میں آتا چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ آہنی قلابے میں کس گیا ہو۔

میں کوئی مٹی کا مادہ نہیں تھا، ایک جوان اور صحت مند انسان تھا مگر مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس شخص کے کنگ سائز ہاتھ مجھ پر گرفت فلوادی تھی۔

میں نے یہ مشکل اپنی جان چھڑائی اور خدا خدا کر کے جب وہ کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جی بڑے صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.....؟“

میرے الفاظ پر ”صاحب“ نے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا کئے۔ چند لمحے پہلے وہ مصافحہ کرتے ہوئے جس جوانی اور طاقت کا مظاہرہ کر چکا تھا اس کی روشنی میں اسے میری جانب سے ایسے الفاظ کی ہرگز توقع نہیں تھی تاہم میری اس ”جسارت“ پر اس نے برسی کا اظہار کرنے کے بجائے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میرا نام توفیق عمر محوی ہے۔ میں آپ کے پاس ایک نہایت ضروری کام سے آیا ہوں۔“

جی توفیق عمر وی صاحب!“ میں نے غہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اپنے ضروری کام کی وضاحت کر دیں۔“ بات سمجھ کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔

”اپنے کام کے بارے میں تو میں آپ کو بتاؤں گا ہی وکیل صاحب!“ وہ بڑے سہجے لہجے میں بولا۔ ”پہلے کچھ اور وضاحتیں ہو جائیں۔“

میں سوالیہ انداز میں اس جھکی بڑھے ہاتھ سے بولا۔

”پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ میرا نام توفیق عمر محوی ہے، توفیق عمر وی نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اب آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ ”عمر محوی“ کیا ہوتا ہے.....؟“

اتنا بتانے کے بعد وہ رک کر ایسے انداز میں مجھے دیکھنے لگا جیسے میں فوراً بول اٹھوں گا..... جی، توفیق بھائی! بتائیں لیکن جب میں نے اس کی توقع پوری نہ کی تو وہ خود ہی

اپنی بات کو آگے بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔

”بیک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پچھلے رمضان میں عمرے کی سعادت حاصل کی تھی اس لیے اپنے نام کے ساتھ ”عمر محوی“ لگا تا ہوں۔ جب اللہ حج کی توفیق دے گا تو عمر محوی ہٹا کر ”حاجی“ لگا لوں گا۔“

”ویری گنڈ!“ میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”آپ کی عمر کیا ہوگی؟“

”آنے والے رمضان میں پینسٹھ سال کا ہو جاؤں گا۔“ وہ فخر سے سین پھلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اللہ کے فضل سے آج کا نو جوان بھی مجھ سے پنجہ آزمائی کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

”ماشاء اللہ!“ میں نے صرف اتنا ہی کہا کیونکہ وہ جو کچھ کہتا تھا، مجھے پہلے لمحے پہلے مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہو چکا تھا۔

”بیک صاحب! آپ کے ذہن میں، میرے حوالے سے بہت سے سوالات سر اٹھا رہے ہوں گے۔“ وہ میری آنکھوں میں اس قدر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اس سے پہلے کہ میں اپنا مسئلہ بیان کروں، ان سوالات کے جوابات دینا ضروری سمجھتا ہوں۔“

میں نے اسے اس کے عزائم کے دوکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آسانی سے رکنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس وقت میں بھی کاروبار ہی بیٹھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس پینسٹھ سالہ بوڑھے جوان میں عجیب سی محسوس ہونے لگی تھی۔

”جی..... ارشاد۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ایسے سرد موسم میں کوئی گرم کپڑا پہن نہیں رکھا؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جبکہ آپ اپنے گرم آفس میں فل سوٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ میں اسی شلواری میں اپنی بائیک پر بیٹھ کر یہاں تک آیا ہوں۔“

وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ واقعی حیرت ناک تھا۔ تاہم میں نے اس سے سوال کرنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ خود ہی بتانے لگا۔ ”دراصل، میں نے خود کو جوانی میں بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ اللہ کے کرم سے کسی غلط راہ پر قدم نہیں رکھا۔ اس زمانے میں خوراک خالص ہوا کرتی تھی اور اللہ نے ہر نعمت سے نوازا رکھا تھا۔“

”بالکل درست فرمایا آپ نے۔ اب اگر آپ اپنا

مسئلہ بھی بیان فرمادیں تو احسان ہوگا۔“

”جی ہاں..... اب مسئلہ بیان کرنے کا وقت آگیا ہے۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”در اصل، ایک شخص نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔“

”کون سا شخص؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نام تو اس کا فاروق ہے مگر وہ فاروق دادا کہلاتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”محمود آباد میں اس کی بد معاشی چلتی ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”ایک بد معاش سے آپ کی کیا دشمنی نکل آئی؟“

”بیگ صاحب! میں سیدھی راہ پر چلنے والا انسان ہوں اور کسی بھی قیمت پر قانون کو ہاتھ میں لینے کے حق میں نہیں ہوں۔“ وہ پر جوش انداز میں بولا۔ ”ورنہ میں چاہوں تو اس کی ساری بد معاشی ناک کے دساتے بھی نکال سکتا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ ایک قانون پسند اور اصول پرست انسان ہیں۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس فاروق دادا کو آپ سے کیا غاصت ہے۔ اس نے آپ کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟“

”در اصل، میری ساری پریشانی سنی کی وجہ سے ہے۔“ وہ خامے جذبائی انداز میں بولا۔ ”فاروق سنی کو بھگت کرتا ہے، اس پر بری نظر ڈالتا ہے۔“

”فحش طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ سنی اس جوان بونے کی بوتلی یا نوای ہوگی یا زپادہ سے زیادہ بیٹی ہو سکتی تھی لیکن میں نے اپنی سلی کی خاطر پوچھنا ضروری جانا۔“

”یہ سنی کون ہے؟“ میں نے گہری غیبیگی سے سوال کیا۔

”سنی تک غیم ہے بیگ صاحب!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا اصل نام محمد دوسرے ہے اور..... یہ میری بیوی ہے۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں پوچھنے جانا نہ چاہا۔ ”آپ نے جس بد معاش کا ذکر کیا ہے..... اس بد معاش کی عمر کیا ہوگی؟“

”یہی کوئی اٹھائیس تیس سال۔“ اس نے جواب دیا۔

”شیم.....!“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی۔ ”اس کہنے کو شرم نہیں آتی کہ وہ آپ کی بیگم کو پیچھڑتا ہے۔“

”کچھ عمری کا لحاظ کر لیا ہوتا۔“

”بیگ صاحب!“ اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ”تو کیا آپ میری بیوی کو کوئی بڑی عورت سمجھ رہے ہیں؟“

”بھئی! جب آپ پچھنہ سال کے ہیں تو آپ کی بیگم پچاس پچپن سے کم کیا ہوں گی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے جناب!“ وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ”سنی کی عمر صرف پچیس سال ہے۔“

”تو پھر یہ آپ کی سیکنڈ میرج ہوگی.....؟“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”جی، اب آپ کا اندازہ بالکل درست ہے بیگ صاحب!“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”پانچ سال پہلے میری پہلی بیوی منیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”اوہ.....!“ میں نے ہمدردی بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی اولاد تو ماشاء اللہ اب جوان ہوگی۔“

”منیہ سے میری کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بانجھ تھی۔“ وہ غصے سے میری پہلی بیوی منیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

”منیہ کی آخری سال تک اس کا ساتھ نبھایا تھا۔“

”مگر یہ لڑکی کتنی ہی بڑھتی چلی جارہی تھی۔“ میں نے پوچھا۔ ”سنی سے آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”چھ ماہ!“ اس نے جواب دیا۔ ”بہت ہی دھکی اور مظلوم لڑکی ہے جناب اور..... مطلقہ سنی کی کھلی حالت میرے علم میں نہ ہوتے تو شاید میں دوسری شادی کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔“

پھر اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی شادی باہر مہرتین پر ایک چھوٹی سی لائبریری ہے جہاں اس نے اسکول کی کتابیں، کاغذیں اور اسٹیشنری وغیرہ کا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ سنی کی رہائش بھی محمود آباد مہرتین پر ہی تھی اور وہ اکثر اس کی لائبریری سے کتابیں پڑھنے کے لیے لے جاتی تھی۔ اس عرصے میں دونوں میں اچھی خاصی جان پہچان ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ سنی کا باپ ایک شرابی اور بھاری شخص تھا۔ اس نے سنی کی شادی جب اپنے ہی قماش کے ایک شخص منیان سے کر دی تو توفیق کو اس بات کا دلی صدمہ ہوا تھا۔ سنی کی ماں کا

اس کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ بہر حال سنی اور منیان کی شادی بہ مشکل ایک سال بھی نہ چل سکی اور منیان نے طلاق دے دی۔ اس موقع پر توفیق سنی کے لیے

خاصا جند بانی ہو گیا اور بتائیں، کس جذبے کے تحت اس نے سنی کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سنی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے میں کسی حیل و حجت یا تاخیر سے کام نہیں لیا۔

اس دوران میں مٹی کی حدت پوری ہو چکی تھی اور اس کا باپ حنیف خان بھی زہری شراب پینے سے موت کے منہ میں جا چکا تھا لہذا جب مٹی کو توفیق کی شکل میں ایک سہارا نظر آیا تو اس نے توفیق کی شادی کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ اس طرح چھ ماہ پہلے وہ میاں بھوی بن گئے۔ توفیق مرحوی کی رہائش محمود آباد گیت پر تھی۔

یہ تمام معلومات مجھے توفیق مرحوی نے فراہم کی تھیں۔ اپنے بیان کے اختتام پر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بیگ صاحب! میں نے مٹی سے باقاعدہ نکاح کیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے، میری عزت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا اور اسے ہر مصیبت آفت سے بچانا میری ذمہ داری ہے۔ یہ فاروق دادا جیسے دو نکلے کے بچے اس پر آواز سے جیٹے اسے چھیڑیں، یہ میں بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ میں اس فاروق کو ایسا مہرت ناک سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ اس کی آنے والی سات لکھن بھی لنگھنے پن کے بارے میں سوچتے ہوئے کانپ اٹھیں اور..... اور اس کام کے لیے مجھے آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔“

”مثلاً..... میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو ایک دو دن میرے گھر آنا ہوگا۔“ وہ مجھے اپنے منسوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے ایک گھنٹے کے لیے رات کو آٹھ اور نو بجے کے درمیان۔ میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں کہ فاروق کس طرح میری مٹی کو پریشان کرتا ہے۔“

اس کی بات سن کر مجھے الجھن بھی محسوس ہوئی اور حیرت بھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ بد معاش ایک مخصوص وقت پر آپ کی بیوی کو تنگ کرتا ہے؟“

”جی ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔“ اس گورے چٹے دراز قامت بوڑھے نوجوان نے حیات میں گردن ہلائی۔ ”پہلے وہ غبیٹ سبکی نازیبا حرکتیں رات نو اور دس بجے کے درمیان کیا کرتا تھا۔ مٹی نے جب مجھے اس حرکت کی تو میں نے لائبریری سے ایک گھنٹا پہلے گھر آنا شروع کیا لہذا اس نے بھی اپنی مینگی کے وقت میں تہہ پٹی کر لی۔“

پھر توفیق مرحوی نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ صبح دس بجے لائبریری کھولتا تھا۔ دوپہر میں تین سے پانچ بجے تک وہ دکان بند کر کے گچ بریک کے لیے گھر آ جاتا تھا۔ دوبارہ شام پانچ سے رات دس بجے تک وہ لائبریری میں موجود رہتا تھا تاہم ان دنوں وہ رات نو بجے لائبریری بند کر کے

گھر آ جایا کرتا تھا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ”توفیق صاحب! آپ کی بیان کردہ تفصیل سے چند باتیں میری سمجھ میں آتی ہیں اور ایک بات کو میں سمجھنے سے قاصر رہا ہوں.....“

”ایسی کون سی باتیں ہیں بیگ صاحب؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”جو باتیں سمجھ میں آرہی ہیں، ان میں سے پہلی تو یہ ہے کہ وہ بد معاش آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی نیگم کو چھیڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اس کام کے لیے صرف رات ہی کو ترجیح دیتا ہے ورنہ دن میں بھی تو آپ گھر سے دور اپنی لائبریری میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں.....؟“

”نہیں جناب، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ خوش مزاج لہجے میں بولا۔ ”آپ میرے مسئلے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ ایک ذہین اور قابل وکیل ہیں۔ وہ ذلیل انسان اسے وقت میں مٹی سے چھیڑ خانی کرتا ہے جب میں گھر میں موجود ہوں اور رات بھی ہو۔ ایسے وقت کا انتخاب وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اسے میری طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہو اور وہ بھی اس کی ادھی حرکت کا ٹوٹ نہ لے سکیں۔“

”اس سے ایک اور بات بھی یاد ہو جاتی ہے کہ فاروق دادا کہلانے والا وہ فنڈا آپ کے گھر کے بہت قریب آ کر ایسی گھنیا حرکتیں کرتا ہے۔“ میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

”جی ہاں، بہت نزدیک۔ گھر کے پھووازے۔“ اس نے سکواٹائی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ سامنے والی مین میں آ کر ایسی مینگی کرے تو دس لوگوں کی نظروں میں آ جائے گا چنانچہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر گھر کے عقبی حصے میں پہنچتا ہے اور خود جھولوں سے مٹی کو تنگ اور ہراساں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”کیا وہ روزانہ ہی ایسی ہی حرکت کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، روزانہ..... اس موڈی شخص نے میرا سکھ جین لوٹ لیا ہے۔ میں لائبریری بند کر کے پورا دن گھر میں نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی میں مٹی کو اپنے ساتھ لائبریری لے کر جاسکتا ہوں۔ عورت کا اصل مقام گھر کی چار دیواری کے اندر ہے۔ مٹی جناب اور صوم وصلوہ کی پابند ہے۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے تو میں نے اسے اپنا لیا ہے۔“

انسانیت، معاشرتی ناسور اور جانے کیا کیا ثابت کر کے اسے ایک طویل عرصے کے لیے جیل بھجوانا چاہتا تھا۔ اس کے منصوبے کی تفصیل جان کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ بڑھاپے میں جوان عورتوں سے شادی کرنے والے مردوں کا یہ درد مشترک ہے۔ انہیں تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد محلے بدلتا پڑتے ہیں، اپنی بیویوں کو حجاب کا پابند بنانا پڑتا ہے اور توفیق عمر عوی جیسے گونا گوں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ ہمارے معاشرے کی ایک عام روش ہے۔ بعض اوقات آپ بہت مجبور ہوجاتے ہیں۔ آپ کے سامنے کوئی دلو کا پنھا کھڑا بیٹھا ہوتا ہے مگر آپ اس کے لیے یہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتے۔ ان لمحات میں پیری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ بہر حال، میں نے نہایت ہی عمل سے کہا۔

”توفیق صاحب! آئی ایم ویری سوری۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں بالکل صحت مند ہوں۔“ میں نے یہ دستور متحمل انداز میں کہا۔ ”آپ کا والد کسی وکیل سے متعلق نہیں ہے۔ یہ سید حاسد حاکم پولیس میں ہے۔ آپ اپنے علاقے کے قحانے جاکر فاروق دادا کے خلاف شکایت درج کرائیں۔ وہ لوگ خود ہی اس بد معاشرے سے نشت لیں گے۔“

”بیگ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں؟“ وہ نقلی آئینہ مجھ میں بولا۔ ”پولیس، فاروق سے کیا شکایت درج کرے گا؟“

”ہمارے ملک کی پولیس تو چوروں، ڈاکوؤں اور قتلندوں کی سرپرست بنتی ہے۔“

”پانچواں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں توفیق صاحب۔“ میں نے غصے سے ہونے لگے میں کہا۔ ”میں آپ کی خاطر قحانے انجارج کوٹون کر کے فاروق کے خلاف سخت ایکشن لینے کے لیے درخواست کر دوں گا۔“

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں استفسار کیا۔ ”تو آپ میری مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں؟“

”جو کام آپ مجھ سے لینا چاہتے ہیں اس کے لیے میں معذرت چاہوں گا۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”آپ اپنے منصوبے کے لیے کسی اور وکیل سے بات کریں۔“

”اوکے۔۔۔۔۔!“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

”توفیق صاحب! میں آپ کے مسئلے کو پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے غصے سے ہونے لگے میں کہا۔ ”فاروق کی حرکتیں قابل مذمت ہیں جبکہ آپ کے عزائم قابل ستائش۔ ہر معقول شخص کو اپنے گھر کی عزت کی حفاظت کے لیے ایسا ہی سنجیدہ اور جذباتی سوچ کا مظاہرہ کرنا چاہیے لیکن۔۔۔۔۔!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ اس معاملے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟“

”جناب! سیدھی سی بات ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”جب آپ ایک، دو بار میرے گھر میں موجود رہ کر فاروق کو وہ گھنیا حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیں گے تو میرے پاس آپ کی گواہی کی شکل میں، فاروق کے جرم کا ایک محسوس ثبوت آجائے گا جس کی بنا پر میں اس مردود کو گولی کا ناچ بچا دوں گا۔“

”اس کام کے لیے خاص طور پر میں ہی کیوں؟“ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے کسی بھی معزز شخص کو اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ کہیں سے ٹیپ ریکارڈر یا کیسٹ پلیئر کا منہ دہست کر کے اس شیطان کی آواز بھی ریکارڈ کر لیں تاکہ ضرور ہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔“

”آئینہ یا تو عموہ ہے۔“ اس کے چہرے اور ہاتھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ ”ایک تجربہ کار اور کامیاب وکیل کی جگہ پہچان ہے۔ واہ واہ، سبحان اللہ۔۔۔۔۔۔ مگر کوئی اور نہیں، آپ ہی! میں کیسٹ پلیئر یا ٹیپ ریکارڈر جو آپ کی ضرورت ہوگی اس کا انتظام بھی کر دوں گا غریب کام ہر صورت میں آپ ہی کو کرنا ہے۔ آپ آپ پوچھیں گے۔۔۔۔۔ میں ہی کیوں؟“

اس کا آخری فیصلہ میرے دل کی آواز تھی لہذا میں نے جلدی سے کہا۔ ”ننگی اور بھائی کے کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی توفیق صاحب۔ میرے پوچھنے سے پہلے آپ خود ہی بتا دیں۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”کیونکہ ایک عام آدمی کی یہ سب سے وکیل زیادہ طاقتور اور موثر ہوتا ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”فاروق کے خلاف آپ کی گواہی اس کی لٹیا ڈبو دے گی۔ میں نے جو منصوبہ سوچ رکھا ہے اس میں چار چاند لگ جائیں گے۔“

پھر میرے استفسار پر وہ اپنے منصوبے کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کرنے لگا۔ اس کے مطابق وہ میری وکالت میں فاروق دادا پر کوئی دھانسو قسم کا کیس کرنا چاہتا تھا اور پھر میری گواہی کے زور پر وہ فاروق کو بھڑیا، شیطان، تنگ

نچے سے اس کا استفادہ کرنا۔

میں نے پوچھا۔ ”کون تو فقی صاحب؟“

”کوئی ایک ماہ پہلے وہ آپ سے ملنے آئے تھے۔“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں ان کی بیوی ہوں
روہینہ.....!“

”معاف کیجئے گا، میں آپ کو پہچان نہیں پایا اور نہ ہی

توفیق صاحب میری یادداشت میں تازہ ہو رہے ہیں۔“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ”اگر آپ یہ بتا سکیں کہ آپ کے شوہر کس مقصد سے میرے پاس آئے تھے تو شاید مجھے یاد آ جائے۔“

روبینہ نامی اس پردہ پوش خاتون کی آنکھوں میں
تذبذب کی ہر چمکیں لہرائی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس
کے بدن میں بھی بے چینی کی کیفیت محسوس ہوئی۔ اس نے
تقابلی اوٹ ہی سے تصدیق طلب لمحے میں پوچھا۔

آج مرزا احمد بیگ ایڈووکیٹ ہی ہیں نا.....؟“

”کیا ہاں، آپ بالکل درست جگہ پر بیٹھی ہیں۔“ میں

نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں ہی مرزا اسجد بیگ ہوں۔“
اس کے چہرے پر اطمینان مجھکنے لگا۔ چہرے سے
میری مراد اس کی آنکھیں میں وارد نہ آنکھوں کے سوا چہرے
کے باقی حصے تو نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ قدرے
مطمئن انداز میں بتانے لگی۔

”بیگ صاحب! میرے شوہر ایک غنڈے قاروق دادا کے سلسلے میں آپ کے پاس کوئی انوکھا حکم لے کر آئے تھے۔ وہ اس غنڈے کو آپ کی عود سے خراہا رہا تھا۔“

”ایک منٹ.....!“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا تھا جس میں جینٹھ سالہ بوڑھے جوان کا چہرہ نمایاں ہو گیا تھا۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔
”آج تو نئی عمر مری گئی ہے یا نہیں؟“

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے جلدی سے اثبات میں
مردن ہلائی۔

”تو آپ مئی ہیں؟“ میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

توفیق عمرحوی کو میں واقفا بھول گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے زیادہ تر مٹی کا لفظ ہی استعمال کیا تھا اسی لیے جب میرے سامنے بیٹھی ہوئی اس پردہ پوش خاتون نے اچانک نام رو بینہ بتایا تو میرا دھیان مٹی کی طرف گیا اور نہ ہی توفیق عمرحوی کی جانب۔

میں نے اس کے مصافحے کے لیے بڑھ رہے ہوں ہاتھ کو تھام لیا اور کہا۔ ”میں آپ کے کسی کام نہیں آسکا، اس کا مجھے سخت افسوس ہے۔“

ماہوسی کے ان لحاظات میں بھی توفیق عمر حوی میرے ہاتھ کا کچھ مرنے کے خیال سے باز نہیں آیا تھا۔ واقعی، اس کا مصافحہ فدا دی تھا۔

توفیق کے جانے کے بعد میں بھی گھر کے لیے روانہ ہو گیا اور راستے بھرائی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر رنگ، نسل اور مزاج کے لوگ پیدا کیے ہیں۔ توفیق عمر حوی بھی انہی میں سے ایک تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر وہ کل صبح سنی کورٹ کے اجاٹے میں اپنے مطلب کا وکیل تلاش کرنے کی کوشش کرے تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔

☆☆☆

پیشہ ور انسان کی زندگی بڑی مصروف ہوتی ہے، خاص طور پر ایسا پیشہ جہاں میں پبلک ڈینک کا عمل دخل ہو۔ میں صبح کمرے سے نکلتا ہوں، کھانا کھانے سے پہلے اکثر آفس کو میچ کرنا پڑتا تھا۔ دن کا ابتدائی حصہ ایک عدالت سے دوسری عدالت میں آتے جاتے گزرتا تھا۔ صبح کے بعد میچ اور پھر آفس۔ رات کو آفس سے نکل کر کمرے پہنچنے کی بجائے گیارہ بجے ہی جاتے تھے۔ اس افراتفری کے معمولات میں کمرے میں بیٹھ کر غور و جواں بوڑھا توفیق عمر محوی میرے ذہن سے نکلتا تھا شاید وہ دوبارہ بھی مجھے یاد آئے گا مگر ایک واقعے نے اس کی فائیت میں تیزی دے دی تھی کہ کو تازہ کر دیا۔

ایک روز میں حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھا
 ہاتھس کو دیکھ رہا تھا کہ اپنی باری پر ایک بار بدہ خاتون
 میرے چہرہ میں داخل ہوئی۔ اس کی صرف آنکھیں دکھائی
 دے رہی تھیں، باقی کا بدن قلاب میں تھا۔ حتیٰ کہ ہاتھوں
 میں بھی اس نے دستا کے پھانکے رکھے تھے۔ میں نے اسکا
 خواتین کو معاشرے میں زندگی گزارنے اور مختلف شعبوں
 میں نقل و حرکت کرتے دیکھا تو تھا تاہم ایک وکیل کی حیثیت
 سے۔ میرا پہلا تجربہ تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے، اپنی میز کی دوسری طرف بھی کر سون کی سمت اشارہ کر دیا۔ جب وہ اطمینان سے نشست کے سنبھال چکی تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”جی، فرما تم میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”آپ تو نیک صاحب کو تو جانتے ہیں!“ نقاب کے

”جی بیگ صاحب! میں مئی ہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”بھئی! آپ کے شوہر تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔“ میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ”کیا اب مرحوی صاحب نے اپنے منصوبے پر عملدرآمد کے لیے آپ کو آگے بڑھایا ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے بیگ صاحب!“ وہ گھوم کر آواز میں بولی۔

میں چونک اٹھا اور تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ”پھر کبھی بات ہے؟“

مئی کے لہجے نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”کسی منصوبے پر عمل کرنے کا تو اب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ ہی اس کی ضرورت باقی رہی ہے۔ پولیس نے توفیق صاحب کو گرفتار کر لیا ہے۔“

”کیا؟“ بے ساختہ میری آواز بلند ہو گئی۔

”جی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ بہ دستور پریشان آواز میں بولی۔ ”میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ آپ کے بارے میں توفیق صاحب ہی نے مجھے بتایا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اگر آپ ان کے کیمپ میں ہاتھ ڈال دیا تو وہ بچ جائیں گے۔“

میرا غم، رعب پینے پر تیز رفتاری سے حرکت کرنے لگا۔ ”پولیس نے توفیق صاحب کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی اتارتے ہوئے گھوم کر آواز میں بولی۔ ”انہیں فاروق دادا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک لمبی سانس خارج کی۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

”یہ چھبیس فروری دوپہر کا واقعہ ہے۔“ وہ بتانے لگی۔ ”وہ حسب معمول گھر سے تیار ہو کر لائبریری گئے تھے۔ نگ بھگ گیارہ بجے کے قریب پولیس ان کی لائبریری پر پہنچی اور انہیں فاروق کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔“

آج اٹھائیس فروری تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، پولیس نے توفیق صاحب کو دو روز پہلے گرفتار کیا ہے۔ یعنی انہوں نے ستائیس فروری کو مؤثر کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے بیگ صاحب۔“ اس نے سرکوشانی جنبش دی۔ ”اس وقت توفیق صاحب عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہیں۔“

”یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، فاروق کے قتل والا واقعہ.....؟“

”فاروق دادا کی لاش ہمارے گھر کے پچھواڑے کچرے کے ڈمپر پر پڑی ملی تھی۔“ مئی نے بتایا۔ ”چھبیس فروری کی صبح جب بھٹی (جمعہ دار) اس طرف صفائی کرنے

پہنچا تو اس نے ہمارے گھر کے عقب میں ایک لاش پڑی دیکھی۔ بھٹی کے شوہر جانے پر محلے کے کافی لوگ جمع ہو گئے

پھر فاروق دادا کی حیثیت سے اس لاش کی شناخت کر لی گئی۔ تھانہ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ پولیس کو اطلاع دی گئی اور پھر پولیس نے موقع پر پہنچ کر کارروائی کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے بھی کئی اٹنے سیدھے سوالات کیے۔ اس کے بعد وہ لائبریری پہنچے اور توفیق صاحب کو فاروق کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔“

”آپ کے گھر کے پچھواڑے کسی غنڈے کی لاش پڑی ملتی ہے۔“ میں نے مئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کے قتل کے الزام میں آپ کے شوہر کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ پولیس کو کس بنا پر یہ شبہ ہوا کہ فاروق دادا کو توفیق نے قتل کیا ہوگا.....؟“

”اس کی چند وجوہات ہیں۔“ وہ غمگین لہجے میں بتانے لگی۔ ”یہ بات تو آپ کے بھی علم میں ہے کہ اس شخص نے ہمارے گھر کے پچھواڑے پر گھر کے دروازے کے آگے

مجھے تک کر رکھا تھا۔ ممکن ہے، توفیق صاحب نے اس حوالے سے ادھر ادھر کی بات کی ہو.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”دوسری سب سے اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس واقعے سے ایک روز پہلے فاروقی اور توفیق میں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا جس میں توفیق نے فاروق کو خطرناک نتائج

کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ اس موقع پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ممکن ہے، ان دھمکیوں کی وجہ سے پولیس کا دھیان توفیق کی طرف چلا گیا ہو۔“

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”آپ مجھے اس جھگڑے والے واقعے کی تفصیل سے آگاہ کریں جس میں آپ کے شوہر نے

فاروق دادا کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں؟“

”یہ چوبیس فروری کی شام کا واقعہ ہے۔“ وہ معتدل

”آپ کو جو بھی پوچھتا ہے، بے دھڑک پوچھیں۔ مانڈ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ فاروق دادا، توفیق صاحب سے شادی کے بعد آپ کے پیچھے پڑا تھا یا آپ اسے پہلے سے جانتی تھیں؟“

”مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”توفیق صاحب سے شادی کے کچھ ہی عرصے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دو رات کے اندر میرے میں ہمارے گھر کے ہچھواڑے آکر ”منی منی“ کی آوازیں لگتا تھا۔“

”آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ گھر کے عقب میں ”منی منی“ پکارنے والا فاروق دادا ہی ہے؟“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے سوال کیا۔

”اس نے خود اپنے بارے میں مجھے بتایا تھا۔“ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔ ”جب ابتدا میں اس نے مجھے پکارنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون ہے جو مجھے گھر کے ہچھواڑے سے پکار رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر پوچھ لیا۔“

”اے بھائی اکون ہوشم۔“ ”خدا کے لیے مجھے بھائی نہ کہو۔“ ادھر سے جواب آیا۔ ”میں اس علاقے کی مددگار ہوں۔“ فاروق دادا۔ ”کیا یہ مددگار غنڈے کی تلے بھائی نہیں ہو سکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہو سکتے ہیں، کیوں نہیں ہو سکتے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مگر میں تمہارا بھائی نہیں ہو سکتا۔“ ”یہ کیا بات ہوئی۔“

”دراصل، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ ”کیا تمہیں پتا نہیں، میں کسی کی بیوی ہوں۔“ میں نے غصے سے سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں ایسی حرکتیں کرتے ہوئے شرم آتا ہے۔“

”مجھے شرم نہیں آتی بلکہ افسوس ہوتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”افسوس۔۔۔۔۔ کس بات کا افسوس؟“ میں نے بڑبڑ کر پوچھا۔ ”اس بات کا افسوس کہ تم ایک بڑے کھوسٹ کے ساتھ اپنی جوانی برباد کر رہی ہو۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”میرے سینے میں جوان دل دھڑکتا ہے اور یہ دل صرف اور صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔“

”بکو اس بند کرو۔“ میں نے اسے بری طرح ہماڑ دیا۔ ”توفیق صاحب میرے شوہر ہیں۔ میں ان کے خلاف

انداز میں بتائے گی۔“ ”فاروق، توفیق صاحب کی لائبریری پر پہنچا اور ان کے ساتھ بدچیز کی۔ دونوں کے بیچ میں ہاتھ پائی بھی ہوئی تاہم اس سے پہلے کہ مار دھاڑ شروع ہوئی، لوگوں نے بیچ بھاڑ کر انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ اسی موقع پر توفیق نے فاروق کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔“ ”وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی بھربات مکمل کرتے ہوئے کہا۔“

”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔ آپ تھانے جا کر توفیق صاحب سے ایک ملاقات کر لیں۔ وہ آپ کو اس واقعے کی تفصیل بتا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں آج ہی آپ کے شوہر سے ملوں گی۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا پھر غصہ سے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا فاروق دادا کی موت کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”میں بھی نہیں!“ اس کی الجھن بھری آواز ابھری۔ ”میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ آپ کو تو یقین ہے تاکہ فاروق دادا کے موت سے توفیق صاحب کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ مجھے سو فیصد یقین ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”اگر انہوں نے قانون کو ہاتھ میں لیتا ہوتا تو وہ مدد کے لیے آپ کے پاس بیٹھ لیتے؟“

میں نے منی سے یہ سوال محض اس وجہ سے کیا تھا کہ اس بوڑھے جوان کے بعض جذباتی ڈائلاک میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے مثلاً۔۔۔۔۔ اس دو ٹوکے جواب نے فاروق کو میں ایسا مہرت ناک سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ اس کی آنکھ والی سات لکڑیوں بھی لٹکے پن کے بارے میں سوچنے ہوئے کانٹا نہیں کی۔ بیگ صاحب! میں کسی بھی قیمت پر قانون کو ہاتھ میں لینے کے حق میں نہیں ہوں ورنہ میں چاہوں تو اس کی عدالت پر مدعا کی ناک کے راستے بھی نکال سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اگر میں چاہوں تو چپکے سے اپنے گھر کے عقب میں جا کر اس شیطان کی گردن دیوچ لوں، وغیرہ۔۔۔۔۔ اسی بنا پر میرے ذہن میں یہ خیال آگیا تھا کہ کہیں اس جھجلی بڑے نے جوش میں آکر کوئی ایسی وکیلی ”حرکت“ نہ کر ڈالی ہو۔

”ایک انتہائی ذاتی ماسوال ہے۔“ میں نے منی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ مانڈ نہ کریں تو پوچھوں؟“ ”ہمارا سب سے اہم ذاتی معاملہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے بیگ صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

بہن سیدہ واقعہ پیش آگیا۔
 ”اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کرنا بہت اچھی بات ہے۔“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”مگر اس کے ساتھ ہی زمینی حقائق کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خدا نے ہمیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دے کر دوسری مخلوقات پر فوقیت عطا کی ہے لہذا اس سمجھ بوجھ کو کام میں لانا ہم پر فرض ہے۔“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگوں کے مسئلے کا سیدہ حاسدہ معاملہ تو یہ تھا کہ تھانے جا کر فاروق دادا کے خلاف رپورٹ درج کروا دیجئے۔ تھانے سے دو اہلکار آپ کے گھر میں آکر بیٹھ جائے۔ جب فاروق گھر کے عقب میں آکر جانوروں کی آواز نکالتا اور ”منی منی“ پکارتا تو اس کے جرم کا ثبوت مل جائے گا۔ پھر پولیس کیسے اس کے خلاف کارروائی نہ کرتی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ انہیں پولیس والوں پر ذرا بھروسہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تھانے میں کسی کے ساتھ جھڑاکر کے کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کر دیں۔ پولیس والوں سے ان کی بد نظرت ہے۔“

”آپ نے تو انہیں صرف رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے انہیں پیشکش کی تھی کہ اگر انہیں پولیس والوں پر اعتماد نہیں تو میں تھانہ انچارج کو فون کر کے فاروق دادا کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی ہدایت کر دوں گا مگر میری بات انہی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ناراض ہو کر میرے دفتر سے چلے گئے۔“

”جو ہو گیا اسے بھول جائیں بیگ صاحب۔“ وہ منت ریز لہجہ میں بولی۔ ”آپ کسی بھی طرح توفیق صاحب کو اس معیشت کے نعمات دلادیں۔ یہ آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن ہو کر گھر جائیں۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”جب تک آپ کے شوہر ریماڈ پر پولیس کھڑی میں ہیں، کوئی عملی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ میں آج آفس سے اٹھنے کے بعد تھانے جا کر ان سے ملاقات کر لوں گا۔ آپ کل اسی وقت دوبارہ میرے پاس آجائیں۔ پھر باقی کے معاملات طے کر لیں گے۔“

”میں آپ کی فیس کے پیسے ساتھ لے کر آئی ہوں۔“ وہ پرس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ

کوئی بات نہیں سن سکتی۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور پھر کبھی دوبارہ اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔“ خود کو دادا کہلواتا ہے اور رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر گھر کے بچھواڑے سے آوازیں نکالتا ہے۔“

”میں چاہوں تو سامنے والی گلی سے بھی آ سکتا ہوں۔“ وہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ڈرتا دوڑتا نہیں ہوں کسی سے۔۔۔۔۔ بس یہی خیال آ جاتا ہے کہ میری وجہ سے تم کہیں بدنام نہ ہو جاؤ۔۔۔۔۔ میں منی کی بدنامی سے بہت ڈرتا ہوں۔“

”تم جو سوچ رہے ہو اور جو چاہ رہے ہو، وہ کبھی اور کسی بھی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔“ میں نے دونوک لیے ہیں کہا۔ ”لہذا تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ منی کے خیالی دل سے نکال دو اور دوبارہ اس طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھو۔۔۔۔۔“ لختی توقف کے بعد اس نے گہری سانس لی پھر معتدل انداز میں بولی۔

”یہ فاروق دادا سے میری پہلی اور آخری گفتگو تھی۔“ ”کیا آپ کی سمجھ کا اس پر کچھ اثر ہوا تھا؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”خاک بھی اڑ نہیں ہوا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”اس نے اپنی بے ہودہ روش جاری رکھی۔ وہ مجھے اپنے مکان کے بچھواڑے پہنچتا ہلق سے جانور کی آواز نکالتا اور ”منی منی“ کی پکار اور مختلف انداز میں اظہار محبت۔۔۔۔۔“ ”جانور کی آواز۔۔۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”جی بیگ صاحب!“ وہ اشیات میں گمرون جلاتے ہوئے بولی۔ ”وہ گھر کے عقب میں پہنچ کر کسی نہ کسی جانور کی آواز نکالتا پشلا پشلا کر، کتنے کی آواز۔ ایک طرح سے وہ مجھے اپنی آمد کا اشارہ دیتا تھا مگر میں نے پہلے دن کے بعد سے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے یہ سارا معاملہ توفیق صاحب کو بتا دیا تھا وہ غاصب پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹائٹنگ بھی تبدیل کی لیکن اس ضیبت کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ مگر انے اپنی ٹائٹنگ بھی بدل دی تھی۔ توفیق صاحب نے کئی بار اس شیطان سے بھڑنے کا ارادہ بھی کیا لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ پھر وہ اس مسئلے کے حل کے لیے آپ کے پاس آ گئے۔ آپ کے عدم تعاون نے انہیں مایوس کر دیا۔ وہ دن رات اسی بد ذات کے بارے میں سوچتے اور فکر مند ہوتے رہتے تھے پھر انہوں نے یہ معاملہ خدا کے سپرد کیا اور لاٹری کی پرانی ٹائٹنگ کے مطابق وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور پھر۔۔۔۔۔ چند روز

جاتی ہے۔ میں نے ان تمام کاغذات پر توفیق کے دستخط لیے اور مذکورہ کاغذات کو دو بارہ بریف کیس میں رکھنے کے بعد توفیق کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”یہ کیا ماجرا ہے توفیق صاحب.....؟“

”ماجرا..... جو بھی ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔“ وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ”اگر آپ نے میری بات مان لی ہوتی تو فاروق آج جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سانس لے رہا ہوتا لیکن قدرت اپنے طریقے سے کام کرتی ہے۔ جس کی سانسیں پوری ہو چکی ہوں وہ منوں مٹی کے پیچھے ہی جاتا ہے.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں نے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دیا تھا اور اپنی پرانی ٹائمنگ کے مطابق لاہور میں جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے مٹی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ کسی بھی قیمت پر اس لفٹ کے کسی بات کا جواب نہ دے۔ مٹی نے میری پورا اتنی بلند ہے کہ وہ اس کے اوپر سے اندر مچن میں جھانک نہیں سکتا تھا اور مٹی دروازہ آہنی ہے جس پر موٹا تالا بڑا رہتا ہے۔ فاروق نے اس عرصے میں کئی بار مٹی سے وہ دروازہ کھولنے کی درخواست بھی کی تھی تاکہ وہ رو برو مٹی سے باتیں کر سکے تاہم مٹی نے مکمل مندی کا مظاہرہ کیا اور کبھی اس لوہر کی باتوں میں نہیں آئی۔ میں نے مٹی پر واضح کر دیا تھا کہ اگر بھی وہ تمام اخلاقی حدود کو چھو جائے تو بھی دیوار کو کوڑ کر گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو مٹی فوراً ”چور چور“ کا شور مچاتے ہوئے گھر کے سامنے دوڑے اور ان سے نکل کر باہر گلی میں آجائے۔ ماشاء اللہ مٹی خالص بھار اور ہمت والی عورت ہے۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اللہ کے ایسا موقع آنے سے پہلے ہی اس شیطان کا خاتمہ کر دیا..... جس کو جہاں باک!“

آخری جملہ اس نے ایسے بد مزہ انداز میں ادا کیا تھا جیسے اس کے منہ میں کوئی نہایت ہی کڑوی شے آگئی ہو۔ اس رویے سے توفیق کی مقول سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ فاروق نے مٹی کے حوالے سے پچھلے کچھ عرصے سے جو غیر اخلاقی و تیرہ اپنا رکھا تھا، اس کی روشنی میں توفیق عرصوی اس سے محبت تو ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

”توفیق صاحب! فاروق دادا کا قتل آپ کے گھر کے پچھواڑے ہوا ہے۔“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کی لاش کچرے کے

چاہیں تو.....“

”نہیں!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کل جب میرے پاس آئیں گی تو اس وقت میں بھی لے لوں گا۔ پہلے میں توفیق سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ جان سکوں کہ اس کیس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے کی کوشش کر رہا ہے۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

اچانک اس بوڑھے جوان کے معاملے میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ مٹی نے مقتول فاروق کے اظہار محبت کے حوالے سے بھی خاصے مضحکہ خیز انکشافات کیے تھے میرے استفسار کے جواب میں اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ فاروق روزانہ ہی اس کے گھر کے عقب میں آ کر پہلے مختلف جانوروں کی آوازیں نکالتا تھا اور پھر عامیانہ انداز میں اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا وہ وقت کا ایسا ہی پابند اور دھن کا ایسا ہی پکا تھا کہ کبھی چھٹی نہیں کرتا تھا؟ اس نے جواب دیا تھا کہ ایسی بات نہیں، وہ کبھی کبھی ایک دو دن کے لیے غائب بھی ہو جاتا تھا اور ان دنوں وہ شکرانے کے لفظیں بولتا کرتی تھی۔ بہر حال یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا اور..... اس کا خاتمہ؟ فاروق کے خاتمے پر ہوا تھا۔

اس روز دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر کا دروازہ کھولنے سے پہلے متعلقہ تھانے جا کر توفیق سے ملا۔ ریل گاڑی پر چالیں کی حویل میں کسی ملزم سے ملاقات کے لیے کیسے کیسے جھٹکتے رہے استعمال کرنا پڑتے ہیں، اس کی تفصیل پہلے بھی کئی بار بیان کی جا چکی ہے۔

توفیق عرصوی سے میری یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات میں مجھے اس کی پونجی ہڈیوں میں جو جوش و خروش اور طنطنہ نظر آیا تھا وہ ان وقت مفقود تھا۔ حوالات میں گزرنے والی چند راتوں نے اس کی حالت خراب کر دی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ میرا کیس ضرور لیں گے۔“ وہ حوالات کے فرش سے اٹھ کر میری جانب بڑھا اور اپنی سلاخوں نے اسے مجھ تک نہیں پہنچنے دیا۔

میں نے بریف کیس کھول کر چند اہم کاغذات نکالے جن میں وکالت نامہ اور درخواست ضمانت سر فرست تھیں۔ اس نوعیت کے اہم کاغذات ہر وکیل کے پاس ریڈی ہوتے ہیں۔ بس، ان میں موکل کے حساب سے خانہ پری کر لی

ڈھیر پر پڑی ملی ہے اور آپ کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق آپ کی گرفتاری کا سبب وہ جھگڑا ہے جو قوعد سے ایک روز قبل آپ کا مقتول کے ساتھ ہوا تھا جس میں آپ نے اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کہنے نے اس روز میری لائبریری پہنچ کر ایسی بے ہودگی کی تھی کہ مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ میرے منہ میں جو بھی آیا، میں بول چلا گیا۔ مجھے یاد ہے، جب میں بہت زیادہ جوش و جذبات میں تھا تو میں نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی اور میرے انہی الفاظ نے آج مجھے تھانے میں پہنچا دیا ہے اور اس کے بعد میں عدالت پہنچنے والا ہوں۔“

اس کے بعد توفیق عمرحوی نے مجھے اس جھڑپ کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ میں سردست آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ان معاملات کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر آئے گا۔

”توفیق صاحب! جب آپ کا مقتول فاروق کے ساتھ جھگڑا ہو رہا تھا تو وہاں درجن بھر افراد بھی جمع ہو گئے تھے جنہیں آپ قاتل بھی کہہ سکتے تھے۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو سینٹے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے کون سا ہے چند آپ کے ہمدرد ہوں گے جنہوں نے میری معلومات کے مطابق آپ لوگوں کو دست و گریبان ہونے سے روکا ورنہ کوئی بڑا حادثہ بھی جنم لے سکتا تھا۔“

”وہ جبر ہے ہاتھوں پٹنا۔۔۔۔۔ بہت بری طرح پٹنا۔“ توفیق نے دونوں ہاتھوں کی منہیاں کھول بند کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی بوڑھے جوان کا پورا وجود بھی کپکپا اٹھا تھا۔ ہر طاقتور کی کارکردگی کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ صلیق ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ کارکردگی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے حقیقت اور قانون فطرت یہی ہے جو کسی بوڑھے جوان کے لیے تبدیلی نہیں ہو سکتا۔

”توفیق صاحب! اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا چاہیے اور کچھ بھی بولنے سے پہلے اسے اچھی طرح تول لینا چاہیے۔ جس مجمع کے سامنے آپ نے فاروق کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی، میرے اندازے کے مطابق انہی میں سے چند لوگ پولیس کے اتھے چڑھ گئے ہیں جہاں آپ کو فاروق کے قتل کے الزام

میں دھر لیا گیا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے تمہوڑا رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں وہیں ایک آدمہ دشمن بھی چھپا بیٹھا ہوتا ہے جو موقع کی تاک میں رہتا ہے تاکہ نقصان پہنچا سکے۔ آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا ہے۔۔۔۔۔“

توفیق عمرحوی نے گردن جھکا دی اور حوالات کی آہنی سلاخوں کو تھاتھتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی واپس نہیں آتے۔ جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا۔ میں اس واقعے کے بعد سے سخت پریشان ہوں۔ اب اوپر خدا اور نیچے آپ ہیں۔ میری ساری امیدیں آپ ہی سے لگی ہیں۔۔۔۔۔“ بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرائی گئی۔

”مگر خدا پر بھروسہ ہے تو وہ ضرور آپ کی مدد کرے گا۔“ میں نے کئی آنچلے لہجے میں کہا۔ ”ان کاغذات پر۔۔۔۔۔“ میں نے اپنے برقعہ میں کوچھتھایا۔ ”آپ کے دستخط لینے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے آپے کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے چنانچہ آپ ہر گز اور پریشانی محسوس نہ کریں۔“

”تھیک یو بیگ صاحب!“ وہ شکل انظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے چند ضروری ہدایات دین اور عدالت میں ملاقات کا وعدہ کر کے تھانے سے نکل آیا۔

اگلے روز صبحی ایک بار پھر میرے آفس میں موجود تھی۔ میری ملک ملک کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے توفیق صاحب کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے نا۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں! میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اسے اپنی فیس کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے فوراً اپنے وینڈ بیگ میں سے فیس کی رقم نکالی کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید بنا کر اس کے حوالے کی اور کہا۔

”عدالتی اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے جو یقیناً آپ ہی کو برداشت کرنا ہوں گے۔“

”تھیک ہے بیگ صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں بولی۔ میں تمام اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ توفیق باعزت بری ہو جائیں گے نا؟“

”انشاء اللہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا جیسے کسی نے خاص طور پر اسے یہ مشن سونپا ہو۔

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں جناب!“ وہ بے بسی سے چلکیں جمپکاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ”دفعہ کی رات کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟“

”میں بھی نہیں بیگ صاحب!“ اس کی آنکھوں میں تذبذب ابھرا۔ ”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ کیا دفعہ کی رات یعنی بچپن فروری کو بھی مقول آپ کے گھر کے بچھواڑے آیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے کسی جانور کی آواز نکال کر آپ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اس رات وہ گھر کے عقب میں نہیں آیا تھا یعنی۔۔۔۔۔ میں اس کی موجودگی سے واقف نہیں کیونکہ اس نے نہ تو کسی جانور کی آواز نکالی تھی اور۔۔۔۔۔ نہ ہی مجھے پکارا تھا۔“

”اس کے باوجود بھی اگلی صبح قاروق دادا کی لاش آپ کے گھر کے بچھواڑے پھرے کے ڈمپر پر پڑی تھی۔“ میں نے سوچ میں دوہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دفعہ کی رات آپ کے گھر کے عقب میں آیا تو تھا مگر کسی جانور کی آواز نکالنے سے پہلے ہی وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شیطان کے ساتھ اس رات کیا ہوا تھا۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ”مگر ہے،“

”اللہ نے ہماری دعا قبول کر کے اس مصیبت سے ہمیں نجات دلوائی ہے۔“

”اللہ موجود مصیبت سے بھی آپ کو نجات دلانے کا۔“ میں نے اپنی سرے انداز میں کہا۔ ”آپ پورے اطمینان کے ساتھ چلیں۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی پھر میرا شکریہ ادا کر کے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت دائر کر دی اور ملزم کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔ دوسری جانب سے وکیل استغاثہ نے ضمانت رکوانے کے لیے زور لگایا۔ جیسا کہ پہلے

ہوئے کہا۔ ”ابھی تو میں نے صرف آپ کے شوہر کی اسٹوری سنی ہے۔ پولیس جب عدالت میں چالان پیش کرے گی تو استغاثہ کی رپورٹ کی شکل میں بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں گی جن میں زیادہ تر آپ کے شوہر کے خلاف چاہیں گی۔ بہر حال۔۔۔۔۔“ میں نے ڈاراک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی صورت حال سامنے آئے گی، میں سنبھال لوں گا۔“

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”روینہ صاحبہ! ابھی طرح سوچ کر بتائیے، کیا چوتیس فروری کی رات بھی قاروق آپ کے گھر کے بچھواڑے، آپ کو پریشان کرنے آیا تھا؟“

”چوتیس فروری۔۔۔۔۔؟“ اس نے ابھمن زدہ انداز میں کہا۔

”جی، چوتیس فروری!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جس شام قاروق اور توفیق میں جھگڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔؟“

”بالکل آیا تھا بیگ صاحب۔“ وہ پُر دھوک لہجے میں بولی۔ ”لیکن اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ شام میں اس نے توفیق سے کوئی پھڑا وغیرہ کیا ہے۔“

”وہ آیا ہوگا، کسی جانور کی آواز نکال کر آپ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے بعد وہ آپ کو پکارنے لگا ہوگا۔“

”جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔“ اس نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”لیکن اتنے عرصے کے ناخوشگوار تجربے کے بعد میں نے اس کی آواز نہ باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ وہ مجھے ہی ہمارے گھر کے بچھواڑے نمودار ہوتا، میں توفیق صاحب کی ہدایت کے مطابق گھر کے بیرونی دروازے کو کھول دیا کرتی تھی تاکہ اگر کسی دھوکہ دہو دہو پوار پھاند کر گھر کے اندر کود آئے تو میں گھر سے باہر کھڑے ہو کر پھانسیوں۔“

”لیکن ایسا سنگین واقعہ بھی پیش نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”جی۔۔۔۔۔ اللہ کا شکر ہے۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

”اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بد معاش مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بزدل شخص بھی تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کے پیچھے

بھی اس امر کی کئی بار وضاحت کی جا چکی ہے کہ قتل کے مزم کی ضمانت نامہ کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ آدمی سمجھنے کی مگر مگر بحث کے بعد عدالت نے مزم کی ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جنیل بھیج دیا، پھر پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو سنی خاصی باپوس نظر آئی۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے دل شکستہ لہجہ میں کہا۔

”بیگ صاحب! میں تو توقع کر رہی تھی کہ توفیق کی ضمانت ہو جائے گی۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”کیا اس سے پہلے کبھی آپ کا عدالت سے واسطہ پڑا ہے؟“

”نہیں..... براہ راست نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میرے چچا مرحوم ایک گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان کا اپنے مالک مکان سے تنازعہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک سہ ماہی تک چلا گیا تھا۔ اس کیس کی ساری تفصیلات ہیں یہ میری یادداشت میں.....“

”مالک مکان اور کرائے دار کے بیچ پیدا ہونے والا تنازعہ اور قتل کے کیس میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے روہینہ صاحبہ!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ بہت نہ ہاریں۔ قتل کے مزم کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ ابھی تو اس کیس کی ابتدا ہے۔ اپنے حوصلے کو جوان رکھیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

”اے اللہ! کہہ رہے ہیں تو میں یقین کر لیتی ہوں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ظاہر ہے عدالت اور قانونی معاملات کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں پر بھروسہ ہے۔“

میں نے اسے کئی دلائل پیش کر کے رخصت کر دیا۔

اگلے تاریخ پندرہ روز بعد کی۔ ان دوران میں مجھے اس کیس کو اسٹڈی کرنے کا بھرپور موقع ملا تھا۔ استغاثہ نے رپورٹ تیار کرتے وقت مزم کی ذات کے حوالے سے چند چیزوں کو اجاگر کر کے اسے فاروق دادا کے قتل میں ملوث کرنے کی اپنی کوشش کی تھی۔ میں اس کا خلاصہ آپ کے خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

استغاثہ کے مطابق مزم توفیق مرحوم ایک غصیلہ اور جھڑا شخص تھا اور اس کی فطرت میں شک کا عنصر شامل تھا۔ بڑھاپے میں جب اس نے خود سے چالیس سال چھوٹی ایک نوجوان عورت سے شادی کی تو گویا اس کے پر نکل آئے

تھے۔ وہ خود کو جوانوں سے زیادہ جوان ظاہر کرنے لگا۔ اس بات پر بڑا فخر بلکہ غرور تھا کہ وہ بیسٹھ سال کی عمر میں ایک پچیس سالہ عورت کا شوہر ہے۔ اس فخر نے اس کی طبیعت اور مزاج میں ایک عجیب طرح کا عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ کوئی بھولے سے بھی اس کی بیوی کی طرف دیکھ لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ شخص اس کی بیوی کو لے اڑے گا۔ اسے ہر وقت اپنی بیوی کے کھونے کا دھڑکا لگا رہتا۔ اس کیفیت نے اسے نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اسی نفسیاتی عارضے نے مزم کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ مقتول اس کی بیوی کو ورطانے، یہ الفاظ دیگر ہتھیانے کے چکر میں ہے۔ مزم نے کئی لوگوں کے سامنے مقتول کی نازیبا حرکتوں کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ بالکل حقیقت یہ ہے کہ مقتول کا اس کی بیوی سے دور دور کا بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ بس، اتنی سی بات تھی کہ مزم اور اس کی بیوی کا ایک ساتھ جاتے دیکھ کر مقتول دو، تین بار طنزیہ انداز میں سر ہلاتا اور عین ممکن ہے، اس نے کوئی ایک آدھ جملہ بھی پہنچا دیا تھا۔

اس کے بعد استغاثہ کی رپورٹ میں اس جھڑے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا جو چھ ماہ کی شام مزم اور مقتول کے بیچ ہوا تھا جس میں مزم نے مقتول کو جان سے مارنے کی خطرناک دھمکی دی تھی۔ یہ ایسا استغاثہ کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس جھڑے کے اگلے روز ہی فاروق دادا مردہ حالت میں پایا گیا تھا اور وہ بھی توفیق مرحوم کے گھر کے پچھواڑے، کچرے کے ڈھیر پر لٹا ہوا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروق کی موت پچیس ماہ کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہ بھاری ہلاک تھا جو تعمیراتی کام میں استعمال ہوتا ہے۔ چھل نے وزنی ہلاک مقتول کے سر پر مارا تھا جس سے اس کی کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے تھے۔ ہلاک کی ضرب ایسی خطرناک اور کاری تھی کہ مقتول کو سانس لینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور وہ پلک جھپکتے میں موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اس کی لاش کے قریب ہی وہ ”قاتل ہلاک“ بھی پڑا ہوا مل گیا تھا۔ ہلاک کے ایک حصے چھلنے والا خون اور اس میں چپکے ہوئے ہال مقتول فاروق کی لاش تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بھی درج تھا کہ مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا جو اس کی فوری موت کا سبب بن گیا تھا۔ کھوپڑی کا سامنے والا حصہ یعنی پیشانی وغیرہ نوٹ پھوٹ سے محفوظ رہی

”یہ عروں کا کوئی عجیب سا میل نہیں ہے۔“ وکیل استغاثہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”اس ثقافت کی وجہ سے دیکھنے والے تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ باپ بیٹی جا رہے ہیں۔“

توفیق کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تاہم وہ نہایت ہی تحمل لہجے میں بولا۔ ”ممکن ہے، بعض سچ نہیں لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہوں مگر ہم نے چونکہ باقاعدہ و نکاح کیا ہے اور ہم قانوناً و شرعاً میاں بیوی ہیں لہذا ہم نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ کون ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے۔“

”جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کو ہمارے معاشرے میں عموماً قدم قدم پر عجیب و غریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یقیناً یہ مسئلہ تمہارے ساتھ بھی رہا ہوگا؟“

”نہیں جی۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ طرم نفی میں کہہ لیا۔ ”میں نے سوئے ہوئے بولا۔“ ”سوائے مقتول فاروق کی بے ہوشی کے میں بھی ایسی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرتا پڑا۔“

”مقتول فاروق!۔۔۔۔۔“ وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کی تم سے کیا دشمنی تھی۔۔۔۔۔ تم نے کیوں اس کی جان لی۔۔۔۔۔؟“

”میں نے کسی کی جان نہیں لی اور نہ ہی میری کسی سے دشمنی تھی۔“ میری توقع سے بڑھ کر طرم نے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ وہ شیطان خود ہی میری بیوی کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گیا تھا۔“

”کیا ہاتھ دھوکر پیچھے پڑ گیا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے تفریح لینے والے انداز میں پوچھا۔

”وہ میری بیوی کو تنگ کرتا تھا۔ رات کی تاریکی میں جب میں گھر میں موجود نہیں ہوتا تھا تو وہ مردود ہمارے مکان کے پھانسی پر آکر۔۔۔۔۔ اسے پھینکتا تھا۔ بے ہودہ اور واپسات جملوں کی مدد سے وہ اظہار محبت کرتا تھا۔ ہم اس کی ان کمینہ حرکتوں سے عاجز تھے۔“

”یعنی صورت حال وہی تھی جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے تذکرہ کیا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے چہیتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کو اکثر ایسے ناخوشگوار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ ہیں نا؟“

”آپ یہ بار بار پوچھا کہ کہہ رہے ہیں؟“ طرم، وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بگڑ کر بولا۔ ”جھپٹیں۔۔۔۔۔ اور کسے؟“ وکیل استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا چھپا سٹھ سال کی عمر میں بھی تم خود کو

تھی۔ اس سے واضح ہو جاتا تھا کہ قاتل نے مقتول کی بے خبری میں، عقب سے اس پر ایک بھرپور وار کیا تھا۔ اگر مقتول کو اپنے عقب میں قاتل کی موجودگی کا احساس ہو جاتا تو وہ اپنا قیمتی بچاؤ کر سکتا تھا۔“

پندرہ روز بعد عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، کسی بھی کیس کی ابتدائی چند پیشیاں تکنیکی معاملات کی نذر ہو جاتی ہیں۔ یہ عدالتی کارروائی خاصی بور اور خشک ہوتی ہے۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز لگ بھگ تین ماہ کے بعد ہوا۔ رنج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ طرم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا مگر اس سے پہلے طرم کا حلفیہ بیان کرنا ضروری کیا گیا۔ استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان میں کوئی خاص بات موجود ہوگی۔

طرم نے عدالت کے دربار میں بیان ریکارڈ کرایا جو اس سے پہلے وہ پولیس کے چکا تھا۔ یہ بیان نہایت ہی مختصر اور نپا تھلا تھا جس میں توفیق عمر حوی نے میری ہدایت کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔*

طرم کا بیان ریکارڈ ہو چکا تھا مگر استغاثہ جرح کے لیے ایکوڈ ذباکس (طرم والے ٹیبرے) کے پاس چلا گیا۔ اس کے تہہ رخا سے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ وہ طرم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

”بڑے صاحب۔۔۔۔۔ اس وقت تمہاری عمر کیا ہوئی گا؟“

”چھپا سٹھ سال چل رہا ہے۔“ طرم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

میں نے عدالت میں ملاقات کے دوران میں اور بعد میں بھی اپنے موبائل پر اسی طرح یہ بات سمجھا دی تھی کہ اسے عدالت اور وکیل استغاثہ کا سامنا کس انداز میں کرنا ہے لہذا وہ میری ہدایت کے مطابق نہایت ہی ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنا کیس ڈیل کر رہا تھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ ایک سال پہلے تم نے شادی کی تھی؟“ وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جی، یہ درست ہے۔“ طرم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”کیا یہ بھی درست ہے کہ تمہاری بیوی عمر میں تم سے چالیس سال چھوٹی ہے؟“

طرم نے اثبات میں گردن ہلانے پر استغاثہ کیا۔

بوڑھا نہیں سمجھتے؟“

”ہرگز نہیں!“ مزم چمک کر بولا۔ ”شاید آپ نے یہ محاورہ نہیں سنا وکیل صاحب..... جیسی جیسی، ساٹھا پاٹھا!“

”محاورہ میں نے سن رکھا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے اعتماد سے کہا۔ ”مگر تمہاری حالت اور صحت کو دیکھ کر لگتا ہے کہ“

”پاٹھا“ تمہارے اندر پاپا ہر آس پاس کہیں موجود نہیں۔“

مزم کو جلال آ گیا۔ وکیل استغاثہ نے اس کی دھتکتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مستغفر ہوا۔ ”وکیل صاحب! آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ وکیل استغاثہ بولکھ گیا۔

”وکیل صاحب! آپ ایک عقل مند اور سمجھدار انسان ہیں۔“ مزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ میں نے سکھ کی سانس لی کہ توفیق نے جوش میں آنے کے بجائے خود کو معتدل کر لیا تھا۔ ”آپ نے قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ بہر حال میں ہی وضاحت کر دیتا ہوں۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے مزم کی سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میرے کہنے کا مقصد یہ تھا وکیل صاحب کہ کیا آپ خود کو صحت مند اور جوان سمجھتے ہیں؟“

”الحمد للہ!“ وہ کراری آواز میں بولا۔ ”میں واقعی صحت مند اور جوان ہوں۔“

وکیل استغاثہ نے اپنی ذات کے حوالے سے جو دعویٰ کیا تھا وہ اس کو دیکھ کر کھانکھاتا تھا مگر دوسری طرف بھی جیسا سٹھ سالہ توفیق عمر دعویٰ تھا وہ آسانی سے وکیل استغاثہ کی جان چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔

”وکیل صاحب.....!“ مزم نے بھر انداز میں کہا۔ ”میری موجودہ حالت اور صحت کو دیکھ کر آپ مجھے ایک بوڑھا شخص قرار دے دیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ جیسا سٹھ سالہ مرل سا بوڑھا آپ جیسے جوان رعنا کو معائنہ کی دعوت دیتا ہے..... کیا آپ میری اس دعوت کو قبول کریں گے؟“

بیچ نہایت ہی توجہ سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مزم اور وکیل استغاثہ کے درمیان ہونے والی عجیب، دلچسپ اور سنسنی خیز گفتگو سے محفوظ بھی ہو رہا تھا۔ یہ

صورت حال میرے سوا کبھی یعنی اس کیس کے مزم توفیق عمر دعویٰ کے حق میں جاتی تھی۔

وکیل استغاثہ مزم کی دعوت کے جواب میں ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ ایسی کیفیت کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ چند لمحوں پہلے وہ صحت مند اور جوان ہونے کا دعویٰ کر چکا تھا لہذا دعوت کو قبول نہ کرنا بھری عدالت میں اپنی بھد اڑوانے کے مترادف ہوتا۔

وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”کیوں نہیں، کیوں نہیں..... ہاتھ کلن کو آری کیا۔“

”اور پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے مزم نے مصالحوں کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

وکیل استغاثہ نے مجبٹ اپنا ہاتھ مزم کے ہاتھ میں دے دیا اس کے ساتھ ہی عدالت کے کمرے میں ایک کرب ناگت قحط ہوئی۔

یہ بیچ یقیناً وکیل استغاثہ کے حلق سے خارج ہوئی تھی۔ مزم کے ہڈیوں بھرے ہاتھ کی فولادی گرفت نے وکیل استغاثہ کے ہاتھ کا گویا قیصر ہلاک کیا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔ عدالت کے کمرے میں موجود تمام افراد اور جج حیرت اور ابھمن بھری نظر وں سے وکیل استغاثہ کو پیش آنے والی صورت حال کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

مزم نے دو چار طوفانی ”ٹھیک وینڈی“ بھٹکے دینے کے بعد وکیل استغاثہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی آہنی جکڑ سے پکڑ کر وکیل استغاثہ کے ہاتھ نے انداز میں اپنے ہاتھ کو کھول بند کر کے تھکے کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”وکیل صاحب! آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اگر میں نے عدالت کی عمر میں کسی پچیس سال کی عورت سے شادی کی ہے تو مجھ میں اس کی اہلیت بھی موجود ہے۔ میں نہ صرف یہ کہ اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت کر سکتا ہوں بلکہ اس کی طرف اٹھنے والی کسی بھی سختی سے ٹھٹھنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں لیکن.....“ وہ چند لمحات کے لیے چپ رہا۔ ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن..... اس کے ساتھ ہی میں ایک امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والا شہری ہوں۔ اگر مجھے قانون کو ہاتھ میں لینا ہوتا تو میں بہت پہلے اس خنڈے سے اٹھ جاتا۔ میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تھا اور اللہ نے اپنی حکمت سے اس معاشرتی ناسور کو عبرت ناک انجام سے دو چار کر دیا۔“

”اگر آپ کی اس بات کو درست مان لیا جائے کہ

میں طرم سے پوچھا۔

”کتاب کے بہانے پھڑا کرنے..... کیا کہانی ہے؟“

”یہ بڑی شرم ناک کہانی ہے۔“ طرم نے ٹھہرے

ہوئے انداز میں کچھ پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ

میں اضافہ کیا۔ ”مگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس

کہانی کو مختصر بیان کرنا چاہتا ہوں۔“

جب توفیق عمرحوی نے مجھے اس واقعے کے بارے

میں بتایا تھا تو میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ اس معاملے کو

عدالت میں کس طرح پیش کرتا ہے۔ ان لمحات میں وہ سن

و عن میری ہدایات پر عمل کرتا دکھائی دیتا تھا۔

”پریشن گرائیڈ.....!“ جج نے طرم کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

عدالت کی جانب سے اجازت ملنے ہی توفیق عمرحوی

شروع ہو گیا۔ ”جانب عالی!“ وہ براہ راست جج سے

مخاطب تھا۔ ”دفعہ سے ایک روز پہلے یعنی چوبیس فروری کی

شام لگ بھگ پانچ بجے توفیق عمرحوی لاہوریری پر آیا۔ اسے

دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا

کہ یہ شیطان صفت آدمی یقیناً یہاں کوئی فتنہ چکانے آیا

ہے۔ بہر حال، میں نے پہل نہیں کی اور اس کی نظر سے اس

کی طرف دیکھا۔

”بڑے صاحب! مجھے دو تین کتابیں پڑھنے کے

لیے جائیں۔“ وہ بڑی رمان سے بولا۔ ”چند روز کے بعد

واپس کر دوں گا۔“

اس نے چونکہ کوئی غلط بات نہیں کی تھی لہذا میں نے

بھی بالکل کاروباری انداز میں پوچھا۔ ”کون سی کتابیں؟“

”وہی.....!“ وہ رمانسرا انداز میں آواز دبا کر بولا۔

مجھے اس کا انداز پسند نہ آیا۔ ”وہی کون سی؟“ میں

نے سوال کیا۔

”وہ کتابیں جن سے لڑکیاں چھٹائی جاتی ہیں۔“ وہ

بڑے بھونڈے طریقے سے مسکراتے ہوئے کوئی آواز میں

بولا۔ ”جن کے شائع کرنے اور بیچنے پر سخت پابندی ہے۔

میرا مطلب ہے..... ممنوعہ کتابیں!“

”ایک منٹ.....!“ میں نے اس کی بات سن کر

ہونے سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر تنبیہ انداز میں کہا۔ ”میری

لاہوریری میں اس نوعیت کی کتابیں نہیں ہوتیں۔ آپ غلط

جگہ پر آ گئے ہیں۔“

”اچھا تو بڑے میاں..... اب تم مجھے پکڑ دو گے۔“

وہ اچانک بدتمیزی پر اتر آیا۔ ”میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم

نے بات تو میری کتابوں کا وہ اسٹاک اپنی لاہوریری سے اٹھالیا

ہو۔ انہی سسٹنی خیز کتابوں کی مدد سے تو تم نے اس عمر میں ایک

نوجوان لونڈیا کو بھانسا ہے۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ میں نے ترش لہجے میں کہا۔

سنی کی ذات کے حوالے سے اس نے بہت رک رک کر جملہ کہا تھا۔

”واہ واہ..... سبحان اللہ! کچھ بات واقعی بہت کڑوی

ہوتی ہے۔“ اس نے مجھے ہاتھ دلائے کی کوشش کی۔ ”کیا یہ

غلط ہے کہ سنی شادی سے پہلے تمہاری لاہوریری سے پڑھنے

کے لیے کتابیں لے جایا کرتی تھی؟“

”یہ بات غلط نہیں ہے مگر جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا

حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔“ میں نے غصے کو ضبط

کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ معاشرتی ناول پڑھنے کے لیے لے

جاتی تھی۔“

”معاشرتی ناول.....!“ اس نے یہ الفاظ ایسے

زہر لے انداز میں دہرائے کہ میرے تن بدن میں آگ لگ

گئی۔ ”میں سب سمجھتا ہوں کہ ان معاشرتی ناولوں کی آڑ

میں کون کون سی ممنوعہ کتابیں..... کتابیں اس لاہوریری سے

جاتی ہیں۔ تم ایک ہوس پرست اور عمر کی بڑھاپے سے

مفلح کی نوجوان نسل کے ذہنوں میں زہر انڈیل رہے ہو تم۔

میں تمہاری لاہوریری پر چھاپا پڑواؤں گا تو سنیں گا۔ تم ان

تمام گندے رسائل کے ساتھ گرفتار کر لیے جاؤ گے۔“

”میں یہاں تک اس کی “بک بک” اور یاد دہانی کو

برداشت کر رہا تھا لیکن جب اس نے سنی کے بارے میں

بجھائی شروع کی تو میری برداشت جواب دے گئی۔ میرا

پتہ نہ برز سکتا تھا۔ سنی میں پھٹ پڑا اور جو بھی منہ میں آیا،

بولتا چلا گیا۔ اس دوران میں، میں نے اس خبیث کو جان

سے مارنے کی دھمکی دی تھی..... لگاتی توقف کر کے اس

نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے

ہوئے بولا۔

”اگر اس روز لوگ سچ بچاؤ نہ کراتے تو خدا کی

قسم..... ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ بچتا۔ سنی کی

انسٹلٹ نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج

نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا

اعلانہ کر دیا۔

”دی کورٹ از اینڈ جارنڈ.....!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ

بھگتائے گئے جن کے نام علی الترتیب محمد رفیق، ریاست علی اور قدیر احمد تھے۔ محمد رفیق اور ریاست علی اس بات کے معنی شاہد تھے کہ ملزم توفیق عمر صوی نے مقتول کو بڑے خطرناک انداز میں جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ اس بات کا اقرار تو ملزم خود پچھلی پیشی پر عدالت کے روبرو کر چکا تھا تاہم استغاثہ کی پیشکش کا انداز خاصا منفرد اور چٹ پٹا تھا۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محمد رفیق اور ریاست علی کے بیانات کی روشنی میں کس قسم کی عدالتی کارروائی ہوئی ہوگی۔ تیسرا گواہ قدیر احمد وہ شخص تھا جس کے ساتھ ملزم اکثر اپنے گھریلو حالات کا رونا روتا رہتا تھا اور مقتول کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں اسے بتاتا رہتا تھا۔ قدیر نے عدالت کو بتایا کہ کئی بار ملزم نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر میں کا بس چلے تو وہ اس فاروق کینے کی منڈی مروڑ ڈالے۔ ان تینوں گواہوں کو استغاثہ کی جانب سے پیش کر کے۔

کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ عدالت کو باور کرایا جائے، ملزم اپنے دل میں مقتول کے لیے شدید ترین نفرت اور انتقامی جذبہ رکھتا تھا اور بڑے کھلے ڈالے انداز میں اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔

ایک بات کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اس پیشی پر تین نہیں بلکہ استغاثہ کی جانب سے گواہ پیش کیے گئے تھے اور چوتھا گواہ تھا جاوید عرف جید۔ وہ سو پچھڑ جس نے مقتول فاروق دادا کی لاش دریافت کی تھی۔ لیکن ریاست علی اور قدیر کی طرح جید کے بیان میں بھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

جید حسب معمول گلیوں کی صفائی کرنے اس علاقے میں پہنچا تھا۔ وہ صبح ہونے والے کچرے کو ملزم کے مکان کے عقبی حصے کے کچرے کو لے کر رہا تھا جہاں سے کے ایم سی کا ٹرک اٹھالے جاتا تھا۔ وہ کچرے کے روز جب وہ کچرے والی ٹرائی کو دھکیلتے ہوئے ملزم کے مکان کے پچھواڑے پہنچا تو وہاں ایک لاش کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے شور مچا کر اہل محلہ کو جمع کر لیا۔ اس کے بعد ہی یہ معاملہ سامنے آئے۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں بچیں، تیس منٹ باقی تھے۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

جج نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔

کسی بھی تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ کے برابر ہوتی ہے بلکہ وہ استغاثہ کا ”حقیقی وارث“ ہوتا ہے اسی

لیے اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ میں عموماً ابتدائی میں تفتیشی افسر سے سوال و جواب کر لیا کرتا ہوں لیکن اس کیس میں، میں نے وائسٹ بعد میں اس کی طرف توجہ کی تھی اور اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔

تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام جنید علی معلوم ہوا۔ وہ ایکس پینڈم اور اسٹارٹ پولیس آفیسر تھا۔ میں نے آئی او (انوسٹی گیشن آفیسر) جنید علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آئی او صاحب! کیا آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو توجہ سے پڑھا ہے؟“

ایک انتہائی سادہ سا سوال تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی تفتیشی افسر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو نہ دیکھا ہو۔ اسی رپورٹ کی بنا پر تو استغاثہ کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

انکو آئی آفیسر نے چونک کر میری جانب دیکھا اور بڑے عناد سے بولا۔ ”جی ہاں، ایک بار نہیں، میں نے کئی بار اسے پڑھا ہے اور نہایت توجہ کے ساتھ۔“

”جی ہاں!“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ کیا آپ اس تاریخ اور وقت سے اتفاق کرتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ خاموش مضبوط لہجے میں بولا۔ ”یقیناً مقتول کی موت پچیس فروری کی رات ہی کو واقع ہوئی تھی کیونکہ جب پچیس فروری کی صبح میں نے جیلے کو واقعہ پر پہنچ کر مقتول کی لاش کا معائنہ کیا تو مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ مقتول کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بارہ گھنٹے

بچے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ اس کی کھوپڑی بری طرح چمکی ہوئی تھی اور وہاں سے خارج ہونے والا خون بھی سرد اور گردن سمیت بالائی جسم کے مختلف حصوں پر جم چکا تھا۔“

”گو یا۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہی واقع ہوئی تھی؟“

”جی ہاں، مجھے کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔“ وہ پروٹوق انداز میں بولا۔ ”میں نے اپنا ماہرانہ تجربہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے تجربے کی تصدیق کرتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا لہذا امر واقعی یہ ہے کہ مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔“

دل کش کہانیوں اور دلآویز سلسلوں سے مرصع مئی 2015ء کا سالگرہ نمبر 2

پاکستان

کراچی

ماہنامہ

رفاقت جاوید اور نگہت سیما کے ناولوں کی پرکشش اقتضا

زاہدہ پروین کے روایتی زبان و بیان کا شاہکار..... جنگل کا پھول کا آخری حصہ

زمر نعیم کے اسیر وفا میں خوب صورت وفاقوں کا تذکرہ

ممتا کے حسین اور پُر روح جذبے کا اظہار کوئی ارجمند عقیل اور رفعت شبانہ کی ناول کہانیاں

نبیلہ ابرار کا بڑی مہارت سے متاع دل سنبھالے ہوئے

نمبر 2 کے لیے نیلم احمد بشیر اور زاہدہ فاطمہ حسنین کی خصوصی تحریریں

پڑھیے ذیشان رسول کی

شادی کا احوال

عظمیٰ آفاق کے قلم سے دلچسپ

انٹاز میں

علاوہ ازیں ان مایہ ناز راسخ و شاعر کاویں کے ذوق کی نذر جس میں صائمہ اکرم ،

ام ایمان ، عقیلہ حق ، سعدیہ رئیس ، شمیم فضل خالق و دیگر شامل ہیں

سب اپنی مختلف طرز میں شاعری کے ذریعے ہر قاری کو اپنے قلم سے شوق و اشتیاق کا لہجہ

کے درمیان ملزم توفیق عمر صحری کے گھر کے بچھوڑے، کچرے کے ڈھیر کے پاس موجود تھا، میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“
 ”نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“
 وہ پورے یقین سے بولا۔ ”اس دوران میں وہ وہاں موجود تھا، جسے تو اس کی لاش ادھر پڑی ملی تھی۔“
 ”مقتول کی موت کھوپڑی چننے سے واقع ہوئی تھی اور تباہ حال کھوپڑی کا معائنہ یہ بتاتا ہے کہ ہلاک سے سر کے عقبی حصے پر وار کیا گیا تھا۔“ میں نے آئی او کو الفاظ کے جال میں باندھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل نے مقتول کی بے خبری میں عقب سے اس پر وار کیا تھا؟“
 ”جی ہاں..... اس میں کوئی شک نہیں۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

”اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل، مقتول کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچا تھا؟“ میں نے بدستور سوال کیا۔
 ”قاتل پہلے سے وہاں چھپا بیٹھا تھا یا دے قدموں مقتول کا تعاقب کرتے ہوئے جائے وقوعہ تک پہنچا تھا، اس بات سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوتا۔“ آئی او جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ قاتل نے مقتول کی بے خبری میں، اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر بھاری ہلاک کا وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔“
 ”قاتل نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔“ میں نے آئی او کے الفاظ کو دہرایا اور عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا مطلب ہے، مجھیں فروری کی رات آٹھ بجے کے درمیان قاتل اور مقتول دونوں ملزم کے گھر کے بچھوڑے میں موجود تھے؟“

”جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
 اس نے کہا کہ میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے ایک منگٹے سے جال کو سینٹے ہوئے قدرے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”آئی او صاحب! یہ بات تو مجھ میں آ رہی ہے کہ مقتول سے آپ کا اشارہ فاروق دادا کی طرف ہے جس کی لاش ملزم کے گھر کے بچھوڑے کچرے کے ڈھیر پر پڑی ملی تھی لیکن.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”ذرا یہ بھی وضاحت کر دیں کہ قاتل سے آپ کی مراد کون ہے؟“
 ”واہ واہ..... سبحان اللہ!“ وکیل استغاثہ کی

”تھیک پو آئی او صاحب!“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس میز کی جانب بڑھ گیا جس پر آلہ قتل ایک سیلفنیشن بیگ کے اندر پیک پڑا تھا۔
 کيس کی سماعت کے دوران میں ایک چوبلی میز پر آلہ قتل اور دیگر متعلقہ اشیاء ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ میں کافی دیر سے اس کیس کے انکوائری آفیسر کے ساتھ جو اگلیاں کر رہا تھا اس پر بیچ محفوظ اور وکیل استغاثہ مکدر ہو رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کی سماعت میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کون سا سانپ نکالنے والا ہوں۔ سانپ تو میں واقعی نکالنے والا تھا اور اس نیک کام میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔

میں نے چوبلی میز کے پاس پہنچ کر سیلفنیشن بیگ میں محفوظ آلہ قتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آئی او سے سوال کیا۔ ”آپ کے خیال میں اس ہلاک سے خطرناک واقعہ کر کے مقتول فاروق کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا؟“
 ”اس میں میرے سے زیادہ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کا عمل دخل ہے۔“ وہ غصے سے لہجے میں بولا۔ ”میں نے جائے وقوعہ پر لاش کے معائنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے تھے، لیبارٹری ٹیسٹ نے ان کی تصدیق کی ہے۔ ہلاک کے ایک کونے پر مقتول کا خون اور اس خون میں مقتول کے سر کے چند بال چھپے ہوئے ملے تھے۔ خون خشک ہو کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہلاک کو چمک کر دیکھ سکتے ہیں۔“

”کسی چمک کی ضرورت نہیں مائی ڈیئر آئی او۔“ میں نے دو تانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے آپ کی بات پر پورا اعتماد ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ اب میں آپ سے جو دو تین منٹ سوال پوچھوں گا ان کا آپ بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔“

دو اچھن تانہ انداز میں مجھے ہنسنے لگا۔
 وکیل استغاثہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا اور مسلسل معاندانہ نظریے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اگر یہی سوال و جواب میں استغاثہ کے کسی عام گواہ سے کر رہا ہوتا تو وہ ”آئی جیکشن پور آؤٹ“ کا نعرہ لگاتے ہوئے کئی بار بیچ میں کود چکا ہوتا۔ میں وکیل مخالف کی محبوبی اور بے بسی کو بڑے بھرپور انداز میں انجوائے کر رہا تھا۔

”آئی او صاحب!“ میں نے انکوائری آفیسر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حالات کی زحمت سے بچاتے ہوئے دہنگ لہجے میں کہا۔“ حالات و واقعات اور پوسٹ مارٹم لیبارٹری رپورٹس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتول فاروق ہمیں فروری کی رات آٹھ اور نو بجے

سال کا تھا مگر اس کیس کے دوران میں اس کی عمر چھیانوے سال ہو گئی تھی۔ آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”جی ہاں، یہی!“ بات کے اختتام پر اس نے طرم کی جانب اشارہ کر دیا۔

”کیا آپ طرم کو پہچانتے ہیں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میرے اس سوال پر وہ بری طرح چونکا۔

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے مزے لے لے کر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ پھر میں کی طرح اڑ سکتا ہے۔ ایک لمحے یہاں اور دوسرے لمحے ”شوں“ کر کے جا رہا ہے.....؟ یا پھر آپ کے خیال میں طرم نے اپنے ہمزاد کو پھینک کر کھا ہے؟“

”نہیں.....“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”طرم پھر نہیں اور نہ ہی اس نے اپنے ہمزاد کو مطیع و فرماں بردار بنایا تھا ہے۔“ میں نے خود کھائی کے انداز میں کہا۔ ”اس کا منہ صاف مطلب یہی ہے کہ فاروق دادا کو اس نے قتل نہیں کیا کیونکہ.....“ میں نے قدرے رک کر ڈرامائی انداز اختیار کیا پھر سناتے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کر دی۔ ”کیونکہ طرم بیک وقت دو الگ الگ مقامات پر نہیں پایا جاسکتا۔“

”بیک صاحب.....!“ بیج کی سرسراہٹ ہوئی اور اس نے

میری سماعت پر دستک دی۔ ”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ ”جناب عالی!“ میں نے روئے سخن بیج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروق دادا کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جبکہ اس دوران میں طرم جائے وقوعہ سے دور محمود انیس تین میں موجود تھا لہذا وہ کسی بھی طور مقتول کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا۔“

میرے انکشاف نے عدالت کے کمرے میں کھلبلی مچادی تھی۔ ہر طرف سنسنی خیز چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ بیج نے حاضرین عدالت کو خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بیک صاحب! آپ اپنے دعوے کی وضاحت کریں۔“

”جناب عالی!“ میں نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا پھر بڑے اعتماد کے ساتھ بتانا شروع کیا۔ ”طرم روزانہ صبح دس بجے لائبریری کھولتا تھا جو کہ محمود آباد نمبر تین میں واقع ہے جبکہ جائے وقوعہ طرم کی رہائش محمود آباد گیٹ کے علاقے میں

برداشت جواب دے گئی۔ وہ زہر میں بچھے ہوئے الفاظ میں بولا۔ ”یعنی ساری رات قصبے زلیخا چلتا رہا اور صبح پوچھا جا رہا ہے کہ..... زلیخا عورت تھی یا مرد..... اس کیس کو عدالت میں لگے کئی ماہ گزر گئے۔ سماعت آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے اور میرے قاتل دوست کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے موکل پر فاروق دادا کے قاتل ہونے کا الزام ہے۔ کتنی مصیبت سے پوچھ رہے ہیں..... قاتل سے آپ کی مراد کون ہے۔“

میں نے وکیل استغاثہ کے زہر پلے جیلے کو صبر و تحمل کی ڈھال سے روکا پھر اپنے مخصوص تپانے والے انداز میں کہا۔ ”مائی ڈیئر کونسلر! آپ نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کر دی کہ میرے موکل توفیق عمر صوفی پر فاروق دادا کے قتل کا الزام ہے۔ یعنی جب تک استغاثہ معزز عدالت کے روبرو اس الزام کو درست ثابت نہیں کر دیتا، میرے موکل کو قاتل نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے میں آپ کی چند باتوں سے مکمل اتفاق بھی کرتا ہوں مثلاً.....“ میں نے مائی توفیق سے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”مثلاً یہ کہ..... اس کیس کو عدالت میں لگے کئی ماہ گزر گئے..... سماعت آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے.....

وغیرہ وغیرہ..... اس کے ساتھ ہی میری آپ سے درخواست ہے کہ برائے مہربانی ڈینٹس اور آئی او کے درمیان برائت کی زحمت نہ کریں۔ آئی او صاحب اس کیس کے بارے میں سب سے زیادہ واقعاتی اور تکنیکی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ میرے ہر جملے کا یہ آسانی جواب دے سکتے ہیں۔ یہ فرض محال، اگر آئی او صاحب کسی مرحلے پر لا جواب ہو جائیں تو آپ ان کی مدد کے لیے آواز ادا ہوں گے۔“

میری اس وضاحت نے وکیل استغاثہ کو سلگا کر رکھ دیا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، مگر اس کے چہرے کے خوف ناک تاثرات سے یہی نظر آتا تھا کہ اس کا بس چلے تو وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالے گا۔ میں اسے نظر انداز کر کے آئی او کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”جی آئی او صاحب!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا۔ ”قاتل سے آپ کی مراد کون ہے؟“

”طرم توفیق.....!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”یعنی پیرا موکل چھیانوے سالہ توفیق عمر صوفی؟“ جب توفیق سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ عینیشہ

ہے۔ اس جگہ کو محمود آباد نمبر ایک بھی شمار کر سکتے ہیں۔
بہر حال..... میں نے کھائی توقف کر کے ایک گہری سانس
لی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”خزم سہ پہر تین بجے سے پانچ بجے تک لائبریری
بند رکھتا تھا اور پھر پانچ بجے سے رات دس بجے تک وہ دوبارہ
لائبریری میں موجود رہتا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی خزم نے انہی
معمولات کے مطابق رات دس بجے لائبریری بند کر کے گھر
کی راوی تھی اور لگ بھگ دس بج کر پچیس منٹ پر وہ گھر پہنچا
تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر رات کا کھانا کھایا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اگلے
روز یعنی چھبیس فروری کو گیارہ بجے دن لائبریری سے اسے
مقتول فاروق کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔
جب وقوعہ کے روز خزم شام پانچ بجے سے رات دس بجے تک
اپنی لائبریری پر موجود تھا تو پھر وہ رات آٹھ اور نو بجے کے
درمیان فاروق دادا کو کیسے قتل کر سکتا ہے۔“

”ہوں.....“ بیج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔
”جناب عالی“ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے
کہا۔ ”میرا منوکل ایک بچہ ضرور اور معصوم انسان ہے۔
فاروق دادا کے قتل سے اس کا وہ کبھی واسطہ نہیں۔ اسے
کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس میں ملوث کرنے
کی کوشش کی گئی ہے لہذا معزز عدالت سے میری درخواست
ہے کہ خزم کو باعزت بری کرنے کے احکام صادر کیے
جائیں۔ اس کے ساتھ ہی استغاثہ کو پابند کیا جائے کہ وہ
جلد اصل مجرم یعنی فاروق دادا کے قاتل کو عدالت میں
پیش کرے۔ ورنہ آج پورا آئے۔“

بیج نے گہری توجہ سے میری بات سنی اور میرے
خاموش ہونے پر کہا۔ ”بیگ صاحب! کیا آپ وقوعہ کے
روز خزم کی شام پانچ بجے سے رات دس بجے تک محمود آباد نمبر
تین میں موجودگی کا کوئی ثبوت عدالت کو فراہم کر سکتے
ہیں..... خاص طور پر رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان وقفے
کے حوالے سے؟“

”جی..... ضرور۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”میں
اس سلسلے میں چند زندہ ثبوت عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔“
”زندہ ثبوت!“ بیج نے چونک کر مجھے دیکھا۔
کا مطلب ہے..... گواہ؟“

”نہیں سہرا“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے
ہوئے کہا۔ ”گواہ..... یعنی گواہ..... بلکہ یعنی گواہان۔“
بیج نے دیوار گیر کھاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا مقررہ

وقت ختم ہونے میں چند سیکنڈ باقی رہ گئے تھے پھر وہ مجھ سے
مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! آپ آئندہ
پیشی پر صفائی کے گواہان کو عدالت میں لے آئیں۔“
اس کے بعد دس دن کی تاریخ دے کر بیج نے عدالت
پر خاست کر دی۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ کی حالت دیدنی تھی۔ یوں
محسوس ہوتا تھا، اسے سانپ سوگھ گیا ہو۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹھرے میں
رضوان احمد کھڑا تھا۔ رضوان کی بان سگریٹ کی چھوٹی سی
دکان بھی جو خزم کی لائبریری سے ملحقہ تھی۔ رضوان نے بیج
بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد عدالت کو بتایا کہ وقوعہ کی رات
دس بجے اس نے خزم کو لائبریری بند کر کے وہاں سے
رفتہ ہوئے دیکھا تھا۔ رضوان کی دکان آدمی رات تک
کھلی رہی تھی۔ وہ دونوں چونکے کاروباری پڑوسی تھے لہذا خزم
گھر جانے کے پہلے رضوان سے سلام دعا ضرور کیا کرتا تھا۔

صفائی کا دو گواہ محمد طفیل تھا۔ طفیل کی لائبریری
کے سامنے سڑک کی دہری جانب کپڑے کی دکان تھی۔
طفیل نے بھی اپنے طفیلیہ بیان میں عدالت کو بتایا کہ وہ
روزانہ کم و بیش ساڑھے نو بجے اپنی دکان بند کر کے گھر چلا
جاتا تھا۔ وقوعہ کے روز جب وہ دکان بند کر کے گھر جا رہا تھا
تو اس نے خزم کی لائبریری کو کھلا دیکھا تھا اور خزم بھی
لائبریری کے اندر موجود نظر آ رہا تھا۔

جب یہ دونوں گواہ بھگت چکے تو بیج نے مجھ سے
مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! کیا آپ کے
پاس کوئی ایسا گواہ بھی موجود ہے جو اس امر کا شاید ہو کہ خزم
وقوعہ کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان اپنی لائبریری پر
موجود تھا؟“

عدالتی کارروائی کے دوران میں ایک وقت میں
صرف ایک گواہ ہی کو کمرے میں لا کر اس کا بیان ریکارڈ کیا
جاتا ہے اور بعد ازاں حسب ضرورت اس پر جرح بھی کی
جاتی ہے۔ باقی گواہ عدالت کے کمرے کے باہر کوریڈور
میں چوبلی ٹینچوں پر اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے
ہیں۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ایک گواہ کا بیان
دوسرے گواہ کی کواعی پر اثر انداز نہ ہو۔

”جناب عالی!“ میں نے بیج کے استفسار پر نہایت
بی مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”میرے پاس دو ایسے معزز گواہ
ہیں جو اس امر کے متعلق شاید جی کہ میرا منوکل وقوعہ کی رات

کے حلفیہ بیان کے ریکارڈ ہو جانے کے بعد طرم کی بے گناہی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ حاجی ستار نے عدالت کو بتایا کہ طرم نے اس سے پچھلی صف میں نماز عشا ادا کی تھی۔

میں نے جرح کے اختتام پر صفائی کے گواہ سے پوچھا۔ ”حاجی صاحب! میرے ٹوکھل نے مجھے بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ دونوں..... یعنی آپ اور طرم عشا کی نماز کے اختتام پر مسجد سے ایک ساتھ ہی نکلے تھے؟“

”جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مسجد سے نکل کر توفیق اپنی لائبریری کی جانب بڑھ گیا تھا اور میں اپنے گھر کی طرف.....“

”کچھ یاد ہے..... آپ اندازہ لگا سکتے ہیں.....“

میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”وقوعہ کے روز آپ عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے کتنے بجے نکلے تھے؟“

”یہی کوئی ساڑھے آٹھ بجے..... یا پانچ دس منٹ زیادہ۔“ اس نے جواب دیا۔

”پانچ دس منٹ کم نہیں.....؟“

”نہیں..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ اٹل لہجہ میں بولا۔

”حاجی ستار صاحب! آپ کا مطلب ہے.....“ میں نے تعذر بقی طلب انداز میں کہا۔ ”آٹھ پینتیس..... یا آٹھ چالیس.....؟“

”جی ہاں..... میرا یہی مطلب ہے۔“

”تھیک یو حاجی صاحب۔“ میں نے صفائی کے گواہ سے سوال و جواب کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے روئے سخن جج کی طرف موڑا اور پوچھا۔

”پورا آزمائشی کے آخری دو گواہان کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کے جواب میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے کہ طرم توفیق عمر حوی وقوعہ کی رات سات پینتالیس سے لے کر آٹھ چالیس تک مسجد میں موجود تھا۔ یہ لگ بھگ وہی وقت ہے جو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتول فاروق دادا کی موت کے حوالے سے بتایا گیا ہے۔ ان خصوصیات کی روشنی میں یہ بات پائیدار ثبوت کو تشکیل دیتی ہے کہ طرم کسی بھی طور مقتول کے قتل میں ملوث نہیں بلکہ کسی سوچنی بھی گہری سازش کے تحت اسے اس کیس میں قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے..... دیش آل پور آؤ!“

میرے ٹوکھل دلائل کے اختتام پر جج نے نگاہ اٹھا کر

آٹھ اور نو بجے درمیان جائے وقوعہ سے دور ایک مسجد میں موجود تھا۔“

”مسجد میں.....؟“ جج نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”جی سر!“ میں نے سرکواٹھاتی جنبش دیتے ہوئے.....

یہ آواز بلند کیا۔ ”طرم نہایت پابندی سے عشا کی نماز ادا کیا کرتا تھا۔ وقوعہ کی رات وہ سات پینتالیس پر اپنی لائبریری سے نکل کر مسجد میں گیا جو اس کی لائبریری کے نزدیک ہی واقع ہے۔ عشا کی نماز کا اختتام لگ بھگ آٹھ تیس پر ہوا۔ وہ مسجد سے نکلا اور سیدہ حال لائبریری جا پہنچا۔ مسجد میں اس کی آمد و شد کے دو معزز گواہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے انہیں باری باری گواہی کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”پر مین گرائیڈ.....!“ جج نے بھلدی بھر کم آواز میں کہا۔

سب سے پہلے عبداللہ باب صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوا۔ جب وہ اپنا..... وکھائی ریکارڈ کر چکا تو میں سوال و جواب کے لیے ونس باکس کے لایب چلا گیا۔ میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”عبداللہ باب صاحب! آپ طرم کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟“

”کافی عرصے سے جانتا ہوں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”روزانہ عشا کے وقت مسجد میں ہماری ملاقات ہوتی ہے۔“

”آپ وقوعہ کی رات بھی آپ کی طرم سے ملاقات ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں..... مسجد میں داخل ہوا تو یہ وضو کر رہا تھا۔“

”یہ کم و بیش کتنے بجے کی بات ہے؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت رات کے پونے آٹھ بجے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے ایک دو ضمنی سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔

اپنی باری پر وکیل استفسار نے بھی صفائی کے گواہ عبداللہ باب پر تیز و تند سوالات کی بوچھاڑ کر دی تاہم وہ گواہ کی زبان سے ایسی کوئی بات نہ اٹھا سکا جو استفسار کے حق میں جاتی ہو۔

عبداللہ باب کے بعد حاجی ستار، طرم کے مسجد میں موجود ہونے کی شہادت دینے ونس باکس میں پہنچ گیا۔ اس

وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟“

وکیل استغاثہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہوتا تو وہ لب کشائی کرتا۔ صفائی کے آخری دو گواہان عبدالوہاب اور حاجی ستار نے گویا کیس کا پاسا پلٹ دیا تھا۔ اب میرے منہ کے بے گناہ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

وکیل استغاثہ کے مبہم اور ڈھیلے ڈھالے جواب کے بعد جج نے فیصلے کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر کسی حد الٹی کارروائی کے بعد عدالت نے میرے منہ کے لیے طرز توفیق مرحوی کو باعزت بری کر دیا۔ اس روز روپنہ عرف منی کی خوشی دیکھنے سے غلط سمجھتی تھی۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے آئندہ زندگی کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ انہیں رخصت کر دیا۔

ایک پیشہ ور وکیل کی زندگی اتنی معروف ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربے میں آنے والے تمام ملزم کو اپنے یادہ مر سے تنگ یاد نہیں رکھ سکتا۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ وہ دہماہ کے بعد میں بوڑھے نو جوان توفیق مرحوی اور اس کی بیوی روپنہ عرف منی کو بھی بھول بھال گیا۔ ممکن ہے، میں انہیں بھولنے کے لیے فحش و فحشاں کر بیٹھتا اگر ایک عجیب واقعہ پیش نہ آیا ہوتا۔

توفیق مرحوی کی باعزت بریت کے کوئی سال ڈیڑھ سال یا دو سال بعد کی بات ہے۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں جینو سب معمول اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو پورا کر رہا تھا کہ کسی شخص سے ملنے کے لیے آگئی۔ وہ خاصی پریشان اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ رکی علیک سلیک کے بعد میں نے بے تکلفی سے پوچھ لیا۔

”خیریت تو ہے روپنہ صاحب! میں توفیق صاحب کو پھر کسی غنڈے کے قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کر لیا گیا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں بیگ صاحب!“ وہ اضطرابی لہجہ میں بولی۔ ”مگر یہ درست ہے کہ میں توفیق صاحب کی وجہ سے سخت پریشان ہوں اور انہی کے اصرار پر میں اس وقت آپ کے پاس آئی ہوں۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے توفیق صاحب کو؟“

”وہ شدید بیمار ہیں۔“ وہ رد ہانسی ہو گئی۔ ”پچھلے دنوں

انہیں ذیابیطس ہوا گیا تھا پھر پتا چلا کہ گردن توڑ بخار ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں ہیں۔ وہ ایک بار آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے۔ بیگ صاحب کو بلا کر لاؤ۔ مجھے ان سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔“

اپنی بات کے اختتام پر منی نے متعلقہ اسپتال کا نام بھی بتا دیا۔

ان دنوں گردن توڑ بخار نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ یہ دماغ کی مخصوص جھلیوں کا انفیکشن ہوتا ہے جس کی وجہ سے بہت تیز بخار بھی آتا ہے۔ اگر بروقت اس کا علاج نہ ہو پائے اور انفیکشن کنٹرول سے باہر ہو جائے تو پھر موت یقینی ہوتی تھی۔ میں یہ بات ”گردن توڑ بخار“ کے ابتدائی زمانے کے حوالے سے کر رہا ہوں جب اس کے لیے کوئی مخصوص انسٹی بائیوٹک تیار نہیں کی گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میڈیکل ریسرچ نے اس خطرناک بیماری کی خطرہ کو کافی حد تک کم کر دیا ہے اور اس کے علاج کے لیے زود اثر انسٹریشن انسٹی بائیوٹک تیار کر لی گئی ہیں۔

جہاں تک مرحوی صاحب کے ذیابیطس کا تعلق تھا تو اس کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ بوڑھا نو جوان جنوری کے مہینے میں ایک سادہ شلوار قمیض میں آدمی رات کو کھوٹا پھر تا اور بائیک ڈرائیو کرتا پایا جاتا تھا اور بیسٹھ چھپاٹھ سال کا ہونے کے باوجود بھی اسے اس بات پر نظر تھا کہ وہ جوانوں سے زیادہ جوان اور توانا ہے۔ اس قسم کے عجیب و بلند بائیک دمچے بعض اوقات انسان کو کڑی مشکلات میں مبتلا دیتے ہیں۔ توفیق مرحوی کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ منی کی پوری بات سننے کے بعد میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کل کسی وقت اسپتال جا کر توفیق صاحب سے ملاقات کر لوں گا۔“

”کل نہیں! آج ہی!“ منی نے تاکیدی لہجہ میں کہا۔ ”بیگ صاحب! توفیق کی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ ضد کر رہے تھے کہ میں آج ہی بیگ صاحب کو لے کر آؤں۔“

”اوہ۔۔۔!“ میں نے تشویش بھری نظر سے منی کو دیکھا اور کہا۔ ”انہوں نے بتایا تو ہوگا، وہ مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں؟“

”نہیں۔۔۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”میں نے بہت پوچھا مگر انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں وہ ایک ہی بات کہتے رہے۔ میں بیگ صاحب سے جو بھی ضروری بات کر دوں گا، وہ تمہارے

ساٹنے ہی کروں گا۔"

"ٹھیک ہے روینہ صاحبہ! آپ مطمئن ہو کر جائیں۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں آفس سے اٹھنے کے بعد سیدھا اسپتال جا کر توفیق صاحب سے ملاقات کروں گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب! وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں توفیق صاحب کے لیے بہت پریشان ہوں۔ ڈاکٹر ز مجھے تسلیاں تو دے رہے ہیں مگر ان کے الفاظ کے کھوکھلے پن سے لگتا ہے کہ وہ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ خود توفیق بھی ہمت ہار چکے ہیں۔" بات کے اختتام پر اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "روینہ صاحبہ! باپوسی گناہ ہے۔ آپ حوصلہ پکڑیں اور توفیق کی بھی ہمت بندھانے کی کوشش کریں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ یہ چھوٹی موٹی بیماریاں توفیق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

اس نے ایک بار پھر دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔ "میں یہاں سے سیدی اسپتال جاؤں گی اور وہاں توفیق کے قریب رہ کر آپ کا انتظار کروں گی۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ بے فکر ہو کر جائے گا۔ رات کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنی پہلے ہی اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا جہاں توفیق عمرحوی ایڈمٹ تھا۔ مذکورہ اسپتال میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا لہذا مجھے کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں تھا۔

راستے بھر میں سوچنے کی بجائے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے مٹی کے کھینچان کے لیے کہہ تو دیا تھا کہ چھوٹی موٹی بیماریاں توفیق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں مگر میں جانتا تھا کہ میرے یہ الفاظ تسلی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ڈبل نمونیا اور گردن توڑ بخار کوئی معمولی بیماریاں نہیں تھیں۔

میرا ذہن اس حوالے سے بھی بڑے تشویش ناک انداز میں سوچ رہا تھا کہ وہ بوڑھا نوجوان آئی سی یو میں لے لیے مجھ سے ایسی کون سی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بیان کے مطابق توفیق اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ وہ مٹی کے حوالے ہی سے کوئی بات کرنا چاہ رہا ہوگا۔ انہی سوچوں میں غلطیاں میں متعلقہ اسپتال پہنچ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں توفیق عمرحوی کے پاس تھا۔ اس وقت میرے مٹی اور

توفیق کے سوا وہاں اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر توفیق کی جھجی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔ "بیگ صاحب! مجھے یقین تھا، آپ ضرور آئیں گے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو..... گویا، یہاں آکر آپ نے میری آخری خواہش پوری کر دی ہے۔"

"دیکھیں تا بیگ صاحب....." مٹی گلوگیر آواز میں بولی۔ "یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے توفیق عمرحوی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آپ تو ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ حوصلہ پکڑیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سب ٹھیک ہوگا کہ نہیں اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا۔" وہ گویا خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! میں نے آپ کو جس مقصد کے لیے اس وقت یہاں بلایا ہے وہ بڑا بوجھ ہے تو میرے ضمیر سے ایک بوجھ اتر جائے گا اور میں سکون سے مر سکوں گا۔"

میں نے اور مٹی کے ایک وقت تشویش بھری سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ہماری نگاہیں دو خطرناک بیماریوں میں جکڑے ہوئے نوجوان پر تنک گئیں۔ وہ خواب ناک انداز میں بتانے لگا۔

"بیگ صاحب! فاروق دادا کو میں نے قتل کیا تھا....."

"کنگ..... کیا.....؟" میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

مٹی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "بیگ صاحب! لگتا ہے، ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے جیسی ہے ایسی الٹی سیدی باتیں کر رہے ہیں..... میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو بلانے کی۔" وہ نجیف مگر حکیمانہ آواز میں بولا۔ "جب تک میری بات عمل نہ ہو جائے، ہم دونوں کو توجہ دینا ہے اس کے بعد جو جی میں آئے، کرتے رہنا....."

ہم دونوں ہمدردی سے ہنس گئے۔ وہ دھیمے لہجے میں بولنے لگا۔

"اس شیطان سے نجات کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا۔ ایک روز پہلے جب میرا اس سے بحث ہوا تھا تو رات کو میں نے اپنے گھر کی چھت پر ایک بلاک رکھ دیا تھا۔ آئندہ روز یعنی دوپہر کی رات ٹھیک سوا آٹھ بجے میں اپنے گھر کی چھت پر موجود تھا تاہم مٹی میرے

منصوبے سے باجمعت پر موجودگی سے قطعی طور پر واقف نہیں تھی۔ پوری گلی کی چیتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ میں نے اس مقصد کے لیے اپنے گھر سے دور ایک جھٹ کا انتخاب کیا اور پھر مختلف چھتوں سے ہوتے ہوئے اپنی جھٹ پر آ گیا۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے مذکورہ گھر والوں سے کیا بہانہ کیا ہوگا کیونکہ یہ اہم نہیں ہے۔

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں پوچھے بتانہ رہا۔ ”مگر تو عہد کی رات آپ سات پیٹیا لیں پر تو مسجد کے وضو خانے میں عشا کی نماز کے لیے وضو کر رہے تھے اور اس امر کی تصدیق صفائی کے گواہ عبدالوہاب نے کی تھی۔“

”عبدالوہاب نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔“ وہ ناتواں آواز میں بتانے لگا۔ ”عبدالوہاب نے وضو کرتے دیکھا تھا مگر میں وضو خانے سے چپکے سے نکل آیا تھا اور آئندہ میں بچپن میں منٹ میں، میں اپنے منصوبے کے مطابق اپنے گھر کی تاریک جھٹ پر موجود تھا۔ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے فاروقی ہمارے گھر کے پچھواڑے پہنچا۔

میں نے اس کے بچے اور نوکراٹھ سے اسے فوراً پہچان لیا۔ ویسے بھی اس وقت کچرے پر کسی کی آمد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ جانوروں کی آواز گھنٹے سے پہلے اس نے گردن جھکا کر اپنی دست و پاؤں میں نام دینے کی کوشش کی۔ بس، میں نے اسی لمحے کو غیبت جانا اور اس کے لیے نشانہ لے کر بلاک کو ہاتھوں سے آزاد کر دیا۔ میری خوش قسمتی اور فاروقی کی بدبختی کہ وزنی بلاک آن واحد میں اس کی موجودگی

کے نتیجے میں پر جا کر لگا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر اگلے ہی لمحے پھر بے کے ڈمیر پر ڈمیر ہو گیا۔ میں نے پانچ سے دس منٹ تک چھپتی تاریکی میں کھڑے ہو کر اس کے اٹھنے کا انتظار کیا مگر اس کے بعد وہ دس ذرا سی بھی جنبش پیدا نہیں ہوئی جس سے مجھے یہ یقین ہوا کہ وہ ابھی بھی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ فاروقی اس جہاں سے اس جہاں میں منتقل ہو چکا تھا۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے چھاپھر زاری آواز

میں بولا۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ اس رات مجھے اشتانہ خطا نہیں گیا ورنہ صورت حال مختلف ہوتی۔ اس مردود کو ختم واصل کرنے کے بعد میں اپنی لائبریری چلا گیا تھا اور پھر صبح کے مطابق رات دس بجے لائبریری بند کر کے گھر آ گیا تھا۔“

”اور وہ جو.....“ میرے ذہن میں سسنی خیزی نے اودھم مچا رکھا تھا۔ ”حاجی ستار کے بیان کے مطابق آپ نے نہ صرف اس سے پچھلی صف میں نماز عشا ادا کی تھی بلکہ اس رات آپ دونوں ساڑھے آٹھ اور پونے نو کے درمیان

ایک ساتھ مسجد سے باہر نکلے تھے۔“

”اس مشن کی تکمیل میں حاجی ستار نے میرا بہت ساتھ دیا تھا بیگ صاحب!“ وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”چھ ماہ پہلے حاجی صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، بہت ہی ہمدرد اور نیک انسان تھا وہ..... ستار میرے حالات سے بخوبی آگاہ تھا جب میں نے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا اور درخواست کی کہ اسے میری جائے وقوعہ سے دور موجودگی کے حوالے سے ایک جھوٹ بولنا ہے تو کھاتی سوچ بچار کے بعد وہ میری مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ حاجی ستار بھی فاروقی سے شدید نفرت کرتا تھا۔ کئی مرتبہ بازار میں آتے جاتے فاروقی نے اس کی بیٹی رخسانہ کے ساتھ بھی بدتمیزی کی تھی۔“

”گویا.....!“ توفیق عمر حوی اپنی بات مکمل کر کے گہری سانس لینے لگا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ لوگوں نے ”امداد باہمی“ کے اصول پر عمل کیا تھا۔“

اس نے مجھے سوال کا جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آنکھیں بند کر رکھی اور گہری سانس لینے لگا جیسے اسے سانس لینے میں دیر لگی محسوس ہو رہی ہو۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ فاروقی کا قاتل تھا تاہم یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس شخص نے بڑھاپے میں جوانوں والا کام دکھا کر خود کو بوز حیا جوان جلالت کر دیا تھا۔ توفیق عمر حوی کے انکشافی اقبال جرم پر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

”اللہ آپ کو جلد از جلد صحت یاب کرے۔“ دعا کی الفاظ کے ساتھ میں واپس آ گیا۔

اگلے روز جب میں عدالت جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا تو کئی کافون آ گیا۔ میں نے ”ہیلو“ کیا ہی تھا کہ وہ غناک آواز سنیں بولی۔ ”بیگ صاحب! آج صبح توفیق کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”اوہ.....!“ میں ایک افسردہ سانس خارج کر کے رہ گیا۔

رات آئی سی یو میں توفیق کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چند لمبے کا مہمان ہے پھر اس نے خود بھی بڑے وثوق سے کہا تھا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”سکتا ہے، یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو۔“ واقعی گزشتہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی تھی۔

(تحریر: حسام بت)



مکافات

تنویر ریاض

ہم سب میں کہ قدرت کی دسترس سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ انتقام اچھا ہوا یا برا، انجام تو تکلیف دہ ہی ہوتا ہے اور جب کوئی کسی کے برے وقت سے فائدہ اٹھاتا ہے تو قدرت بھی غیر محسوس طریقے سے اسی وقت کے شکنجے میں اسے قید کر دیتی ہے۔ یہ اور بات کہ گزری ہوئی کب تکجا ہو کر اٹھنے کا روپ دھارتے ہیں اور مطلوب کو کب اپنی مکرر مشکل اس میں دکھائی دیتی ہے۔

ایک ماہر کلاؤٹ کے خاموش انتقام کا بیاں تک مہر

اپنے آبائی قصبے جانے کے لیے ریڈی نے مختلف وجوہات کی بنا پر بس کے سفر کو ترجیح دی۔ حالانکہ وہ ہوائی جہاز یا ریلٹ اے کار کے ذریعے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ سکتا تھا جبکہ بس میں اسے تقریباً چھ گھنٹے لگ گئے۔ اس کا ایئر کنڈیشننگ سسٹم بھی کچھ اتنا اچھا نہ تھا اور

کھڑکیوں کے گندے شیشوں کی وجہ سے باہر کے مناظر بھی منوعہ دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ نشستیں آرام دہ تھیں جن کی وجہ سے اس ستر سالہ یوزر کی ہڈیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے قصبے کا نام پالمر تھا اور وہ نو ہیشاٹر میں واقع تھا۔ وہ سیکس پیدا ہوا، پلا بڑھا اور اس نے عزیز کے

کانٹ بھی تھا۔ ایک گھنٹے بعد کھیل شروع ہونے والا تھا اور یہی گیم اسے نئے راستوں کا سفر بتا سکتا تھا۔

☆☆☆

ریڈی نے اپنی آنکھیں جھپکا کیں۔ شاید اسے نیند آگئی تھی۔ بس انجن کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بس دیر موٹ کے قہقہے پر کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اعلان کیا۔ ”بس یہاں دس منٹ رکے گی۔ آپ لوگ چال قدری کر کے اپنی ٹائیس سیدھی کر سکتے ہیں۔“

وہ بھی اپنی سیٹ سے اٹھا اور بس سے نیچے اتر آیا۔ اسے بہت دیر سے ہاتھ روم کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سامنے بے ہوئے ریسٹوران میں چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں کا ہاتھ روم بھی صاف ستھرا ہوگا۔ ایک بار پھر اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔ کئی سال پہلے جب وہ جوان تھا تو ہر چیز دھڑکھڑکھٹ میں نظر آتی تھی۔ اس نے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھ دھوئے اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا جبکہ پہلی بار اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بھی بوڑھا ہوگا تاہم اسے کئی چھپتاوا نہیں تھا۔ اس کے پاس یادوں کا خزانہ اور بھاری بھرپور تیلنس تھا جس کے سہارے زندگی آرام سے گزاری جا سکتی تھی۔

وہ بس میں سوار ہوا لیکن اپنی نشست کے پاس جا کر رک گیا۔ کوئی شخص اس کی سیٹ پر بیٹھا نہیں تھا۔ اس نے جھکا ہوا اس کے بیگ کو دیکھ رہا تھا اور اس نے یونینفارم پہن رکھی تھی۔ وہ کھنکھارتے ہوئے بولا۔ ”ایکسپوزی!“

وہ شخص اسے دیکھتے ہی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سوری! کیا یہ تمہاری سیٹ ہے؟“

”ہاں!“ ریڈی نے جواب دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تاہم یونینفارم دیکھ کر اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے نہیں ہے بلکہ اس نے اپنے کام والی یونینفارم پہن رکھی تھی۔ وہ غالباً کسی ڈیلیوری کمپنی میں کام کرتا تھا۔

”دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔“ وہ شخص معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”ڈرائیور کا کہنا تھا کہ بس میں سٹین بہت کم ہیں۔ میں نے یہ دو خالی دیکھیں تو.....“

یہ کہہ کر وہ شخص اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اسٹیوڈیو!“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی اسٹیو!“ ریڈی نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھا یا اور بولا۔ ”مجھے ریڈی جاردوس کہتے

اکیس سال اسی قہقہے میں گزارے پھر کسی وجہ سے اسے یہ جگہ چھوڑنا پڑی اور وہ پچاس سال تک اپنے شہر سے دور رہا لیکن اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنا پرانا حساب چکانے کے لیے واپس آجائے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھوٹی سی توند پر باندھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے بھروسے کے نیچے چڑے کا بیگ رکھا ہوا تھا جس میں بیس بال یونینفارم، بیس بال کے دستانے، پرانے سوئی کپڑوں کے علاوہ ایک اعشاریہ تین آٹھ کارڈیالور بھی تھا اور اسی کی وجہ سے اسے بس میں سفر کرنا پڑا کیونکہ اس وقت تک بس کے اڈوں پر میٹل ڈیٹیکٹرز نصب نہیں کیے گئے تھے۔ اس لیے اس کے پگڑے جاگنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دوسری صورت میں اس کے لیے پولیس یا ایف بی آئی کو مطمئن کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس نے گھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایک بار پھر گہرا سانس لیا اور پرانی یادوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

ریڈی جاردوس کو ستمبر 1958ء کی وہ صبح اور بھٹے کا دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ چھوڑ کر جانے کا عزم لیے بستر سے اٹھا۔ اس روز اسے اپنی اکیس سالہ شوکی میں پہلی بار کچھ ملنے والا تھا۔ اس نے کمرے کے کونے میں گئے ہوئے چھوٹے سے واش بیسن میں اپنا منہ دھویا۔ دھنک صاف کیے اور لباس تبدیل کر کے تیار ہو گیا۔ وہ گزشتہ دو سال سے اپنے بوڈنک پاؤس میں رہ رہا تھا اور اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو وہ زیادہ عرصے یہاں قیام نہیں کرتا۔ اس نے تیار ہونے کے بعد اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا پھر ایک نظر کمرے پر ڈالی جہاں ایک کرسی ریڈیو، ایک کرسی اور واش بیسن کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہاتھ روم مشترکہ تھا جبکہ نیچے لیونگ روم میں سیزجیوں کے پاس ایک چارٹا بلیک اینڈ وائٹ فی وی رکھا ہوا تھا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی۔

اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے لباس پر دھو ڈالی۔ اس نے سفید رنگ کی سوئی بیس بال کی یونینفارم پہن رکھی تھی جس کا کارڈ اور آسٹینش مٹ چکی تھیں۔ قمیص کی پشت پر نمبر 9 اور ٹیم کا نام لکھا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایک یاد دہانی بعد یہ نام بدل جائے گا اور اس کی جگہ نیو یارک، شکاگو یا بوئن کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ الماری کے ساتھ رکھے بک شیلف کی طرف بڑھا اور اپنے دستانے اٹھا لیے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر یہ دستانے چڑھائے اور مسکرا دیا۔ یہ شخص دستانے ہی نہیں بلکہ ایک بہتر اور اچھی زندگی گزارنے

اور اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو اسے پالمر سے نکال کر میجر لیگ کھینٹنے کے لیے کسی بڑی ٹیم میں شامل کر لیا جائے گا اور اس کے بعد یہ قصبہ اس کے لیے ایک بھولی ہوئی داستان بن کر رہ جائے گا۔

☆☆☆

ساتھی مسافر اس کی جان کو انک گیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بول اٹھا۔ ”میرا مقصد تمہیں کریدنا نہیں ہے لیکن اس لوگو کو کچھ کر میجر انجس بڑھ گیا ہے۔ دراصل مجھے ہمیشہ سے چھوٹی ٹیموں سے دلچسپی رہی ہے جیسے اس زمانے میں گرینائیٹ لیگ اور سن سیٹ لیگ وغیرہ ہوا کرتی تھیں۔“

رینڈی نے کھڑکی پر نظر پڑ جاتے ہوئے کہا۔

”گرینائیٹ کوئی چھوٹی ٹیم نہیں تھی۔“

”اس کے لیے ڈی!“ وہ شاید رینڈی کی بات نہیں سمجھ رہا تھا۔

”گرینائیٹ لیگ پیشہ ور کھلاڑیوں کی ٹیم نہیں تھی اور نہ ہی اس کا تعلق کسی بڑی لیگ سے تھا۔ یہ ایسے شوقیہ کھلاڑیوں کی ٹیم تھی جو بال کھیلنا پسند کرتے ہیں۔“

”میں نے دو سال پہلے ایک نمائش میں پالمرل کی ٹیم کے کھلاڑیوں کا گروپ فوٹو دیکھا تھا۔ شاید 1940ء کے زمانے کی تصویر تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ پالمرل کی ٹیم نے کب لیگ میں حصہ لیتا چھوڑا؟“

”نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

اسٹیو کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔

”اس کے دماغ میں کوئی بلب روشن ہو گیا ہے۔ وہ چمکے ہوئے بولا۔“ ضرور تمہارا تعلق پالمر سے ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

رینڈی نے اسے تروید کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ آہستہ سے بولا۔

”ہاں، ٹھیک سمجھے ہو۔“

”تم وہاں اپنی سیلے ملنے جا رہے ہو یا دوستوں سے؟“ اسٹیو نے پوچھا۔

”نہیں، بس یونہی گھومنے کی غرض سے جا رہا ہوں۔“

وہ اسٹیو سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے ایک پرانا حساب چکانا ہے۔

☆☆☆

وہ کھیل کے میدان میں پہنچا جو دریا کے قریب ایک وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سائیکل ایک درخت کے تنے سے لٹائی اور پرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھی کھلاڑی بھی وہاں پہنچ چکے تھے

”ہیں۔“

”میرا ٹرک خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے اب مجھے بس کے ذریعے پالمر جانا پڑ رہا ہے۔“

”تم پالمر میں رہتے ہو؟“ رینڈی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں۔ ہماری کھیتی کا مینسٹر سے باہر بھی ایک دفتر ہے لہذا میں صبح کام پر نکلتا ہوں اور دوپہر ڈھٹنے تک پالمر واپس آ جاتا ہوں۔“

اسٹیو نے رینڈی کے چہروں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”کیا میں تمہارا ریگ دیکھ سکتا ہوں؟“

رینڈی کا دل دوبارہ زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ ہلکاتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“

اسٹیو بولا۔

”میں نے اس پر کچھ پینٹ ہوا دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ گرینائیٹ لیگ کا لوگو ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

رینڈی کی جان میں جان آئی۔ وہ مہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”تم ٹھیک سمجھتے ہو۔ گرینائیٹ لیگ کا ہی نشان ہے۔“

”کیا تم اس ٹیم میں کھیل چکے ہو؟“

رینڈی پہلے تو ہلکے پلکے پالمر کھڑکی کی طرف متوجہ ہوئے پھر بولا۔

”نہیں۔“

☆☆☆

رینڈی ناشتا کیے بغیر ہی بورڈنگ ہاؤس سے باہر چلا آیا۔ اس کے سامنے ایک جانب گھڑی کے سائیکل کے نیچے اس کی پرانی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے سائیکل پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور آئن پر غور کر میدان کی جانب چل دیا۔ وہ ایک گرم دن تھا اور بارش ہونے کی کوئی پیش گوئی نہیں تھی۔ اسے بائیسکل چلانے میں دو بارشیں ہو رہی تھیں۔ اس عمر میں بائیسکل چلاتے ہوئے وہ خاصا آسن لگتا تھا لیکن اسے اپنے کھیل کے علاوہ کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا ہوا اس مقام تک پہنچا تھا اور پالمر ٹیم میں اس کی خاص اہمیت مکنی تھی۔ وہ ایک اچھا ہنر مند تھا لیکن گیند کو ٹچ کرنے میں اسے کمال حاصل تھا اور اس کی ٹیم

ہوئی گیندوں پر مخالف ٹیم کے کھلاڑی کو ہٹ لگانے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔

یہ اس موسم گرما کا آخری ٹیم تھا جو وہ پالمر اور گرینائیٹ لیگ کے لیے کھیل رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ

تماشا ٹیموں میں میجر لیگ تیس سال کا نمائندہ بھی موجود ہوگا

اور پریکٹس میں مصروف تھے۔ وہ انہیں زیادہ منہ نہیں لگا تا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ سب اس سے جلتے ہیں لیکن وہ مجبور تھے کیونکہ وہ ٹیم کی ضرورت بن چکا تھا اور اس کی بدولت ان کی ٹیم گزشتہ تین سال سے کوئی میچ نہیں ہاری تھی۔ پوری ٹیم میں اس سے اچھا گیند چھینکنے والا کوئی نہ تھا۔

اس نے ایک نظر اسٹینڈ پر ڈالی۔ وہاں کھلاڑیوں کے والدین اور دوست بھی موجود تھے۔ اسے تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ اس کا باپ ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا اور ماں نے شراب کی بوتل کو اپنا ساتھی بنالیا۔ وہ آٹھ سال کا تھا جب اس کے باپ کا انتقال ہوا اور سولہ سال کی عمر میں ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ ملائی سے اسٹینڈ کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی آنکھیں خوشی سے پلک پلک اٹھیں۔ ہاں..... وہ وہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے لیے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ سینڈی گرم نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جواب میں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ ان کی ملاقاتیں گزشتہ آٹھ سال سے جاری تھیں۔ سینڈی مقامی مل کے منیجر فرینک گرم کی بیٹی تھی اور صرف دو روز پہلے ہی ان کے درمیان عہد و پیمان ہوئے تھے اور ان میں سے ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ مناسب وقت آئے پر وہ سینڈی کو لے کر یہاں سے چلا جائے گا اور وہ دونوں شاؤکی ٹولیس گے کیونکہ یہاں رہتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا۔

اس نے ایک بار پھر سینڈی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا پھر اسے رکنا پڑا کیونکہ تماشاخیوں کے اسٹینڈ میں ایک عمر رسیدہ شخص داخل ہو رہا تھا جو قبے کے لوگوں کے لیے اجنبی لیکن اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے اسے مل کا میدان واضح طور پر نظر آ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی نوٹ بک تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک عام سا شخص معلوم ہو رہا تھا جو پائلرل اور امریکن لیگیون ہال کا میچ دیکھنے آیا ہو۔ لیکن وہ ایک اسکاؤٹ تھا اور چھوٹی نیوں سے اچھے کھلاڑی تلاش کرنے کے بڑی نیوں کو دیا کرتا تھا۔ دو ہفتے پہلے وہ بورڈنگ ہاؤس کے باہر کا تھا لیکن اس نے اندر آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے ریڈی کے ایک میچ کے بارے میں سن رکھا تھا جس میں اس نے آٹھ کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا اور صرف ایک کھلاڑی اس کی گیند پر ہٹ لگا سکا۔ چنانچہ فیرٹی ٹائی اس شخص نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ریڈی کا کھیل دیکھنے کے لیے دو ہفتے بعد ضرور آئے گا۔

ریڈی نے اس پر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے جو اچھے کھلاڑیوں کی تلاش میں قصبوں، بکلوں اور گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے بالکل اس کان کن کی طرح جو کچھڑ اور ریت میں سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈھونڈتا ہے۔ کئی گھنٹوں کی ڈرائیونگ، نامناسب خوراک، چھوٹے ہونٹوں میں قیام، یہ بھی کیا زندگی ہے لیکن نیا ٹیلنٹ مل جانے پر اسے بھی اتنی خوشی ہوتی ہوگی جتنی کہ کان کن کو سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا ملنے پر۔ وہ اپنے آپ کو اسی سونے کے ٹکڑے کے مانند تصور کر رہا تھا۔

اچانک اس کے عقب سے ایک مردانہ آواز آئی۔
”ہے ریڈی..... ہمیں تھوڑی سی پریکٹس کر لینی چاہیے۔“
اس نے پلٹ کر دیکھا وہ اسپارٹا نام گرم تھا۔ اس کی دل فرینڈ کا بڑا بھائی جو نیلے پر کھڑا تھا ہمارا تھا۔ ریڈی نے اس کا جواب میں ہاتھ ہلایا اور نیلے کی جانب بڑھنے لگا۔
کھیل میں سرگرمی ہی ہونے والا تھا۔

☆☆☆

مسافر ساتھی نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”میچ سچ بتاؤ، تم گریناٹ لیگ میں کھیلتے تھے؟“
ریڈی خاموش رہا۔
”ورنہ تم یہ لیگ کیوں اٹھائے پھر رہے ہو۔ تم ضرور اس ٹیم کے لیے کھیلتے ہو گے۔“
”ہاں۔“ اس نے بالآخر اعتراف کر لیا۔ ”میں گریناٹ لیگ میں تھا۔“
وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ یقیناً کسی کی کوئی یاد نہیں وہاں لے جا رہی ہے۔“
”ہاں۔“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

☆☆☆

میچ دیکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ان میں دونوں ٹیموں کے حمایتی شامل تھے۔ ریڈی نے اسٹینڈ کی جانب دیکھا۔ امریکن لیگیون کی جانب سے پہلا کھلاڑی بیٹنگ کے لیے آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جگہ کو جوتے کی نوک سے صاف کیا۔ نگاہ اپنے فیلڈر فورنیز پر ڈالی جو گزشتہ پانچ سال سے کچر کے طور پر کھیل رہا تھا اور پہلی گیند چھینکنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گیند پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو مخصوص انداز میں کھمایا اور گیند کو اپنے نشانے پر چپک دیا۔ اس نے اپنی طرف سے بہترین کوشش کی تھی

”شاید کہ اتر جائے تیرے دل

میں میری بات“

☆ وہ کھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس ایک گوشے کو ویران کر دیتی ہیں جو کسی ایک انسان کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

☆ محبت کو آزاد چھوڑ کر اپنا پائے رکھنے کے قابل بن جائیں۔ زنجیروں میں بند خاص مجبور ہے یا واقعی آپ کا اپنا کیسے پتا چل سکتا ہے۔

☆ جھٹلاہٹ کا سب سے موثر علاج ایک دوست ہوتا ہے جس پر چیتنے چلانے کے بعد آپ اس کی گود میں سر رکھ کر ڈھیر سارا رو سکیں۔

☆ سلطان علی غازی احمد راحیل، مہرین ناز۔ ساہیوال

لیے اسکا ڈنکس کے بائیں اور وراز کے کھلاڑیوں کے بارے میں معلومات نہیں ہوتی تھیں۔ وہ خود مختلف علاقوں میں جا کر کھلاڑیوں کو دیکھتے اور وہی کھلاڑی ان کی نظروں میں آ سکتا تھا جو اس روز اپنا مکمل دکھانے میں کامیاب ہو جائے۔ گویا اس کھلاڑی کے پاس ایک ہی موقع ہوتا تھا۔

☆☆☆

یہ موقع اس نے تلواد یا تھا۔

دوسری انگ بھی اچھی ثابت نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی گیندیں سچ جگہ پڑ رہی ہیں۔ اس کے باوجود وہ انہیں کاؤنٹر اراوے رہا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس انگ میں کوئی دن نہیں بنا اور تین کھلاڑی کچھ آؤٹ ہو گئے لیکن آخری کھلاڑی کے آنے تک اس کے بازو شل ہو چکے تھے اور اس کا اسٹوڈنٹ کی ڈلی کی طرح پھٹتا جا رہا تھا۔ اب ان کی ٹیم کی باری تھی۔ وہ اپنا بلا پکڑے باہر آیا۔ نام اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا۔ مخالف ٹیم کا باؤنڈری گیند ہاتھ میں پکڑے انگ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا پھر نام نے آواز لگائی۔ ”اسٹرائیک!“

رینڈی آگے بڑھا تو نام نے آہستہ سے کہا۔ ”اپنی جگہ پر رہو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“

اس نے بے کاؤنڈل مضبوطی سے پکڑ لیا اور انتظار کرنے لگا۔ نام ہستے ہوئے بولا۔ ”آج کا دن تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ اسکاؤٹ بھی تمہارا مکمل دیکھ رہا ہوگا۔“

لیکن نام گرم زور سے چلتا یا۔ ”ہاں!“

اس نے بے چینی کے عالم میں نام کی طرف دیکھا اور دوبارہ گیند پھینکی۔ یہ کوشش پہلے سے بھی بہتر تھی۔

”ہاں!“ نام ایک بار پھر چلتا یا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نام کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اس سے پہلے کئی بار نام کے سامنے گیند کرائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گیند کو کہاں پھینکنا ہے۔ اس کے بعد اس نے تین گیندیں اور پھینکیں۔ جن میں سے ایک پر ہٹ گئی اور کھلاڑی رن لینے میں کامیاب ہو گیا جس پر اس کے حامیوں نے دل کھول کر تالیاں بجا دیں۔ رینڈی نے پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھا۔ ایسا پہلے کسی نہیں ہوا تھا۔ پہلی انگ ختم ہوئی اور وہ کسی کو آؤٹ نہ کر سکا۔ وہ فیلڈ سے باہر آیا اور سیدھا نام گرم کے پاس چلا گیا۔

”نام! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

نام نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو، تم کیا کر رہے ہو؟“

”تم جانتے ہو کہ میں کیسا گیند پھینکتا ہوں۔ وہ گیندیں بالکل نشانے پر تھیں جنہیں تم نے بال قرار دے دیا۔“

”میں اس بیچ کا اسپائر ہوں اور ابھی یہ پہلی انگ چل رہی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم بیچ پر جا کر بیٹھو اور اپنی پادھی کا انتظار کرو۔“

☆☆☆

پالمر کی حدود میں واس ہوتے ہی بس کی رفتار سست ہو گئی اور وہ سڑکوں پر بھیڑ ڈال کر صاف رہ گیا۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ مرکزی شاہراہ پر بے ٹکری سے سائیکل چلاتا تھا اور اسے کسی کار سے ٹکرا جانے کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اسے ہر جانب گاڑیاں، دکانیں اور نئے نئے گھر نظر آرہے تھے۔ وہ پالمر کا نظارہ کرنے میں اتنا محو تھا کہ اسٹیو کی پوری بات نہیں سنا سکا جو کہہ رہا تھا۔

”اس زمانے میں اسکاؤٹس کا طریقہ کار بھی مختلف ہوگا؟“

”ہاں۔“ رینڈی نے جواب دیا۔ ”اس وقت انٹرنیٹ، ویب سائٹ اور ای میل کا رواج نہیں تھا۔ اس

ریٹزی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ”ٹام..... پلیز۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، مجھے تمہارے اور اپنی بہن کے تعلقات کا علم نہیں۔ جانتا ہوں کہ تم نے اس سے کیا کہا ہے کہ تم اب بڑی لڑکی میں کھیلنے جا رہے ہو اور اس سے شادی کر لو گے۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں اور ڈیڈی تمہیں اس کی اجازت دے دیں گے۔“

امریکن لیگنوں کا کھلاڑی گیند پھینکنے کے لیے تیار تھا۔ ٹام تھوڑا سا جھکا اور آواز نیچی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میری بہن سے شادی کر کے اسے اپنے گھر والوں سے دور لے جاؤ گے۔ تم ایسا کر سکتے ہو جبکہ میں یہاں موجود ہوں اور اس کھیل کو سپر دائرہ کر رہا ہوں۔“

باؤڈلر نے اس کی جانب گیند پھینکی۔ اس نے زور سے بلا ٹھہرایا۔ گیند ہوا میں بلند ہوئی اور ایک کھلاڑی نے اسے پکچ کر لیا۔ وہ مڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ٹام کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ دیکھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری باری ختم ہوئی۔ اب باہر آ جاؤ۔“

ریٹزی اپنی شیخ پر چلا اور آٹا سپرک کر اس نے اسٹینڈ کی طرف دیکھا۔ اسکاؤٹ جا چکا تھا۔

☆☆☆

بس منزل مقصود پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ وہاں بیٹھے اترے۔ اسٹیون نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”تمہارے ساتھ باتیں کر کے اچھا وقت گزارا۔“

مجھے بھی تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ ریٹزی نکلتا ہوا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلتے ہی والا تھا کہ اسٹیون نے کہا۔

”ایک بات تو میں پوچھنا بھول ہی گیا۔ اس لڑکے کا کیا بنا، جس کا کھیل دیکھ کر وہ اسکاؤٹ آیا تھا؟“

”اس کے بارے میں میں سچی بات تھا کہ وہ دوسرے روز ہی قصبے سے چلا گیا اور پھر کبھی میں اس کا نہیں کھیل۔“

☆☆☆

اس رات ریٹزی اپنے کمرے میں بیٹھا ہاں کی طرح بے تھا شاد رنک کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کی طرح شراب پی کر موت کو گھٹے لگا لے۔ اب اس کے لیے زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹام کی وجہ سے اس کا سیریت اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا لیکن ٹام گرم کمرے کے کتبے ہوئے لفظ اس کے دماغ پر تھوڑے کی طرح برس رہے تھے جنہیں وہ بھی نہیں بھول

سکتا تھا۔

☆☆☆

دو چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ اس لیے سستانے کے لیے قریبی پارک کی ایک شیخ پر بیٹھ گیا جو ٹام گرم کے گھر کے سامنے ہی تھا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں جیسے اسے یہاں تک پہنچنے کے لیے میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑا ہو۔ اسی سالوں بعد بھی وہ یہاں نہ آتا مگر اس نے گزشتہ دنوں فی وی پر بیس بال کے اس کھلاڑی کی کہانی نہ سنی ہوتی جو ساٹھ کی دہائی کے شروع میں منظر عام پر آیا اور ایک شاندار کیریئر بنانے کے بعد اب وہ فلوریڈا میں آرام دہ زندگی گزار رہا تھا۔ یہ 1958ء میں پنسلوانیا کے ایک چھوٹے سے قصبے سے دریافت ہوا تھا۔

1958ء سے تو اس کی بھی تاریخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس کے منہ سے ایک آواز آئی۔ ”اس شو میں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس روز وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم شیخ کھیل رہا تھا۔ جو پچاس کے ساتھ ہوا، اگر وہ نہ ہوتا تو وہ شیخ اس کی قسمت بدل سکتا تھا۔ شہرت اور دولت اس کے قدموں میں ہوتی اور وہ سینڈی گرم کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوتا لیکن اس کے بجائے کیا تھا۔“

اس نے صبح ہوتے ہی بس پکڑی اور پالمر سے نکل آیا۔ اپنے سب خواب وہیں چھوڑ کر کھلی دنیا میں آنے کے لیے وہ نیویارک اسٹیٹ چلا گیا۔ ایک کچھ دوسری ملازمت کرتا رہا۔ اسی دوران اس نے اکاڈمیس میں بیٹھی ملازمت کر لی اور مختلف کمپنیوں کے لیے کام کرتا رہا۔ اس نے ایک مورت سے شادی بھی کی جس نے پندرہ سال کی از دوامی زندگی میں اسے پریشانوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پھر ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ اب وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ بھی بھی پالمر سے کوئی خبر آ جاتی۔ ریٹزی شادی کے لیے کیلی فورنیا چلی گئی تھی۔ ٹام نے باپ کے مرنے کے بعد مل شیخ دی اور ایک ایوارڈمنٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس روز فی وی پر وہ شو دیکھ کر اسے اچانک ہی ٹام کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ پہلے سے زیادہ مونا اور خوش ہوگا۔ چھوٹے سے قصبے میں چھوٹے ذہن کے ساتھ محدود زندگی گزار رہا ہوگا۔ ٹام کا خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ اب پالمر واپس جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ سڑک پار کی اور ٹام کے گھر کی جانب چل دیا۔

پرواز

ایک بوڑھا اپنے پوتے کو اس جنگ کے بارے میں بتانے لگا جو انسان کے اندر جاری رہتی ہے۔

وہ بولا۔ "میرے بیٹے! یہ جنگ ہم سب کے اندر دو بھیڑیوں کے مانند ہے۔ ایک بھیڑیا برا ہے۔ یہ غصہ، حسد، بدگمانی، غم، کچھتاوا، لالچ، نخوت، گناہ، تکبر اور انا ہے۔

دوسرا بھیڑیا اچھا ہے۔ یہ خوشی، امن، محبت، مہمانیت، عاجزی، سخاوت، سچائی اور یقین ہے۔

پوتے نے ایک پیڑے کے لیے توقف کیا پوچھا۔ "اانا جان کون سا بھیڑیا جیتا ہے؟"

بوڑھے نے اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "جسے تم خوراک دیتے ہو۔"

مرسلہ۔ اظہر من یوم، ہزاری، جتوئی

انتظار کے دوران ریڈی نے آنے والے لمحات کا تصور کیا۔ یقیناً ٹام اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ یہی نظر میں وہ اسے نہ پہچان سکے۔ ایسی صورت میں اسے اپنا تعارف کروانا ہوگا پھر ٹام اسے پہچانے گا۔ چڑھے کا بیگ ریڈی کے زانوؤں پر رکھا ہوگا پھر باتوں باتوں میں وہ ٹام کو اپنی پرانی یونیفارم اور رستائے دکھائے گا۔ اسے بتائے گا کہ وہ بیس بال سے کتنی محبت کرتا تھا اور کس طرح ٹام نے اس کی زندگی سے اس کیل کو نکال دیا۔ پچاس سال ہو گئے۔ اس نے گیند کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ٹام یہ سب کچھ سن کر نروس اور خوف زدہ ہو جائے گا اور جب اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اُبرائے لگیں گے تو ریڈی اپنا ریو لوڈ نکال کر اس کے سر کو نشانہ بنائے گا۔

اس نے دوبارہ ڈور تیل بھائی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر ایک بے جان سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ریڈی شہنشاہی سے ہٹ کر بولا۔

ایک مہینا پہلے وہ ٹی وی شو دیکھنے کے بعد اس نے پالمر جانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس نے اپنا پرانا اعشاریہ تین آٹھ کار ریو لوڈ نکال کر صاف کیا جو اس نے کئی سال پہلے اس وقت خریدا تھا جب وہ ایک کھیتی میں تنخواہوں کی ادائیگی پر مامور تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ایک بار پالمر جا کر پرانا حساب ضرور چکائے گا۔ اس نے انٹرنیٹ سے ٹام کا فون نمبر معلوم کیا اور پبلک آفس سے اسے فون کرنے چلا گیا۔ وہ اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ "ہیلو۔"

ریڈی نے اپنا کلا صاف کیا اور بولا۔ "کیا یہ ٹام کرسٹم کا نمبر ہے؟"

"ہاں۔" وہ عورت بولی۔ "لیکن وہ اس وقت فون پر نہیں آسکتا۔ اگر کوئی پیغام ہوتا تو دو۔"

"یقیناً؟" اس نے دل میں سوچا۔ "اس کے لیے پیغام یہ ہے کہ کئی سال پہلے میں نے مجھے برا دیکھا تھا۔ امپائر ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے خلاف فیصلے

دے دیے اور میری زندگی تباہ کر دی۔ میرے خواب چٹنا چور ہو گئے اور میں ہمیشہ کے لیے بیس بال سے دور ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنی بہن کو مجھ سے بچانا چاہتا تھا بعد اس کی خاطر اس نے میری زندگی برا دیکھی۔"

لیکن وہ یہ سب زبان سے نہ کہہ سکا۔ اس نے ایک لمحہ سانس لی اور بولا۔ "نہیں، کوئی پیغام نہیں ہے۔"

☆☆☆

اب وہ کوچ میں بیٹھ چکا تھا اور ایک بہت ہی عمدہ مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹل کی فروخت سے ٹام کے ہاتھ اچھی حالت میں آئی تھی۔ تبھی تو وہ اتنے اچھے علاقے میں یہ مکان خریدنے کے قابل ہو سکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ٹام نے ان برسوں میں کتنی کد کی گزاری ہوگی۔ خوب دولت کمائی ہوگی اور ٹھانڈے، اپنی پہلی کے ساتھ رہ رہا ہوگا۔ شاید ہی اسے بھی 1958ء کی آمدنی کا خیال آیا ہو جب اس کے غلط اور بے رحمانہ فیصلوں نے ریڈی کو در بدر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ اس طاقت کا کمال تھا جو امپائر ہونے کی حیثیت میں اسے حاصل تھی تو گویا اس دنیا میں طاقت ہی سب کچھ ہے۔

اس نے چڑھے کے بیگ کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور ڈور تیل بھادی۔

ساتھ ہی چٹاب کی بوتل لگی ہوئی تھی۔
ایولین مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے آنے کی
بہت خوشی ہوئی کیونکہ ٹام سے ملنے بہت کم لوگ آتے ہیں۔
جب سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“

”اوہ۔“ رینڈی نے آنسوؤں کا اظہار کرتے ہوئے
کہا۔ ”ایکسیڈنٹ کس طرح ہوا تھا؟“

ایولین نے وہیل چیئر کے ونڈل پر اپنا ہاتھ رکھا اور
بولی۔ ”میں سال پہلے کی بات ہے۔ نئے میں دھت ڈرائیور
نے اسے ٹکر مار دی۔ اس وقت سے اس کا علاج ہو رہا ہے
لیکن اس کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جاتی رہی ہے اور اب
یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ گوکہ بول نہیں سکتا لیکن
مجھے یقین ہے کہ اب بھی اس میں سننے کی صلاحیت باقی ہے
اور جانتا ہے کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔“

رینڈی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔
ایولین کی آواز بھراکتی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے
کی کوشش کر رہے ہوئے کہنے لگی۔ ”تم اس سے باتیں کرو،
میں چائے بناتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ٹام ایک نئی آواز سن
کر خوش ہوگا۔“
یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور کمرے میں صرف وہ دونوں ہی
رہ گئے۔

☆☆☆

رینڈی نے اس کے خمیدہ جسم اور سر پہ ہونے
پرے کو دیکھا اور پرانے زخم ہرے ہونے کے بعد ایک
اپریل 1958ء میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے وہ فنسٹریٹ
میں اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ تاہم رینڈی نے اپنے
جذبات پر قابو پا یا اور پرسکون لہجے میں بولا۔ ”ہیلو ٹام؟“
ٹام کی آنکھیں چپکے لگیں جیسے وہ اسے پہچاننے کی
کوشش کر رہا ہو۔

”یاد کرو، میں رینڈی جاروس ہوں۔ تمہیں
1958ء کی وہ صبح تو یاد ہے جب میں بال کے بیچ میں تم
نے میرے خلاف فیصلے دیے اور میرے لیے بڑی ٹیم میں
کھیلنے کا موقع ضائع کرو یا کیونکہ تم نہیں چاہتے تھے کہ میں
تمہاری بہن سے شادی کروں۔“
ٹام مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

رینڈی نے اپنا بیگ کھول کر دستا ند باہر نکالا۔ اسے
اپنے ہاتھ میں رکھ کر دیکھا اور پھر اتار کر وہاں بیگ میں رکھ دیا۔
اس کے بعد میں بال کی یونیفارم نکالی اور ٹام کے سامنے
لہراتے ہوئے بولا۔

”مجھے ٹام گرم سے ملنا تھا۔ کیا وہ گھر پر موجود ہے؟“
اس نے سر ہلایا اور بولی۔ ”کیا تم اس سے ملنا پسند
کرو گے؟“

رینڈی کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور دونوں ہاتھ
پیسے سے پھیک گئے۔ یہ سب کچھ اس کے پلان میں شامل
نہیں تھا لیکن اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس نے آہستہ
سے کہا۔ ”ہاں۔“

اس عورت نے پورا دروازہ کھول دیا اور بولی۔ ”اندر
آ جاؤ۔ میرا نام ایولین ہے اور میں ٹام کی بیوی ہوں۔“
”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ میرا نام رینڈی ہے۔“
رینڈی جاروس۔

لیونگ روم کافی بڑا تھا جس میں دو کاؤچ لگائے
پرانے ماڈل کالی وی اور کتابوں سے بھرا شلف رکھا ہوا
تھا۔ کاؤچ پر بیٹھے ہوئے، اس نے سوچا کہ یہ لیونگ روم،
پورڈنگ کے اس کمرے کے مقابلے میں بہت بڑا تھا۔ اس
خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں پرانی فلم چلنے لگی۔ اس
نے بیگ کو اپنے منہ سے لٹکا دیا اور منصوبے میں تھوڑی سی
تبدیلی کر لی۔ جب ٹام کمرے میں داخل ہوگا تو مصافحہ
کرنے کے بعد وہ کہے گا کہ اس سے تنہائی میں بات کرنا
چاہتا ہے۔ یہ سن کر ایولین کمرے سے باہر چلی جائے گی اور
وہ اپنا کام شروع کر دے گا۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں سوچنے کی
ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے کوئی مار کر چل دے گا۔ ٹام
میں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
تھا۔ اہل گھر یہاں آنے کا مقصد اس امپائر کو مارنا تھا جس
نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ ایولین کی آواز اسے اپنے
بہت قریب سنائی دی۔ ”کہہ دی تھی۔“

”ٹام! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ وہ اپنا نام رینڈی
جاروس بتا رہا ہے۔“

رینڈی نے اس آواز کی سمت میں دیکھا۔ ٹام گرم
اس کے سامنے تھا۔ اسے وہیل چیئر میں دیکھ کر رینڈی کا منہ
حیرت سے کھل گیا۔ اس کا دیرینہ دشمن صرف چند فٹ کے
فاصلے پر تھا۔ رینڈی کے ہاتھوں کی گرفت بیگ کے ونڈل
پر اور بھی مضبوط ہو گئی۔

اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے
جوڑ اور پٹھے کافی عرصے قبل ڈھیلے پڑ چکے ہیں۔ اس کے
تھنوں میں آکسیجن کی ٹوب لگی ہوئی تھی اور چہرے پر سفید
اور بھورے نشان پڑ گئے تھے۔ وہیل چیئر کے ونڈل کے

”اب تو تمہیں سب یاد آگیا ہوگا۔ تم اس بیچ میں امپائر تھے۔ جس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تم نے میرے خلاف فیصلے دیے اور میرا کیریئر تباہ کر دیا۔“

یہ کہہ کر اس نے یونیفارم بیگ میں رکھ دی۔ اب اس کا ہاتھ رپوا لور پر تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”جانتے ہو کہ تم نے مجھ پر کتنا ظلم کیا۔ مجھے بیس بال سے عشق تھا۔ تم نے مجھ سے میری دونوں محبتیں چھین لیں۔ جہاڑی بہن کو تو میں بھول سکتا ہوں لیکن بیس بال سے دوری کی خلش آج بھی میرے دل میں پھانس کی طرح چھبتی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا نام۔“

اس نے نام کے ڈھکے ہوئے جسم، سپاٹ چپرے، پتی پتی ٹانگوں اور بازوؤں پر ڈالی، پیشاب کی ٹھیلی، آسجین کی ٹیوب، اس کے خواب، غصہ اور جوش انتقام سب کچھ گنڈہ ہو رہا تھا۔ ریڈی نے ایک گہرا سانس لیا اور بیگ سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔

ایولین کمرے میں لوٹ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چائے۔۔۔۔۔۔“

ریڈی نے اپنا کپ پکڑ لیا۔ ”واقعی“

مجھے اس کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔“

☆☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لوریا کے کنارے تک پہنچا اور بیگ سے ریوا لور نکال کر مورچے کی پینک دیا۔ پھر وہ ٹھہرا ہوا پارک کی جانب آیا جہاں کچھ فاسٹ فوڈ کے بیچے میل رہے تھے۔ وہ ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور بیگ اپنے پیروں کے پاس رکھ لیا۔ اس کا سر بری طرح جکڑا رہا تھا اور وہ کبھی سے اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ اس نے اپنے دامن سے نظام لینے اور اسے مارنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ہڈی پہلے ہی اپنا وار کر چکی ہے۔ نام اب ایک زندہ لاش کے ساتھ تھا اور لاشوں پر گولی نہیں چلائی جاتی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے اپنے لورسوں کے کنارے رکھ کر اب کیا کرے۔ جس سے انتقام لینے آیا تھا، وہ اپنے ہی قدرت کے انتقام کا نشانہ بن چکا تھا۔ بس پکڑے اور نیو یارک واپس چلا جائے اور بقیہ عمر یادوں کے سہارے گزار دے۔

”ہائے ریڈی۔“

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی شخص میدان کے

کنارے پر کھڑا اسے پکار رہا تھا۔ اس نے ریڈی کی جانب کوئی چیز پھینکی۔ ریڈی کا بایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ وہ بیس بال کی گیند تھی۔ اسٹیو اس کے پاس آیا اور بولا۔

”میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ لائبریری کے پرانے ریکارڈ سے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے زمانے کے بہترین کھلاڑی تھے اور تم سے اچھا گیند پھینکنے والا کوئی نہ تھا۔“

ریڈی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ اسٹیو یہ آنسو نہ دیکھے سکے لیکن وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ”میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔“

ریڈی نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا۔ ”بولو۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے بتایا تھا کہ میرا بیٹا بیس بال کا شوقین ہے اور بچوں کی طرح کھیلتا ہے۔ اس سال انہیں لیگ کھیلنی ہے جس کی وہ تیاری کر رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی ایسا کھلاڑی نہیں جو گیند کو صحیح طریقے سے منج کر سکے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم انہیں اس بارے میں نصیحت کر دے سکو؟“

ریڈی بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے بیس بال پھوڑے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کھیل تو وہی ہے۔ اس کے اصول، قاعدے اور طریقے تو نہیں بدلے۔“

ریڈی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بال کا معائنہ کیا۔ اس نے کہا۔ ”میں بدلا تھا۔ وہی چمڑا، وہی سلائی، وہی شیب۔ اتنے سالوں بعد گیند پکڑنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔“

”ہاں۔ تم جیک کہہ رہے ہو۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔“

اسٹیو کی آنکھیں پانی سے چمکنے لگیں۔ وہ چپکتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گو یا تم تیار ہو۔“

ریڈی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گیند اور دوسرے ہاتھ میں گرینائیٹ لیگ کا بیگ تھا۔ اس نے مضبوط آواز میں کہا۔ ”ہاں، میں تیار ہوں۔“

اسے یوں لگا کہ بیس بال سے اس کی محبت زندہ ہو گئی ہے جو نہ جانے کب سے اس کے دل کے کسی چور خانے میں چھپی ہوئی تھی اور موقع ملتے ہی باہر آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسٹیو کی طرف دیکھا اور میدان کی جانب بڑھ گیا۔

محفل شہر و سخن



✽ محدث.....کراچی

آئے گی میرے جسم سے اخلاص کی خوشبو
میں پھول ہوں اور پیار کی شبنی پہ سجا ہوں

✽ ایم عمران قاسم.....سبیل تحصیل کرسیدالکمرشی

کئی بار طوفان سے ٹکرائی
کئی بار ٹکرا کے ساحل پہ آئے

حلاش طلب میں وہ لذت مٹی ہے
دعا کر رہا ہوں کہ منزل نہ آئے

✽ محمد زریان سلطان.....اردو بازار کراچی

دل بس کر ہر دکھ سہ لے گا، ہے شرط تہلہ ساتھ ملے
تم دشت بنو یا شہر یا پاؤں کا جھالا بن جاؤ



✽ ریاض بٹ.....حسن آباد

دیوانہ وار آپ کا ملنا وہ لمحہ ہے
تھا وقت سازگار ابھی کل کی بات ہے

حالات دوستوں سے بہت دور لے گئے
لاکھوں تھے ٹھکسار ابھی کل کی بات ہے

✽ جلیل ملک.....بگستان جوہر کراچی

مانا کہ بہت قیمتی ہے وقت تیرا لیکن
ہم بھی ناپید تھے گزرے دنوں کی بات ہے

✽ رمضان پاشا.....کشن اقبال کراچی

شغاف ہو گئیں سچی اونچی حویلیاں
اک جھونپڑی کی چھت سے دھڑکی مارشوں کے بعد

✽ نوید احسن رانجھا.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ہر ایک پاؤں مجھے روند کے گنہ دوست
جانے کون سی منزل کا راستہ ہوں میں

✽ عابد سعید.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

رات گھبری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے

تم جو پھنجرے تو بھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

✽ مسٹر ایند مسز محمد صفدر معاویہ.....خانپوال

بریں منزلیں میرے راتے
بریں دعا حیرے واسطے

✽ مسز محمد صنف آصف.....بھکر

بدلہ وفا کا بدلہ سادگی سے دس گے ہم
تم ہم سے روکھ جانے اور زندگی سے ہم

✽ توقیر عباس رجوکہ.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

سب اس پہ متفق تھے کہ مجھ سے عناد تھا
یارو! بات بات میں ورنہ تضاد تھا

سب کی الگ زبان تھی لہجے الگ الگ
کتنا مخالفت میں مگر اتحاد تھا

✽ اظہر حسین پیار.....ہزاری جتوئی

مجھے زندگی کی دعا نہ دے مجھے زندگی کی طلب نہیں
بھی جینا مجھ کو عزیز تھا، یہ بجا سہی مگر اب نہیں

✽ چودھری علی رضا گوندل..... کمالے شوگر ملز
ان لمحوں کی یادیں سنبھال کر رکھنا
ہم یاد تو آئیں گے لیکن لوٹ کر نہیں

✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میر پور خاص
ٹپے ہیں دھم محبت میں اس قدر ہم کو
اداس اتنے ہوئے مرہموں کو بھول گئے
بہت قریب سے گزرے ہیں دشت کے جھونکے
ہوائے صبح کی ہم لذتوں کو بھول گئے

✽ اعجاز احمد راحیل، ماہی..... ساہیوال
دل ڈھونڈتا تھا رنجشوں کے مختلف جواز
دل کو ہی پھر ملال ہوا فاصلوں کے بعد
منصف! رتری عدالتوں کی شہرتیں بجا
پر میں اجڑ گیا ہوں ترے فیصلوں کے بعد

✽ آمنہ رشید سیال..... مروہڑی، ضلع سکس
افتق کے اس پامانے کیا ظلم ہے
لوٹے نہیں زمیں پر اب بار جو گئے

✽ بلقیس خان..... واہ کینٹنمنٹ
ہوائیں، رنگ، خوشبو، پھول، تلی سب برفاق ہیں
درو دیوار بھی سبے ہوئے ہیں اپنے مینوں سے
زمیں پہ پاؤں جن کے خوف سے ہم رکھ نہیں گئے
وہ ایسے سانپ لگے ہیں ہماری آنکھوں سے

✽ حیدر آباد..... حیدر آباد
تیرا مجھے روز دھم تازہ دے
کسی کو جلی محبت میں مات ہو جیسے
ہمارے دل کو کئی مانگتے نہیں آیا
کسی غریب کی دنیا کا ہاتھ ہو جیسے

✽ حسن معاویہ، حسین معاویہ، حسن معاویہ..... بھکر
اندھیرے اور بڑھ گئے تو کیا ہوا
ماپوں تو نہیں ہیں طلوع سحر ہے ہم
الہیلی..... کراچی

روپ تو اس کو ایسا دیتے، دیکھتی ہی رہ جاتی دنیا
ہم بت سازی چھوڑ چکے تھے، جب وہ پھر موم ہوا

✽ رضوان تنولی کریڑوی..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
عبادت کے لیے جب جسم اطہر رقص کرتا ہے
جبین عشق جھکتی ہے تو منبر رقص کرتا ہے

✽ طالب حسین ظلمی..... نیو سینٹرل جیل ملتان
طلوع شمس و قمر سے پہلے میں تجھ پر آقا درود بھیجوں
ہر اک شام و سحر سے پہلے میں تجھ پر آقا درود بھیجوں
خدا کی کتاب تو ہے میرا سارا نصاب تو ہے
حصولِ علم و ہنر سے پہلے میں تجھ پر آقا درود بھیجوں

✽ مادیہ ایمان، ماہا ایمان..... گھانا
تجھے کتنوں کا لبو چاہیے اے ارض وطن
جو ترے عارض بے رنگ کو کھنار کریں
کتنی آہوں سے کھجیا ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو حیرے صحراؤں کو گلزار کریں

✽ راشد حبیب تابش..... ضلع انک، ممبئی
میرے عدو بھی میرے قتل پر پریشان تھے
مگر تو شان سے میت کوئی اچھی کب بھی
جہاں دار سے شوکت کشید ہوتی ہے
ہمارے جہاں دار و گرنہ خون دریا کب بھی

✽ محمد شہباز اکبر..... ڈھکی، پاکستان شریف
جن کی صداقتوں پہ کون کب نہ کرے دلنشین
تم بھی کتابِ دل کی انہی آیتوں میں ہو

✽ سعید عباسی..... بہاولپور
مجھے پتا تھا کہ لوگ بدل جاتے ہیں دوست
مگر میں نے کبھی تجھے لوگوں میں گناہی نہیں دیا

✽ اور لیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
جاننے رات کا مزاج نہ پوچھ
ہم گریہ کے گھر نہیں آتی

✽ ناصر علی..... عباسیہ ٹاؤن، رحیم یار خان
اب تو وہ بھی جس کے بارے نظر آنے لگے
ان کی بھی نیندیں اڑ گئیں مارے نظر آنے لگے
آنکھ ویراں دل پریشاں ناک برہم لب خاموش
اب تو وہ کچھ اور بھی پیارے نظر آنے لگے

✽ مونا رضوان..... کورنگی کراچی
جب بھی انسانوں کو پرکھا، مجھ کو یہ احساس ہوا
تن من ان کا زہر بھرا ہے ناگن میں کیا رکھا ہے

✽ نوشاد علی..... فیصل آباد
دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

✽ عاصم اقبال جہاں..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وفا میں ہر قسم سہ لے وفا کی شرط ہے اول
نگاہوں سے صدا دینا حیا کی شرط ہے اول
تیرے بیٹھنے میں ساقی عجب دستور دیکھا ہے
تیرا اک جام پینے میں وفا کی شرط ہے اول
✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی
غنیچہ شوق لگا ہے رکھنے
پھر تجھے یاد کیا ہے دل نے
✽ عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور
زندگی مہک جائے صبح نوخیز کی صورت
آئینہ کی سی شفاف ہوائے صاحب تیری صورت
ہر آن مسکراہٹ تیرے چہرے پہ لگی ہو
نہ ہو کوئی غم، نہ دل میں رہے کوئی گدورت
✽ فرحان شیخ..... سیالکوٹ

حیرت والی کوئی بات نہیں تو پھر
کیوں اتنی سیر ہو رہی جاتی ہے
باہر برف میں لپکا ایک نیا موسم
اند آگ پرانی بیڑی جاتی ہے
✽ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ ٹریفک بائی پاس
بھر آئیں نہ آنکھیں تو اک بات کیوں
اب تم سے پھرنے کا امکان بہت ہے
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
جلوسٹھی سے گرتی ریت کے مانند
وہ نکلی کیا زندگی سے، ذرا ذرا کر کے

✽ کمال انور..... کراچی
اب کسی اور کو چاہوں تو شکایت کیسی؟
تم جو پھڑے ہو رہے میری عادت کر کے
✽ عبدالرحمن..... میرپور
سرمبر وہ خوابوں کے کل تم کرتے ہیں
علاج غم نہیں کرتے فقط تقریب کرتے ہیں

✽ رضیہ عمیر..... کراچی
دل اگر ہے نقاب ہوتے
سوچو کتنے فساد ہوتے
✽ ایم اے فاضل فریدی..... لاہور
اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے
✽ رائے طیب اکرم بھٹی..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
نہ غلش جدائی کی ختم ہو نہ حیات گزرے قرار سے
میں خزاں رسیدہ ہوں دوستو مجھے غرض کیا ہے بہار سے

✽ وسیم احمد..... میانوالی
چمن والو! خدا حافظ قفس کو لے چلی گردش
چمن میں گر اندھیرا ہو تو گھر میرا جلا لینا
✽ زوہب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
خوش تو ہو ہی چکا تھا غرق طوفان حیات
حسن بھی عروج غم ہستی میں ڈوبا جائے ہے
✽ سید محمد علی..... حیدر آباد
میری آنکھوں سے جھلکتا ہے میری روح کا درد
میرے چہرے پہ میرے سر کی سی ویرانی ہے
✽ شازبہ کمال..... کراچی
جلائے بیٹھے ہیں ہم اس جگہ جو کے دیے
جہاں سحر بھی اترتی ہے روشنی کے لیے
✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
اپنی خیال سے آنکھیں تمام رات جلیں
میں جاگتا ہوں اسے نیند آگئی ہوگی

✽ افضل علی..... بہاولپور
دکھائی چکے نہیں دینا نگاہ ہوتے ہوئے
بچا ہوا ہے وہ قاتل گواہ ہوتے ہوئے
✽ اطہر حسین..... کراچی
میں تری یاد کے زنداں میں ابھی تک ہوں اسیر
کب تو آزاد کرانے یہ قلام آئے گا

مختار شعرو سیخت

نام: _____
پتہ: _____

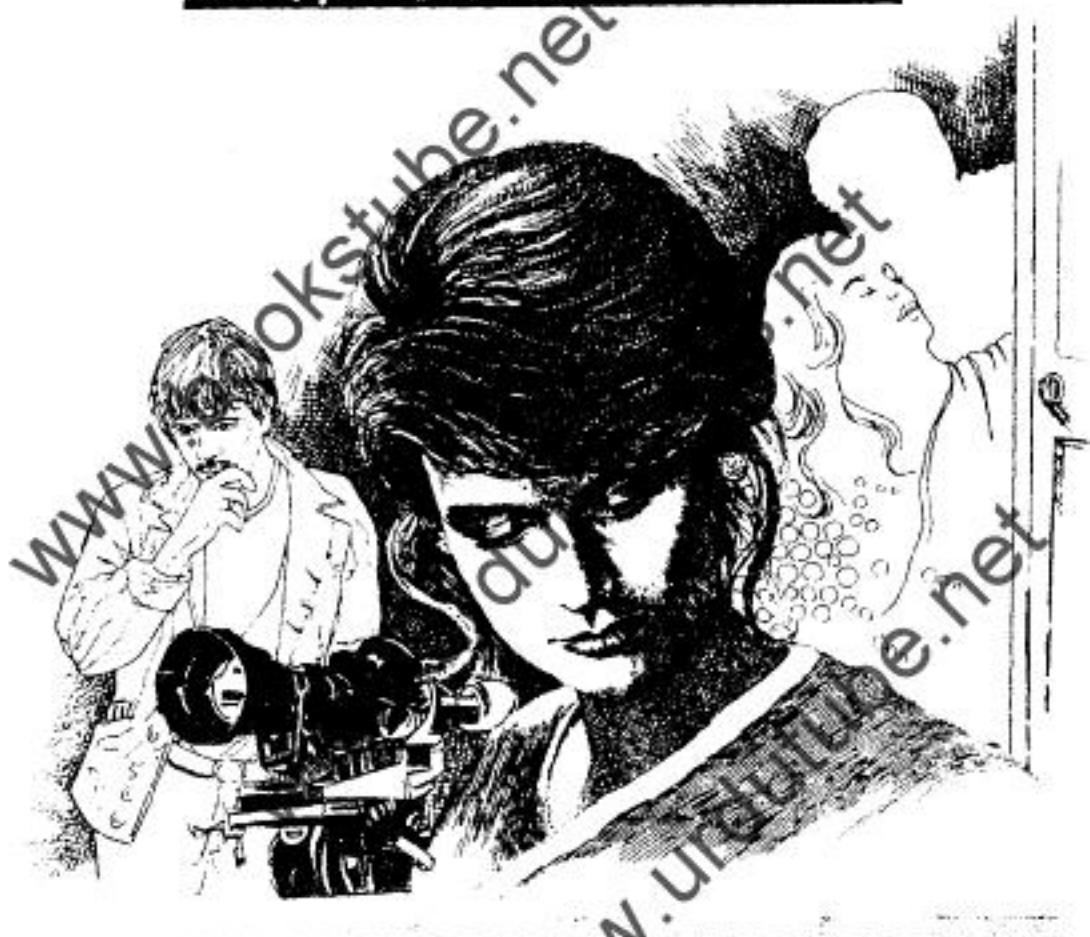


منتقم مزاج

دانش علی

دام غریب آسان تو ہے لیکن اسے آخری لمحات تک نبھانے والے بہت بڑے فنکار ہوتے ہیں... اس نے بھی اپنا کردار بڑی خوبی سے ادا تو کیا مگر ایک کسک کسی کے دل کو بے چین بھی کر گئی تھی کیونکہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے ہمیشہ خسارے کا سودا کرتے ہیں اور یہ بات انہیں ہمیشہ آخر میں سمجھ آتی ہے۔

ذاتیات میں دخل اندازی کرنے والے ایک بلیک میٹر کی چال بازی



مارکس ہنری اس وقت ہالی وڈ کے ایک طویل مارکس ہنری اس وقت ہالی وڈ کے ایک طویل عریض رقبے پر پھیلے ہوئے خوبصورت، سرسبز اور پر رونق سوئس پارک کی نم آلود گھاس پر چت لیٹا ہوا تھا یہ سوئس پارک کا نسبتاً کچھ کم پر رونق اور تاریک گوشہ تھا۔ مارکس کی نظریں مسلسل پارک کے مین گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں سے اس کے شکار نے پارک میں داخل ہونا تھا، کچھ دیر بعد ہی اس کا مطلوبہ شخص پارک میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ مارکس اس کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا لیکن وہ مارکس کی شکل

سے ناواقف تھا۔ جونہی اس نے مارکس کی طرف دیکھا مارکس نے اسے مخصوص انداز میں اشارہ کر دیا۔ آنے والا شخص مارکس کے قریب آ کر رک گیا۔
”رقم لے آئے، مسٹر۔“ بھلو میسی؟“ مارکس نے اسے بغور دیکھا۔

”ہاں“ مارکس کا مخاطب اس بھلو میسی لب کشا ہوا۔
”لاؤ اب وہ سی ڈی مجھے دے دو۔“
اس بھلو میسی نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر مارکس کی طرف بڑھا دیا۔

”رقم پوری ہے نا؟“ مارکس نے اس بھلو میسی کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے وضاحت چاہی اور لفافے کو کھول کر دیکھا۔
مارکس کے حسب مشا لفافے میں ڈالرز موجود تھے۔
اس نے جیب سے ایک پیکٹ نکال کر اس بھلو میسی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس میں یقیناً کسی سووی کی سی ڈی تھی۔

”اس کے بعد ہم دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔“ مارکس بھلی آواز میں بولا۔ ”اور تم بھی اس فلم کو جلا دینا کیونکہ کوئی اس فلم نہیں ہے اس میں تم ایک انسان کو قتل کرتے ہوئے نظر آ رہے ہو اور انسان بھی وہ جو تمہارا بہت اچھا بڑا پس پارٹنر تھا، جس کے قتل کی تلاش میں پولیس اب تک دھکے کھا رہی ہے، لیکن اسے یہ کہہ دو کہ مارکس کی سرکوشی میں ہمدردی کا عنصر نمایاں تھا جو بھلو میسی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔“

”بس بس۔“ اس بھلو میسی نے مارکس کی بات سن کر ہنسنے سے پہلے ہی قطع کر دی۔ ”مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اب مجھے کیا کرنا ہے اور ہاں، اب تمہارے پاس بھی اس سووی کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔“ اس نے جیب سے ایک سی ڈی نکالی اور کہا۔
اس کا انداز قدرے عجیب تھا جیسے اسے مارکس کا یہ مشورہ انتہائی ناگوار گزر رہا ہو۔

”یہ اس سووی کا ماسٹر ریپڈ ہے۔“ مارکس نے بھی سخت لہجے میں جواب دے دیا اور یہ سب اس کے ساتھ دھوکا نہیں کرتا یہ میرے کاروبار کا اصول ہے۔“
”بس ٹھیک ہے اب تم یہاں سے جاؤ۔“ اس بھلو میسی نے انتہائی رکھائی سے کہا۔ ”اور آئندہ میرے ساتھ مت آنا اپنے ہمدردانہ مشورے لے کر۔“

”اوکے، تمہاری مرضی۔“ مارکس نے جواب دیا۔
پھر پروائی سے کندھے اچکائے اور ہاتھ کو الو داحیہ انداز میں ہلاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

اپنے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے جیب سے لفافہ نکال کر اپنی الماری کے ایک خفیہ خانے میں روپوش کر دیا۔ وہ اپنی اس کمائی ہوئی دولت کو فی الفور بینک میں جمع کرنے کا عادی نہیں تھا کیونکہ اس میں اس کے لیے گرفتاری کا خطرہ ہوتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دواش روم میں نہانے کی نیت سے چلا گیا۔ جب وہ وہاں آیا تو سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھا اور خود کو بہت فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا۔ اس فلیٹ کی دیواریوں میں ایک یہ ٹیلی ویژن ہی تو اس کا سامنی تھا۔ جو اس کا دل بہلانے کا سامان تھا اور زندگی کی تنہائیوں میں صرف جینی لوکس تھی جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ جینی نے اس کا ایسے محسن وقت میں ساتھ دیا تھا جب وہ ساری دنیا میں تھما رہا تھا۔ ماضی کے ایک سیانک سانحے نے مارکس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کا باپ ڈریوڈ کیسرون ایک انتہائی دولت مند آدمی تھا۔ اس کا بیوی دل کا ایک بہت بڑا قارم تھا۔ اس کے علاوہ وہ کاروں کے ایجنٹر پارٹس بنانے کی ایک بڑی کمپنی کا مالک بھی تھا۔ مارکس کی ماں مارگریٹ کیسرون حقیقتاً ایک بہت ہی نفیس خاتون تھی۔ زندگی کی کوئی خوشی اور دولت تھی جو ڈریوڈ کیسرون کے اس گھر سے خاندان کے پاس نہیں تھی۔ مارکس کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ گریسوں کی ایک بچی ہوئی دوپہر تھی جب ڈریوڈ کیسرون اپنے ایک دوست رونا لڈ بیرن کو ساتھ لے کر گھر آیا تھا۔ رونا لڈ ایک انتہائی مفلوک الحال شخص تھا۔ وہ ڈریوڈ کیسرون کا چچا دوست تھا، اس لیے ڈریوڈ کیسرون نے اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر جانا شروع کر دیا اور کچھ دن بعد ہی رونا لڈ نے بہت حد تک بچی کے تمام کام اور ذمے داریاں اپنے کندھوں پر سنبھال لیں۔ ڈریوڈ کیسرون کا روپار کی طرف سے بہت حد تک بے فکر ہو چکا تھا۔ رونا لڈ کی شکل میں اسے ایک مضبوط سہارا جوں گیا تھا۔ لڈ کی سہارا سے ڈریوڈ کیسرون کو اس طرح بے سہارا کر دیا کہ ڈریوڈ کیسرون کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ڈریوڈ کیسرون کی بے پروائی اور بے نیازی کی وجہ سے رونا لڈ نے نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ لیگل پیپرز کی رو سے بھی تمام کاروبار اور کوٹھی پر قبضہ کر لیا اور اس سانحے کے چند دن بعد ہی ڈریوڈ کیسرون کا انتقال ہو گیا۔ مگر وہ درحقیقت رونا لڈ بیرن کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ڈریوڈ کیسرون کی قبر کی مٹی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ رونا لڈ نے ڈریوڈ کیسرون کی بیوہ مارگریٹ کا گھادپا کر اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ مارکس اس وقت ایک کالج اسٹوڈنٹ

”مگد، یو آراے ویری اٹلی جٹ ہوائے۔“
 نو جوان نے مارکس کی تعریف کی۔ ”ویسے میرا نام میجک
 ڈان ہے، لوگ مجھے مسٹر میجک کہتے ہیں۔“ اس نے خود اپنا
 تعارف کرانے میں پہل کی۔

”جی، جان چکا ہوں۔“ مارکس نے مختصر جواب
 دیا۔ ”آپ ڈاکٹر کے یہاں یہ نام لکھوا چکے ہیں۔“
 ”بہت زبردست۔ تم تو اچھے بھلے حاضر دماغ لڑکے
 ہو، تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑے گی مسٹر.....؟“
 ”مارکس ہنری.....“ مارکس نے اپنا نام بتا کر اس کا
 ادھر اوجھل کھل کیا۔

”ویسے میں ایک پرائیویٹ جینرل میں سینئر کیرامین
 ہوں۔“ میجک نے اپنے تعارف میں مزید اضافہ کیا تھا۔
 اس کے جواب میں مارکس نے صرف ہوں ہاں پر
 ہی اکتفا کیا تھا۔ اسے ان باتوں سے اس وقت کوئی دلچسپی
 محسوس نہیں ہو رہی تھی اسے تو اس وقت بھوک ستا رہی تھی۔
 ”کیا کھانا کھان گم ہو، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ
 گے.....؟“

”بتاؤں گا، مگر اس وقت مجھے بھوک لگی ہے۔“ مارکس
 نے صاف الفاظ میں اپنی خوشحالیت کا اظہار کر دیا۔
 ”اوہ! آئی ایم سوری۔“ میجک نے ہنس پر تاسف لہجہ
 میں کہا۔ ”آؤ کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔“
 میجک اسے ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔ جس نے ان
 کے آرڈر کے مطابق کھانا سروس کر دیا تھا۔

”اس شہر میں اچھی لگتے ہو۔“ میجک نے سوالیہ لہجہ
 میں کہا۔

”ہاں!“ مارکس نے کھانے کے دوران مختصر جواب
 دیا اور پھر میجک کے سامنے اپنی ساری روداد بیان کر دی۔
 میجک کو اس کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔
 کھانے سے فارغ ہوتے تو میجک اسے اپنے ساتھ اپنے
 فلیٹ میں لے آیا اور اپنے کچھ ہی ملازمت کی بات بھی
 کرادی... اب مارکس کو میجک کے بارے میں بہت حد تک
 معلومات ہو چکی تھیں۔ میجک صرف ایک جینرل کا کیرامین
 ہی نہیں بلکہ ایک بہت ہی مہیا ہوا بلکہ میجر بھی تھا اور اسی وجہ
 سے اسے گولی بھی لگی تھی لیکن عین وقت پر مارکس کے پہنچنے کی
 وجہ سے میجک بچ گیا۔... ان کے بارے میں میجک نے
 مارکس کو اپنا فیصلہ بتا دیا تھا کہ بہت جلد وہ بزنس مین کو اپنے
 ان پائلو غنڈوں کو آئندہ کوئی آرڈر دینے کے قابل نہیں
 رہنے دے گا۔

تھا۔ اس نے اپنی ماں کی جان بچانے کے لیے روٹا لٹ پر حملہ
 بھی کیا لیکن مارکس کو خود ہی روٹا لٹ کے دندہ صفت خونی
 ملازموں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ یہ مناظر مارکس کی
 آنکھوں میں گویا بیسٹ ہو کر رہ گئے تھے اس نے اسی روز
 قسم کھائی تھی کہ زندگی میں جب وہ اپنے قدموں پر کھڑا
 ہو جائے گا تو وہ روٹا لٹ سے انتقام ضرور لے گا۔ قسمت اسے
 ایک اچھی شہر میں لے آئی تھی جتنی ویران دو پہر، اچھی شہر
 نا آشنا لوگ، مارکس ساحل سمندر پر اداس بھوک پیاسا سر
 جھکائے بے نام منزل کی طرف چلتا جا رہا تھا کہ اچانک اس
 کی نظر ایک حادثے سے متصادم ہوئی۔ ایک کار کی
 ڈرائیونگ سیٹ پر ایک زخمی نو جوان کراہ رہا تھا۔ اس کا
 لباس اس کے خون کی رنگت میں رنگین ہو چکا تھا۔ مارکس
 نے اس نو جوان کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ جلد ہی سے
 نو جوان کے قریب گیا۔ مارکس کو دیکھ کر نو جوان کی آنکھوں
 میں چمک ابھر آئی تھی۔

”پلیز! ہیلپ می.....“ نو جوان نے ڈوبتی ہوئی آواز
 میں کہا تھا۔

مارکس نے برق رفتاری سے کار کا دروازہ کھول کر
 نو جوان کو برابر والی سیٹ پر کھینچ لیا اور میڈی کرائیونگ سیٹ
 سنبھال لی۔

”جلد ہی کسی قریبی اسپتال کی طرف چلو۔“ نو جوان
 نے تکلیف دہ آواز میں مارکس سے کہا۔

مارکس کی مدد پا کر نو جوان کو حوصلہ ہوا تھا۔ مارکس
 نے وہی رفتار سے کار آگے بڑھا دی۔ مارکس کی نظر میں
 نو جوان کو بالکل قریب سے دیکھ رہی تھیں نو جوان کو گولی لگی
 تھی۔ مارکس دیکھ کر یہاں کے راستوں سے ناواقف تھا
 لیکن نو جوان کی ہدایت پر چل کر تے ہوئے جلد ہی وہ ایک
 ڈاکٹر کے سامنے موجود تھے اور نو جوان ٹریینٹ سے فارغ
 ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس تمام عمل میں کافی وقت لگ گیا تھا لیکن
 مارکس تمام وقت آپریشن میجر کے باہر ہی ٹھہرتا رہا
 تھا۔ ٹریینٹ کرا کے وہ باہر نکلے تو نو جوان ابھی محسوس کر رہا
 تھا ڈاکٹروں نے گولی اس کے جسم سے نکال دی تھی۔

”تھینک یو سو مچ۔“ واپسی پر نو جوان نے ہی ٹھہرنا
 آنا ز مارکس کا شکریہ ادا کرنے سے کیا۔ ”آج اگر تم نہ آتے
 تو شاید میں زندہ نہیں بچ پاتا۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“ مارکس نے مسکرا کر
 کہا۔ ”ابھی زندہ رہنا آپ کے نصیب میں تھا۔“ مارکس کی
 بات سن کر نو جوان مسکرا دیا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم اس بزنس میں کوئل کر دو گے؟“
مارکس نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔ ”لیکن کیا یہ اچھی بات ہوگی؟.....؟“

”تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں ان کے ہاتھوں خود کو قتل کرواؤں؟“ مسٹر میجک نے کچھ حلقی سے کہا۔ ”تم بتاؤ، تم اگر میری جگہ ہوتے تو تم کیا کرتے؟“

مارکس لا جواب ہو گیا حالانکہ اس کے اور مسٹر میجک کے معاملات میں قدرے فرق تھا۔ روٹا لڈ نے مارکس اور اس کے والدین کے ساتھ قلم کیا تھا۔ وہ اور اس کے والدین۔۔۔

بے قصور تھے جبکہ میجک ایک بلیک میلر تھا بلاشبہ وہ ہر طرح سے اپنی طرز کا ایک انوکھا کریمشل تھا اور بھرموں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جن کے نزدیک جرم کرنا کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ جرم کر کے پکڑے جانا انتہائی نا اہلی اور بری بات سمجھی جاتی ہے لیکن میجک نے یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ وہ کسی کو خود بھی قتل نہیں کرتا۔ اس باقی بزنس میں کے قتل کا کیا منصوبہ میجک کے پاس تھا؟ اس نے مارکس سے شیئر نہیں کیا تھا۔ لیکن ایک دن اس کو معلوم ہوا کہ میجک نے اپنے منصوبے پر عمل کر لیا تھا۔ یہ اطلاع بھی مارکس کے علم میں نیلی ویزن کی خبروں کے ذریعے آئی تھی کہ شہر کا ایک معروف بزنس میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مگر قتل کون تھے؟ کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس واقعے کے بعد میجک مارکس کو ساتھ لے کر ہالی وڈ آ گیا تھا۔ مارکس آسان الفاظ میں میجک کو یوں سمجھ پایا تھا کہ میجک بھی مستقبل کے اشرافیہ میں شمار ہونے والا تھا۔ اس سے مل کر مارکس کو محسوس ہوا تھا کہ شاید

کسی بھی نیکی چاہتی ہے کہ وہ روٹا لڈ سے بھرپور انتقام لے۔ قسمت کی مہربانی سے میجک کی بدولت مارکس کے پاس ایک ملاقات بھی تھی۔ اپنی تعلیم بھی وہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ رہائش کے لیے میجک کے فلیٹ کی صورت میں ایک ٹھکانا بھی موجود تھا لیکن اس سب کے ساتھ ساتھ ایک کتبہ بھی دل میں موجود تھی۔ وہ روٹا لڈ کو کسی بھی صورت میں نہیں بھولا تھا اور نہ ہی بھولنا چاہتا تھا جو وہ روٹا لڈ سے اپنا انتقام لینے کے لیے تیاری کر رہا تھا اور میجک نے اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ

روٹا لڈ اب وہاں نہیں تھا جہاں مارکس اسے چھوڑ گیا تھا۔ میجک نے روٹا لڈ کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہیں روٹا لڈ نے مارکس کا گھر، کمپنی سب فروخت کر دیا تھا اور اب خود غائب تھا۔ میجک اور مارکس سے درکنار قسمت کے اپنے فیصلے الگ ہی ہوتے اور مارکس کے ساتھ بھی یہی

ہوا۔ میجک سے زیادہ بد قسمتی نے مارکس کا ایسا ساتھ نبھایا کہ اچانک ہی مارکس کی زندگی میں بیجان بچا ہو گیا۔ غم و اندوہ سے لبریز ایک شب اس کی خنجر بھی جب اس نے اپنے فلیٹ میں قدم رکھا تو میجک اس کے سامنے زخمی حالت میں پڑا ترپ رہا تھا۔ انجانے دشمنوں کا داؤ چل گیا تھا۔ میجک پر بھرپور حملہ کیا گیا تھا۔ مارکس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میجک کو کسی طرح زندہ بچالے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ مرتے ہوئے میجک نے اسے کچھ خاص راز کی باتیں بتائیں اور آخری نصیحت بس یہی تھی کہ مارکس کو اب اس فلیٹ میں نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے بعد میجک اس دنیا کا باقی نہیں رہا تھا۔

مارکس کی نظروں کے سامنے اس کے مہربان دوست، استاد اور ایک محسن کی لاش پڑی تھی۔ گناہ قاتل اپنا کام کر کے چاہتے تھے۔ مارکس نے اس قتل کو چھپانے کی بہت کوشش کی تھی مگر میجک ایک نامور میڈیا پرسن ثابت ہوا تھا۔ ہر طرف اس کے قتل کے چرچے ہو گئے تھے پولیس نے تفتیش شروع کی تو مارکس کو میجک کی بہت ساری اشیاء پوش کرنی پڑی تھیں۔ اگر میجک کی بھرمانہ کارروائیاں پولیس کی نظروں میں آ جاتیں تو مارکس کی پولیس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا تھا۔

پولیس بھرپور طریقے سے حرکت میں آ گئی تھی اور یہ سب مارکس کے لیے بہت پریشان کن تھا لیکن مجبوراً اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس صورتحال میں نہ ہی وہ اپنا فلیٹ تبدیل کر رہا تھا اور نہ ہی اپنا کام کر سکتا تھا۔ اس دوران مارکس بھی مفصل پولیس کی نظروں میں محسوس رہا لیکن مارکس کو اندازہ تھا کہ ایک دن یہ جوش و خروش مٹا

دیا جائے گا۔ اور پولیس اپنی معمول کی کارروائیوں تک محدود ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا ایک دن شاید پولیس آفسر کو مارکس کے بے قصور ہونے کا احساس ہو گیا تھا لیکن وہ بہت ہوشیار تھا۔ اب اس کی پولیس کی نظروں میں محسوس ہونے سے محتاط رہنا چاہتا تھا۔ اس نے موقع خیمت جان کر پولیس کو اطلاع دیتے ہوئے اپنی اہمیت میں ہی میجک کی وصیت کے مطابق فلیٹ تبدیل کر لیا تھا۔ ایک بار یہاں سے نکلنے کے بعد اس کے پاس بہت سارے راستے کھلے تھے۔ اس نے دوسرا اقدام اٹھاتے ہوئے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ میڈیا کی یہ ملازمت اس کے لیے شہرت کا باعث بن سکتی تھی اور شہرت اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ شہرت کے نقصانات کا اندازہ وہ میجک کا حال دیکھ کے کر ہی چکا تھا۔ میجک کی زندگی کے تجربات اور اس کی اپنی ذہانت اس کے لیے..... مشکل راہ تھے۔ اس نے چند

فیصلہ

ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں چند لوگوں کو بحث کرتے ہوئے پایا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ جو شخص برائی نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص برائی کرے پھر سچے دل سے توبہ کرے وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے۔ جب ان لوگوں نے اس بزرگ سے اسی بحث کا فیصلہ کرنے کو کہا تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ میں کوئی عالم تو نہیں ہوں لیکن میں کپڑا بننے کا کام کرتا ہوں۔ دھماکے لیے ہوتے ہیں پھر ان میں سے جو دھماکا ٹوٹ جائے تو میں اس کو گرہ لگا دیتا ہوں پھر اس گرہ والے دھماکے پر خاص نظر رکھتا ہوں۔ کہیں دوبارہ نہ ٹوٹ جائے۔ لیکن ہے جس کی تار گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ٹوٹ جائے پھر وہ اللہ پاک سے بھی توبہ نہ کرے گی کہ لگا تا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں بر خاص رحمت والی نظر رکھتا ہے تاکہ پھر گناہوں کی کثرت کی وجہ سے تار نہ ٹوٹ جائے۔

مرسلہ۔ نعیم احمد۔ سکھر

دن کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ اب وہ کچھ دن سستا چاہتا تھا۔ لیکن نقد پر کا پیسہ اس پر رضامند نہیں تھا کہ اسے ٹھمننا چاہیے۔ بیک کی لائبریری کا وہ سامان جسے اس نے پولیس سے پوشیدہ کیا تھا، ایک دن اسی سامان میں اسے ایک نئی ویڈیو ڈی ڈی ملی گئی۔ بیک کی موت سے صرف ایک دن قبل کی تاریخ سی ڈی پر نمایاں نظر آرہی تھی۔ مارکس نے سی ڈی پلیئر میں سی ڈی ڈال کر اسے آن کر دیا۔ غالباً کسی ہونٹ کے کمرے کا منظر تھا جو نئی ویڈیو اسکرین پر نمایاں ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی مارکس کی نظروں کے سامنے تھے۔ مارکس نے اپنی پوری توجہ اس سی ڈی کو دیکھنے کی طرف مائل کر دی۔

”آخر ہم کب تک اس طرح جگہ جگہ چھپتے پھر میں گمے درجہ ۲ منظر کے ساتھ ہی ابھرنے والی نسوانی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

مارکس کے لیے یہ پہلا جملہ ہی نہایت تعجب خیز تھا۔ آخر یہ دونوں کس سے چھپتے پھر رہے تھے۔

”یہ سوال تم اپنے دل سے کرو، جینی۔“ درجہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تاسف اور اداسی کے ملے جلے احساسات نمایاں تھے۔ ”اور میں تو کہتا ہوں کہ تم واپس اپنے باپ کے پاس چلی جاؤ۔“

اوہ! تو یہ وجہ ہے، مارکس چونکا۔ اس کی آنکھ میں کچھ یہ وجہ آئی تھی کہ دونوں اپنے اپنے گھر سے فرار ہوئے تھے لیکن کیوں؟ یہ بات مارکس پر عیاں نہیں ہوئی تھی ایک ایسے علاقے میں جہاں نوجوان لڑکے لڑکیوں کا سر عام ملاقاتیں کرنا، رشتی، محبت کرنا اور اپنی مرضی سے شادی کرنا کوئی معمولی بات نہ ہو، وہاں آخر ایسی کیا بات تھی کہ یہ دونوں اس طرح چھپنے پر مجبور تھے بہر حال بیک دنیا سے جاتے جاتے تھے، اس کے لیے ایک کیس چھوڑ گیا تھا۔ بیک کا خیال آتے ہی مارکس کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا تھا۔ یہ کیس بیک کے دل سے صرف ایک دن پہلے کا ہی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ بیک کے قتل سے ان دونوں کا بھی کوئی تعلق ہو، یہ خیال مارکس کو بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اب اس کے سر پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی، وہ جلد از جلد ان دونوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور ان دونوں تک پہنچنا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، لہذا وہ ان دونوں تک پہنچ گیا لیکن اس کی سوچ کے اختتام پر جرم اور قانون سے لبریز ایک ابھی ہوئی نئی لو اسٹوری اس کی منتظر تھی۔ نئے انکشاف نے مارکس کو لرزادیا تھا، اس کیس کی

مختصر کہانی یہ سچائی تھی کہ درجہ جینسن اور جینی کو مارکس ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے لیکن دونوں کی مجبوریوں کی وجہ سے وہ ایک بھڑکے ہوئے ایک مجبور ہونے کی وجہ سے دنیا کی نظروں سے چھپنا پڑتا تھا جبکہ جینی ایک مجرم سے محبت کرنے کی پاداش میں زمانے کی نظروں سے چھپنے پر مجبور تھی جینی کے باپ کا لٹن کا کردار اس کہانی میں سب سے اہم تھا، وہ پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر تھا اور درجہ کا شدت سے متعلق جملہ جینی کے لیے اذیت کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ درجہ کو اور درجہ سے زیادہ اپنے باپ سے محبت کرتی تھی دونوں میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ درجہ کا کہنا تھا کہ وہ جرائم کی ایسی دلدل میں پھنسا ہوا ہے جہاں سے نکلنا اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوگا۔ درجہ کے کردار کے بارے میں جان کر مارکس یہ سوچنے پر حق بجانب تھا کہ درجہ بھی بیک کا قاتل ہو سکتا ہے لیکن بعد میں اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ بیک کے قتل سے ان دونوں کا کوئی تعلق سامنے نہیں آیا

سرکاری و غیر سرکاری اعلیٰ عہدیدار اور ملازمین، بزنس میں سیاستدان حتیٰ کہ مجرم تک بھی اس کا شکار بن چکے تھے۔ مارکس کی زندگی کے دن یونہی تنہائیوں کے ساتھ گزر رہے تھے۔ بھجک کی جدائی اسے بہت گراں گزر رہی تھی۔ اس اداسی سے نجات کے لیے اس نے ہوٹل موریل کا رخ کر لیا تھا جہاں بکی راتیں اپنی رنگینیوں کی وجہ سے مشہور تھیں، وہاں آکر مٹکین سے مٹکین دل بیل جایا کرتے تھے بالآخر ایک دن مارکس کو بھی وہاں دل بہلانے کا سامان میسر آ گیا۔ ایک رات جب وہ ایک ڈنکر کرنے کے بعد اداس بیٹھا وہاں کے ایک جام میں غرق تھا۔ ایک نسوانی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”ہیلو.....“ امرنم نسوانی آواز سن کر مارکس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، ایک لڑکی اجازت لیے بغیر ہی اس کے سامنے بڑھ کر اسے بوسہ دے رہی تھی۔

”اوہ آپ.....“ مارکس حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لڑکی اس طرح ایک روز اس کے سامنے اچانک ہی آئے گی۔

”کیوں؟ کیا میں بوسہ دیتی ہوں؟“ لڑکی اب کٹھن ہوئی۔ ”ہوسکتی ہیں“ مارکس نے بلا تامل مگر کچھ گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”ہو کیوں نہیں سکتیں۔“

”تو پھر آپ مجھے یہاں لے کر کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ لڑکی نے چہرے پر خوف کیوں ابھرایا۔ ”خوف نہیں حیرت۔“ مارکس نے وضاحت میں کہا۔ ”دراصل میں بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم دونوں اس طرح یہاں ملیں گے۔“

”خواب میں لڑکی مسکرا دی، مارکس کی حیرت کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑکی کچھ کامیابی ہوئی تھی، جس کا باپ کالٹن ایک پولیس افسر اور بوائے لے پزور تھا۔ جیکسن ایک مجرم تھا۔ مارکس جینی اور درجہ کو بلیک میں لے چکا تھا، بعد میں مارکس کو معطوم ہوا تھا کہ درجہ کو انتہائی وحشیانہ انداز کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا اور کالٹن پر اسرار طور پر فوت ہو گیا تھا۔ آج وہی جینی مارکس کے سامنے کھڑی تھی۔

”لیکن آپ یہاں کیسے.....؟“ مارکس نے سوال کیا۔ ”جس طرح آپ یہاں ہیں اسی طرح میں بھی یہاں ہوں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ جینی نے مارکس کا سوال جواب کی صورت میں واپس کر دیا۔ ”ویسے مجھے لگتا ہے کہ آپ کی کشش مجھے یہاں منجھ لاتی ہے۔“

تھا۔ ان دونوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بھجک نامی ایک کیسرا مین... ان کی انکی سووی بنا چکا ہے اور اب وہ کسی بھی وقت بلیک میل ہونے جا رہے ہیں شاید اگر ایسا ہو جاتا تو درجہ واقعی اپنے دشمن بھجک کو راستے سے ہٹا دیتا۔ اس کیس میں مارکس کو ایک پولیس والے کا روپ دھارنا پڑا تھا، یہ سب تربیت بھجک کی ہی دی ہوئی تھی کہ کب کہاں کس طرح کس کیس میں اپنے آپ کو کیا ظاہر کرنا چاہیے اور اپنے شکار سے کس روپ میں ملاقات کرنی چاہیے اور اس پر مارکس مل بھاہو کر کامیابیوں کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس بار بھی خوب لمبی رقم مارکس کے ہاتھ آئی تھی جو اس نے بطور پولیس آفیسر درجہ سے حاصل کی تھی۔ جینی اس تمام وقت میں مارکس کو اپنے باپ کا جاسوس ہی سمجھتی رہی تھی، گویا مارکس نے جینی کا میانی سے یہ سہم کھلیا تھا۔ درجہ کے جرائم اور جینی اور درجہ کے تمام تعلقات اس رشوت کی رقم کے ذخیرے دھبے دھبے تھے جو اپنے تئیں انہوں نے مارکس کے بینک اکاؤنٹ میں اضافے کے لیے مارکس کو دی تھی۔ کسی کو بلیک میل کرنا، کوئی جرم کرنا یا کسی کو انصاف دینا، اگرچہ مارکس کے خون میں شامل نہیں تھا لیکن وقت اور حالات انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ رونالڈ ہے انتقام لینے کی خاطر مارکس کو بہت ساری دولت کی ضرورت تھی۔ اس دنیا کا حقیقی دستور ہے کہ ظالم سے انتقام لینے کے لیے اس کے ہم پلہ بننا پڑتا ہے اور ظالم کوئی بھی ہو بھی غریب نہیں ہو گا۔ اس دولت کی ہوں انسان کو ظالم بننے پر مجبور کرتی ہے اور ظالم سے اپنا انتقام لینے والا اگر غریب ہو تو مستحق کا انتقام خود کسی کے مشروحوں سے ہو جاتا ہے۔ مارکس اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ کسی سے انتقام لینا ہو تو بغیر دولت کے ایسا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر تھی دولت جائز ذرائع سے حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے، لہذا مارکس ناجائز ذرائع سے بہت تیز رفتاری کے ساتھ دولت جمع کر رہا تھا۔ بہت جلد وہ اپنی ایک بڑی اور خوبصورت ذاتی کوئی کا مالک بن گیا تھا۔ یہ اس کا مستقل ٹھکانا تھا، ورنہ قلیت تو وہ لباس کی طرح تبدیل کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ مسافرتیں طے کرنے کے لیے اس کے پاس ایک خوبصورت، قیمتی اور تیز رفتار ہیوی بائیک بھی تھی۔ اپنی ذاتی کوئی میں اس نے اپنے استعمال کے لیے ایک مشین و زیپائنش کا پرنٹیشن فرنیچر اور دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ ظالم اس نے اپنے ڈینک کی طرز پر گاڑیوں کے اسمیر پارکس کا ایک چھوٹا سا بزنس بھی اسٹارٹ کر لیا تھا مگر اس کے برعکس سچائی یہ بھی کہ کتنے ہی نوجوان لڑکے لڑکیاں، عمر سیدہ و افراد



استعمال میں سہولت بھی۔۔۔
صحت کے ساتھ بچت بھی

روزانہ صرف ایک
ہاشمی اسپاگھول
Once a Day Pack
استعمال کیجئے

اورفٹ نہیں۔۔۔ پرفٹ رہیے

ڈیلی لو  فنٹ ریبو

”میری کشش، آپ نے خوب کبھی مس جینی۔“ مارکس نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔ ”اور مجھ سے پوچھیں تو میری تنہائی مجھے یہاں سمجھ لائی ہے، کسی تنہا انسان کے لیے اس سے بہتر سماجی اور اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے۔“ مارکس نے سامنے رکھے واٹن کے گلاس کی طرف اشارہ کر دیا۔

”کمال ہے۔“ جینی نے ایک طویل سانس کھینچ کر چند لمبے آنکھیں بند کر لیں پھر دوبارہ آنکھیں کھول کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”ویسے کسی تنہا انسان کے لیے میرا کلب بھی بہت بہتر جگہ ہے۔“

”آپ کا کلب؟“ مارکس نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

”ہاں، مڈ ٹاؤن کلب۔“ جینی نے کلب کا نام بتایا۔

”جہاں میں ڈانس کرتی ہوں۔“

”کیا آپ ایک کلب ڈانسر ہیں؟“ مارکس نے وضاحت طلب کی۔

”نہیں۔“ جینی نے نفی میں سر ہلایا تو اس کی گردن پر بکھرے ہوئے سنہری مٹیاں چلنے لگیں۔ مارکس کے دل کی دھڑکنیں تڑپ اٹھیں۔ ”کسی کی تلاش مجھے ایسے ہی وہاں لے گئی تھی جیسے آج یہاں قسمت مجھے اپنی منزل پر لے آئی ہے، پاپا اور ورگھ کے بعد میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہو گئی تھی، نہ کوئی عزیز ہشتے دار، کوئی دوست، تلاش محبت کے مجھے تباہ کیا ہے، اس بات کا اندازہ آپ خود بھی کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ بھی تو میری طرح اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ مارکس نے اس کی تائید کی۔ ”میں آپ کا کلب، وہاں بھی تو آپ کے بہت سارے فریڈنڈ ہوں گے، لوگ مرتے ہوں گے آپ پر؟“

یہ مارکس کا ایک سماجیہ تھاجو اس نے جینی کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس بات سے غافل نہیں ہونا چاہتا تھا کہ شکاری کبھی بھی خود بھی شکار ہو جاتا ہے۔

”ہاں۔“ جینی اداس لہجے میں اس کے ساتھ بولی۔ ”بہت سارے لوگ مرتے ہیں لیکن مجھ پر نہیں، میری اداؤں پر، میرا کلب صرف دل بہلانے کے لیے اچھی جگہ ہے، دل لگانے کے لیے نہیں، وہاں میرے پرچار و چار ہیں مگر کوئی بھی میرا سچا دوست نہیں، کوئی آپ جیسا آشنا نہیں ہے۔ بے شک آپ بھی میرے بدترین دشمن رہے ہیں لیکن آج یہاں آپ سے مل کر احساس ہو رہا ہے کہ دشمن ہی سہی آپ میرے پرانے آشنا بھی تو ہیں۔“

”دشمن نہیں کہو، مجبور کہو۔“ مارکس نے اس کی بات

کاٹ دی۔ ”جو کچھ ہوا جو کچھ میں نے کیا اور آج تک کر رہا ہوں یہ سب میری مجبوری ہے۔“ مارکس نے اپنی تمام آپ جینی اس کے گوش گزار کر دی۔

”چلو مجبوری سہی۔“ جینی نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ ”جو ہوا سو ہوا، ہم سب کچھ بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں دوستوں کی طرح، آج سے نہ آپ اکیلے نہ میں اکیلی۔“

مارکس ششدر رہ گیا۔ اصولاً تو جینی کو چاہیے تھا کہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی کرتی لیکن وہ تو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی تھی، اس سے محبت کی متقاضی تھی۔ وہ چند لمبے جینی کو ٹھٹھکی باندھے دیکھتا رہا اور اس کے متعلق کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے اپنا نشتہ میں بھولنا ہوا دوستی کا ہاتھ جینی کی طرف بڑھا دیا اور دونوں میں سبکی سے دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

”مارکس بہنری۔“ مارکس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا تھا۔

”جینی لوٹیں۔“ جینی نے جواباً تعارف میں اپنا نام بتایا۔

”میں اس نام سے واقف ہوں کس جینی۔“

مارکس نے آگاہی دی۔

اس تعارف کے ساتھ ہی جینی کے ہونٹوں پر ایک معنی فیز تبسم کی لکیر نمایاں ہو گئی تھی جس کے سبب اس نے اسے بھی واٹن کا ایک گلاس پیش کر دیا۔

”ناؤ وی آر فرینڈز۔“ جینی نے دلربائی سے کہا تھا۔

”آپ مسکراتی ہوئی بہت خوبصورت لگتی ہیں۔“ مارکس نے توصیفانہ لہجے میں کہا۔

”شک یو۔“ جینی نے مختصر سا جواب دیا۔ ”اکثر لوگوں کی میرے بارے میں یہی رائے ہے۔“

دونوں کچھ دیر بیٹھے اپنے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے رہے پھر اداویہ وادویہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

”تم نے یہ نہیں بتایا کہ میں کس کی تلاش اس کلب میں سمجھنے لے گئی تھی؟“ مارکس کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

”کیا بتاؤں!“ جینی کے انداز میں ایک مرتبہ پھر اداویہ وادویہ باتوں کی ایک ڈانسر ”میری“ کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہی میری ویپرین جس کی وجہ سے درجہ جیکسن مجھ سے مل گیا۔ اسی میری نے ورگھ کے پاس کو یہ اطلاع دی تھی کہ درجہ جیکسن ایک پولیس آفیسر کی بیٹی کی زلفوں کا اسیر ہو چکا ہے اور کسی بھی وقت اپنے پاس اور دیگر ساتھیوں

ماں تو عظیم ہے

ابا جی مجھے مارتے تو امی بچا لیتی تھیں، ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں گی تو ابا جی کیا کریں گے؟ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے میں نے امی کا کہنا مانا۔

انہوں نے بازار سے وہی لانے کا کہا میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے سائلن کم دیا میں نے زیادہ پر اصرار کیا، انہوں نے کہنے پر صبر نہ کیا، پیٹھ کے روٹی کھاؤ میں نے زمین پر بیٹھ کر روٹی کھائی اور اس پر بیٹھ گیا، کپڑے بدل کر بیٹھے، میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا، مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر انہوں نے یہ کیا کیا مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ ”کیوں دلاور پھر میں صدمہ دے بنا دو نہیں ہے تو؟“

اس وقت میرے آنسو تھے کہ نہ کتے ہی نہیں تھے

مرزا ادیب کی کتاب ”مٹی کا دیا“ سے اقتباس

میں نے کچھ تعلقات چھینک کی طرح ہوتے ہیں ختم ہوتے ہی شکر الحمد للہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔

میں زندگی میں اپنا جی تو ہر کوئی دکھاتا ہے، اپنا ہے کون؟ یہ وقت بتاتا ہے۔

میں شیخ سعدی نے ایک دفعہ فرمایا۔

میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور میرے برے وقت نے مجھے بتایا

کہ دنیا کیسی ہے؟“

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڈٹ وی

اور جی ٹاؤن کراچی

کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے، درتھ جیکسن اپنے باس کا خاص بندہ تھا اور درتھ کا باس میری کا دیوانہ تھا۔ اس نے میری کے کہنے میں آکر درتھ کو کل کروا دیا۔ تمہیں معلوم ہے مارکس میری نے ایسا کیوں کیا تھا، اس لیے کہ وہ درتھ کو باکل پٹن کی حد تک پیار کرتی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ درتھ کسی اور لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے لیکن درتھ کی غلطی یہ تھی کہ وہ پولیس آفیسر کالٹن کی بیٹی جینی لٹون سے محبت کرنے لگا تھا۔ میری نے درتھ کو کئی مرتبہ یہ باور کرایا تھا کہ اگر وہ اس کا نہیں ہوا تو بھی کسی کا نہیں ہوگا اور درتھ کی دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے مجھ سے محبت کی خاطر جرائم پیشہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور یہی بات اس کے باس اور ساتھیوں کے لیے اذیت، نفرت اور خوف کا سبب بنی تھی۔“ جینی نے تفصیل سے اپنے دل کی بات مارکس کے روبرو بیان کر دی۔

جینی سانس لینے کے لیے دیکھتی تو مارکس نے غور کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھلا رہے تھے۔ یعنی درتھ اس کے دل میں اب تک آباد تھا۔

”اچھا! تو یہی وہ میری ہے جو کلب میں تمہاری دشمن ہے؟“ مارکس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”اوہ! اس کی تلاش نے تمہیں ٹھنڈا نٹ کلب میں اسیر کر دیا ہے۔“

”ہاں! اب وہ میرے ساتھ ہی کلب میں ہوتی ہے۔“ جینی نے انکشاف کیا۔ ”مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اب میری دشمن نہیں رہی لیکن میں اب بھی اس کی دشمن ہوں اور میں اس سے انتقام لینے کے لیے ہی اس کلب میں آئی ہوں۔“

”تو پھر تم نے اس سے ابھی تک اپنا انتقام کیوں نہیں لیا؟“ مارکس نے تعجب سے سوال کیا۔ ”تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو، کیا تم اسے جیل کا ارادہ رکھتی ہو؟“

”میں ایک پولیس آفیسر کی بیٹی ہوں مارکس، کوئی راستہ چلتی عام سی مجرم نہیں ہوں۔“ جینی نے براہ اعتماد انداز میں اپنے پاپا کے حوالے سے اپنا تعارف دے دیا۔ ”مجھے اچھی طرح معلوم ہے کس سے کس طرح انتقام لینا چاہیے، مارکس! میں نے صرف درتھ کی جدائی ہی برداشت نہیں کی بلکہ درتھ کے بعد اپنے قادر کی جدائی کا زخم بھی سہا ہے، میرے قادر پر ان کے چمکے کی جانب سے الزام لگایا گیا تھا کہ ان کی بیٹی ایک مجرم کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اپنی بیٹی کی وجہ سے وہ بھی اس مجرم کے لیے دل میں ہمدردی رکھتے ہیں اور درتھ کے قتل کے بعد میرے والد پر یہ الزام لگا تھا کہ پولیس آفیسر کالٹن نے مجھے میں اپنی نیک نامی کو قائم

تمہاری مدد کروں۔“

مارکس نے راز جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر جینی میری سے کس قسم کا انتقام لینے کی پلاننگ کیے ہوئے تھی۔
”نہیں مارکس، میرا اصل بارگٹ میری نہیں بلکہ اس کا پاس ہے۔“ جینی نے وضاحت کی۔ ”میرے پاس میری اس تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔ اسی لیے تو میں اس کے دل میں اس حد تک اترنا چاہتی ہوں کہ اسے میرے علاوہ اپنا کوئی دوست نظر ہی نہ آئے۔“

”تو کیا وہ تمہارے کلب میں میری سے ملنے نہیں آتا؟“ مارکس نے استفسار کیا۔ ”آخر وہ ابھی تک تمہاری پہنچ سے دور کیوں ہے؟“

”نہیں، وہ میری سے ملنے کلب نہیں آتا ہے۔“ جینی نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن وہ میری پہنچ سے دور بھی نہیں ہے مارکس۔ میرا پھندا ان کے گلے میں ہے بس اس کو گلے کے لیے دو مضبوط ہاتھوں کی تلاش ہے، بہت جلد تم دیکھ لو گے کہ میں اپنے دشمنوں سے کیسا انتقام لیتی ہوں۔“

مارکس اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ اس کی باتوں میں واقعی بہت کچھ لپٹی اور اعتماد تھا۔ وہ ایک بہترین منصوبہ ساز دماغ کی مالک معلوم ہو رہی تھی۔ اس سے آگے اس کے دماغ میں کیا پلاننگ کی مارکس اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا پایا تھا۔ اس کے بعد مارکس نے اس سے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں کی تھی وہ سمجھ چکا تھا کہ جینی اس کی سوچ سے بھی زیادہ گہری تھی اور پہلی ملاقات میں وہ اتنی آسانی سے کھل کر سامنے نہیں آنے والی ہے۔

وہ اس کی باتیں کرنے کے بعد ایک ساتھ ہی ریٹورن کرنے سے باز ہو گئے۔ مارکس اپنی بائیک پر سوار ہوا تو جینی سینڈل بجاتی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ مارکس اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ کتنی حسین تھی، وہ رات مارکس کے لیے بہت بڑی اور مسرت کی رات تھی، اس کی زندگی کی تنہائی میں کوئی جگہ کوئی ہمسفر مل گیا تھا۔ دونوں کے درمیان بہت جلد محبت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا اور یہی وہ جینی تھی جو اس بھری دنیا میں مارکس کی واحد سہارا اور راز دار تھی۔ مارکس نے جینی کے ساتھ مل کر مستقبل کے منصوبے بھی بنا لیے تھے۔ دونوں کو ہی رہائش کے لیے نیو یارک سٹی بہت پسند تھا اور جس ہوشیاری، ذہانت اور مکاری سے مارکس دولت کما رہا تھا، دونوں کو یقین تھا کہ مارکس کا شمار جلد از جلد شہر کے امیر ترین افراد میں ہونے والا ہے۔ بڑے بڑے لوگ جو اس کے دشمن تھے اس کے خلاف کئی حربے آزما

رکھنے کے لیے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ورگھ جیسے قاتل کیا ہے۔ یہ وہ باتیں تھیں جو ایک فرض شناس پولیس آفیسر کے لیے صدمے کا باعث بنیں، پھر ایک شب وہ اپنے بیڈروم میں مردہ پائے گئے تھے۔ ان کی پر اسرار موت کا سراغ آج تک نہیں لگ سکا مگر مجھے پورا یقین ہے کہ میرے قادر کے قاتل میری اور اس کا پاس ہیں۔“

”میری اور اس کا پاس.....“ مارکس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، وہ میری کے پاس کے بارے میں وضاحت کا طلب گار تھا۔

”ہاں، میری اب ورگھ کے پاس کے لیے کام کرتی ہے۔“ جینی نے وضاحت کر دی۔ ”وہ اب میری کا پاس ہے۔“

”مجھے افسوس ہے جینی۔“ مارکس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔“

”ہاں مسٹر مارکس۔“ جینی حسرت زدہ انداز میں گویا ہوئی۔ ”کاش تم میری اور ورگھ کی وہ مودی نہ بناتے، نہ وہ مودی ورگھ کے پاس تک پہنچتی اور نہ یہ بات لیک آؤٹ ہوتی کہ ایک مجرم اور ایک پولیس آفیسر کی بیٹی آپس میں اتنا پیار کرتے ہیں۔ نہ ورگھ ملا جلا نہ ہی میرے باپ۔“

”پلیز مجھے معاف کر دو جینی۔“ مارکس کو حقیقتاً بہت صدمہ ہوا تھا۔ ”لیکن تم یقین کر دو کہ تو کسی شخص نے ورگھ کے حوالے کر دی تھی اور اس کے بعد میں نے اس کی ورگھ سے رابطہ نہیں کیا، میرے بزنس کا اصول ہے اور میں اس کا پابند ہوں پھر جانے کیسے یہ راز فاش ہوا۔“

”جیسے بھی ہوا۔“ جینی اداسی سے بولی۔ ”راز تو فاش ہو چکا ہے اور پاپا تو مجھ سے چھن ہی گئے۔“

”لیکن ایک شاہد ایک دن تو یہ راز فاش ہونا ہی تھا جینی۔“ مارکس نے اپنے منہ پر ریزہ ڈالنے کی کوشش کی۔ ”ہاں میں مانتا ہوں کہ اس طرح یہ دلائل کھانا نہیں چاہیے تھا۔“

مارکس کا دل چاہتا تھا کہ اسے یہ سچ بتا دے کہ اس کی اور ورگھ کی مودی اس نے نہیں بنائی تھی بلکہ یہ اس کے استاد میچک ڈان کی کارستانی تھی مگر یہ سچ یہ تھی کہ میچک کے قتل کا کیس ویسے ہی بہت مشکل سے قانون میں کم ہوا تھا اور اس کا ذکر ایک پولیس آفیسر کی بیٹی کے ساتھ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔

”کیا تم میری اس ایمانداری کی تعریف نہیں کر سکتی؟“ کہ ایک مجرم ہونے کے باوجود میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔“ مارکس نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کہو تو میں اس میری سے..... انتقام لینے میں

سے مایوس ہوتا تو جینی کا تصور اسے حوصلہ دیتا تھا کہ جینی کس قدر ہوشیاری، لگن اور تنگ دود سے اپنے دشمن کو ڈھونڈ رہی ہے تو پھر مارکس ایسا کیوں نہیں کر سکتا یہی باتیں سوچ کر اس کی ہمت دوبارہ جوان ہو جاتی تھی انہی سوچوں میں وہ غرق تھا کہ اس کا دھیان جینی کی طرف چلا گیا۔ دو دن ہو گئے تھے جینی سے اس کا رابطہ نہیں ہوا تھا جبکہ جینی کے بغیر تو اس پر دو ہل گزرا تاگر اس ہوتا تھا۔ وہم اس کے ذہن میں ریٹک رہے تھے۔ اسی شمس کے عالم میں سل فون کی بھینٹا ہٹ نے اسے بھنجوڑ دیا۔

”ہیلو.....“ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو مارکس، کیسے ہو؟“ دوسری طرف سے جینی کی ٹکٹاتی ہوئی آواز سن کر وہ خوشی سے جموم اٹھا۔

”اوہ جینی کہاں ہو تم؟“ اس نے بے تابانہ استفسار کیا۔

”جینی ملتی ہو، فون ریسیو کرتی ہو، یہ سب کیا ہے؟“

”اوہ مارکس۔“ جینی کی آواز سل فون کے ایئر میں ابھر رہی تھی، وہ مائل میں نے گھر شفٹ کر لیا ہے۔“

”کہاں؟“ مارکس نے پوچھا۔

”یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔“ جینی نے اس کے تجسس میں مزید اضافہ کیا۔ ”پہلا تم سے بتاؤ کہ اگر میں تمہیں روٹا لڈ کا پتا بتا دوں تو.....؟“

”تو تو میں اس ضیٹ کو اسی وقت کوئی مار دوں گا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔“ مارکس کے دل میں موجود نفرتوں کے سمندر اس کے لب و لہجہ میں موجزن ہو گئے تھے۔ ”جلدی بتاؤ کیا تم بیچ کبہ رہی ہو؟“

”تو تو پھر میری بات غور سے سنو۔“ جینی کو کیا ہوئی۔

”جینی پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کب اور کہاں مل رہی ہو؟“ مارکس کی بے تابی دیدنی تھی۔

”میں ابھی نہیں مل سکتی۔“ جینی نے واضح الفاظ میں انکار کے بعد رے کے بغیر اس کا نام آگے بڑھایا۔ ”میں بہت مصروف ہوں مجھ سے ملنے کے لیے میں تم روٹا لڈ کو کھودو گے۔“

”خفیک ہے۔“ مارکس نے ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر بتاؤ وہ مجھے کہاں ملے گا؟“

”آج وہ اپنے ایک پرائیویٹ ٹیکھے میں ایک لڑکی سے ملاقات کرے گا۔“ جینی نے تفصیلاً ساری بات بتانا شروع کر دی۔ ”یہ کوئی اعلیٰ برانڈ کی سار کی اسگٹنگ کا معاملہ ہے۔ یہ بات میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم اچھی طرح سمجھ لو، روٹا لڈ اب وہ چھوٹا سونا آدی نہیں رہا ہے جسے تمہارے ڈیڈ نے سہارا دیا تھا۔ تمہیں جو کچھ کرتا ہے بہت

کرنا کام ہو چکے تھے۔ مارکس تنہا تھا مگر اس کا طریقہ واردات کچھ اس طرح تھا کہ بلیک سیل ہونے والے شکار کو یہ خوف ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے بلیک سیلرز کی ایک بڑی ٹیم لگ چکی ہے جس سے جان چھڑانا شاید ناممکن ہے۔ لہذا وہ مارکس کے مطالبے کے مطابق رقم ادا کر کے جان چھڑانے کو ہی بہتر جانتے تھے۔ پولیس بھی اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکی تھی۔ یہ الگ بات کہ ایک مجرم ہونے کے باوجود اس دوران اسے صرف ایک پولیس آفیسر سے خطرہ محسوس ہوا تھا جس کے ساتھ جینی نے اس کی ملاقات کروائی تھی۔ اس کا نام جیمز تھا، وہ جینی کے فادر کالٹن کا اسٹنٹ تھا جو ان کی موت کے بعد ان کی جگہ تعینات کر دیا گیا تھا۔ جینی نے اب تک مارکس کی ملاقات میری سے نہیں کروائی تھی اور مارکس نے بھی اس کا اصرار نہیں کیا تھا۔

مارکس کو میری سے زیادہ اپنی دولت میں اضافہ کرنے اور اپنے کیس نمٹانے کی فکر تھی۔ اچھلو میسی کے تازہ ترین کیس سے فارغ ہو کر بلاکس اپنے فلیٹ پر پہنچا تھا اور اب بستر پر لیٹا ہی دی۔۔۔ پرانے کراؤں سے محفوظ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی نیند نے اس کی چالیں پر اپنا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا تو وہ بی وی بند کر کے خنڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات کی تاریکی ختم ہوئی اور صبح آج بھلا ہنودار ہوا تو سورج کی پہلی کرن مارکس کو بیدار کرنے کے لیے مڑکی کے شفاف شیشے سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس

روشن کنون نے مارکس کے چہرے پر پڑنے لگا۔ اسے اپنے وجود کا احساس دلا یا تو مارکس بیدار ہو گیا۔ حسب معمول وہ غسل کر کے حمام کرنے بیٹھ گیا۔ اس دوران وہ روٹا لڈ کے بارے میں مسلسل سوچتا رہا تھا۔ آخر وہ کس طرح روٹا لڈ سے انتقام لے۔ وہ اسے صرف مارنے کا ہی قہنما نہیں تھا بلکہ وہ اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا اور یہی مصیبت یہ تھی کہ روٹا لڈ کو اس نے ہر جگہ ڈھونڈ لیا تھا مگر روٹا لڈ تھا کہ بالکل ہی معقود

الخبر ہو چکا تھا۔ جب سے جینی مارکس کی زندگی میں آئی تھی روٹا لڈ سے انتقام لینے کی خواہش اس کے دل میں شدت اختیار کر چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اس پہلو سے اب جلد از جلد فرار حاصل کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔

جینی نے اس کی زندگی میں پہلے بچا دی تھی، روٹا لڈ سے جلد از جلد انتقام لینے اور جینی سے مل کر اس کے ساتھ اپنا گھر بسانے کی خواہش دیوانگی اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اپنے غلیظ کاروبار سے وہ آکٹا ہٹ محسوس کرنے لگا تھا جس سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ روٹا لڈ کی تلاش

احتیاط سے کرنا ہوگا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ رونا لڈا اس ہنگامے میں اس لڑکی کے ساتھ بالکل جہا ہوگا اور یہ معاملہ طے کرنے کے بعد رونا لڈو فوراً لندن روانہ ہو جائے گا پھر وہ کب آتا ہے کب جاتا ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارے پاس انتقام لینے کا یہ سب سے سنہری موقع ہے۔“

”مگر اس ہنگامے کا ایڈریس.....؟“ مارکس نے جملہ ادھر اور اچھوڑا۔

”تم نکسو، میں بتا رہی ہوں۔“

”تم مجھے ایس ایم ایس کرو۔“

”نہیں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو، ایس ایم ایس کہنی دیکارڈ میں آتا ہے میں کسی طرح کارسک نہیں لینا چاہتی۔“ جینی نے واضح کیا۔ ”یہ کوئی مذاق نہیں ہے، تم جانتے ہو کہ مارکس نے چارہ لیا۔“

”تم بھی میرے ساتھ رو کر ہوشیار ہو گئی ہو۔“ مارکس نے مسکرا کر کہا۔

”پتا نہیں کون کس کے ساتھ رو کر کیا ہو گیا ہے۔“ مارکس کے مسکروں نے جینی کی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

مارکس نے اس کی ہدایت کے مطابق ایڈریس نوٹ کرنا شروع کر دیا۔ جینی نے مکمل وسعت کے ساتھ ایڈریس اور ملاقات کا وقت نوٹ کر دیا تھا۔

”تم بھی آ رہی ہونا؟“ مارکس جینی کے لیے بے قابو تھا۔ ”نہیں میں بہت مصروف ہوں، میرا کچھ بچا نہیں۔“ جینی نے یہ کہہ کر گفتگو کا سلسلہ ختم کرنا چاہا تو مارکس نے ایک لمحہ بھر اس سے رونا لڈا کے بارے میں سوال کر دیا۔

”وہ مسئلہ تھا کہ وہ جہیں کہاں، کیسے مل گیا اور جہیں کیسے یقین ہے کہ یہ وہی رونا لڈا ہے؟“ مارکس کے سوال میں تشویش کا عنصر بھی شامل تھا۔

”افوہ، بتا دیتی ہوں۔“ جینی نے آہستہ آہستہ کے ساتھ تفصیل بتانا شروع کی۔ ”مجھے، ایک ٹرانس پارٹی کے دوران میری اس سے اتفاق ملاقات ہوئی تھی۔ تم نے اس کے بارے میں اتنا کچھ بتا رکھا ہے کہ مجھے اس کی پہچان میں کوئی وقت نہیں ہوئی اور پھر اس کی کچھ باتیں جی جی رہی تھیں اس دن کے بعد سے میں اس کے قریب ہوتی چلی گئی۔ وہ بڑھاپے میں بھی لڑکیوں کا بہت رسیا ہے۔ یہ نیا گھر بھی مجھے اس نے گفٹ کیا ہے اور جب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ وہی رونا لڈا ہے جس کے تم متلاشی ہو تو آج میں

نے جہیں یہ سر پرانزدہینے کا فیصلہ کر لیا، اب تم جانو اور تمہارا کام جانے، گڈ بائے۔“

”اوکے، جینک یو۔“ مارکس نے بھی شکر ایلے کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔

مارکس کو اپنے وجود میں آگ بھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ جینی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے اپنی الماری سے ہجک کا پستول نکال کر لوڈ کر لیا تھا۔ چرے کے نقوش تبدیل کرنے کے لیے اس نے ایک مخصوص قسم کا ماسک پہن لیا تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا، آج سے پہلے وہ رونا لڈو کو تڑپا کر مارنا چاہتا تھا لیکن اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایسا کوئی موقع اس کے پاس نہیں ہے، اب تو جی فوراً فیصلہ کرنے اور ایکشن لینے کا وقت تھا۔ اس کے بعد جینی کے ساتھ گزرنے کے لیے ایک محبت بھری پرسکون زندگی کی منتظر تھی۔ وہ فلیٹ سے نکلا اور اپنی موٹر سائیکل تقریباً آڑھ ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جس کے بارے میں جینی نے اسے بتایا تھا۔ یہ ایک خوبصورت اور انتہائی پوش علاقہ تھا۔ تمام ہنگامے اس میں ڈوبے ہوئے تھے، مارکس اس ہنگامے سے کچھ فاصلے پر کھڑا۔ موٹر بائیک کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کرنے کے لیے اس نے ایک محفوظ مقام کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے اپنی تمام کارروائی سے فارغ ہو کر اسی بائیک پر اپنے فلیٹ تک واپس چاہا تھا، اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موٹر بائیک کسی کی نظروں میں آئے اور اس نے والے وقت میں اس کے لیے کسی مسئلے کا باعث بنے۔ اس کام کے بعد اس نے ہر طرف سے ہنگامے کے قریب وقوع کا اندازہ لگا دیا۔ وہ ہنگامے میں داخل ہونے کے کسی مناسب راستے کی جستجو میں تھا۔ تمام جمع تفریق کے بعد اس نے ہنگامے کے قریب ایک ایسا مقام ڈھونڈ لیا۔ مارکس کا خیال تھا کہ اسے ہنگامے میں داخل ہو کر رونا لڈا کا انتظار کرنا چاہیے لیکن اس طریقے میں خطرہ زیادہ تھا۔ اس لیے مارکس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر باہر ہی اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اب وہ اپنے لیے ایک پوشیدہ مقام کا متلاشی تھا جہاں پہنچ کر وہ ہنگامے کے دروازے پر پوری طرح سے نظریں رکھ سکے لیکن اس کی سمجھ میں ایسا کوئی مقام نہیں آیا تو وہ ہنگامے سے کچھ فاصلے پر اپنے کانوں سے موبائل فون لگائے ادھر ادھر ٹھٹھے لگا جیسے وہ کسی سے بہت ضروری بات کر رہا ہو، اس کی نظر اس اپنے شکار کے انتظار میں بار بار ہنگامے کے گیٹ پر ٹھہر جاتی تھیں۔ جینی کے دیے ہوئے ٹائم

کے کتنا قریب جائے یا اسے خاموشی سے کھڑکی کے باہر سے
ہی فائر کر کے ختم کر دے لیکن جذبات و جنون عقل و حواس پر
غالب آنے لگے تھے۔ مارکس کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔
وہ اچانک ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کی
پستول کا رخ سیدھا رونا لڈ کی طرف تھا۔ رونا لڈ اور لڑکی
اسے اس طرح یہاں دیکھ کر یکدم اٹھ کھڑے ہوئے
تھے۔ مارکس نے اپنے چہرے سے ماسک اتار دیا اور
رونا لڈ کو اپنی پہچان کرانا شروع کر دی۔

”پہچانا مجھے ظالم درندے۔“ مارکس کی آنکھوں میں
خون اتر آیا تھا۔ ”پہچان مجھے، میں کون ہوں؟“

”ہاں، بہت اچھی طرح پہچان گیا ہوں ڈیر یوڈ کے
بیٹے۔“ رونا لڈ کی آواز میں غراہٹ نمایاں تھی۔

”اچھا ہوا کہ تم نے اپنی موت کو پہچان لیا۔“ مارکس
نے اپنے پستول کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کر دیا۔

”میں کھلونوں سے بچوں کو ڈرایا جاسکتا ہے لڑکے،
مجھے نہیں۔“ رونا لڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم کیوں
اپنی موت کو آواز دے رہے ہو بے وقوف بیٹے۔“

اس کی زہریلی مسکراہٹ نے ایک لمحے کے لیے
مارکس کو فکر مند کر دیا تھا، لیکن ایسا تو نہیں کہ رونا لڈ کے آدمی
اور گرد موجود تھے اور اب مارکس دشمنوں کے درمیان بعض
چکا تھا لیکن اسے فوراً ہی جینی کی بات یاد آئی کہ رونا لڈ اور وہ
لڑکی بالکل اکیلے ہوں گے مگر ایسی کیا بات ہو سکتی تھی کہ رونا لڈ
نے باہر بھی اپنے آدمی نہ کھڑے رکھے ہوں، لیکن جینی نے
مارکس کے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا تھا، ہزاروں سوال مارکس کے
ذہن میں ابھرے اور تحلیل ہو گئے لیکن اب ان سوچوں اور
سوالوں کا وقت نہیں تھا۔ اب تو مارکس رونا لڈ کے کمرے میں
موجود تھا اور رونا لڈ اس کے سامنے تھا اگر مرنے کا وقت آ بھی
گیا تھا تو مارکس نے قہر لے کر لیا تھا کہ وہ رونا لڈ کو مار کر ہی
مرے گا۔ اس خیال کے بدلے اس نے نہ تو کوئی دوسری بات کی
اور نہ ہی رونا لڈ کی کوئی بات لی اس کے بے آواز پستول
نے شعلے اگلے تھے۔ جن کا رونا لڈ نے بھرپور جواب دیا تھا
رونا لڈ بڑھاپے میں بھی بہت سخت جان اور پھر تیل ثابت
ہو رہا تھا، مارکس بھی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔

اسی دوران لڑکی نے بھی مارکس کے عقب سے اس
پر حملہ کیا تھا۔

”تم پیچھے ہٹ جاؤ میری۔“ رونا لڈ اپنی بھاری
آواز میں چپٹا۔

”لیکن باس۔“ لڑکی اپنا جملہ ادھر اچھوڑ کر پیچھے

کے مطابق اس کا شکار وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔۔۔۔۔ اسی
دوران میں اس نے ارد گرد رونا لڈ کے کارندوں کی موجودگی
کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن ایسا کچھ نہیں تھا حالانکہ یہ
بات مارکس کے لیے باعث حیرت بھی تھی۔ زیادہ دیر نہ
گزر رہی تھی کہ جھنگے کے دروازے پر ایک سرخ رنگ کی کار
آ کر ٹھہر گئی اور اس میں سے ایک واجبی سی شکل و صورت والی
دراز قد لڑکی برآمد ہوئی۔ یہ بات مارکس کی توقع کے۔

برخلاف تھی۔ کیونکہ وہ تو اپنے اندازے کے مطابق رونا لڈ کا
خضر تھا اور لڑکی کی اس طرح آمد بتا رہی تھی کہ رونا لڈ پہلے

سے اندر موجود ہے۔ مارکس کو اپنے دل میں ایک حسرت کا
احساس ہوا کاش یہ اندازہ اسے پہلے ہوتا کہ اندر رونا لڈ اکیلا

ہے تو وہ بہت پہلے ہی اندر جا کر رونا لڈ کو ختم کر کے یہاں
سے فرار ہو جاتا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی کو دیکھ

رہا تھا جس کے چہرے پر بے تابی کے آثار نمایاں تھے۔
اس کے ہاتھ میں ایک بڑا بیگ تھا لڑکی نے سرسری نظروں

سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کار ڈور لاک کر کے جھنگے کے
دروازے کی طرف بڑھی۔ بال تیل بجانے کی دیر تھی کہ

دروازے کا الیکٹریک لاک بند ہو کر کھول دیا گیا۔ اب
مارکس اپنے کام کے لیے تیار تھا۔ ارد گرد ہی رونا لڈ کا کوئی

کارندہ تھا نہ ہی لڑکی کا کوئی ہمراہی تھا۔ جس سے چند خفیہ
کیمروں کی نظروں سے پوشیدہ رہتا تھا۔ کسی بھی ڈی روح

کی موجودگی کو نہ محسوس کرتے ہوئے اس نے جھنگے کی طرف
قدم بڑھا دیے۔ اپنے طے شدہ جیسے وہ جھنگے میں داخل

ہو چکا تھا۔ وہ اپنا پستول ہاتھ میں تھا سے ہوئے رونا لڈ کو قتل
کر لینے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ اندر رونا لڈ کی بیش

قیمت کا موجودگی۔ مارکس مختلف ہال کمروں اور راہداریوں
سے دے قدموں کے آواز سنا رہا۔ راستے میں نظر آنے والے ہر

کیمرے پر اپنی بے آواز پستول سے فائر کرتا اپنے خلاف
پہننے والے مبینہ ثبوت کو مٹانا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی اور رونا لڈ اسے

کبھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ آخر ایک کمرے کی کھڑکی کے
شیٹے میں سے مارکس کی نظر میں رونا لڈ کا جامکس۔ رونا لڈ

نوار و لڑکی سے باتوں میں مصروف تھا اس کے سامنے ٹیبل
پر جام کے گلاس موجود تھے مارکس ان گلاسوں کو دیکھ کر ایک

لمحے کے لیے چونکا۔ گلاس تعداد میں تین تھے جبکہ یہاں
رونا لڈ اور اس لڑکی سمیت صرف دو افراد موجود تھے۔

مارکس کی چھٹی حس یہاں کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا الارم
بجھا رہی تھی مگر مارکس اب پلٹ کر دیکھنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ

صرف اس گفتگو میں تھا کہ رونا لڈ کو مارنے کے لیے وہ اس

بجک کی بادشہت سے ستاری تھی۔ کاش اس وقت وہ زندہ ہوتا اور مارکس کے ساتھ ہوتا۔ کاش وہ دیکھتا کہ اس کا شاگرد آج صرف ایک بلیک میلر ہی نہیں رہا بلکہ قاتل بھی بن گیا ہے۔ اس نے مطمئن ہونے کے لیے اپنی الماری سے سکون آور دوا... نکال کر دودھ کے ساتھ لگی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اسی وقت اس کا ذہن جینی کی طرف چلا گیا۔ جینی نے اسے بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ جینی نے اسے میری اور رونالڈ کے بارے میں عملی تفصیلات کیوں نہیں بتائی تھیں؟ اس نے یہ بات مارکس سے کیوں چھپائی تھی کہ جس لڑکی سے رونالڈ مینٹگ کرنے جا رہا ہے وہ جینی کی دشمن میری ہی ہے؟ اس نے مارکس کو یہ بات بھی کیوں نہیں بتائی تھی کہ میری کا باس رونالڈ ہی ہے؟ یہ سوال مارکس کو پاگل کیے دے رہے تھے پھر اس نے ان تمام سوالات کو فوراً سے جھٹک دیا، کچھ بھی تھا جینی نے اس کی زندگی پر بہت برا احسان کیا تھا، جس رونالڈ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ اور بجک پاگل ہو چکا تھے جینی نے مارکس کو اس تک بہت آرام سے پہنچا دیا تھا کہ اس کی زندگی پر اتنا برا احسان کر کے جانے وہ خود کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا پرانا نمبر بند تھا اور جس نمبر سے اس نے رونالڈ کے کام سے ملے تھے بتایا تھا وہ نمبر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ ایڈریس کے مارکس بالکل لاعلم تھا، اسی نمبر پر دوا... اثر انداز ہونا شروع ہو گئی اور مارکس پر خند غالب آ گئی۔ رات کے کسی چھ بجے سو بائیں فون کی الارٹ ٹون نے اسے بیدار کر دیا۔ موبائل فون کی آواز اسے پولیس کی گاڑی کا سائرن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس طرح خوفزدہ ہو کر اٹھا جیسے اس نے کوئی بھیاںک پہنا دیا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی رات کے دو بج رہے تھے کوئی ایک بج چکا تھا کچھ غلط نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق رہا تھا۔ اس نے فون ریسیو کیا، دوسری طرف جینی تھی۔ جینی نے صرف حالیہ احوال پوچھنے پر اکتفا کیا تھا اور بہت جلد دوبارہ ملاقات کی خوشخبری دیتے ہوئے مستقبل کے پلان کے بارے میں آگاہ کرنے کے متعلق بتایا تھا کہ وہ دونوں ایک نئی زندگی شروع کریں۔ اپنا ایڈریس اس نے اب بھی نہیں بتایا تھا۔ بہر حال مارکس کے لیے یہ بھی نعمت تھا کہ جینی نے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا تھا۔ مارکس اب لوگوں کو بلیک میل کرنے کا کام بند کر کے اپنی توجہ اپنے اسپر پارٹس کے کاروبار پر مبذول کر رہا تھا۔ اب اسے صرف جینی کا انتظار تھا اس کے خیال میں ایک پیاری محبت بھری دنیا اس کی اور

بہت مہنی۔ ان کے مختصر جملوں کا تبادلہ مارکس کو چونکانے کے لیے کافی تھا۔ مارکس کے ذہن نے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ یہ لڑکی جینی کی دشمن کلب ڈانسیر میری دچرنا ہے اور رونالڈ ہی اس کا باس ہے جس کو جینی اپنے پاپا اور وجہ کا قاتل گردانتی ہے جس کی تلاش جینی کو کلب تک لے گئی تھی اور مارکس کو در بدر بھٹکنا ہی تھی لیکن جینی نے یہ بات مارکس سے کیوں چھپائی تھی؟ مارکس کے ذہن میں سوالیہ نشان ابھر گیا تھا۔ میری نے اس دوران بھاگنے کی کوشش کی مگر اس کی کنکٹی پر پڑنے والے مارکس کے... گھونٹنے نے اسے وہیں بے ہوش کر دیا تھا۔ یکا یک مارکس کے پستول میں گولیاں ختم ہو گئیں اور نو بت دونوں کے درمیان باقاعدہ ہاتھ پائی اور دھچکا مشتکی تک آ گئی تھی۔ مارکس پاگلوں کی طرح رونالڈ کے حلقے کر رہا تھا اور رونالڈ بھی بھرپور طریقے سے جواب دے رہا تھا۔ بالآخر مارکس کا جنون رونالڈ کی بوڑھی طاقت اور تجربے پر غالب آ گیا۔ رونالڈ زمین پر کچھ اس طرح گر رہا تھا کہ مارکس نے اس کا سر اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ اٹھ رہا تھا لیکن مارکس دیوانہ وار اس پر ٹھوکریں برسائے جا رہا تھا کیسا تک کہ رونالڈ کے منہ سے غرغراہٹ کی آخری آواز بلند ہوئی۔ اس کی کھوپڑی خون میں ڈوب چکی تھی۔ وہ ایک لمحے میں ختم ہو گیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر مارکس میری کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دمہ چھوڑنا مارکس کے لیے مشکل پیدا کر سکتا تھا۔ بالآخر اس کی اگلی ٹھوک میری کے سر پر مین دماغ کے مقام پر پڑی اور میری ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی۔ اس نے دونوں لٹکوں کو وہیں چھوڑا۔ اپنے تئیں اپنے جرم کے تمام ثبوتوں کو مٹا دیا، ماسک دوبارہ چہرے پر سجایا اور ہتکے سے باہر نکل آیا۔ ممکن انداز میں چلا ہوا وہ اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا اور موٹر سائیکل کو برقی رفتار سے تقریباً اڑاتا ہوا اپنی اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے موٹر سائیکل کو کسی ایسی جگہ لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بھی اس کے نزدیک اس کے جرم کا ایک ثبوت تھا۔ وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد پورا کر چکا تھا۔ اب وہ پرسکون زندگی کی طرف قدم بڑھانا چاہتا تھا تمام کارروائی سے فارغ ہو کر وہ فلیٹ پر پہنچا اور بہت دیر تک خود کو تارل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ایک بلیک میلر ضرور تھا لیکن کوئی پیشہ ور قاتل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہرگز رتا ہوا لمحہ اسے اس خوف میں مبتلا کرتا جا رہا تھا کہ بس ابھی وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے والا ہے۔ اسے اس موقع پر

جینی کی خنجر تھی۔ وہ اس بات کا شدت سے خنجر تھا کہ جینی کب اس کی زندگی میں شامل ہوتی ہے۔ رونالڈ کے قتل کا پانچواں دن تھا۔ اس لیے مارکس ذہنی طور پر بھی فریش ہو چکا تھا۔ رات کو وہ تھا کاراواہیں اپنے قلیٹ پر پہنچا تو اسے قلیٹ کے ماحول میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کسی نے اس کے قلیٹ میں داخل ہو کر کوئی کارروائی کی ہے لیکن کیا ہوا ہے؟ بات بہت دیر غور و فکر کے بعد بھی اس کی نظر س نہیں بھانپ سکی تھیں۔ لہذا اس نے سب کچھ فراموش کر کے غسل کرنے کا ارادہ کیا اور غسل کر کے فریش ہونے کے بعد وہ ایک کپ کافی بنا کر لایا اور نی وی سیٹ پر رکھی ایک سی ڈی سی ڈی پلیئر میں لگا...

دی۔ اب وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا کافی پینے کے ساتھ ساتھ سی ڈی بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سی ڈی نے اس کی تمام توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ اس کا خیال یقین میں بدلتا جا رہا تھا اس کا غیر موجودگی میں کوئی اس کے قلیٹ میں آیا تھا۔ یہ سی ڈی مارکس کی نہیں تھی تو پھر یہ اس کے گھر میں کس طرح آئی؟ مارکس سوچ رہا تھا کہ کچھ انجانے خطرات کے گھیرے اس کے گرد و نواح ہوتے جا رہے تھے۔ اسی وقت موبائل فون کی نون کو اس نے غصے سے محسوس کیا۔ اس نے مووی بند کرتے ہوئے فون اٹھا کر کال کی ہے لگا لیا۔

”ہیلو.....“ وہ خوف سے حشر مچائی آواز میں بولا۔
”ہیلو، مارکس ہنری.....“ دوسری طرف سے ایک منگراتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں زہر مچا رہی تھی۔ ”کہو، کیسی گلی مووی...“ کتنے اچھے لگ رہے ہو تم ایک آدمی اور ایک لڑکی کو اسنے بھینک کر انداز میں قتل کرتے ہوئے، جیسے حال جو ہوا سو ہوا اب موت کی کرسی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ مووی کے بدلے میری منہ مانی رقم اور رقم دینے کے لیے جب اب وقت نوٹ کرو اور اپنی جان بچانے کے لیے آ جاؤ۔“

دوسری طرف سے اس سے مووی کے بدلے ایک کثیر رقم کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اب مارکس سمجھ چکا تھا کہ اس کا اندازہ اس وقت بالکل درست تھا۔ رونالڈ میری کی آمد سے قتل بھی اس جھگڑے میں اکیلا نہیں تھا بلکہ اسے منصوبہ ساز اس وقت خود رونالڈ کے ساتھ موجود تھا اور اس جھگڑائی داغ نے ایک تیر سے تین شکار کیے تھے۔ اس نے نہ صرف رونالڈ اور میری کو مارکس کے ہاتھوں قتل کرایا تھا بلکہ وہیں ایک قاتل کی حیثیت سے مارکس کی مووی بھی بنائی تھی۔ مارکس کے پاس اپنے مخاطب کی بات ماننے کے علاوہ

کوئی چارہ نہیں تھا۔ مارکس سے اس کا تقریباً سب کچھ ہی مایک لیا گیا تھا لیکن مارکس کے لیے اس وقت اس تمام دولت سے زیادہ اپنی زندگی قیمتی تھی۔ یہ دولت، قلیٹ، جھگڑے گاڑیاں وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا تھا لہذا اس نے اپنے شکاری کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ بھی اپنے شکار کو مووی کے بدلے رقم دینے کے لیے مقام اور وقت کا تعین کیا کرتا تھا۔ آج اس کے شکاری نے اسے ہوٹل موریل میں بلایا تھا۔ اپنی زندگی بھر کی کمائی کے بدلے مارکس مووی کا ماسٹر پرنٹ لے کر اپنے قلیٹ پر چھٹے ہوئے قدموں سے واپس پہنچا ہی تھا کہ کال بیل کی بجنگ نے اسے لرزادیا۔ اس نے سی ڈی ایک خفیہ خانے میں پوشیدہ کر دی اور پوچھل پوچھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”ہیلو میز مارکس ہنری اپنی زندگی کا مقصد تم نے پورا کر لیا، آخر تم نے رونالڈ سے اپنا انتقام لے ہی لیا جس کے لیے تم نے میری خوشیاں تباہ کر دی تھیں اور یہ دیکھو کہ میں نے تم سے کیا کیا ہے اور میری کے پاس رونالڈ سے اپنا انتقام لے لیا۔ انتقام کی کہانی تو یہاں ختم ہوئی لیکن اس بھینک مووی کا ماسٹر پرنٹ اب بھی پولیس کے پاس ہے مسٹر مارکس ہنری سو اب تم پولیس کو بھی اس کا فرض پورا کرنے دو تا کہ میں اور جیمو جلدی جے ہنی مون منانے کے لیے نیو یارک سٹی جا سکیں.....“

مارکس اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ وہ سوچ رہی نہیں سکتا تھا کہ کبھی کوئی اس سے اس قدر بھینک انتقام بھی لے سکتا ہے۔ یہ تو سراسر دھوکا تھا۔ اس نے تو اپنے کاروبار میں بھی اس کے ساتھ ایسے دھوکا نہیں کیا تھا مگر یہ کاروبار کہاں تھا کہ تو انتقام تھا اس کی دوستی اور محبت کی آڑ میں اس کی کمر پر کامیاب دھوکا لگایا تھا۔ اس کے اعتماد کا خون کر دیا گیا تھا۔ اسے مہرہ بنایا گیا تھا اور پھر اس کی زندگی بھر کی کمائی ایک ہی جھگڑے میں اس سے جینے کے بعد اسے تڑپا تڑپا کر اس کی زندگی تباہ کرنے کے منصوبے پر کامیابی سے عملدرآمد ہو گیا تھا۔ موت کی کرسی شدت سے مارکس کی خنجر تھی۔ مارکس انہی سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر کھڑے پولیس آفیسر جیمو نے اس کے ہاتھوں میں جھکڑی پہنا دی۔ جینی کے تشکیک آمیز قہقہے اس کی بے وفائی اور فریب کی تصدیق کے لیے مارکس کے کان میں پچھلے ہوئے لاوے کے مانند سرایت کرتے جا رہے تھے۔



محمد الہیٰ نواب

اتھار ہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پر تہیں ہو یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے چھونکے ہوں یا بادوبارار کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی مہک، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... پر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بتایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کچھل چھکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تعزیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی نظیروں کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے زخموں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے عقیدہ کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے۔ چھوٹا ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنا نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی کا خیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی اس کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا بلن ہے تو کہیں رقابت کی چلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنکین لمحات کی لمحہ لمحہ رو باد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا حقیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کئی چھاؤں کئی روپ، بہت کی متائیں، برقا توں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ





[illegible]

نہیں سکو گے۔ میرے لب و لہجے سے پہچانو۔"

وہ غصے سے بولا۔ "مراد.....!"

مراد کا نام سننے ہی پوری فیملی چونک گئی۔ ڈی بلیک گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے رفتار کو سست کرتے ہوئے کہا۔ "پلیز اسٹیکر کی آواز بڑھاؤ، مجھے سننے دو۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟"

اس نے آواز بڑھا دی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے سب ہی افراد سننے لگے۔ جانا کہہ رہا تھا۔ "ہاں تو فرعون کی اولاد...! اپنے باپ کی آواز پہچان گئے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ایک بیٹے کے بعد دوسرے کی باری ہے لیکن میں اتنی جلدی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے تمہارے بیٹے کو صرف زخمی کیا ہے اور خالی کار کے پرچے اڑا دیے ہیں۔" وہ خطرناک دھمن بے بسی سے فون کا لٹن رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میں تم سے اتحاد رکھنے والے دوسری خلیفوں کے برابر ہوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ کس طرح مارنے سے پہلے محبت پیدا کرنا ہوں۔ وہ تمام سربراہ بھی میری نظروں کے تحت ہیں لیکن تم سے غصے کے بعد ان کی نیندیں حرام کروں گا۔"

میکی کا ایک بھائی سربراہ ڈی بلیک اس وقت کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہارا باپ بھی ہماری پرچہ نہیں بچا سکتے گا۔" وہ فیکس ریکٹ کا ڈی بلیک بول رہا ہوں۔ لندن میں تمہاری بیوی بن کر آیا ہوں۔" بے نے کہا۔ "پہلے حساب کرو۔" میکی نے انڈیا میں تمہارے کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے مجھے میکی سے نفٹ لینے دو پھر تمہیں گھاس ڈالوں گا۔"

بیلٹانے رونے کے انداز میں کہا۔ "قارگا ڈیسک میرے بیٹے سے دشمنی نہ کرو۔ تمہاری دشمنی اس کے باپ سے ہے۔"

انہیں جواب ملا۔ "اس کی آئندہ نسل کو ختم کروں گا تو دشمنی باپ سے ہی ہوگی۔ اگر میرا ایک مطالبہ پورا کیا جائے گا تو تمہارے بیٹے کی جان چھوڑ دوں گا۔"

میکی نے پوچھا۔ "کیا مطالبہ ہے تمہارا؟"

بے نے کہا۔ "سنا ہے تم اپنی بیٹی میڈونا کی شادی کسی سے کرنا چاہتے ہو؟ کون ہے وہ بد نصیب؟"

"وہ ڈاکٹر عیسیٰ بن کا بیٹا ایمان علی ہے۔"

"یہ شادی نہیں ہوگی۔ میں نے دور سے دیکھا ہے، تمہاری بیٹی بڑی پٹاخہ ہے، پہلی دیوالی میں مٹاؤں گا۔"

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ "کیا بکواس کر

اسٹینڈیم میں حالات معمول پر آ گئے تھے۔ سٹیج پولیس کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب کوئی دھماکا نہیں ہوگا۔ تماشا کی اپنی سیٹوں پر آکر بیٹھ رہے تھے۔ راکٹل شوٹنگ کا مقابلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

بے نے وہاں پہنچ کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بشری سے فون پر پوچھا۔ "تو کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "میں گیٹ نمبر تھری کے باہر ہوں۔"

وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "میں اسی گیٹ کے سامنے ہوں۔ تو کہاں ہے؟ کیا تجھے میری کار نظر آ رہی ہے؟"

"ہاں، نظر آ رہی ہے۔ دل سے دیکھے گا تو میں بھی نظر آ جاؤں گی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "دل کی آنکھوں سے کیسے دیکھوں؟"

میرا دل تو تیرے پاس ہے... میری جان ابھی جا... وہ کار کے پیچھے تھی۔ آگے بڑھ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھنے ہوئے بولی۔ "لے آگئی..."

وہ اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر بولا۔ "تو نے میکی براؤن کے بیٹے چھڑا دیے ہیں۔"

وہ خود کو چھڑا کر بولی۔ "کیا تم نہیں ہے؟ یہاں آکر انگریزوں کی طرح بے حیاء بن رہا ہے۔"

"ہائے میری جان...! ممبر نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے ٹریڈنگ حاصل کرے گی تو میری جیسی بن جائے گی۔"

"تو ہمیشہ مرینہ کی مثال کیوں دیتا ہے؟ میں اس سے کہیں زیادہ اچھی ہوں۔ چل اسے بلا دو دیکھ تماشا اس کے بھی بارہ ہوں۔"

ان جانتے ہوئے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی پھر کہا۔ "میرے ساتھ وہ کرکارنا سے انجام دیتی رہے گی تو تم پر فخر کروں گا۔"

پھر وہ کار روک کر بولا۔ "تو ڈرائیو کر میں میکی سے باتیں کروں گا..."

انہوں نے جگہ بدل لی۔ بشری کار ڈرائیو کرنے لگی۔ وہ فون نکال کر نمبر بچ کرنے لگی۔

میکی ڈی بلیک کی گاڑی میں اسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے فون سے رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ اس نے اسکرین پر انہماں نہ کر کے پھر فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔

"ویلو کون؟"

بے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "قیقے سے پہچان

رہے ہو؟ مرد کے پہنچے ہو تو میرے سامنے آکر بولو پھر تم ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکو گے۔"

"شادی کا پیغام دینا ہوتا تو تمہارے سامنے آنا پڑتا۔"

میں تو بس موج مستی کروں گا۔"

میزڈونا فحش سے اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ "جب تک دل نہیں بھرے گا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے بعد تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

ہیلنا نے چٹخ کر کہا۔ "یہ دشمن کی اولاد کیا کہہ رہا ہے؟ یہ میری بیٹی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔ یہ براؤن کی بیٹی ہے۔ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔"

"چلو وعدہ کرتا ہوں۔ اسے معمولی بنا دوں گا۔" وہ فون کے سامنے چٹکی بجا کر بولا۔ "ایک چٹکی بجا کر معمولی بنا دوں گا۔ اب تمہارا بیٹا ہی نہیں بیٹی بھی ٹارگٹ بن گئی ہے۔ اب اگر ہمت ہے تو ایمان علی سے اس کی شادی کا دن مقرر کرو پھر اس کا انجام دیکھو۔"

بچے نے فون منقطع کر دیا۔ میڈونا، ایمان علی (مرد) کے لیے دیوانی ہو رہی تھی۔ بھائی کی ہلاکت کے باعث وہ فیملی دس دنوں تک سوگ منا رہی تھی۔ وہ تنہا براؤن نے فرعون بن کر حکم دیا تھا کہ دوسرے بیٹے ایمان علی کو اس کی بیٹی سے شادی کرنی ہوگی۔

اگرچہ شادی ذرا مل گئی تھی لیکن میڈونا مطمئن نہیں تھی۔ دس دنوں کے بعد ہی سہی، وہ ایمان کی آغوش میں چھلک جائے گی۔

اسی کے ملنے نے ابھی چیلنج کیا تھا تا کہ میکی فرعون بن کر ایمان علی کو دلا جائے۔ پر مجبور نہ کرے اور واقعی وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اس شے اٹھانے سے کہا۔ "سوگ منانے کے بعد شادی نہیں ہوگی۔ کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرنی ہوگی۔"

میڈونا نے احتجاج کیا۔ "تو جیسا! آپ جرائم کی دنیا میں تائیفون کہلاتے ہیں۔ کیا بیٹی کی شادی کے لیے ایک دشمن کو راستے سے ہٹا نہیں سکتے؟ کیا ہے آپ کی مروت؟"

"بکواس مت کرو۔ آنکھوں سے دیکھ رہی ہو کہ وہ کسی طرح بھی ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ ہمیشہ ہمیں ہی نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس نے تمہارے ایک بھائی کو قتل کیا ہے۔ دوسرے اسپتال پہنچا کر مہلت کر رہا ہے کہ وہ ہماری فیملی میں گھسا آ رہا ہے۔" اس نے مضامین پتھج کر کہا۔ "وہ کیسا جیالا ہے، یہ ابھی زخمی بیٹے اور ہماری کارکی تباہی نے ابھی طرح سمجھا دیا ہے، تم بھی سمجھو۔ نادان بیٹا نہ بنو۔"

ڈی بلیک نے کہا۔ "اس کتے نے اچانک فون بند

کر دیا۔" وہ نہ ابھی اس کی ایسی کی تھی کر کے رکھ دیتا۔"

میکی نے پوچھا۔ "فون پر کیا کرتے؟ کیا اسے گولی مار دیتے؟ کیا اسے ہم سے کہیں دور لے جا کر اس سے پیچھا چھڑا دیتے؟"

وہ بولا۔ "میکی! تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ میں دشمن کا چیلنج سن کر پیچھے ہٹنا نہیں جانتا۔"

وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ابھی اس کا نمبر بیچ کرو۔ میں اس سے بولوں گا کہ میں میڈونا کو بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں ایک بیٹے کے اندر ایمان علی سے اس کی شادی کروں گا۔ میں اسے چیلنج کروں گا کہ اس نے ماں کا دودھ پیسا ہے تو آئے اور اس شادی کو روکے۔"

میڈونا نے خوش ہو کر کہا۔ "انکل! آپ بہت اچھے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "بے وقوف لڑکی! انکل کے منصوبے کو سمجھو۔ تمہارا چلاؤ ال کر مراد کو اپنی طرف آنے پر مجبور کرے گا۔ وہ سر ہٹا کر چیلنج قبول کرے گا۔ تمہیں وہاں سے اٹھانے یا مار ڈالنے کے کا۔"

پھر وہ بے بسی سے بولا۔ "میں اسے گھیرنے اور پکڑنے کے سلسلے میں ناکام ہوتے آ رہا ہوں۔ یہ ڈی بلیک ناکام ہوگا تو اس کا کچھ نہیں جائے گا۔ یا تو تم جان سے جاؤ گی یا عزت سے جاؤ گی۔"

ڈی بلیک نے کہا۔ "جب میڈونا کی شادی میرے ہاتھ سے ملے گی تو وہاں تم اور تمہارے گمن میں بھی شادی ہوگی۔ پلاننگ کرنا۔ بعد میڈونا اور ایمان علی کی شادی کا دن مقرر کریں۔ اور اسے چیلنج کریں گے۔ اس کا باپ بھی میڈونا کو اغوا نہیں کر سکتا گا۔"

ہیلنا نے کہا۔ "براؤن شیک کہہ رہے ہیں۔ اس شادی کے بہانے اسے گھیرنے کا پلان وضع ملے گا۔ وہ تو ہمارے لیے ملک الموت بن گیا ہے۔ اسی اسی وقت کوئی شخص پلاننگ کریں۔ کسی دن تو اس سے پیچھا چھڑانا ہے تو پھر اب کیوں نہیں۔"

وہ ماں تھی۔ ایک بیٹے کی ہلاکت کے بعد دوسرا ابھی بچا ہوا تھا۔ وہ آخری بیٹے کی سلامتی کے لیے چاہتی تھی ابھی بیٹی کا چلاؤ ال کر مراد کو پھاس لیا جائے۔

میکی اس کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس ذلیل کینے سے جلد ہی پیچھا چھوٹ جائے تو اس سے ابھی بات اور کیا ہوگی۔ میں اپنے مشیروں سے بات کرنے کے

بعد ڈی بلیک کی بات مانوں گا۔“

وہ سب چپ ہو گئے۔ اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ گاڑی کی محدود فضا میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

مرینہ بروز انوار کو اسٹیڈیم سے کچھ دور ایک اسپتال میں لے آئی تھی۔ دھماکے سے تباہ ہونے والی کار کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے سینے پر بھی آکر لگا، چوٹ گہری نہیں تھی۔ ایمر جنسی میں فوراً ٹریسٹ لے لی وہ ہوش میں آ گیا تھا۔

وہاں مرینہ نے اس کے لیے ایک کمرہ حاصل کیا۔ کرائے کا بوائے فرینڈ بھی اس بوڑھے بی اے کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ اس کے لیے دودھ، کھن، پھل، میوے اور دوائیں لارہا تھا۔ مرینہ نے اس پرسنل سیکریٹری کو مطلع کرنے کی پلاننگ کرنے سے پہلے اس کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔

یہ معلوم ہوا تھا کہ بروز انوار پندرہ برسوں سے میکی براؤن کی خدمت کر رہے تھے۔ چھ برس پہلے میکی نے اس کی ذہانت اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنا مشیر اور رازدار پرسنل سیکریٹری بنالیا تھا۔

ریڈارٹ کا بیٹا وارنر سسلی تھا، وہیں ایک عالی شان محل میں میکی اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ محل کے ایک طرف ہیڈ کوارٹر کی بڑی سی عمارت تھی۔ عمارت کے احاطے میں کئی چھوٹے چھوٹے رہائشی بنگلوں بنے ہوئے تھے۔ وہاں صرف رازدار باڈی گارڈز، قانونی مشورے دینے والے، میسر اور پرسنل سیکریٹری کی فیملیز رہتی تھیں۔

ان سب کو اداران کے بیوی بچوں کو بھی سسلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہی علاقے میں جہاں جاتے تھے وہاں ان کی سختی سے نگرانی کی جاتی تھی۔ سب گارڈز ان کے آس پاس چلے رہے ہوتے تھے۔ انہیں کسی غیر ضروری فرد سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک بار میکی کا ایک رازدار باڈی گارڈ اس سے بدظن ہو کر اس کی ملازمت چھوڑنا چاہتا تھا۔ میکی نے اس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ باڈی گارڈ سمجھ گیا کہ آقا کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا اپنی حفاظت کے لیے اسے باڈی گارڈ بھی نہیں رہنے دے گا۔

تب اس بد نصیب نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور سسلی کی بندرگاہ تک پہنچنے پہنچے حرام موت مارا گیا تھا۔

میکی براؤن کی لائف ہسٹری میٹ ڈیپارٹمنٹ کے

ریکارڈز روم میں تھی۔ مرینہ نے اسے پڑھ کر کام کی کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور خوب سوچ سمجھ کر بوڑھے بروز انوار کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

وہ اسپتال کے کمرے میں اپنوں سے دور پڑا تھا۔ مرینہ کو اپنی خدمت میں مصروف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوری طرح حواس میں آنے کے بعد پوچھا۔ ”بھئی! تم کون ہو؟“ وہ بولی۔ ”میرا نام مٹلاش ہے۔ میں اسٹینول سے آئی ہوں۔ یہاں گرینڈ کمپیوٹر اسٹی ٹیوٹ میں منچر ہوں۔ میں نے اسٹیڈیم میں آپ کو دیکھا تو چونک گئی۔ یوں لگا جیسے اپنے ڈیڈی مرحوم کو دیکھ رہی ہوں۔ آپ ان سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔“

وہ کمزوری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنا باپ ہی سمجھو۔ میرے لیے اپنے دل میں درد مرتی ہو۔ مجھے اٹھا کر یہاں لائی ہو۔ میرا علاج کرا رہی ہو۔ تمہارے سینے میں ایک گولہ ہے۔ تم ایک بیٹی کی طرح خدمت کر رہی ہو۔“

وہ ایک مردانہ انداز میں بولا۔ ”آہ...! میرا آقا اور ان کے کسی گارڈز نے یہ سمجھنے کی زحمت نہیں کی کہ میں ان کے کام سے کار کی طرف سے آیا تھا اور اسی وقت دھماکا ہوا تھا۔ کسی کو میری پروا نہیں ہے کہ میں زندہ ہوں بھی یا نہیں؟“

مرینہ اسے فون دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ کا فون میں نے رکھا تھا۔ اب تک کوئی کال نہیں آئی ہے۔ واقعی کسی کو تو آپ کی خبر لینے چاہیے تھی۔ صرف ایک کال کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ آپ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔“

اس بوڑھے کی آنکھوں سے دکھ درد جھلکنے لگا۔ مرینہ اس کے پاس آکر بیٹھ کے سرے پر بیٹھ کر اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ اپنی بیوی بچوں کا فون نمبر بتائیں۔ میں ان سے رابطہ کرانے دوں گی۔“

وہ بولا۔ ”میرا بیوی رتیچا بہت بیمار ہے اور ایک پیاری سی بیٹی ہے۔ اس کا نام مٹلاش ہے۔ میں اپنی یہ حالت بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ وہ سسلی میں ہیں۔ انہیں بے خبر رکھوں گا تو وہ سکون سے رہیں گی۔“

”اپنے پاس کے نمبر بتاؤ۔ میں تم سے بات کراتی ہوں۔“ ”میرے پاس کا نام میکی براؤن ہے۔ فون میں اس کے نام سے نمبر محفوظ ہے۔“

مرینہ نے فون میں اس کا نام اور نمبر پڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پچھلے دنوں ایک میکی براؤن کا نام اخباروں میں پڑھا ہے۔ ٹی وی کی خبروں میں سنا ہے، وہ ایک بدنام

"میں عادی نہیں بلکہ مجبور ہو گیا ہوں۔ مرنے سے پہلے آخری خواہش یہی ہے کہ اپنی بیٹی کو وہاں سے نکال کر کہیں دور لے جاؤں۔"

"کیا بیٹی وہاں محفوظ نہیں ہے؟"

اس کے چہرے سے تکلیف ظاہر ہوئی۔ اس نے نہیں کہتے ہوئے سر ہلایا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "کیا مسئلہ ہے؟" وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مسئلہ رہنے دو۔ کیا کرو گی پوچھ کر؟"

"آپ کی تکلیف دور کروں گی۔ کسی کام آؤں گی۔" وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کوئی ہمارے کام نہیں آ سکتا۔ وہ پہاڑ ہے، اس کے سامنے سب بچا ہیں۔" وہ بولی۔ "بچاؤ کر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے حالات بتائیں گے۔ کم سے کم اپنی بیٹی کا ہی مسئلہ بتاؤں گے اور مجھے وہاں کے راستے معلوم ہوں گے تو میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گی۔"

وہ بڑی محنت سے بولا۔ "میری بیٹی! تم بہت بھولی ہو۔ یہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ اس وقت کتنا احمقانہ دعویٰ کر رہی ہو۔ وہ۔۔۔ تمہیں ایک چمک میں اڑا دے گا۔"

"آپ میٹلی براؤن کے اندر کی کمزور یاں جانتے ہیں، وہ کتنا ہی شہ زور کیوں نہ ہو، کسی سے قزاق نہ کھاتا ہوگا۔ کیا وہ کسی کے ہاتھوں پریشان نہیں ہو رہا ہے؟ اس خطرناک شخص کے ایک بیٹے کو کسی نے ہلاک نہیں کیا ہے؟"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں پاکستان کا رہنے والا ایک بوڑھا مراد علی منگی ہے۔ وہ اس کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا رہا ہے۔ جہاں بیٹے کی ہلاکت نے اسے کسی حد تک توڑ ڈالا ہے۔" مرینہ نے اس کی طرف جبکہ کر دمبی آواز میں کہا۔ "اگر اس مراد علی منگی کو تمہاری مجبور یاں معلوم ہوں گی تو پھر یقین کر لو کہ تمہاری بیٹی وہاں سے نکھن کے ہال کی طرح نکل آئے گی۔"

اس نے بھی دمبی آواز میں کہا۔ "میں نے کئی بار سوچا ہے۔ کوئی مراد جیسا جیالا ہی میری جولیا کو عزت کی زندگی دے سکتا ہے، وہاں سے کسی طرح لاسکتا ہے اور اس کے دوسرے بیٹے جیک کو بھی نکل کر سکتا ہے۔"

مرینہ نے اسے ٹوٹتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم چاہتے ہو، جیک بھی مراد کے ہاتھوں مرے؟"

"ہاں مراد، روٹی براؤن کو ہلاک نہ کرتا، جیک براؤن کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تو ہمارے تمام مسائل ختم ہو جاتے۔"

زمانہ مجرم ہے اور کسی نے اس کے بیٹے کو گولی مار دی تھی۔" وہ بولا۔ "یہ وہی میٹلی براؤن ہے، بہت خطرناک شخص ہے۔ تم اس سے بات نہ کرنا۔ مجھے نمبر سچ کر کے دے دو۔"

اس نے نمبر سچ کیے۔ دوسری طرف سے اطلاع ملی کہ اس کا فون بڑی ہے۔ دس منٹ بعد ری ڈائل کرنے سے رابطہ ہو گیا۔ مرینہ نے فون کو اس کے کان سے لگا دیا۔ وہ فون کو پکڑ کر بڑی فضا سے بولا۔ "پاس! میں اسپتال میں زخمی پڑا ہوں۔ جب بلا سٹنگ ہوئی، تب میں آپ کی کار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ زخم کھاتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔"

میٹلی براؤن نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میرے دشمن کا نشانہ تم بن گئے۔ کیا زخم گہرا ہے؟"

"یہ میرے بڑے بچے کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں برداشت کر رہا ہوں، شاید ایک ہفتے تک چلنے پھرنے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"اسپتال کا نام بتاؤ، جہاں سے لیے خدمت کا بھیج رہا ہوں۔ علاج مناسب ہے جس کوئی کی نہیں ہوگی۔ جتنا کیش چاہو گے ملے گا۔ آرام سے وہاں رہو۔ اطیمینان سے علاج کراتے رہو۔"

اس نے اٹھا کی۔ "جناب عالی! میرا بڑا بچا میری کمزوری اور میری تنہائی بیوی اور بیٹی کے لیے غائب رہی ہے مجھ پر رحم کریں۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔ سخت مراد علی منگی جولیا کو میری بیمار داری کے لیے بھیج دیں۔ مجھے دلی امید ہے اسے سنبھال لوں گا۔"

مرینہ نے لہجہ میں بولا۔ "یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں کسی رازدار کے کسی فیملی ممبر کو سسلی سے باہر جانے نہیں دیتا۔ بیوی کے ساتھ تمہاری کمزور یاں ہیں۔ وہ تمہارے مرتے دم تک میری لاپرواہی میں رہیں گی۔ تمہاری نگرانی کرنے والے اور خدمت کرنے والے ابھی آرہے ہیں۔"

رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وہ بڑے دکھ سے گوگٹے فون کو دیکھنے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "کیا تمہاری بیٹی کو بیمار داری کے لیے نہیں بھیجے گا؟"

وہ بڑے کرب سے بولا۔ "وہ جانے خاص رازداروں کو بڑی رقمیں دیتا ہے، بڑے عیش و آرام سے رکھتا ہے لیکن قیدی بنا کر رکھتا ہے۔ میں اس کے اہم رازداروں کا امین ہوں۔"

مرینہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ بیوی اور بیٹی کے ساتھ عیش و عشرت سے قیدی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر تو اس زندگی کے عادی ہو گئے ہوں گے۔"

"وہ اپنے بیٹے کو بھی اجازت نہیں دے گا۔"
 "آپ بوڑھے ہیں۔ یہ نہیں سمجھیں گے کہ جوان لڑکی
 لڑکے سر بھرے والدین سے کس طرح اپنی باتیں منوالیتے
 ہیں۔ یہ آپ کی نظروں میں کمزوری کو شش ہوگی پھر بھی
 کوشش کریں۔ آپ جولیا سے بات کریں۔ وہ جنگی کوشش
 میں اتارے گی۔ جنگی اپنے باپ سے اپنی ضد منوائے گا۔"
 "چلو مان لیتا ہوں۔ وہ جنگی کے ساتھ سسلی سے باہر
 آجائے گی پھر کیا ہوگا؟"

وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "مراد اسے ہمیشہ کے لیے جنگی
 سے نجات دلا دے گا اور اسے تحفظ بھی فراہم کرے گا۔"
 وہ حیرانی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مراد میری
 مشکل آسان کرنے کہاں سے آئے گا؟ کیا تم اسے جانتی ہو؟"
 وہ بولی۔ "یہ سب کہتے ہیں کہ مراد کو مرینہ تک نہیں چھپا
 کر رکھتی ہے۔ کیا آپ نے مرینہ کا نام سنا ہے؟"
 "بہت سنا ہے، وہ یہاں کی میٹ آفیسر ہے۔"
 وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، اس نے جینز کی پچھلی جیب سے
 میٹ آفیسر کا آئی ڈی کارڈ نکال کر دکھایا پھر کہا۔ "میں ہوں
 مرینہ، پہلے لیکن کہہ لیجئے نہیں کرو گے تو اپنی گڑیا جیسی بیٹی
 کو بھی وہاں سے رہائی دلا نہیں سکو گے۔"
 "تم مجھے ابھاری ہو۔ میں نے مرینہ کی تصویریں
 دیکھی ہیں۔"

"یہ جو چہرہ دیکھ رہے ہو، اس کے منہ میں ہی ہوں۔
 کبھی مراد سے تمہارا سامنا ہوگا تو اسے بھی پہچان نہیں سکو گے،
 ہم دشمنوں سے اپنے اصلی چہرے چھپائے رکھتے ہیں۔ اس
 لیے محفوظ ہیں اور آزادی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔"
 وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر مکملش میں رہ کر بولا۔
 "جیسے تم بوجھ و سار کرنا ہوگا۔ میں اپنی جولیا کو ہر قیمت پر
 وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی مجھ پر زیادہ بھروسہ نہ کرو۔ صرف اپنی بیٹی کو
 سمجھاؤ کہ وہ جنگی کے منہ اور دیوانگی سے فائدہ اٹھائے،
 اسے اپنے اشارے پر چلائے اور سسلی سے باہر آ جائے۔
 وہ جس ملک میں بھی پہنچے گی ہم اسے جنگی اور اس کے
 سیکورٹی گارڈز کے چنگل سے نکال لائیں گے پھر اسے
 محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا دیں گے۔ وہاں تمہارے آقا کا کوئی
 آدی نہیں پہنچ سکے گا۔"

بروز انوفون پر بیٹی سے رابطہ کرنے لگا۔ نیٹ ورک کی
 خرابی کے باعث کچھ دیر تک پریشانی رہی، پھر رابطہ ہو گیا۔
 وہ مرینہ کے مشورے کے مطابق بیٹی سے باتیں کرنے لگا۔

"کیا جنگی براؤن تمہاری بیٹی کو تار چر کرتا ہے؟ کیا اس
 کی عزت سے کھیلتا ہے؟"
 اس نے جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں،
 وہ نظریں نہیں ملارہا تھا۔ ایک باپ کے جھکے ہوئے سر نے
 بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں لیکن نظریں
 جھکی رہیں۔

وہ میرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ "جب سے وہ پیدا ہوئی
 تب سے دل میں رہتی ہے۔ ہم نے اسے پھول کی طرح رکھا۔
 وہ ہمارے لیے کالج کی گڑیا تھی۔ ہم اسے ٹوٹنے سے بچاتے
 رہے۔ وہ ایک باریبار ہوئی، قریب المرگ ہوئی۔ ہم نے موت
 سے لڑ کر بچالیا۔ لیکن آقا کے بیٹے سے نہ بچا سکے۔"
 اس نے ہونٹوں کو تختی سے بھیچا پھر ہونٹ غلے اس
 نے کہا۔ "میں نے دہلی زبان میں آقا سے شکایت کی۔ وہ
 سخت لہجے میں بولا۔ میرے بیٹے کے خلاف میرے منہ پر
 بول رہے ہو۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟ جولیا اسے پسند
 آگئی ہے تو دل بھانسنے دو۔ تمہاری تنخواہ بڑھا دی جائے
 گی۔ میں اس ملازم سے لعنت نہیں بھیج سکتا تھا۔ میں اس
 کے ایک ایک راز کا اٹن ہوں۔ ملازمت چھوڑنے کی بات
 کرتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔"

وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "جیری جینی کے کیسے
 کیسے بنے تھے۔ آقا زادے نے خاک کر دی ہے۔ وہ اس سے
 نفرت کرتی ہے لیکن نفرت ظاہر کرنے کی جرأت نہیں
 کر سکتی۔"

"وہ ظالم آقا کہتا ہے، انتظار کرو۔ جب میرے بیٹے
 کا دل بھر جائے گا تو اسے چھوڑ دے گا لیکن وہ نہیں چھوڑے
 گا، وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن میں صاحب ایک
 ملازم کی بیٹی کو نہیں بٹانا چاہتے۔"

مرینہ نے کہا۔ "آپ کی باتیں سن کر ایک کام کی بات
 معلوم ہوئی کہ جولیا، جنگی براؤن کے حواس پر چھا گئی ہے۔"
 "ہاں، جولیا کہہ رہی ہے کہ اس سے شادی کرنے کے
 لیے باپ کے خلاف بڑبڑاتا رہتا ہے۔"

مرینہ نے اسے سمجھایا۔ "جولیا اس کی اس کمزوری
 سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔"
 "وہ کیسے فائدہ اٹھائے گی؟"

"بیٹی سے بولیں وہ جنگی کو اپنے ساتھ لندن یا کسی
 دوسری جگہ سیر و تفریح کے لیے لے جائے۔ وہ سیکورٹی کے
 انتظامات کے ساتھ جولیا کو سسلی سے باہر لے جائے گا تو باپ
 اعتراض نہیں کرے گا۔"

اسے اپنی موجودہ حالت بتائی تو وہ باپ سے ملنے کے لیے پریشان ہو گئی۔ وہ وہاں کی پابندیوں سے بیزار تھی۔ باپ نے فرار کی راہ سمجھائی تو وہ راضی ہو گئی۔

میکلی براؤن کی طرف سے آنے والے خدمت گاروں نے فون پر بروزنانو سے کہا کہ وہ بیس منٹ میں آ رہے ہیں۔ مرینہ نے کہا۔ ”میں جا رہی ہوں، مجھے میکلی کے کسی کارندے کے سامنے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں فون کے ذریعے تم سے رابطہ رکھوں گی۔“

وہ اس سے مصافحہ کر کے اسپتال سے باہر آ گئی۔ شام چھ بجے کی فلائٹ سے مراد، ماروی اور عبداللہ کبڈی آنے والے تھے۔ اس وقت چارنچ رہے تھے۔ وہ اپنی ریختہ کار میں آ کر بیٹھ گئی، کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے کچھ دور جا کر رک گئی تاکہ میکلی براؤن کے آدمیوں کی نظروں میں نہ آئے۔ پھر اس نے فون نکال کر ماسٹر کو بوبو سے رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں مرینہ بوبو۔“

وہ بولی۔ ”تمہیں تو معلوم ہو چکا ہوگا، بلبے نے بڑی کامیاب واردات کی ہے۔“

”ہاں تلے نے بتایا ہے، اس کی دو گاڑیاں تباہ ہو گئی ہیں۔ اگرچہ وہ میکلی کے کسی ایک ممبر کو نقصان نہیں پہنچا سکا پھر بھی ایک اچھی کارکردگی دکھائی ہے، مراد علی کی کوشش سے اور زیادہ دہشت پھیلا دی ہے۔“

”ماسٹر! تلے کی اس واردات سے میں نے ایک بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ میکلی براؤن کے ایک بوڑھے رازدار پر مسل سیکرنگ کر کے روکنا کوثر پک کیا ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا واقعی؟“

”تمہیں یہ بھی پتہ چلے گا اور خوشی ہوگی کہ اس سے دوستی کر لی ہے۔ وہ مجھ پر اعتماد کر رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان فون کے ذریعے خفیہ رابطہ رہا ہے۔“

”تم نے ایسا کیا کیا ہے کہ وہ اپنے آقا کے خلاف تم سے دوستی رکھے گا؟“

مرینہ نے اسے بتایا کہ بروزنانو اپنے آقا سے بدظن ہو گیا ہے۔ آقا کے بیٹے نے اس کی بیٹی کوداشتہ بنا لیا ہے۔ وہ بیٹی کو سسلی سے باہر لانے کے لیے مرینہ کی پلاننگ پر عمل کر رہا ہے۔ وہ بولی۔ ”جب جو لیا جیسی کے ساتھ وہاں سے نکل کر کسی ملک میں پہنچے گی۔ تب میں، مراد اور جڈان کی سیکورٹی توڑ کر جو لیا کو رہائی دلاؤں گا۔ اسے اپنی پناہ میں نہیں رکھیں گے۔ اسی دن جیسی براؤن کو ٹھکانے لگا دیں گے۔“

”ویری ٹائس مرینہ! دوسرا بیٹا جائے گا تو میکلی

براؤن کی کمرٹوٹ جائے گی۔ یہ بتاؤ کیا تم ڈیوٹی پر واپس جاؤ گی؟“

”نہیں، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ پورا میٹ ڈپارٹمنٹ بھی چاہتا ہے کہ مراد کے ذریعے پچاس لاکھ ڈالرز وصول ہو جائیں۔ میں نے اس ملازمت پر لغت بھیج دی ہے۔“

”اچھا کیا۔ تمہیں ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم مراد کو جان سے زیادہ چاہتی ہو۔ میرا ہی کام کرتی رہو۔ میں میٹ والوں سے زیادہ بے کیا کروں گا۔“

”انہوں نے میرے اپارٹمنٹ پر پہرا بٹھا دیا ہے تاکہ میں ادھر جاؤں تو پکڑی جاؤں۔ میرے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے جینک اکاؤنٹ کو فریز کر دیا ہے۔“

”نہا اکاؤنٹ نئے نام سے کھولو۔ جتنی رقم جب چاہو گی وہاں جمع کرالو گی۔“

”تھیک ہے۔ میں ابھی انرپورٹ جا رہی ہوں۔ تم نے مراد اور ماروی کے لیے نکلنے والی فلائٹ میں سٹیش لی ہیں، وہ دو گھنٹے بعد سن سٹی گئے۔ مراد جانے ہوگی۔ میں ان کے ساتھ انرپورٹ میں دو گھنٹے گزاروں گی۔“

”میں اس وقت فون پر مراد سے باتیں کروں گا۔ یہاں اس کی رہائش اور سیکورٹی کے انتظامات مکمل ہیں۔ تم بروزنانو سے مل گئی رہو۔ کوشش کرو کہ اس کی بیٹی آج کل میں وہاں سے نکل آئے۔“

”میں کوشش کرتی رہوں گی۔“

وہ اٹھ ختم ہو گیا۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے انرپورٹ کی طرف جانے لگی۔ ابھی وہ ایک بات سے بے خبر تھی کہ بشری نے ایک چٹکا دینے والا کارنامہ انجام دیا ہے اور دشمنوں کی نئی پلاننگ کے مطابق میکلی براؤن کی بیٹی میڈونا کی شادی ڈی بلیک کے علاقے میں ہوئی۔

اس سے پہلے ہی تلے نے مراد بن کر انہیں چیلنج کیا ہے کہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ اس سلسلے میں دشمن منصوبہ بنا رہے تھے کہ میڈونا اور ایمان علی کی شادی کے بہانے مراد کو کس طرح ٹریپ کیا جائے گا۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ دشمنوں کے تمام منصوبے طشت ازبام ہو جائیں۔ اس لیے مرینہ، مراد اور جڈا ابھی بے خبر تھے۔

وہ انرپورٹ پہنچ گئی۔ وہاں ایک جگہ بیٹھ کر جہاز کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ فون کی رنگ نون نے اسے متوجہ کیا۔ اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے جین دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو؟“

Italiano[®]

Permanent Hair Colour Cream

*Colour Your
Life*

Esha Gupta

- ✓ Gives strength to hair
- ✓ Soft and glossy hair
- ✓ Even coverage
- ✓ No greys



Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner

*Available in 10 Different Shades



جنے کی آواز سنائی دی۔ "میں بلال احمد بلال بول رہا ہوں۔ ابھی ماسٹر نے تمہارا یہ نمبر دیا ہے اور کہا ہے تمہارے درمیان رابطہ رہنا چاہیے۔ مجھے تمہارے ساتھ کام کرنا ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے تمہارے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔ تم بہت اچھے جا رہے ہو۔"

"مراد ماروی کو لے کر آ رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا ہے۔ میں ابھی انٹرپورٹ میں ہوں۔ اس سے دور ہوں گا۔ میری وائف بشری عرف ملی میرے ساتھ ہے۔ وہ مراد اور ماروی کو پہلی بار دیکھنے آئی ہے۔"

وہ دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ "میں بھی یہاں ہوں۔ تمہارا نام تو سنا ہے لیکن ابھی دیکھا نہیں ہے۔" بلال بھی دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "میں بھی تمہیں صورت سے پہچان نہیں سکوں گا۔"

"میں چہرہ بدل چکی ہوں۔ جب مراد آئے گا اور میں اس سے ملوں گی تب مجھے دیکھ سکوں گے۔"

"کیا تمہیں اندر جانے کی اجازت ملے گی؟" "نہیں، ہم یہاں ٹیبلٹس مانیٹرنگ لابی میں جانی کے اطراف رہ کر ملیں گے۔"

اسی وقت لاؤڈ اسپیکر سے کہا گیا کہ پاکستان سے آنے والی فلائٹ رن وے پر اتر چکی ہے۔ وہ انتظار کرنے لگے۔ مراد کو کسٹم چیکنگ کے لیے نہیں جانا تھا کیونکہ وہ وہیں اندر رہ کر دوسری فلائٹ سے جانے والا تھا۔ اس نے اپنی ماروی کی ٹکٹیں وہاں سے حاصل کیں۔ اس میں اچھا خاصا وقت بچ رہا تھا۔

مرید عبداللہ کبڈی کو دیکھا۔ وہ وزٹرز لابی میں آ کر ٹینیس کورٹ کے ساتھ عمارت سے باہر جا رہا تھا۔ جب مراد ماروی کے ساتھ جانیوں کے پاس آیا تو مرید نے آکر کہا۔ "سر امیر نام تلاش ہے۔"

مراد پہلے ہی تلاش کے متعلق ماروی کو بتا چکا تھا کہ ماسٹر کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک کامران سے لندن انٹرپورٹ میں ملے گی وہ بے حد حسین بھی تھی۔ مراد نے کہا۔ "ماسٹر کہہ رہا تھا تم ہماری گائڈ بن کر رہو گی۔"

مرید نے کہا۔ "پہلے تو میں تمہاری وائف کا حاکم کرتی ہوں۔ ماشاء اللہ ایسا قدرتی حسن اور ایسی کشش ہمارے بار دیکھ رہی ہوں۔ پورا رنگ مراد!"

ماروی نے کہا۔ "شکریہ۔ مراد کہہ رہے تھے تم ہمارے ساتھ رہو گی۔"

"ہاں، دو چار روز میں ایک اہم معاملے سے نمٹنا ہے۔"

مراد کو یہاں آنا ہوگا۔ جب میں دن رات ساتھ رہا کروں گی۔" وہ مراد کو بروڈواں اور اس کی بیٹی کے پر ابھرتے ہوئے بولی۔ "میں نے نیکی براؤن کے اس راز دار بی اے کا اعتماد کسی حد تک حاصل کر لیا ہے۔ جب ہم اس کی بیٹی جولیا کو رہائی دلائیں گے اور اسے اپنی پناہ میں رکھیں گے تو بروڈواں ہم پر اعتماد دکر کرنے لگے گا اور ہمیں نیکی کی ایسی کمزوریاں بتاتا رہے گا جن سے ہم کھیلنے رہیں گے۔ اسے مٹی میں ملا تے رہیں گے۔"

بلال جانیوں سے دور اپنی ملی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ مراد جانی کے پاس کہاں کھڑا ہے۔

ملی نے کہا۔ "تم نہ بھی بتاؤ تب بھی پہچاننے کے لیے ماروی بھابی کا مشرقی حسن ہی کافی ہے۔ ہائے... کیسی من موہنی ہیں۔ جی چاہتا ہے دوڑ کے جاؤں اور کچے لگانوں۔"

"کچے لگانے جائے گی تو جانی سے ٹکرائے گی۔ تجھے سمجھایا ہے، ہمیں اللہ سے دور اجنبی بن کر رہنا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور جانی کے پاس کھڑی ہوئی مرید کو دیکھ رہا تھا۔ آئندہ اس کے ساتھ کام کرنا تھا۔ ادھر مراد ماسٹر سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ ماروی نے پوچھا۔ "ملاش! تمہاری شادی ہوگئی ہے؟"

وہ مسکرائی۔ سمجھتی ماروی کے دل میں اندیشے چٹکیاں لے رہے ہیں۔ اس نے کئی انکھیوں سے مراد کو دیکھا۔ "میں ایک جیلے سے محبت کرتی ہوں۔ جلد ہی اس سے شادی کرنے والی ہوں۔"

ماروی نے گھور کر کہا۔ "تم مجھ سے بول رہی ہو اور مراد کو دیکھ رہی ہو۔"

وہ پھر مسکرائی بولی۔ "ماسٹر سے ہونے والی باتیں سننے وقت تو دیکھنا ہی چاہیے گا۔ اتنا چھوٹا دل نہ رکھو۔ تمہارے مایاں کو ہزاروں عورتیں دیکھتی ہیں۔ ہماری دنیا میں مراد کا واسطہ قطعی ہی عورتوں سے نہیں ہے۔ کیا تم ان سب کو حکم دو گی کہ مراد کو نہ دیکھیں؟"

"میں انہیں عورتوں سے دور رکھنے کی کوشش کروں گی۔"

"تم ایک بہت ہی ایڈوائس اور ماڈرن عورتوں کے ملک میں آئی ہو۔ وقت اور حالات کے مطابق خود کو بدلنا چاہیے۔ ابھی یہ جالی رکاوٹ نہ بنی تو میں تم سے اور مراد سے مصالحت کرتی۔ آئندہ ملاقات میں کروں گی۔ تم اعتراض کرو گی تو ماسٹر مراد سے کہے گا کہ اس کی وائف بیک ورڈ پسماندہ اور ناخواندہ ہے۔ تم اپنے ساتھ مراد کی بھی انسلٹ کرو گی۔ پلیز

نے آواز دی۔ ”ایمان! مجھ سے منہ پھیر کر کیوں جا رہے ہو؟
یہ لڑکی کون ہے؟ تمہاری شادی مجھ سے ہونے والی ہے۔“
وہ ماروی کے ساتھ آگے جا کر ایک طرف مڑ کر نظروں
سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پھر چنچ پڑی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے ڈیڈا!
اسے روکیں۔“

مریدہ بھی وہاں سے دور ہو گئی تاکہ میکی براؤن اسے
نئے روپ میں نہ دیکھے۔ میکی دور تھا، اس نے بیٹی کی آواز
نہیں سنی۔ وہ دوڑتی ہوئی باپ کی طرف جانے لگی۔ بیٹی کے
بالکل قریب سے گزرنے لگی۔ اس لمحے میں بیٹی نے جیکے سے
ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ وہ توازن پر قرار نہ رکھ سکی۔ آگے کی
طرف اچھل کر فرش پر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس کی آنکھوں
کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ وہ فوراً ہی اٹھ نہ سکی۔
بیٹی نے دونوں ہاتھ جھارتے ہوئے ناگواری سے کہا۔
”امیری بھابی کا رستہ روک رہی تھی۔“

☆☆☆

بیٹی نے اسی حرکت کی تھی کہ بلڈ ایکدم سے پھٹا گیا
تھا۔ اس سر پھر نے اسے اس دشمن کی موجودگی میں میکی براؤن
کی بیٹی کو اوندھے منہ مڑا دیا۔ ایک بچکانہ حرکت کر کے جرائم
کی دنیا میں جتنے کے لیے اسے خطرات کو دعوت دی تھی۔
بلے نے فوراً ہی اس کے گداز بازو پکڑا اسے کھینچے ہوئے
وہاں سے دور لے جاتے ہوئے بڑبڑاتا تو کی پھمی ایہ کیا
کیا تو نے؟ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ابھی خیریت تھی کہ نصیب اچھے تھے۔ وہاں ان سے
بڑا دور تھے۔ کسی نے بیٹی کو میڈونا سے دشمنی کرتے نہیں
دیکھا تھا۔

جب وہ گرتے وقت چنچ پڑی، تب ماں باپ اور بھائی
نے سر اٹھا کر دیکھا پھر ان کے ساتھ سب گاؤں بھی دوڑتے
ہوئے آئے۔ وہ اسی پڑی تھی۔ گہری گہری سانسیں لے
رہی تھی۔

میکی براؤن نے بیٹی کے پاس فرش پر دوڑا نو ہو کر
اسے دونوں بازوؤں سے اٹھایا۔ پختہ فرش پر اوندھے منہ
گرنے کے باعث ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ماں اپنے
اسکارف سے لہو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”او مانگی گاڈو...! یہ کیا
ہو گیا؟ تم کیسے گر پڑیں؟ کیا کسی نے تمہیں گرایا ہے؟“

باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میں نے تمہاری آواز سنی
تھی۔ شاید تم چنچتی ہوئی کچھ کہہ رہی تھیں؟“

میڈونا کا سر جھک رہا تھا۔ اس نے جالیوں کی طرف سر
اٹھا کر دیکھا۔ وہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ادھر ہاتھ

اپنے مرد پر بھروسہ کیا۔ یہ تمہارا ہے، تمہارا ہی رہے گا۔“
بشری عرف ملی ماروی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔
اس نے بلے سے پوچھا۔ ”وہ کون عورت ہے، مراد بھائی
کے سامنے کھڑی ہے؟“

”وہ مراد کی طرح زبردست فائٹر ہے، آج سے میں
اس کے ساتھ رہ کر کام کروں گا۔“

”کوئی ضروری ہے عورت کے ساتھ رہ کر کام کرنا؟“
وہ عجیبہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔
”دیکھ بیٹی! لڑنے والی کوئی بات نہ کرنا۔ میں نے پہلی ہی
سمجھایا ہے ہم بھرمانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ بعض حالات
میں عورتوں کے ساتھ دن رات رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ بھروسہ
بھروسہ کرنا ہوگا۔ میں تیرا ہوں تیرا ہی رہوں گا۔“

وہ ہاتھ نیچا کر بولی۔ ”کروں گی بھروسہ۔ کرنا ہی
ہوگا مگر دیکھو تو اتنی دور سے صاف پتا چل رہا ہے کہ بھابی
اسے پسند نہیں کر رہی ہیں۔ وہ عورت ہے کون؟ بھابی کو
تکلیف ہو رہی ہے مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ تم
ابھی فون پر اس سے بول رہے تھے۔ ابھی بولو کہ وہاں سے
جائے نہیں تو۔۔۔۔۔“

وہ گھور کر بولا۔ ”نہیں تو؟“
”میں اس کے بال پکڑ کر وہاں سے نہینتی ہوئی لے
آؤں گی۔“
”پاکل ہوئی ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ میرے پاکستان کی بیٹی ہے، میری بھابی
ہے۔ کسی سو کن جیسی عورت کو برداشت نہیں کروں گی۔“
چپ ہو جا۔ وہ ابھی چلی جائے گی۔

وہ ایک سر پھر کر دیکھا رہا تھا۔ دوسری سر پھر کر آگئی۔
وہ میڈونا تھی، اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ کسی فلائٹ
سے سسلی جا رہی تھی۔ بلے نے میکی براؤن کو دیکھ کر زیر لب
کہا۔ ”یا خدا! یہ جانی دشمن کہاں سے آ گیا۔“

اس دشمن نے مراد۔ ایمان ملی کو معنی ہونے والے
داماد کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جالیوں سے بہت دور تھا۔ میڈونا کی
ضرورت سے ادھر جا رہی تھی۔ اس نے مراد کو دیکھ لیا۔ وہ
تڑپ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے چنچ پڑی۔ ایمان! تم
کہاں گئے تھے؟ کہاں سے آرہے ہو؟ باہر آؤ۔۔۔۔۔“

مراد اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا۔
”مصیبت آرہی ہے، میں جا رہا ہوں۔“

وہ دوڑتی ہوئی قریب آگئی تھی۔ مراد ماروی کا ہاتھ پکڑ
کر اس سے انجان بن کر وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔ اس

اٹھاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔ ”وہ... وہ ایمان...“
 وہ آگے نہ بول سکی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ سر پر بھی
 چوٹ آئی تھی۔ مٹی نے بہت ظلم کیا تھا۔ آخر وہ تکلیف سے
 کراہتی ہوئی بولی۔ ”پاپا... وہ ایمان وہاں ہے۔“
 ان سب نے جالیوں کی طرف دیکھا۔ وہاں ایمان تو
 کیا، کوئی بے ایمان بھی نہیں تھا۔ باپ نے کہا۔ ”مائی
 ڈیئر... کیا کہہ رہی ہو؟ وہاں تو صرف ٹھنڈے فلاحی کے
 مسافر ہوتے ہیں۔ کیا تم نے ایمان مٹی کو دیکھا ہے؟“
 وہ سر ہلا کر بولی۔ ”ہاں، وہ کسی جوان خوب صورت
 لڑکی کے ساتھ ہے۔ وہ اس کی کون ہوگی ڈیئر؟“

وہ باپ کا بازو پکڑ کر چھوڑتے ہوئے بولی۔ ”اسے
 پکڑیں۔ نہیں تو وہ چلا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے، اس کا دل پھر
 گیا ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے منہ پھیر کر اس لڑکی کے
 ساتھ چلا گیا ہے۔ وہ کون ہوگی؟ اسے پکڑیں ڈیئر...!“
 میکی براؤن اور جینی براؤن فوراً وہاں سے دوڑتے
 ہوئے جالی کے پاس آئے۔ مٹی نے اگرچہ جیکی کو زخمی کیا
 تھا۔ تاہم وہ میڈیکل ٹریٹمنٹ کے علاج چلنے پھرنے کے قابل
 ہو گیا تھا۔

وہ جالی کے پاس آ کر دو رنگ متلاشی نظروں سے دیکھنے
 لگے۔ اندر کئی مسافر عورتیں مرد اور بچے آتے جا رہے تھے۔
 دے رہے تھے۔ مرادی پر چھائیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔
 مرینہ ان سے دور ایک طرف کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ
 رہی تھی۔ پہلے پریشان تھی کہ مراد ان کی نظروں میں آ جائے گا
 تو کیا ہوگا؟ پھر اسے اطمینان ہو گیا کہ دشمن اس کی پر چھائیں
 بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہ بھی اطمینان تھا کہ وہ قانون کے خلاف اسے دیکھنے
 اور پکڑنے کے لیے اندھ نہیں جاسکیں گے۔ پھر اس نے
 مطمئن ہو کر سر گھما کر ایک سمت دیکھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر بڑا اونٹنی کی آواز میں جھگڑ
 رہے تھے۔ وہ اپنا ہاتھ جھڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”کیوں
 میرا ہاتھ پکڑا ہوا ہے؟ کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟“
 ”اری اوہ بہت خطرناک آدمی کی بیٹی ہے۔ ان کا ہوا
 خاندان مراد کا جانی دشمن ہے۔ اگر وہ تجھے دھمکی کرتے آج
 لیے تو ہمیں زندہ نہ چھوڑتے۔“

میڈونا فرش پر سے اٹھتے ہوئے ماں سے بولی۔ ”مام!
 میں دوڑتی ہوئی ڈیئر کو بولنے آ رہی تھی کہ ایمان ادھر ہے۔
 ایسے وقت کسی عورت نے میری پانچ پانچ ماری تھی۔“
 یہ بات چونکا دینے والی تھی کہ کسی نے براؤن فیملی کی

بیٹی کو گرایا تھا۔ تمام مسلح گارڈز متلاشی نظروں سے دور تک
 دیکھنے لگے۔ اس کی ماں بھی اس پاس کسی دشمن عورت
 کو تارنے لگی۔ پتا پہلے ہی اسے وہاں سے دور لے گیا تھا۔
 میڈونا گرنے سے پہلے اپنی دھن میں بھاگتی جا رہی
 تھی۔ وہ مٹی کی صورت نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس نے باپ
 اور بھائی کو دیکھا۔ وہ جالیوں کے پاس کھڑے ہوئے
 تھے۔ وہ بھی مرادی طرف سے اندھے ہو گئے تھے۔ وہ
 نظر نہیں آ رہا تھا۔

پلے نے پھر مٹی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چلتے ہوئے
 کہا۔ ”چل یہاں سے... وہ ماں بیٹی تجھے ڈھونڈ رہی ہیں۔
 کیا میڈونا نے دوڑتے وقت تجھے دیکھا تھا؟“

”میں کیا جانوں؟ دیکھا ہوگا۔ وہ خطرناک باپ کی
 بیٹی ہوگی۔ اپنے گھر میں۔ ادھ...!“ وہ حقارت سے
 بولی۔ ”تو مجھے دیکھا نہیں، وہ پانچ کی بیٹی بھائی اور مراد بھائی
 کو روکنے والی تھی۔“

وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”یہ بتا، یہ تمام کتے کیا اندر
 جا کر انہیں پکڑ سکیں گے؟“

”نہیں وہ میکی براؤن جتنا طاقتور اور وسیع ذرائع کا
 مالک ہے، اتنا ہی قانون کی نظروں میں ناقابل گرفت مجرم
 ہے۔ اس پر پابندیاں بہت ہیں۔ یہاں لاکھ پورٹ پر انہیں
 جس والے اس کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔“

وہ بولی۔ ”اللہ کرے یہ مر جائے۔ مراد بھائی کونسا ہے؟“
 پلے نے پارکنگ ایر یا میں آ کر کار کا اگھا دروازہ کھولا
 اور کہا۔ ”تو یہاں بیٹھ۔ میں کام سے جا رہا ہوں۔ خبردار
 میرے پاس آنے تک گاڑی سے باہر نہ نکلتا۔“

وہ ہاتھ بچا کر بولی۔ ”ارے واہ...! تجھے دیر ہوگی تو
 کیا ڈھونڈنے بھی نہ آؤں؟“

”کہہ دیا ایمان کے باہر نکلے گی تو مانگیں توڑ دوں
 گا۔ دیر ہوگی تو مجھے کال کر لینا۔“

وہ اسے کار میں چھوڑ کر تیزی سے چلتا ہوا پھر عمارت
 کے اندر آیا۔ مٹی کو وہاں سے دور کار میں بٹھانے کی ایک
 وجہ یہ تھی کہ وہ مرینہ سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔ عورتوں
 کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس لیے اسے وہاں چھوڑ
 آ رہا تھا۔

مرینہ ایک جگہ بیٹھی میکی براؤن اور اس کے آدمیوں کو
 ادھر ادھر آتے جاتے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب ہی جنس میں مبتلا
 تھے۔ کسی طرح معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایمان مٹی وہاں کس
 لڑکی کے ساتھ ہے اور کس فلاحی میں کہاں جا رہا ہے؟ میکی

میں اس سے نٹ لوں گی۔ شادی مجھ سے ہونے والی ہے اور وہ کسی دوسری کے ساتھ آسمانوں میں اڑتا پھر رہا ہے۔

بچے کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمن مراد تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یونہی خیال آرائیاں کرتے رہیں گے۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ کر مرینہ کے پاس آیا۔ وہ پہلی بار ایک دوسرے کے دربرو ہوئے تھے۔

مرینہ نے مسکراتے ہوئے اندازہ کیا کہ وہی بڑا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔ وہ جواباً مسکرا کر بولا۔ ”تمہاری آنکھیں سوال کر رہی ہیں اور جواب ہے کہ میں بڑا ہوں۔“

وہ میکی براؤن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہاں دشمن کی فیلے کے پاس رک کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ اطمینان ہوا ہے کہ وہ مراد تک نہیں پہنچ پائیں گے اور اب وہاں کا جہاز ٹیک آف کرنے والا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں اسی انتظار میں بیٹھی ہوں کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر نکل جائے۔“

بڑا اس کے قریب بیٹھنے ہوئے بولا۔ ”وہ اسے روک نہیں سکیں گے لیکن۔۔۔ کوئی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ سن سٹی جا رہا ہے اور وہاں ماسٹر کو یو یو کے ٹیکٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اب یہ دشمن معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ ایمان علی وہاں کیوں گیا ہے؟“

مرینہ نے کہا۔ ”ہاں، یہ گڑبڑ ہوئی ہے۔ اب وہ دشمن اس کی ٹوہ میں رہے گا۔ ماسٹر کو ابھی انفارم کرنا ہوگا۔“

اس نے اپنا فون نکال کر ماسٹر سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”یہاں از پورٹ میں مراد کا راستہ رکے والا تھا۔ میکی براؤن کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ سن سٹی جا رہا ہے۔ وہ یہاں تو اسے روک سکتا لیکن سن سٹی میں گڑبڑ کر سکتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”نہیں، باپ بھی یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ میرا ہاتھ ہے۔ یہاں صرف میری حکمرانی ہے۔ اس کے کسی شوٹر کو یہاں آنے تو دو۔ وہ ایک کی لاش دیکھ کر پھر کسی دوسرے کو ادھر نہیں بھیجے گا۔“ پھر اس نے پوچھا۔ ”تم اس کے پی اے پر وزنو اور اس کی بیٹی کے معاملے میں کیا کر رہی ہو؟“

”انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے اس کی بیٹی جو لیا آج کل میں جنگی کے ساتھ سسلی سے باہر آئے گی۔“

”ان کے ساتھ بہت ہی سخت سکیورٹی ہوگی۔ اس سے پہلے تم ٹھوس پلاننگ کرو۔“

”پہلے دیکھنا ہوگا کہ وہ دونوں کس ملک میں جائیں

براؤن کوشش کر رہا تھا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے اندر جانے کی اجازت مل جائے۔

بچے نے مرینہ سے ملاقات سے پہلے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو مرینہ۔۔۔ میں بڑا بول رہا ہوں۔“ وہ بولی۔ ”ہائے بچے۔۔۔ کہاں ہو تم؟ ابھی مجھ سے آکر ملو۔ ہمارے درمیان شاسانی ضروری ہے۔“

”میں یہیں از پورٹ پر ہوں۔ جب تم مراد سے باتیں کر رہی تھیں، جب میں نے تمہاری صورت دیکھی تھی۔ اس وقت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا میں قریب آ جاؤں؟“

اس نے دشمنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں مل سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، دشمنوں کو ہم پر غور نہیں ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”میرے موجودہ روپ میں کوئی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ کیا تمہیں کوئی دوست یا دشمن پہچان سکتا ہے؟“

”کوئی نہیں پہچانے گا۔“

”تو پھر چلے آ میں بھی ملنا چاہتی ہوں۔“ وہ فون بند کر کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میڈ ونا اور اس کی ماں کے قریب سے گزرنے کے لیے معلوم کرنا ضروری تھا کہ براؤن میکی کے افراد اب کیا کر رہے ہیں؟

اس وقت میکی اپنے بیٹے جنگی کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر بیٹی سے بولا۔ ”اتنا معلوم ہوا ہے کہ ابھی ایک جہاز سن سٹی جا رہا ہے۔ شاید ایمان علی اسی جہاز میں جائے گا۔“

وہ باپ کے پاس آکر بولی۔ ”پلیز ڈیڈ اسے مار دینا۔“

”جائے ندیں۔“

”میں اسے روک نہیں سکوں گا۔ ابھی صرف سن سٹی کے مسافروں کو جانے کی اجازت ہے۔“

بڑا قریب ہی رگ کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہاں آس پاس اور کئی مسافر ادوزیرز کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میکی نہ اس پر غور کر رہا تھا، نہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میکی نے سر ہما کر جالیوں کی طرف دیکھا پھر بیٹی سے کہا۔ ”ہمارے بدترین دشمن ماسٹر کو یو یو کا ہیڈ کوارٹر سن سٹی میں ہے۔ ایمان علی کا بھلا ماسٹر سے کیا لینا ہے؟ میں سوچ رہا ہوں وہ خواہ مخواہ ادھر کیوں جائے گا؟“

پھر اس نے انداز آ کہا۔ ”دیکھنے بعد ہمارا جہاز روانہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے، ایمان اسی جہاز سے کہیں جا رہا ہو؟“

میڈ ونا تو جیسے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اوگاڈ۔۔۔ اہیلپ پی۔ وہ میرے جہاز کا مسافر ہوگا تو

کے۔ وہاں کے ماحول اور حالات کے مطابق سوچا جائے گا۔“ پھر اس نے اپنے دل کی بات کہی۔ ”آپ یہ بات ذہن میں رکھیں۔ میں پہلے سے کہہ دیتی ہوں، وہاں مراد میرے لیے ضروری ہوگا۔ بہت ضروری ہوگا۔“

بلا اس کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”مراد سے بولیں کہ وہ اپنی مون ایک جگہ نہ منائے۔ جس ملک میں جولیا اور جیکی جائیں گے، وہاں بھی لہوا چھالنے کے لیے اپنی مون منائے چلا آئے۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”ہاں وہ جی دلہن کے ساتھ ہے۔ اسے یہاں سن سٹی میں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اسے ساتھ لے جائے گا، ابھی وہ دو گھنٹے میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔“

اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ مرینہ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میدان جنگ میں صرف فائٹر عورت کو جانا چاہیے۔ میں نے ماروی کے لیے کہہ تو دیا ہے لیکن وہ ایک سیدھی سادی سی شریک حیات ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی مشن پر رہے گی تو پراہلہم بن جائے گی۔“

پلے نے کہا۔ ”یہی مشکل میرے ساتھ ہے۔ میری بی بی فائٹر ہے، لیکن عورتوں والی لڑائی جانتی ہے۔ اس کے مشن میں کوشش کروں گا کہ اسے سینیں اپارمنٹ میں چھو نہ کر جاؤں۔“ پھر وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہائے ری عورت...! یہی بننے کے بعد چھپا نہیں چھوڑتی۔“

مرینہ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا ارادہ ہے... کیا بیزار ہو؟ اس سے کیا چھڑانا چاہتے ہو؟“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”عورت بیوی بننے کے بعد چھپا نہیں چھوڑتی۔“

”پھر تو وہ بوجھ بنتی ہوگی؟“

وہ پھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہرگز نہیں۔ یہاں معاملہ الٹا ہے۔ میں اس سے دور نہیں رہنا چاہتا۔ وہ ساتھ رہتی ہے۔ ایسی مزیدار باتیں کرتی ہے، ایسی دلچسپ حرکتیں کرتی ہے کہ میں بارود اور آگ سے گزرنے کی بجائے صحت مند بھول جاتا ہوں۔“

”جب تم نے میکی کے بیٹے کو گولی ماری تو کیا وہ تمہارے ساتھ تھی؟“

”نہیں وہاں بڑے خطرات تھے۔ میں اسے اپارمنٹ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میرا چچا کر رہی تھی۔“

”یہی تو کہہ رہی ہوں، عورت بیوی بننے کے بعد چھپا

نہیں چھوڑتی۔ کیا وہ کار چلا نا جانتی ہے؟“

”ہاں میں سن سٹی میں ٹریننگ حاصل کرتا رہا۔ وہ بھی بہت کچھ سیکھتی رہی۔ چھوٹی گمن چلا لیتی ہے مگر نشانہ پکا نہیں ہے۔“

پھر مسکرا کر بولا۔ ”لیکن بہت حیران کن ہے۔ کل اس نے اسٹینڈیم میں میکی کے دوسرے بیٹے پر گولی چلائی تھی۔“

”کیا واقعی...؟“

مرینہ نے بے چینی سے دو کھڑے ہوئے میکی کے بیٹے جیکی کو دیکھا۔ پلے نے کہا۔ ”اسے گولی چھو کر گزر گئی تھی۔ اس لیے چلتا پھرتا دکھائی دے رہا ہے۔ بشری کا نشانہ بھی پکا ہے۔“

مرینہ نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”پھر بھی لانے مرنے والی ہے۔“

اروی کی طرح صرف اپنے مرد کی پہرے دار تو نہیں ہے۔ تو بہت ہی شکی مزاج ہے۔“ پھر وہ ناگواری سے بولی۔ ”کیا تم نے دیکھا تھا، میں مراد سے باتیں کر رہی تھی اور اس کے تہور بدل گئے تھے۔“

”تم مادی کی بات کر رہی ہو۔ ادھر میری بی بی کے تہور بھی بدل گئے تھے۔ وہ تمہارے خلاف بول رہی تھی۔ دنیا کی تمام بیویاں اپنے حقوق کے مطابق جانتی ہیں کہ ان کے شوہروں سے کوئی دوسری عورت بات نہ کرے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”صاف نفرت آ رہا ہے۔“

”کچھ کل کھلائیں گی۔ میں نے دیکھا تھا وہ ابھی تمہارا تھا۔“

”میں اسے پارکنگ ایریا میں کار کے اندر بٹھا کر آیا ہوں اسے خاکہ کی ہے کہ ادھر نہ آئے۔“

وہ ہنسنے ہوئے بولی۔ ”آئے گی تو تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر گریبان سے پرکھ لے جائے گی۔“

”میں اسے اتنی دلچسپی نہیں دیتا کہ میرا گریبان پکڑ لے۔ یہ چاہتا ہوں کہ وہ تم سے دلچسپی نہ کرے۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے دیکھا تھا؟ میڈونا ٹوک کر کھا کر نہیں مگرتی تھی۔ بی بی نے ٹوک کر مار کر اسے گرایا تھا۔“

اس نے چونک کر حیرانی سے پلے کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”اوکھا! کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟“

”میڈونا باپ سے کہنے جارہی تھی کہ مراد ان جالیوں کے چپے ہے۔ اسے جانے سے روکا جائے۔ ایسے وقت بی بی کی کھوپڑی ٹھوم گئی۔ دماغ میں یہ بات سما گئی کہ کوئی اس کی ماروی بھالی کو جانے سے نہ روکے۔ اس نے میڈونا کو اونٹ سے منہ کر کر باپ تک پہنچنے سے روک دیا۔“

جواب بنے سے پہلے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا۔ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان سیاہ ٹیکرولڑکی وہاں آکر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک ہسٹول تھا۔

بلی کو اتنی عقل تھی کہ ہتھیار کے سامنے زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔ وہ کوئی مار کر فرار ہو جائیں گے۔ وہ چپ گئی۔ نجات حاصل کرنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔

جو پہلے کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہوا تھا، وہ وہاں سے ہٹ کر پچھلی سیٹ پر اس لڑکی کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے لائٹ کوٹ کے اندر سے شاٹ گن نکال لی تھی۔ بلی سمجھ گئی یا تو وہ لیسرے ہیں یا پھر بلی سے دشمنی رکھنے والے ہیں۔

ٹیکرولڑکی نے کہا۔ ”نورا بتاؤ تم کون ہو؟ اور جو آدمی مار رہا ہے، وہ تمہارا کون ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟“

بلی نے کہا۔ ”میرے مرد سے تمہیں کیا لیتا ہے؟ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟“

اس نے بلی سے سخت لہجے میں کہا۔ ”فضول باتیں نہ کرو۔ نورا بتاؤ کیا وہ ہماری طرح دھندا کرتا ہے؟ اگر تم دونوں ہمارے کام کے نہ ہوئے تو اس بلی سے بچنے کے لیے جاؤ گے۔“

اسٹیزنگ سیٹ پر بیٹھے ٹیکرولڑکی نے کہا۔ ”یہ کام کے ہیں یہ بلی براؤن کے دشمن ہیں۔ تب ہی اس نے میڈونا کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔“

بلی نے انگریزی بولی تھی مگر ایک ایک کر کے بلی بول رہی تھی۔ ”کیا بول رہے ہو؟ میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔“

وہ اسے کھانے کے انداز میں بولنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ”تم نے میڈونا کو کیوں گرایا تھا؟“

وہ ہاتھ نہ اٹھا کر بلی نے کہا۔ ”وہ میری بھالی کو جانے سے روکنا۔“

وہ لکھت چپ ہو گئی۔ یہ عقل آئی کہ ماروی اور مراد سے تعلق ظاہر کرے گی تو دشمن مراد کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ معلوم کریں گے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

پھر ان تینوں ٹیکرولڑکیوں کو معلوم ہو جاتا کہ بلی اور بلا مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات بتائے؟ اس نے کمزوری بات بتائی۔ ”وہ بات یہ ہے کہ مجھے بھی کبھی شرارت کرنا چھوٹا لگتا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق میری ایک ٹانگ بے اختیار اس کی

”مائی گاؤ! تمہاری صورت تو بڑی حیران کن ہے۔ کچھ کر گزرنے کے لیے دیر نہیں کرتی۔ تم اسے ڈھیل دیتے رہو گے اور وہ ایسی حرکتیں کرتی رہے گی تو مشکلات سے دو چار ہوتے رہو گے۔“

بلی نے کہا۔ ”اس نے دشمنوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ میں یہاں سے بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ میڈونا کے گاؤں زورور تک میری بلی کو تلاش کرنے کے لیے بھٹک رہے ہیں۔“

”بھتری اسی میں ہے کہ اپنی بیوی کو ہمارے معاملات سے دور ہی رکھا کرو۔ جاؤ، اسے یہاں سے دور لے جاؤ۔“

وہ کاری آگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بار بار بے چینی سے ادھر دیکھ رہی تھی، جدھر بلیا گیا تھا۔ آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ دل میں کھد بڑی ہو رہی تھی۔ یہ بات اس کے دماغ میں گھل رہی تھی کہ وہ حسین چڑیل بھادی بھالی سے باتیں کر رہی تھی۔ مراد بھالی تو بلی کے ٹیکرولڑکی اور بلیا دھری گیا ہے۔

اس نے بے چینی سے بھٹو بدل کر سوچا۔ ”میں بلی کو اس کے ساتھ کام کرنے سے نہیں روک سکوں گی۔ کیا کروں؟ ان لوگوں کا کام ہی ایسا ہے۔“

وہ کاری کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔ چاند کی دنیا میں عورتیں بھی بندوق چلاتی ہیں۔ میں نے بھی پتھر مارا ہے لیکن میں غیر مردوں کے ساتھ کام کرنے والی عورتوں کی طرح بے حیا اور بد معاش نہیں ہوں۔“

اس نے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ بلی کے پاس جانے کی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کاری سے ہٹ کر لکے اور عمارت کے اندر نہ آئے۔ وہ تذبذب میں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ونڈل پر تھا۔ اسے کھولے یا نہ کھولے یا نہ جائے یا نہ جائے؟

ایسے ہی وقت ایک شخص اس کے پاس آیا۔ اس کے قریب کھڑکی پر جھک گیا۔ وہ ایک سیاہ ٹیکرولڑکی کا لالہ چہرے پر دو سفید دیدے چمک رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تو سفید دانت یوں لگے جیسے اسے چبانے کے لیے آیا ہو۔

اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ”اسے تم کون ہو؟“ اس نے جواب نہیں دیا۔ دوسرا ٹیکرولڑکی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہسٹول تھا لیکن وہ خوفزدہ ہونے والی نہیں تھی۔

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟ میری گاڑی میں کیوں آئے ہو؟“

ناگھوں سے الجھ گئی۔“

ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم بات بنا رہی ہو۔ چالاک نہ بنو۔ تم نے شرارت نہیں کی تھی۔ تمہارا آدمی جانتا ہے کہ تم نے ایک بہت خطرناک شخص کی بیٹی کو گرایا ہے۔ اسی لیے وہ فوراً ہی تمہیں پکڑ کر وہاں سے یہاں لے آیا ہے۔“

تیکرولڑکی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہارا آدمی کرتا کیا ہے؟ جلدی بولو۔“

وہ الجھی ہوئی تھی کہ کیا جواب دے؟ ایسے وقت ایک پولیس افسر گاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کئی گاڑیوں کے شیشوں سے جھانک کر اندر دیکھتا جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کی طرف چلا آ رہا تھا۔

پچھلی سیٹ پر لائٹ کوٹ والے نے فوراً ہی شاٹ گن کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ”کسمبو لا.....! گاڑی یہاں سے نکالو۔ ورنہ افسر ایک ایٹھ پانچ لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ہم پر شبہ کرے گا۔“

کسمبو لائے اسٹارٹ کر کے گاڑی اسٹارٹ کی۔ بیٹی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میں نکل جاؤں گی۔ اپنے آدمی کو بلاتی ہوں۔ اس کے ساتھ جاؤں گی۔“

پچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے پستول نکال کر اس کی پسلی سے لگا دی۔ بڑی سفاکی سے بولی۔ ”اگر شور مچاؤ گی تو ہمارے خلاف کچھ بولو گی جو میری جوانی میں جاؤ گی۔“

وہ ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ کھڑکی کے باہر ہونے لگی، جیسے کار سے نکل کر بھاگنا چاہتی ہو۔

کسمبو لائے کار کو وہاں سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھو، اگر کوئی بھی پولیس والا روکے اور قریب آئے تو تم مسکرا کر ہم سے بولتی رہو گی۔“

”میں صرف اپنے مرد سے مسکرا کر بولتی ہوں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”کوئی نہ کرو۔ اگر کوئی چالاکی دکھاؤ گی، ہمیں گرفتار کرانا چاہوں تو ہم گرفتار ہونے سے پہلے تمہیں گولی مار کر سزائے موت ضرور دے گا۔“

تیکرولڑکی نے پستول کی نال کو اس کی تھلی میں گزاتے ہوئے کہا۔ ”زندہ رہنا چاہتی ہو، اپنے آدمی سے ملنا چاہتی ہو تو وی کرتی رہو جو ہم کہہ رہے ہیں۔“

کار پارکنگ ایریا سے نکل رہی تھی۔ بیٹی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ دعا مانگ رہی تھی کہ جتنا نظر آ جائے۔ وہ اس سے دور جانا نہیں چاہتی تھی۔ فی الحال ان کی پڑائی تھی۔ اس سر پھری کو اپنے مرد کا ذرا بھی سہارا ملتا تو وہ انخواہونے سے انکار کر دیتی۔ جو ہونی ہے، وہ ہو کر رہتی ہے۔ پھر یہی ہوا وہ کار

پارکنگ لائٹ سے نکل کر عمارت کے سامنے کشادہ سڑک پر آئی اور ذرا رک گئی۔ کچھ ہونے والا تھا۔ آگے ٹریفک کانسٹیبل گاڑیوں کو روک روک کر آگے جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ بیٹی کی پسلی سے پستول لگا ہوا تھا اور اس کی اپنی کہنی بھی پستول کے قریب ہی تھی۔ وہ چاہتی تو ایک ذرا ہاتھ پیچھے کر کے اس پستول کو پکڑ سکتی تھی۔ اس کے اندر کی بے چینی کہہ رہی تھی کہ جو ہوتا ہے ہو جائے کچھ کر... یہاں سے نکل... عقل نے کہا۔ ”یہ لوگ ایسی بھری پری جگہ گولیاں نہیں چلائیں گے۔ انہیں فرار ہونے کا کھلا راستہ نہیں ملے گا۔ بیٹی! کچھ کر جا۔ نہیں تو بے سے پھڑ جائے گی۔“

ایسے ہی وقت بلڈ باتیں کرتا ہوا مرینہ کی کار کی طرف جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بیٹی کے اندر بارود بھر گیا۔ اب کوئی اسے روکنا نہیں رہا۔ اس نے اپنا کمر اس کی طرف کر دیا۔ اس کے ہاتھ کو پستول سمیٹ کر لیا اور اسے پیچھے کی طرف سے ہٹا کر اس کا رخ ڈیس بورڈ کی طرف کر دیا۔ اس کے کونے کونے پر اس کا ہاتھ پھرانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بیٹی کی اس حرکت سے پریشان ہو گئے تھے۔ ان لحاظ میں وہ اس پر جوابی حملہ کر سکتے تھے، نہ اپنی اپنی کن نکل کر گولیاں چلا سکتے تھے۔ آگے پیچھے گاڑیاں تھیں، لوگوں کا ہجوم تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ قریب سے گزرنے والے شیشے سے جھانک کر کار کے اندر ہونے والی خاموش جدوجہد کو دیکھ سکتے تھے۔

لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے پیچھے سے اٹھ کر بیٹی کے ہاتھ پر اور گردن کو پکڑ لیا تھا۔ بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ ”پکڑ لیا ہو جاؤ۔ منہ سے آواز نہ نکالو۔ ہم دوست ہیں ابھی نہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“

بیٹی کے ہاتھ میں پستول آ گیا تھا۔ اس نے فائر کرنا چاہا تو وہ چل نہ سکا۔ پیچھے سے پکڑی ہوئی تھی۔ اس کا منہ اوپر کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ پستول کو پکڑ نہیں سکتی تھی لیکن سمجھتی تھی کہ وہ لاکھ ہے، اس نے دیر نہیں کی۔ فوراً ہی سیٹنی کچ کو ہٹا کر ٹھامیں کی زوردار آواز کے ساتھ گولی چلا دی۔

آخر طوفانی بلڈ بین بیٹھی۔ اسے پکڑنے والے بوکھلا کر پیچھے سیٹ پر الٹ گئے۔

کسمبو لائے راستہ پاتے ہی کار کی رفتار بڑھائی۔ وہ بھی پھر چلی تھی، اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ اس نے جان پر کھیل جانے والا خطرہ مول لیا تھا۔ بیٹے کو کچھ لینے کے بعد اب اسے کوئی دوست یا دشمن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی اندھی دلیری دشمنوں کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ وہ کار سے

اندھ چلے گئے۔

پولیس کی چھ گاڑیوں نے اس وسیع و عریض شاہجہاں بازار کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انیس فون کے ذریعے بتایا گیا تھا کہ فرار ہونے والے تینوں مجرم نیکرو ہیں اور وہ کالے کلوٹے لاکھوں میں بیچا گئے جاسکتے تھے۔

وہاں پولیس کے سیکس سپاہی اور زیادہ تعداد میں آگئے تھے۔ اعلان کیا جا رہا تھا کہ کسی کالے آدی یا کالی عورت کو چینگ کے بغیر عمارت سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ ایسا طریقہ کار تھا کہ وہ تینوں عمارت سے باہر نہیں

چھلانگ لگا کر نیچے گر کر لڑھکتی ہوئی ایک گاڑی کے سرسٹے آئی۔ وہ گاڑی زوردار بریک کے ساتھ رک گئی ورنہ وہ چلی جاتی۔ وہاں گولی چلتے ہی ہنگامہ شروع ہو گئی تھی۔ پولیس والے اپنی ٹیمیں سنبھالتے ہوئے دوڑتے آ رہے تھے۔

چلے نے فائرنگ کی آواز سن کر ادھر دیکھا۔ پھر اپنی بیٹی کو دیکھتے ہی حیرت سے چیخ پڑا۔ "بھئی...!"

وہ اسے آواز سن دیتے ہوئے دوڑتے ہوئے آنے لگا۔ وہ ایک کار کے آگے جم جانے کے بعد وہیں زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے پستول کو تھام کر پڑی جی داری سے بھاگنے والے دشمنوں کی طرف فائر کر رہی تھی۔

وہ تینوں کار کے اندر تھے اور تیز رفتاری سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی ان کے پیچھے دوڑنے لگی تھی۔

مرینہ دور کھڑی تھی۔ بیٹی کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ "واؤ... چلتی کار سے چھلانگ لگائی ہے۔ ایکشن سے کبھی رپ ہے۔ پتا نہیں کن دشمنوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد ان کا فائر کر رہی ہے۔"

اس نے سرگھا کر دیکھا فرار ہونے والے کار سمیت نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی بیٹی کی طرف آئی۔ چلے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زمین پر اٹھا کر بیٹھنے سے لگا لیا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟

پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی آگئے تھے۔ بیٹی کو چاروں طرف سے گھیر کر پوچھ رہے تھے کہ وہ کون لوگ تھے؟ ان کے کون ٹریپ کر رہے تھے؟ اور اسے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

ان دوران میں وہ ان تمام پولیس موبائل گاڑیوں سے رابطہ کر رہے تھے جو ان نیکروز کے تعاقب میں تھیں۔ ان تینوں کی تو جاکر برہنہ آئی تھی۔ ان کی شامت آگئی تھی۔ واردات کرنے والے انہیں طرح جانتے ہیں کہ لندن پولیس کے گھیرے سے بچ لکھا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

پورے شہر میں موبائل پولیس کار میں کاجال بچھا رہا ہے۔ وہ سب وائرلیس کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اور وہ سب بہت ہی سنجیدہ اور فعال ہوتے ہیں۔

فرار ہونے والے بھی پرانے کھلاڑی تھے۔ یہ جاننے تھے کہ لمبی دوڑ کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے۔ انہوں نے ایک معروف علاقے میں دس منزلہ شاہجہاں بازار کے سامنے کار روک دی پھر وہاں سے نکل کر دوڑتے ہوئے عمارت کے

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے ہمیں شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچا ملنے کی صورت میں ادارہ کے کوئٹہ یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ ایک سال کا تمام جال پرچا دستیاب ہو

☆ شہر اور علاقے کا نام

☆ مگر ہر ایک سال IPTCL پرچا ہر ایک فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیروز ٹیکسٹائٹس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

جاسکتے تھے۔ انہوں نے اپنی گھنٹیں پیسک دی تھیں۔ اس کے بعد کوئی غیر قانونی سامان ان کے پاس نہیں تھا۔ پھر بھی ان کے آئی ڈی کارڈز اور ان کا پیشہ معلوم کر کے ان پر شبہ کیا جاسکتا تھا کہ وہی مجرم ہیں۔

وہاں گراؤنڈ فلور سے دسویں منزل تک گھنٹوں چینگ جاری رہی۔ وہ تینوں نگاہوں میں نہیں آ رہے تھے۔ نیچے سے اوپر تک تمام منزلوں میں گورے اور کالے سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ ان میں گاہک بھی تھے اور سیکڑے بھی تھے۔ تقریباً چاس ٹیکرو عورتیں اور مرد سیکڑے تھے اور اپنے اپنے کاؤنٹر کے پیچھے گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ وہ تینوں وہاں پہنچتے ہی سیکڑے بن گئے تھے۔

یہ تحفظ اس لیے حاصل ہوا کہ وہ شاپنگ پلازا ان کے ٹیکرو مالکان کا تھا۔ ایک پولیس افسر اور دوسرا غرساں نے ان کاؤنٹرز پر آ کر تینوں کا محاسبہ کیا۔ وہاں ملازمت کے سلسلے میں ان کے جو قانونی کاغذات تھے، وہ انہیں برسوں سے کام کرنے والے سیکڑے کے پاس رکھے رہے تھے۔ ان پر ایک ذرا بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سہاٹی اور سراغ رساں مطلوبہ مجرموں کو پکڑنے کے لیے بھٹکنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔

تین گھنٹے کے بعد انہوں نے گاہکوں کو خامصرہ ختم کر دیا۔ اس شاپنگ پلازا کا مالک جیسے ہارڈوئیر فروش فلور پر رہتا تھا۔ اس نے تینوں کو آفس میں طلب کیا پھر پوچھا: "کیا چکے ہو، پہلے تم لوگوں سے ایسی غلطی نہیں ہوئی۔ ان پولیس وائس کو کیسے پیچھے لگایا تھا؟"

ملا نے کہا: "ہم سیکڑے براؤن کی چھوٹی بیٹی باری ڈول کو اغوا کر رہے تھے۔ وہاں اسٹورٹ پر سیکڑے کی بیٹی بیٹی اور بیٹا تھا۔ باری ڈول نہیں تھی۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ بچی کو سسلی کے محل میں چھوڑ کر گئے ہیں۔"

جیسے ہارڈوئیر نے کہا: "جب وہ بچی نہیں تھی، کوئی واردات نہیں کی تھی تو پولیس کیوں پیچھے پڑ گئی؟"

ٹیکرو لڑکی نے کہا: "بگ باس نے ہم کو اغوا کیا تھا کہ بچی کو اغوا نہ کر سکیں تو اس کے بیٹے جینی براؤن کو کوئی ملا دیں۔ مراد کسی دن اسے ہلاک کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے ہم گرفتار کریں گے تو ازراہ مراد پر ہی آئے گا۔ نہ سیکڑے ہم پر شبہ کرے گا نہ ہمارے پیچھے اپنے شوٹرز لگائے گا۔"

باس نے پوچھا: "بگ باس کا دماغ بہت کام کرتا ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس کے بیٹے پر گولی چلائی ہے؟" "نو باس... وہاں ہجوم میں بچی کو اغوا کیا جاسکتا تھا۔ کسی پر گولی چلا کر ہم فرار نہیں ہو سکتے تھے۔"

"پھر تم لوگوں نے ایسا کیا کیا کہ پولیس پیچھے پڑ گئی؟" "ہم ایک ایشیائی لڑکی کو ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔"

ہارڈوئیر نے فحشے سے کہا: "ہم سے اجازت حاصل کیے بغیر غنی واردات کیوں کی؟ کون تھی وہ ایشیائی لڑکی...؟" "وہ میز پر گھومنا مارتے ہوئے بولا۔" "تجی تو عقل ہوتی چاہیے کہ وہاں لوگوں کا اور ٹریپنگ کا ہجوم ہوتا ہے۔" وہ بتانے لگے کہ ملی نے کس طرح سیکڑے کی بیٹی کو فٹو کر مار کر گرایا تھا۔ اس کی حرکت سے اندازہ ہوا کہ وہ سیکڑے براؤن کی دشمن ہے۔ آئندہ باری کو اغوا کرنے یا جینی کا مرڈر کرنے کے سلسلے میں ہمارے کام آئے گی۔

ان ٹیکرو لڑکیوں کا بگ باس چاہتا تھا کہ مراد کسی طرح ماسٹر کو لایو کو چھوڑ کر اس کا کام کرے۔ وہ ماسٹر سے زیادہ اسے جیٹھ لایو سوتیں دینے کی آفر کر چکا تھا۔

ملا نے کہا: "جس ایشیائی لڑکی کو ہم ٹریپ کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اندازہ ہوا کہ وہ مسلمان ہے اور پاکستانی ہوگی تو مراد اس کا کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ یوں ہم مراد کے قریب پہنچ کر اسے دست بٹا سکیں گے۔"

ٹیکرو گرل نے کہا: "بگ باس نے سختی سے تاکید کی ہے کہ جب تک مراد سے دوستی نہ ہو، وہ ہمارے لیے کام کرنے پر راضی نہ ہو، جب تک ماسٹر کو لایو کو ہماری پلاننگ سے بے خبر رہنا چاہیے۔"

باس نے پوچھا: "ابھی کیا ہوا؟ یہاں چھپنے والے ایشیائی لڑکی کو ٹریپ نہ کر سکے؟"

ملا نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ ایک سیدھی سادی عام سی لڑکی تھی اور ہمارے قابو میں بھی آئی تھی پھر اچانک ہی اس نے حمہ ان کر دیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ زونا سلا سے بھاگ کر آئی تھی۔ ہم سبیت بن جائے گی۔ اس نے ایسی بھڑکی اور جی داری دکھائی کہ ہم اپنی سلامتی کے لیے وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔"

باس ناگواری سے ان کے بیانات سن رہا تھا۔ پھر وہ بگ باس سے فون پر رابطہ کرنے لگا۔

وہ بگ باس کون تھا؟

میکائو رابرٹ ہیروں کا تاجر تھا۔ دنیا کی چھٹی بڑی دکان کی کان "کا کونا ڈائنمنڈ مائن" میں اڑتیس فیصد کا شیئر ہولڈر تھا۔ اس کی ایک لمبی ہسٹری تھی۔ وہ برسوں سے مجرمانہ زندگی گزارتا ہوا ہیروں کا تاجر بن بیٹھا تھا۔ بے انتہا دولت حاصل کرنے کے باوجود اس کی مجرمانہ سرشت باقی تھی۔ اس کی مجرمانہ تنظیم ڈیٹرنگ ڈائنمنڈ ٹریڈر کہلاتی تھی۔

عشق کھیل جسے

ایک شخص نے بس میں بیٹھے ہوئے مایوس اور افسردہ شخص کو دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا۔
”مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور ناکام ہو گئے۔“

وہ صاحب جھٹاکر بولے۔ ”میں نے زندگی میں ایک بار عشق کیا تھا اور بد قسمتی سے کامیاب ہو گیا۔“

مرسلہ: حسنین عباس، کمیل عباس، گلپناہ روڈ کھاریاں

معروف چلی خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ آئندہ بڑنس پھلے پھولے گا۔ سمیرا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ جس ماروی سے محبت حاصل کرنا ممکن نہیں تھا وہ جا چکی تھی۔

محبوب بڑی حد تک ماروی کو نظر انداز کر کے اس کی باتوں کو سمجھتا تھا۔ اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ جلد ہی اسے اپنی شریک حیات بنالے گا۔ اس میں شبہ نہیں تھا۔ حالات بدل گئے تھے۔ ادھر ماروی اور مراد کے لیے اور ادھر سمیرا کے لیے اب ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات تھی۔ محبوب نے سمیرا سے یہ وعدہ لیا تھا کہ کبھی مراد سے کسی وجہ سے ٹھنڈی ہوئی باوہ دنیا میں نہیں رہے گا تو وہ محبوب کی پناہ میں آ جائے گی۔

اسی طرح ماروی نے بھی اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی غیر یقینی وابستگی تھانہ رہے۔ سمیرا کو اپنی شریک حیات بنالے۔ اب تو محبت ہونا تھا۔ سمیرا شادی سے پہلے ہی اس کی چلی گئی تھی۔ اس نے ماروی کو رخصت کیا تھا پھر انر پورٹ سے گھر واپس آ کر ٹھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گر پڑا تھا۔ وہ دبا ہوا سپاہی تھا۔ بڑے حوصلے سے چپ چاپ ناکائی اور شکست کو برداشت کر رہا تھا۔ اس نے اپنے فون کو دیکھا پھر سوچا۔ اس کے بعد نمبر بیج کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ”ہائے سمیرا!... آخر وہ چلی ہی گئی۔ بچھری گئی۔“

سمیرا نے کہا۔ ”ہم اس کے لیے دعا کر سکتے ہیں۔ خدا اسے سلامتی دے۔ وہ اپنے مراد کے ساتھ دنیا گھومتی رہے۔ ہمیشہ ہمیشہ و عشرت سے رہے۔ یہاں بھی وابستگی نہ آئے۔“

”وہ واپس آئے یا نہ آئے، تم آ رہی ہو۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے لیے اگلا جو کسار ہے گا؟“

اس نے ایسا خوشگوار دمکا کا کیا کہ وہ خوشی سے ہنسنے لگی۔ ”او مانگی گڈ ٹیمس۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ آئی لو یو محبوب! میں تو خوشی سے اچھل پڑی ہوں۔“

اس عظیم میں اور دو خطرناک مجرم اس کے پارٹنر تھے۔ ان میں سے ایک شاپنگ پلازا کا مالک جیمس ہارورڈ اور دوسرا پارٹنر ایک انڈین کرمل کریش راؤ تھا۔ وہ دونوں پارٹنر میکا نو رابرٹ کو بگ باس کہتے تھے۔

جیمس ہارورڈ نے رابطہ ہونے پر بگ باس کو بتایا کہ ان کے تین ٹیکو کارندے کسی طرح انر پورٹ میں ناکام ہو کر چھپنے کے لیے اس کے پاس آئے ہیں۔ فی الحال خیریت سے ہیں۔ وہ تینوں قانونی گرفت میں نہیں آئیں گے۔

میکا نو رابرٹ نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”کامیابی اور ناکامی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ہمیں اس ہلاکی کو اہمیت دینی ہے جیسے وہ ٹریپ کرنے میں ناکام رہے۔“
وہ مسلمان ہے۔ اگر پاکستانی ہوگی تو مراد سے اس کا تعلق ضرور ہوگا۔“

دوست ہوں یا دشمن سب ہی مراد کے پیچھے پڑے تھے۔ اسے دشمنی سے مارنا چاہتے تھے اور دوستی سے ہر قیمت پر اسے اپنی عظیم کامیابی سے بچاتے تھے۔ میکا نو رابرٹ کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں کسی بھی طرح مراد کو اپنی عظیم میں لانا ہے۔ ان تینوں سے کہو، کسی طرح جی ایس کو کسی پروردہ دور سے نظر رکھیں، معلوم کریں کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے، اس کے ساتھ اور کون لوگ ہیں؟“

جیمس ہارورڈ نے گھبراہٹ سے پوچھا۔ ”میکا، تم لوگ اس ہلاکی تک دوبارہ پہنچ سکو گے؟“

وہ بولا۔ ”معلومات کا ایک ہی راستہ ہے۔ ہم اس کی کار میں مراد کو لے آئیں گے، کار کا نمبر بھی یاد ہے۔ رجسٹریشن آفس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کار کا مالک کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس طرح ہم اس کی شاطر حیرت تک پہنچ سکیں گے۔“

وہ پھر ملی ٹریپ کرنے کی پلاننگ کرنے لگے۔ اس سلسلے میں یہ احتیاط برتنے والے تھے کہ ملی کو پہلے رازداری سے ٹھنڈے میں لیا جائے گا۔ جب ٹھنڈے ہو جائے گا کہ اس کا تعلق مراد سے ہے تب اپنے سے دوستی کی جائے گی یعنی آئندہ بھی صرف ملی سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔

☆☆☆☆

جب خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ تمام دلتہ ردور ہو گئے۔ اب ناکامیاں لوٹ کر نہیں آئیں گی۔ کامیابیوں کا نشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبوب کے معاملے میں سمیرا اور معروف چلی کو اب دلی سکون حاصل ہو رہا تھا۔ ماروی مراد کی دہن بن کر جا چکی تھی۔ اس کو بھی سے اس شہر سے اور اپنے وطن سے دور چلی گئی تھی۔

دیکھا جاتا تو انکشاف ہوتا کہ خوش خبری میں جو لفظ خوش ہے اسے ماروی لے گئی تھی۔

اس کے آنے تک اسے ایک بزنس مین کی حیثیت سے ایک نارمل زندگی گزارتے رہنا تھا۔ اس لیے شادی محض ایک خبر تھی۔ اس کے جانے سے ویرانی اور سناٹا چھا گیا تھا۔ اس خلا کو بھرنے بولنے ناپنے گانے کے دھوم دھڑا کے سے بھر دینا تھا۔

ان خوشیوں سے اور موجودہ حالات سے قطع نظر اب بات ذرا دوسرے رخ سے ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اپنے پہلے لمحے سے موت کے پیچھے چلتی رہتی ہے۔ ابھی اچانک معلوم ہونے سے پہلے ہی موت اسے دبوچ کر اس کا دلقت پورا کر دیتی ہے۔ محبوب کے ساتھ بھی موت بڑی جلاوطنی سے چل رہی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک موت نہیں آتی مرنا نہیں آتی رہتی ہے۔

شادی اس طرح آ رہی تھی کہ وہ مراد کا ہم شکل تھا۔ دشمنوں کو بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ مراد ہی تھی نہیں ہے۔ محبوب علی جانڈیو ہے۔

دشمن جانے پہچانے ہوئے تو ان کے پاس جا کر یا فون کے ذریعے مراد اور محبوب کا فرق سمجھا جاتا۔ فی الحال محبوب سخت سکیورٹی میں رہتا تھا۔ چار دیواری سے باہر نہیں جاتا تو اس کے آگے پیچھے سگ کارڈز کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ پھر عدالت رکھنے والوں کو رفتہ رفتہ یہ معلوم ہونے لگا کہ مراد پاکستان میں نہیں رہتا ہے۔ بے پورہ دہلی اور لندن میں شادی کے علاوہ نیکی براؤن کا بیٹا مارا گیا تھا۔ اس طرح یقین ہو گیا تھا کہ مراد پاکستان میں نہیں ہے وہاں ایک معزز بزنس مین محبوب علی جانڈیو اس کا ہم شکل ہے۔

پھر بھی پوری طرح یقین نہیں تھا۔ یہ شب تھا کہ مراد نے دہری شخصیت اختیار کر لی ہے۔ وہ پاکستان میں معزز پر امن شہری بن کر رہتا ہے اور وہاں سے باہر آگ اور لہو کا کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے اندازے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔

تمام شوٹرز اور جاسوس اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی دن بھی ہم شکل بننے والی مکاری کھل کر سامنے آجائے گی۔ یہ تو محض اندازہ تھا لیکن قدرت کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ جب اچانک ہی کھیل شروع ہوتا ہے تب پتا چلتا ہے کہ جیتے جیتے جام بدل جاتے ہیں۔ محبوب بے خبر تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ کاروباری

وہ واقعی خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ کمرے میں ادھر سے ادھر بھاگنے کے انداز میں چل رہی تھی۔ سکون سے ایک جگہ بیٹھ نہیں پارہی تھی۔ بے اختیار ماروی کو دعائیں دیے جا رہی تھی۔ "ماروی جیوے۔ ہزار برس جیوے۔ اس پر خدا کی رحمت ہو۔ اس کے جاتے ہی آپ میرے ہو رہے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں جانتا تھا، میرے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر تم خوشی سے پاگل ہوئے لگو گی۔"

"سچ کہہ رہی ہوں میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔"

"میں ابھی معروف صاحب سے کہہ رہا ہوں۔ وہ آج ہی تمہاری می پاپا کے پاس جائیں گے۔ میرے لیے تمہارے رشتہ مانگیں گے۔ یہ بتاؤ نکاح خوانی کے لیے جیسے کا دن کیسا رہے گا؟"

وہ جلدی سے اٹھیں اور پر مٹھتے ہوئے بولی۔ "آج سے چار دنوں بعد جمعہ ہے۔ مجھے پانچویں دن آپ کی کمر والی بن جاؤں گی۔"

"ہاں وقت بہت لمبا ہے۔ شادی دھوم دھام سے ہوگی۔"

"یا اللہ... اتنی جلدی دھوم دھام کی ہوگی؟"

"یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ ہم بزنس کیونٹی کے بنائے ہوئے معزز افراد کو کیسے نظر انداز کریں گے؟ ان سب کو مدعو کرنا ہوگا۔ تم دیکھ لیتے، ہماری شادی یادگار ہوگی۔ سچ سمندر میں بحری جہاز کے بیچ خیال میں شادی کی تقریب ہوگی۔"

اس بات میں سمیرا کی مسرتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جلد پر چاروں شانے چت ہو کر بولی۔ "ادگا ڈا! اتنی مہنگی اور زبردست تقریب ہوگی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ اتنی بڑی تیاریاں کیسے ہوں گی؟"

"فکر نہ کرو۔ میں سب سے انتظامات کر رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھو۔ اب تم پردہ کرنا کی بجائے ہنسنے لگی۔ محبوب نے پوچھا۔ "یہ پردہ داری کیسی لگے گی؟"

"بڑی اچھی لگے گی۔ ایسی لگے گی جیسے آپ نے ابھی تک مجھے دیکھا نہ ہو۔ بڑے رومانٹک منظر ہوگا۔"

"تم سہاگ رات سے پہلے میرے سامنے نہیں آؤ گی تو اچھوتی لگو گی۔ اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ یہ باتوں کا نہیں کام کا وقت ہے۔ مجھے سیکڑوں کام منٹانے ہیں۔"

پھر اس نے معروف کو یہ خبر سنائی۔ اسے خوش خبری کہنا چاہیے لیکن محبوب صرف خبر سن رہا تھا۔ اس کے اندر جھانک کر

”اس لیے کہ مراد کے دشمن کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔“
ان حالات میں ایک ہی بات دماغ میں گھومتی تھی کہ جس دن مراد کسی دشمن کی گولی سے مارا جائے گا۔ جس دن جرائم کی دنیا میں اس کی موت کی تصدیق ہو جائے گی، اس دن سے محبوب کو کوئی مراد نہیں سمجھے گا اور شاید اس روز وہ بے خوف و خطر ہنی مون منانے کے لیے دنیا کے کسی بھی ملک میں جا سکیں گے۔

صرف اتنا ہی نہیں... ایک اور خوش کن خیال یہ بھی تھا کہ مراد کے بعد ماروی اپنا وعدہ پورا کرنے والی تھی۔ وہ صرف سمیرا کے ساتھ ہی نہیں، ماروی کے ساتھ بھی ڈیل ہنی مون منانے والا تھا۔

بس قسمت کے مہربان ہونے کی دیر تھی۔

سمیرا سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ فون پا تھ میں پکڑے ماروی کے خیال میں گھوم گیا تھا۔ وہ کل پھنسی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا برسوں سے اس کی نہ صورت دیکھی ہے، نہ آواز سنی ہے۔

وہ بڑے بڑے جھجکے سے سوچ رہا تھا، کیا مجھے یاد کر رہی ہوگی؟ اسی لمحے اس نے یاد کیا۔ تھی ہی اسکرین پر اس کا نام پڑھتے ہی وہ جذبول سے سرخسار ہو کر بولا۔ ”ماروی! تم سلامت رہو ہزار برس انجمنی نہیں یاد کیا تھا اور تم مجھ سے آئیں۔“

اس کی رس بھری آواز سنی دی۔ ”یاد کریں میں نے وعدہ کیا تھا کہ لندن پہنچ کر فون کروں گی۔ مجھے افسوس ہے، دیر ہوئی مگر وعدہ پورا کر رہی ہوں۔“

”اس وقت مجھے کتنی مسرتیں حاصل ہو رہی ہیں یہ تم کو بتا سکتی ہو۔ میں یہی چاہتا ہوں اتنی ہی مہربانی کیا کرو جب بھی باواؤں ایک کال ضرور کیا کرو۔“

”کب اپنا وعدہ پورا کریں۔ سمیرا کو اپنی دلہن بتائیں۔“

”میں جلد ہی یہ خبر سناؤں گا کہ وہ میری شریک حیات بن چکی ہے۔ اسی لمحے میں باتیں کرو۔ تم خوش ہونا؟ مراد کے دشمن کوئی پراہم تو نہیں بن رہے ہیں؟“

اس سوال کے پیچھے یہ بھیچھیچھی سی لاشعوری خواہش پرورش پا رہی تھی کہ دشمن پراہم بن جائیں۔ ایسا کچھ ہو جائے کہ ماروی کل گئی ہے آج ہی آجائے۔

لیکن جواب اس کی حسرتوں کے خلاف تھا۔ ماروی نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے۔ ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ دشمن تو دشمن ہی ہیں۔ وہ تو پریشان کرتے رہیں گے۔ مراد کے لیے تو یہ روز کا معمول ہو گیا ہے۔“

”سمیرا دعا ہے کہ دشمن کبھی پریشان نہ کریں اور تم مراد کے ساتھ ساری دنیا گھومتی رہو۔ یہ بتاؤ لندن میں کب

دور سے پر ملک سے باہر نہیں جاتا تھا۔ جب سے عشق کا روگ لگا تھا تب سے ماروی کو صبح و شام دیکھتے رہنے کے لیے ایک ہی شہر میں رہتا تھا۔ اب حالات بدل رہے تھے۔ بزنس پر پوری توجہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کاروباری دورے پر ملک سے باہر بھی جانا تھا اور شاید ہنی مون کے لیے بھی کہیں یورپ کی سمت رخ کرنا تھا۔

فون کی رنگ ٹون نے اسے مخاطب کیا۔ سمیرا کال کر رہی تھی۔ اس نے ہنن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں بولو؟“

”آپ نے تاکید کی ہے کہ مجھے سہاگ رات تک پردہ کرنا چاہیے۔ کیا آواز کا پردہ بھی لازمی ہے؟“

”اب تو بول رہی ہو۔ پردہ کہاں رہا؟“

”بس ایک بات کروں گی۔ ایک ضروری بات۔۔۔“

پھر جیسے کی رات تک اپنی آواز نہیں سناؤں گی۔“

”اچھا بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”سمیرا نے فون میں کھد بدی ہے کہ ہم ہنی مون کے لیے کہاں جائیں گے؟ آپ نے کچھ تو سوچا ہوگا؟“

”آہ... اپنی مون کو شاید اب نہ پائے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”یہ نہ بھولو کہ میں مراد کا ہم وطن ہوں۔ باہر دشمنوں کو کون سمجھائے گا کہ میں مراد نہیں محبوب ہوں۔“

وہ پریشان ہو گئی۔ ”ادگاؤ...!“

اس نے کہا۔ ”وہ گولی مارنے سے پہلے نام نہیں پوچھیں گے اور نہ ہی میرا شناختی کارڈ دیکھیں گے۔ بس دو۔“

”دیکھتے ہی فائر کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔“ پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا لہو میں ڈوبا ہوا ہنی مون مناؤں گی؟“

وہ میرا ہے بولی۔ ”تعجب ہے۔ یہ بھول گئی تھی کہ مراد آپ کا ہم وطن ہے۔ وہ یہاں سے جانے کے بعد بھی...

ہم صل ہونے کے باعث دشمنوں کو آپ کی طرف لگائے رکھے گا۔ آپ کبھی کراچی شہر سے باہر کی دنیا نہیں دیکھ سکیں گے۔“

”شادی کے بعد یہی ہوگا۔ تم میرے ساتھ باہر کھلی فضا میں کہیں نہیں جاسکو گی۔“

”میں آپ کو کبھی خطرہ مول لینے نہیں دیتی گی۔ آپ کی جان ہے تو میرے لیے یہ جہان ہے۔“

پھر وہ بولی۔ ”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کب تک چھپتے ہوئے محدود زندگی گزارتے رہیں گے؟ مراد کے دشمن کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔“

”جب تک یہ چہرہ میرے ساتھ ہے اور جب تک سانس چل رہی ہیں، دشمن ختم نہیں ہوں گے۔“

تک رہو گی؟“

وہ لندن میں نہیں تھی۔ سن سٹی پہنچی ہوئی تھی۔ مراد نے اسے سمجھایا تھا کہ کسی کو یہ نہ بتائے کہ وہ کچھ دنوں تک سن سٹی میں رہے گی۔ اس نے کہا۔ ”ابھی لندن میں ہوں۔ ہم دو چار دنوں میں بنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔“

ایک بیک محبوب کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ بھی سمیرا کے ساتھ بنی مون منانے کے لیے سوئٹزرلینڈ جائے گا تو وہاں ماروی کو قریب سے دیکھ سکے گا۔ پھر نہ جانے وہ مراد کے ساتھ کن ملکوں میں پہنچتی رہے گی۔ فی الحال یہ اچھا موقع تھا۔ بنی مون کے بہانے اس کا دیدار ہو سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے پیدا ہونے والے تمام اندیشوں کو بھول گیا۔ اس نے کہا۔ ”سمیرا بھی بنی مون منانے کے لیے سوئٹزرلینڈ جانے کو کہہ رہی تھی۔ وہاں ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”اعتراض کیوں ہو گی؟ آپ کو سمیرا کے ساتھ دیکھ کر خوشی ہو گی۔ مجھے اطمینان ہو گا کہ آپ ایک ٹارل ازدواجی زندگی گزارنے لگے ہیں۔“

وہ اسے تصور میں دیکھنے لگا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے برفانی علاقے میں اس کے ساتھ اسکیٹنگ کرتی رہا تو دے رہی تھی۔ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”پھر تو یہ پرگرام بگاڑے گا۔ تمہارے اطمینان کے لیے میں سمیرا کے ساتھ ضرور آؤں گا۔“

”میں اجازت دیں۔ جس دن بنی مون کے لیے جاؤں گی اس دن آپ کو کال کروں گی۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ گونگے فون کو دیکھنے لگا۔ محض سمجھا چکی تھی کہ پاکستان کے ہر موت آئے یا نہ آئے، شامت آ سکتی تھی۔

ماروی پاکستان سے باہر آکر وہی تھی کہ دنیا کتنی بڑی ہے۔ وہ جہاں سے گزر رہی تھی، جہاں پہنچ رہی تھی، وہاں دولت کی فراوانی، حسن و شباب کی رنگیں اور جرائم کی سنگین تھی۔

یہ ظاہر خوب صورت مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے۔ مراد کے ساتھ سن سٹی کے انٹرپورٹ سے باہر آئی تو سڑک کارڈز نے اسے سلیپٹ کیا۔ اس کے لیے ایک بہت ہی ہنگامی شاندار گاڑی کا دروازہ کھولا گیا۔ وہ متاثر ہو رہی تھی۔ اس کے آگے بچھے سڑک کارڈز کی گاڑیاں تھیں۔

ان کی رہائش کے لیے دی پبلس آف دی لوسٹ سٹی

میں انتظامات کیے گئے تھے۔ یہ دنیا کے سب سے مہنگے ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ ماروی کے تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے ڈوگ گانے سے پہلے مراد کا بازو تھام لیا تھا۔ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ ”میں تو خواب میں بھی ایسا خوب صورت محل نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیا ہم سچ جگہ یہاں رہیں گے؟“ وہ ہنستے ہوئے اسے چھتے ہوئے بولا۔ ”ہم رہنے کے لیے ہی آئے ہیں، یوں سکر کر نہ رہو۔ تن کر رہو۔ تمہیں احساس کتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔“

ماسٹر کو بوبوان کا استقبال کرنے ہوٹل کے دروازے پر آیا تھا۔ ہلکی بار مراد کو رو برو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک قوی ویکل سیاہ ٹیکرو تھا۔ اس نے مراد کو دیکھتے ہی دونوں بازو پھیلا کر اپنی زبان میں خوشی سے نعرہ لگا یا پھر اسے سینے سے لگا کر کہا۔ ”آج ایک مرد میدان کو سینے سے لگا رہا ہوں۔ تم پہلے ہار گئے ہو، مجھ کے نشانے پر نہیں آتے۔ جرائم کی دنیا میں کون سا ایسا ملک ہے۔ کون سی ایسی تنظیم ہے، جہاں تمہارا چرچا نہیں ہو رہا ہے۔“

وہ بڑے فخر سے بولے۔ ”مراد علی سنگی ایسا نام ہے جسے سننے ہی دشمن خاندان سے ہڑ بول کر اندھ بیٹھتے ہیں۔ ایم پراڈ آف یومانی سن اس میں تمہیں جتنا کہا ہوں، اور اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ تمہیں مانتا ہوں۔“

وہ اس سے الگ ہو کر پیچھے ہٹ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”تم ہلکی بار میرے پاس آئے ہو۔ میں تمہارا استقبال کرتے ہوئے تمہارا قصیدہ پڑھتا ہوں۔“

پھر وہ قصیدہ پڑھنے لگا۔

”تم نے مجھے ذلت اور شرمندگی سے بچایا ہے۔“

مہینہ کیٹ ریلیٹ بہت باور میں تھی۔ ایک برس پہلے انہوں نے میرے لیے کوئل کیا تھا اور لندن میں میرے ایک کیسینو پر قبضہ جمال تھا اور میں کچھ نہ کر پایا تھا۔ میرے پاس بہت سی ماہر شوٹرز ہیں۔ ایک نہیں درجنوں ہیں لیکن کوئی میرے مقول بیٹے کا انتقام لینے کے لیے میکی براؤن کی ٹیلی کے کسی فرد کو کوئی نہ مار سکا۔“

وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ ”میرے بچے...! میرے گاؤں تمہیں میرے لیے آسمان سے اتارا ہے۔“ ”کیا کمال کیا ہے تم نے...! چاہے ایک ہی ان کے بیٹوں کی برنارڈ کو جنم میں پہنچا دیا۔ یہ بھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی برنارڈ جیسے چلاؤ کو چھو کر بھی گزر سکتا ہے۔ تم ایک ہی کوئی چلا کر جرائم کی دنیا میں گفتگو کا موضوع بن گئے ہو۔ پھر ایک

اقوال زریں

☆ بہت بڑا گناہ ہے کہ وہ بات کہو جو تم خود نہیں کرتے۔

☆ جو اللہ کا ذکر کرے وہ زندہ ہے اور جو نہ کرے وہ مردہ ہے۔

☆ خوش خبری و نفرت مت پھیلاؤ۔

☆ مومن بار بار دھوکا نہیں کھاتا۔

☆ سچائی کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔

☆ قرآن اور سنت کی دعوت لے کر اٹھو اور پوری دنیا بھر بھا جاؤ۔

☆ سیدنا جناب برہنہ گیارہ روڈ کھارپاں

کمال اور کیا؟ ریڈ الارٹ کے سربراہ نیکی الہیٹ کو انڈیا میں گولی مار کر یہ دہشت طاری کر دی کہ براؤن فیل کی کا کوئی فرد تم سے نہیں بچے گا۔

وہ بڑے فخر سے بولا۔ "آج تک کسی کے سر کی قیمت پیاس لاکھ ڈالرز نہیں لگی تھی۔ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ تم خطرناک شوٹر ہو۔ موت سے زیادہ خطرناک ہو۔"

وہ آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے جکڑ کر بولا۔ "مرد میدان تم ہو اور نام میرا ہو رہا ہے۔ آج جرائم کی دنیا میں میرا رعب اور وہ دب ہے۔ وہ لندن کے کیسینو کا قبضہ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ یہاں سن سٹی میں ان کے جاسوس آتے رہتے ہیں اور حرام موت مرتے رہتے ہیں۔"

اس نے بڑے یقین سے کہا۔ "یہ کوئی نہیں جانتا کہ تم میرے پاس آئے ہو۔ اچھا ہے یہاں جب تک جا ہو رہو۔ میری تنظیم کا سیٹ اپ دیکھو۔ تمہیں ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بہت کچھ سمجھنا اور سیکھنا بھی ہے۔"

مراد نے کہا۔ "اپنی وہ نفس کے ساتھ محفوظ رہنے کی یہی ایک جگہ ہے۔ اس شہر میں آپ کی سحرانی ہے۔ قدم قدم پر میری عمرانی اور حفاظت کی جائے گی۔ یہاں مکمل فضا میں آزادی سے تفریح کر سکو گے لیکن اپنی طرف سے کسی کا شوق ہے۔ کچھ روز کے لیے کہیں ضرور جاؤں گا۔"

مارو نے ماروی کو دیکھ کر کہا۔ "سوری بنی! میں مارو کو دیکھ کر اپنے آپ کو بھول گیا۔ تمہیں وشن نہ کر سکا۔"

اس نے آگے بڑھ کر ماروی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم میری بیٹی ہو۔ یہاں ساری عمر رہو گی تو کبھی تمہارے پاؤں میں کاٹنا چھین نہیں دوں گا۔ سنا ہے تم سیدھی سادی ہی گھر بیٹھ لو گی ہو۔ ہمارے خطرناک دھندوں کو نہ سمجھتی ہو، نہ سمجھنا چاہتی ہو۔"

وہ اس کے شانے کو چپکے چپکے بولے۔ "کوئی بات نہیں، میری دو بیویاں اور تین بیٹیاں ہیں تمہاری جیسی ہیں۔ وہ محل کی چارو یواری میں عیش و آرام سے رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بیوی اور تین بیٹیاں میرے دھندوں کو سمجھتی ہیں۔ وہ سنگین معاملات میں میرا ساتھ دیتی رہتی ہیں۔"

مارو نے کہا۔ "میں آپ کی ایک بیوی اور تین بیٹیاں کی طرح نہیں بن سکوں گی۔ میرا حراج آپ کی ان بیویوں اور بیٹیوں کی طرح ہے جو کل کی چارو یواری میں رہتی ہیں۔" "تو پرالیم۔ تم عیش و آرام سے محفوظ رہو گی۔ گھر کی چارو یواری کے باہر اپنی مرضی سے جا یا کرو گی۔ ویسے یہ سمجھا دوں کہ سن سٹی کے باہر مراد کے ساتھ بھی کہیں تفریح کے لیے

جانے کی ضد کرو گی تو دشمنوں کی کوئی بھی تمہاری طرف چلی آئے گی۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "جگہ یہاں اپنی دائف کے ساتھ آیا تھا۔ کئی ماہ تک ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ اس کی دائف نے بھی ڈرائیونگ، رائفل شوٹنگ اور انگریزی کی زبان سیکھ لی ہے۔ وہ اس حد تک ایکٹیو ہو گئی ہے کہ اس کے ساتھ چلا دیا جاتی ہے باہر بھی جاتی ہے اسے کسی حد تک دشمنوں سے نشانہ بنایا گیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "آپ ماروی کو جو اہم بات سمجھانا چاہتے ہیں وہ میں ہی سمجھاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہاں تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ سب کے ساتھ تفریح کے لیے کہیں بھی جا سکے گی؟"

"بے شک یہاں خطرہ نہیں ہے۔ اوّل تو کوئی نہیں جان سکے گا کہ مراد علی منگی یہاں آیا ہوا ہے پھر یہ کہ میرے مسلح کارندے ہر جگہ تم دونوں کی سکیورٹی کے لیے موجود رہیں گے۔ یہاں بھی ہوگی کے اندر اور باہر میرے آدمی موجود ہیں۔ تم دائف کے ساتھ جہاں جانا چاہو گے جاؤ گے۔ ابھی سفر سے تھکے ہوئے آئے ہو۔ آرام کرو۔ کل ایک قابل اعتماد گاڑی تمہیں پودے سن سٹی کی سیر کرائے گا۔"

وہ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ ان سے کچھ فاصلے پر دو خوب صورت کنیزیں اور دو وحشی غلام ہاتھ

باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ماروی نے انہیں ناگواری سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ عورتیں یہاں کیوں ہیں؟“

”تمہاری خدمت کے لیے ہیں۔“

”مجھے نہیں کرائی ہے خدمت۔ انہیں جانے کو کہو۔“

مراد نے ان سے کہا۔ ”تم سب باہر جاؤ۔“

وہ چاروں سر جھکا کر چلے گئے۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ماروی! اپنے آپ کو بدلو۔ تمہیں وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہیے۔“

وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں مان سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”کیا حالات کے مطابق بدلنے کے لیے عورتوں کو تمہارے پاس آنے کی جھوٹ دے دوں؟“

”کیا یہ عورتیں جیسے تم سے چھین کر لے جائیں گی؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟“

اس نے ترخ کر جواب دیا۔ ”نہیں ہے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ شادی سے پہلے خوب رنگ رلیاں مٹا چکے ہو۔ تم مرکز نظر رکھوں گی۔ اچھی طرح پرکھتی رہو گی۔ جب اعتماد ہو جائے گا تو پھر بھی تم پر شبہ نہیں کرو گی۔“

”پتا نہیں تم کب تک میری بدسلوکی کا جھین کرو گی۔ تب تک بڑے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ پلیز مجھ پر بھروسہ کرو۔ کسی دن مٹا شاد آنے والی ہے۔ وہ یہاں کے اہم معاملات میں دن رات میرے ساتھ رہا کرے گی۔“

”وہ کیوں رہے گی؟ کوئی مرد کیوں نہیں رہے گا؟“

”وہ ایک ایسی دس مردوں پر بھاری ہے۔ بہت زبردست فائٹر ہے۔ ہانڈ نے خوب سوچا۔ مجھ کو اسے میرا ہاڈی گارڈ بنایا ہے۔ میں اس کے حکم سے انکار نہیں کر سکتوں گا۔ یہ مونے داغ سے منے والی باتیں کیوں نہیں سمجھتی ہو؟“

”تمہارے چاروں گھر سوچتے بچنے کے قابل ہوتی تو یہ سمجھ میں آ جاتا کہ جرائم کی دھول میں دھبے ہوئے ہو۔ شادی کے بعد مسائل پیدا ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا راستوں پر لے جانا چاہتی ہوں لیکن تم غلط راستوں کو نہیں چھوڑو گے۔“

پھر اس نے گھور کر کہا۔ ”تم نے ابھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مٹا شاد دن رات تمہارے ساتھ ڈیوٹی پر رہا کرے گی۔ پھر دن رات میں میرا کتنا حصر رہا۔ تم نے شادی سے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ مرینہ سے جیسا جھوٹ گیا ہے۔ اب مٹا شاد ساتھ رہے گی، مٹا شاد جائے گی تو کوئی دوسری تیسری آتی رہے گی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میں تم سے بحث نہیں کروں

گا۔ اگر سمجھ سکتی ہو تو سمجھ لو۔ میری سلامتی کے لیے ماسٹر کی سرپرستی اور ہتھیار لازمی ہیں۔ ان کے بغیر کوئی بھی مجھے چھوٹی کی طرح مسل دے گا۔ لہذا ابھی یہ نہ کہو کہ میں جرائم کی دلدل میں دھنس گیا ہوں۔“

”جو میرے مقدر میں ہے اسے جھیلنا رہوں گا۔ تم میری جان سے زیادہ عزیز ہو۔ صرف مجھ پر بھروسہ کر کے میرے ساتھ پیار بھری زندگی گزارتی رہو گی۔“

پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”مجھے عیاش اور گناہ گار سمجھو گی تو میرے قریب عورتوں کو دیکھ کر جلتی کڑھتی رہو گی۔ اپنے سگھ چین کو پیار بھری زندگی کو برباد کرتی رہو گی۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟“

ماروی نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر قریب آ کر اس کی گردن میں ہاتھیں ڈال کر سینے سے لگ گئی۔ سرد آہ بھر کر بولی۔ ”میں پھنس گئی ہوں تم کہتے مکار ہو، محبت سے چھانٹ کر یہاں لے آئے ہو۔ تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤ گی۔ میں تو پاکستان جاسکے گا۔ یہ سب بھی نہیں جانتی ہوں۔“

وہ روئے گھاٹے ادا سے پیار کرنے لگا۔ وہ حالات کے آگے جھک رہی تھی اسے جھکا کر رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی بھرمانہ زندگی میں مرینہ بہت اہم ہو گئی تھی۔ اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار ضروری ہوتا ہے۔ مرینہ بھی ایک خطرناک ہتھیار تھی اس کی حفاظت کے لیے۔ وہ دست راست بن کر رہنے والی تھی۔ وہ اپنے تحفظ اور سلامتی کے حوالے سے درست کہہ رہا تھا۔ مراد کے حالات کے سامنے نظر

دہیٹتا لازمی ہو گئی تھی۔

فی الحال ماروی کی دلجوئی لازمی تھی۔ ہوٹل کے چاروں طرف بہت سی خوب صورت بوٹا نیگل گارڈن تھا۔ وہ اس کا دل بہلانے کے لیے اسے گارڈن میں لے آیا۔ ماروی نے آنکھوں کو تازگی بخشنے والی ایسی ہریالی اور عجیب و غریب پتے پودے نہ بھی دیکھے تھے نہ سنے تھے۔ وہ خوشی سے دونوں بازو پھیلائے ادھر سے ادھر دوڑتی رہی۔ ایسی مست ہو گئی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

آگے اس گارڈن میں ایسے بھول بھلیوں والے راستے تھے جہاں سے گزرتے وقت یوں لگتا تھا جیسے بچ بچ کسی گم شدہ شہر میں پہنچ کر بھٹک رہے ہیں۔

دی پبلش آف لوٹ سٹی کا مطلب ہے گم شدہ شہر کا ایک محل۔۔۔ وہ ہوئی ایک خیالی اور تصوراتی محل کی طرح عالی شان تھا۔ اسے دیکھ کر یہ خیال قائم ہوتا تھا کہ ہزار ہا صدیوں پہلے کوئی شہر تھا جو تاریخ کے بدلے ہوئے بدترین حالات کی

شہر کوئی شہر تھا جو تاریخ کے بدلے ہوئے بدترین حالات کی

نہیں لگاؤں گی۔ مجھے تمہاری اس بھرمانہ زندگی سے سخت نفرت ہے اور تم اپنے رنگ میں مجھے رنگنا چاہتے ہو۔
”تم مجھ سے محبت کرتی رہو گی اور میری زندگی سے نفرت کرتی رہو گی۔ کیا اس طرح ایک اچھی زندگی گزار سکو گی؟“

”اچھی زندگی تو خواب ہو گئی ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنے اندر ٹوٹی کھرتی رہوں گی لیکن دل سے مجبور ہوں تم سے پیار کرتی رہوں گی۔“

اتھوں نے رات کا کھانا ڈانٹنگ روم میں کھایا۔ ہوٹل کے اسی پورشن میں ڈانٹنگ روم، ڈانٹنگ روم، بینڈ روم اور ٹی وی لاونج سب ہی کچھ تھا۔ انٹرنس کے باہر سکیورٹی گارڈز اور ملازموں کے کیمین بنے ہوئے تھے۔ ایک حسین ملازمہ ڈانٹنگ روم میں آئی تو ماروی نے اسے گھور کر دیکھا۔

ماروی نے ہوٹل کے یونیفارم کے مطابق مختصر سا لباس پہنا تھا۔ اس کا گورا چمکتا ہوا بدن بڑا ہی جاذب نظر تھا۔ اس نے مراد سے کہا۔ ”سرا! آپ کی کال ہے۔ اسے اٹینڈ کرنے کے لیے اس کو فون میں جانا ہوگا۔“

ماروی نے حسینہ کو گھور کر دیکھا۔ پھر مراد سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ تمہیں باہر کیوں لے رہی ہے؟ کیا کال یہاں تمہارے فون میں ٹرانسفر نہیں ہو سکتی؟“

وہ کھانا چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ماروی! تم ہمارے معاملات کو نہیں سمجھتی ہو۔ کچھ کالیں خفیہ کلاؤڈز کے ذریعے ہوتی ہیں۔ وہ ادھر سے ادھر ٹرانسفر نہیں کی جاسکتی۔“

حسینہ کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ اس کا تو کھانا حرام ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا مراد کو چھین کر لے جانے کے لیے ہی وہ مختصر سا لباس پہن کر آئی تھی۔

یہ یوں کو اس فون کی مزاج نہیں ہوتا چاہیے لیکن جہاں شک درست ہو، وہاں شک ہی جیتتا ہوتا ہے۔ مراد نے باہر کیمین میں آکر ریسیور کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو کون؟“

مرینہ کی کھٹکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں۔ میں نے ماسٹر سے کہا تھا کہ تم سے فون پر بات کروں گی تو ماروی وراثت نہیں کرے گی۔ تب ماسٹر نے یہ نمبر دیا ہے۔ خدا کا نام ہے۔ میں کسی رکاوٹ اور جھنجٹ کے بغیر تمہاری آواز سن رہی ہوں لیکن کب تک...؟“

”مرینہ! تم جانتی ہو، وہ میری جان ہے لیکن جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میرے قریب کسی بھی عورت کو

نذر ہو کر کھنڈر بن گیا تھا یا نابود ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے گارڈن کے اس حصے میں پہنچ کر ایسا ہی لگتا تھا کہ کسی گم شدہ شہر میں آگئے ہیں۔

جو کوزے تک محدود رہتے ہیں وہ سمندر کی وسعت اور گہرائی تک بھی نہیں پہنچتے۔ وہ پہلی بار حسن و عجائبات کی وسیع و عریض دنیا دیکھ رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ رو کر دنیا کی رنگینیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتی رہوں گی۔ یا اللہ! میں بول نہیں سکتی کہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ نظارے یہ سرسبز غلط و حسدوں کے ذریعے حاصل نہ ہوتیں۔“

مراد کو بھی وہ غلط و حسد منظور نہیں تھا۔ مگر کیا کرتا؟ خون خرابے نے اسے اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا تھا کہ ساری زندگی ہاتھ سے بندھن نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ماروی نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”تم بھی محبوب کی طرح رئیس اعظم ہونے پر تیار تھا ہوتا۔ پلیز مراد! سوچو کیا کن چلائے بغیر دولت حاصل کی جا سکتی ہے؟“

وہ مایوسی سے گہری سانس لے کر بولا۔ ”ایک سیدھی سادی پر امن زندگی خواب ہو گئی ہے۔ میں مراد سے پیچھا چھوڑ رہے ہیں نہ کن ہاتھ سے چھوٹنے کی۔“

”یہ دل توڑنے والی بات ہے۔ کیا ہم ساری زندگی بھروسہ کی دنیا میں رہیں گے؟ کیا ہمارے بچے بھی بندھن چلا سکیں گے؟ لہو بہا کیسے؟ پھول نہیں کھلیں گے؟“

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ”تم پیار کرنے والی بیوی کو اپنی ماروی کو کسی سختی زندگی دے رہے ہو؟ تم نے میرے تمام خوب صورت خوابوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔“

وہ کچھ بول نہ سکا۔ جب رات ماروی کو ان لمحات میں محبوب یاد آ رہا تھا۔ یہ خیال آ رہا تھا کہ اس کی منکوحہ ہوتی تو تمام خوب صورت خوابوں کی تعبیریں حقائق بن جاتیں۔ اسے ایک اجلی اور میلی زندگی کا فرق صاف نظر آ رہا تھا۔

مراد نے کہا۔ ”حالات سے سمجھتا کرو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بشری اپنے شوہر بننے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ اسے جی جان سے چاہتی ہے۔ اس کی خاطر اس نے ٹریننگ حاصل کی ہے یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر گئی ہے۔ تمہیں بھی میری خاطر خود کو بدلنا چاہیے۔ تمہیں بھی ٹریننگ حاصل کرنا چاہیے۔“

”میں انسانوں کی جان لینے والی بندھن کو کبھی ہاتھ

برداشت نہیں کر رہی ہے۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ براہ راست میرے فون پر کال نہیں کی۔“

”بھئی تو پوچھ رہی ہوں، ایسا کب ہوگا؟ تم نے لندن انٹرپورٹ میں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس نے نہیں پہچانا تھا کہ میں مرینہ ہوں پھر بھی تمہارے قریب میرا وجود برداشت نہیں کر رہی تھی۔“

”وہ بیوی کی حیثیت سے اپنی جگہ درست ہے۔“ وہ بولی۔ ”میں صاف کہہ دیتی ہوں۔ اب تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔ پھر تم خود ہی دیکھ رہے ہو حالات ایسے سنگین ہیں کہ ہم دونوں کو ساتھ رہنا ہی ہوگا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے لیے ضروری ہو سکتی کروں۔ وہ فکلی مزاج ہے اور ہمیشہ رہے گی۔“ مرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ فکلی مزاج ہے تو کیا غلط ہے۔ کیا ابھی اس سے چھپ کر مجھ سے باتیں نہیں کر رہے ہو؟“

”ہاں مجبوری ہے۔ تم میری ضرورت بن گئی ہو اور وہ کبھی کسی سوکن کو برداشت نہیں کرے گی۔“

”ہم دونوں سمجھ رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ درست ہے۔ ادھر تم اپنی جگہ مجبور ہو اور ادھر وہ اپنی جگہ نہیں پکارتا رہتا ہے۔ میں وہاں آنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ ہم کو انڈیا سے ملنے دے گی؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابھی نہ آؤ۔ ذرا صبر کرو۔“

”میں ماروی کو اپنے اعتماد میں لے رہا ہوں۔“ اس نے انتظار اس لیے کر رہی ہوں کہ بروز انوک کی بیٹی نیکی براؤن کے بیٹے کو شیشے میں اتار کر سسلی سے باہر آئے گی۔ وہ جس ملک میں بھی جائے گی، وہاں تم میرے ساتھ رہو گے۔“

”وہ سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مرینہ سے ملنے رہنے کا ایک راستہ نکل رہا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔“ یہ اچھا موقع ہے بروز انوک کی بیٹی جولیا کو اغوا کرنا ہے اور نیکی کے بیٹے نیکی براؤن کو ختم کرنا ہے۔“

”ہاں۔“ ملنے کا ایک راستہ نکل آیا ہے۔ ہونگا اور نیکی جس ملک میں جائیں گے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”فارگاڈ سیک مراد... پلیز وہاں ماروی کو نہ لانا۔ وہ بڑے مسائل پیدا کرے گی۔“

”بڑی مشکل ہے۔ وہ نئی دہلی ہے۔ بہنی مون منانے کے لیے میرے ساتھ رہے گی۔ میں سوچوں گا کہ مجھے موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہیے۔“

”سوچو اور یہ بتاؤ کہ آئندہ رابطہ کیسے ہوگا؟“

”آئندہ بھی اسی فون پر کال کرو۔ اسے شب نہیں ہوگا۔ بس اب میں جا رہا ہوں۔ وہ کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔“ وہ رابطہ ختم کر کے واپس آ گیا۔ وہ اپنی ماروی کا سچا عاشق تھا۔ لیکن اس کے اعتماد سے کھیل رہا تھا۔ بعض اوقات حالات ایسے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ اچھے موڑ پر لے آتے ہیں کہ ہزار سچائی کے باوجود غائبازی کرتی ہی پڑتی ہے۔

☆☆☆

میڈونا کو اوندھے منہ کرنے کے بعد معمولی چوٹیں آئی تھیں لیکن تمام تکالیف پر ایمان علی حاوی ہو گیا تھا۔ وہ ماں باپ سے اسی کے لیے ضد کر رہی تھی کہ اسے کہیں جانے سے فوراً روکا جائے۔

نیکی براؤن دولت مند اور طاقتور ہونے کے باوجود اسے نہ رنک سکا۔ اسے اندر جانے اور ایمان علی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سن سنی والی فلاح میں چار ماہ کی سسلی جانے والی فلاح میں کس ملک کی طرف جانے والا ہے۔

نیکی براؤن کے ذہنی اس عورت کو بھی تلاش کر رہے تھے جس نے میڈونا کو دوڑنے سے روک کر لیا تھا لیکن اس عورت کے نقش قدم بھی نہیں مل رہے تھے۔

وہ پوری فیکلی سسلی جا رہی تھی۔ جب وہ سب بورڈنگ کارڈز لینے اندر چلے گئے، جب انہوں نے باہر کمرنگ کی آوازیں سنی۔ یہ وہ وقت تھا جب نیکی نے کار کے اندر ایک فارنگا تھا۔ پھر کار سے باہر چھٹانک لگا کر فرار ہونے والوں پر گولیاں چلائی تھیں۔

نیکی براؤن کے خاص ماتحتوں نے اسے فون پر بتایا کہ ایک ایشیائی جوان اور خوب صورت عورت نے عمارت کے باہر ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ وہ جس کار پر فارنگا کر رہی تھی، وہ دور نکل گئی ہے۔ سبائل پولیس بھی ان کے تعاقب میں گئی ہے۔

یہ نیکی براؤن کے پیچھے کے مطابق بہت ہی اہم خبر تھی۔ اس نے کہا۔ ”ایسا ہنگامہ کرنے والی اور گولیاں چلانے والی کوئی عام سی عورت نہیں ہوگی۔ معلوم کرو، وہ کون ہے؟“

”سر اوہ پاکستانی شلوار سوٹ میں ہے۔ ریڈ اینڈ بلیک فکری میچنگ ہے۔ وہ قد آور، صحت مند اور اسماٹ ہے۔“

نیکی نے میڈونا سے کہا۔ ”تم نے اس عورت کی صورت نہیں دیکھی مگر کیا اس کے لباس کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی؟“

سے ہمارے متعلق چپ چاپ معلومات حاصل کی جاتی رہیں گی۔“

وہ بولی۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تو نے مجھ سے بھی بڑے کام کیے ہیں۔ میکی کے جوان بیٹے کو گولی سے اڑا دیا۔ ہم دھماکے سے ان کی گاڑیاں تباہ کر دیں۔ تب تو کوئی معلوم کرنے نہیں آیا کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟“

وہ اس کی پیشانی کو ایک انگلی سے مارتے ہوئے بولا۔ ”کبھی دماغ سے بھی سوچا کر۔ میں نے کسی کے سامنے آکر نہ گولی چلائی ہے، نہ ہم دھماکا کیا ہے۔ آئندہ بھی یہی کرنے والا ہوں۔ رازداری سے دشمنوں کو دہلا تا رہوں گا تو کبھی کسی کی نظروں میں نہیں آؤں گا۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ تو لوگوں کے ہجوم میں گولیاں چلا کر کھلا اشتہار بن گئی ہے۔“

وہ فکر میں جھلا ہو گئی۔ بڑی معصومیت سے منہ بنا کر بولی۔ ”اب کیا ہوگا بھئی؟ ہم اپنے اپارٹمنٹ میں کتنے سکون سے ہیں۔ کیا اب نہیں رہ سکیں گے؟“

”کوئی مسئلہ نہ ملے گا۔ ہمارے دروازے پر نہیں آسکے گا۔ میرے ماتحت کسی اپارٹمنٹ کی بھرائی کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھے خطرات سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ ویسے یہ غلط ہو گیا۔ تجھے ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

اس نے بشری کے چہرے کو دو ٹوک ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”جی داری تو نے دکھائی ہے۔ میرا سینہ چوڑا ہو گیا ہے۔“ فخر سے کہتا ہوں تو جلد ہی میری طاقت چھوڑا ہوا ہونے والی ہے۔“

وہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی گردن کو چومنے لگی۔ ”جو ہوتا ہے ہونے دے۔ جنس گے ایک ساتھ، مریں گے ایک ساتھ۔ خدا نہ کرے کبھی تجھے کوئی لگے تو میں بھی دوسری سانس لینے لوں گی۔ خود کو گولی مار کر تیرے ساتھ مر جاؤں گی۔“

بچے نے اسے ایک ہلکے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”خودکشی کی بات سوچے کی تو سنو توڑ دوں گا۔ اللہ نے زندگی دی ہے۔ تو اسے ختم کرنے والی کون ہوتی ہے؟“

پھر اسے قہام کر بولا۔ ”تیرا یہ وجود میرے لیے ہے۔ کیا میرے بعد دشمنوں سے انتقام نہیں لے گی؟“

”ہاں! یہ تو بھول ہی گئی تھی۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں؟ ان کتوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”تو پاگل ہے، جان دے دی گی۔ کیسے یقین کروں کہ میرے بعد انتقام لینے کے لیے زندہ رہے گی؟“

”تو مر کے دکھا، میں زندہ رہ کر دکھائی ہوں۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ مگر تے وقت سرخ اور سیاہ رنگ کی جھلک دکھائی دی تھی۔“

میکی نے فون پر کہا۔ ”وہی ہے۔ اسی نے میڈونا کو گرایا تھا۔ فوراً اسے گھیرو۔ معلوم کرو، کون ہے؟ کن لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں اور وہ کہاں رہتی ہے؟“

”سرا اس کے پاس کمن ہے پھر پولیس والے ابھی اس کی حمایت میں مفروضہ مجرموں کو گرفتار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور عقل کہتی ہے کہ کمن چلانے والی عورت تنہا نہیں ہوگی اس کے پیچھے خطرناک لوگ ہو سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے اس سے دور رہو اور جلد سے جلد اس کے متعلق معلومات حاصل کرو۔“

بچی نے ایک چھوٹی سی حرکت کی تھی۔ اپنے جیسی ایک جوان لڑکی کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔ اب وہ چھوٹی سی حرکت رانی کا پرہیز بن رہی تھی۔ ڈی ڈی ٹریڈرز (ڈیزیزنگ ڈائمنڈ ٹریڈرز) کا جگ باس میکا نو رابرٹ بھی اسے پکڑنے کی فکر میں جھلا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ریڈ اوارڈ کے سربراہ سیگی براؤن کے کارندے بھی اسے گھیرنے والے تھے۔

بچہ ابھی اپنی بچی کی اس کارروائی سے بے خبر تھا کہ اس نے کتنے دشمنوں کو اپنے پیچھے لگایا ہے۔ بچی اسے اندازہ تھا کہ اس کی سرعام کن شوٹنگ نے مجرموں کو دوڑانے کا کیا ہوگا۔ سب ہی اس مجلس میں جھلا ہوں گے کہ وہ ایکسانی شہر اسٹوٹ والی جوان عورت کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟

بچی نے اندازہ کر لیا تھا کہ مجلس میں جھلا رہنے والے بچی کا چہرہ کتنا معلوم کرتے ہوئے موجود رہا کس گاہ تک ضرور چکیں گے۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ تو کیا کر رہی ہے بچی...؟“

”میں نہ کرنی تو رہی تھی، غوا کر لیتے..... کیا تجھے چھوڑ کر ان کے ساتھ چلی جانی؟“

”میں مانتا ہوں۔ تجھے یہی کرنا تھا تو نے کمال کیا ہے لیکن اب ہم رازداری سے یہاں نہیں رہیں گے۔ رفتہ رفتہ تمام دشمنوں کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ ہم سیدھی سادی زندگی گزارنے والے عام شہری نہیں ہیں۔“

وہ ہاتھ چاکر بولی۔ ”دشمنوں کو کیسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم سیدھے سادے نہیں ہیں؟“

”تو نے سرعام گولیاں چلائی ہیں۔ یہ بات دور تک پھیل چکی ہوگی۔ موٹی عقل والے بھی یہی سوچیں گے کہ جس کی عورت کمن چلائی ہے، اس کا مرد بھی کچھ کم نہ ہوگا۔ آج

تھے۔ مجھ سے مات کھانے کے بعد شرم سے منہ چھپاتا چاہیے تھا۔ محروہ دوستی کرنے کے لیے فون کر رہا ہے۔
 ”وہ دوستی کے بہانے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور ہمارا وعدہ کیا ہے؟ معلومات حاصل کرنے کے پیچھے ان کا کوئی مقصد اور مفاد ضرور ہوگا۔“
 اس نے فون کے ذریعے اپنے ماتحتوں سے رابطہ کیا۔ انہیں بتانے لگا کہ وہ تین ٹیکرو اس کا فون نمبر اور رہائشی پتا معلوم کر چکے ہیں۔ لہذا پوری مستعدی سے اس کے پارٹنرٹ کی نگرانی کی جائے اور ان اطراف میں آنے والے اجنبیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

اس نے فوری ہدایات دینے کے بعد فون بند کیا تو ایک اور کال آگئی۔ اسکرین پر پھر ایک نیا نمبر تھا۔ اس نے کال انشید کی۔ ”ہیلو فرمائیے؟“
 ایک رعب دار آواز سنائی دی۔ ”میں سی آئی اے کے ایک افسر ہوں۔ معلوم ہوا ہے، تم راجا اسٹریٹ میں ایک مہب کے مالک ہو، جبکہ اس کا مالک ایک انڈین تھا۔“
 جلتے لے کہا۔ ”تب جاسوس ہیں اور افسر بھی ہیں۔ یہ تفصیلات تو معلوم کی ہوں گی کہ میں نے حال ہی میں وہ مہب اس انڈین سے خرید لیا ہے۔“
 وہ ٹھٹھکار کر گلا صاف کرنے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے ہم معلوم کریں گے۔ تم ہمارے سوال کے جواب دو۔ یہ بتاؤ تم یہاں لندن میں کتنے عرصے سے ہو؟“
 وہ خود کو سی آئی اے کا افسر کہہ رہا تھا اور بہت سی کمزور حواس سوال کر رہا تھا۔ جلتے نے کہا۔ ”میں یہاں تب سے ہوں جب کوئی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ابے او بیٹا سیتی افسر..... سیدی طرح چلے گئے کہ کون ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“
 ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ وہ عورت تیری کون ہے جس نے میکے صاحب کی بیٹی کو گرانے کی جرأت کی تھی؟“
 جلتے اور بشری نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ انجان بن کر فون پر بولا۔ ”یہ میکے صاحب کون ہیں؟“
 ”وہ اتنے خطرناک انسان ہیں کہ ان کے ہارے میں سنو گے تو پتلون گندی ہو جائے گی۔“
 ”اچھا تو ان کے ساتھ رہ کر تم لوگ پتلون دھو رہے ہو؟ پتا نہیں کون ہو تم لوگ؟ میری وائف کی کسی میکے صاحب کی بیٹی سے بھلا کیا دشمنی ہوگی۔ خواہ وہ الزام نہ دو۔ میں عزت سے پر امن زندگی گزارنے دو۔“
 ”کیا پر امن زندگی گزارنے والے کی بیوی گن قاتل ہوتی ہے؟ وہ ایسی ہے تو تم بھی جانے کس کے لیے ہتھیاروں

اس بات پر دونوں ہنستے ہنستے لپٹ گئے لیکن رنگ لون کباب میں ہڈی بن گئی۔
 انہوں نے الگ ہو کر فون کو دیکھا، جلتے نے اسے اٹھا کر نمبر پڑھے پھر کہا۔ ”کوئی انجان نمبر ہے۔“
 اس نے فون دبا کر اسے کان سے لگا دیا۔ ”ہیلو.....؟“
 دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ”سلام مسلمان بھائی!“
 جلتے نے کہا۔ ”ولیکم السلام۔ مسلمان بھائی۔“
 ”میں اپنی مسلمان پاکستانی بہن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فون میری عزیزہ سسٹر کو دیں۔“
 جلتے نے فون کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”عجب ہے تم کیسے مسلمان ہو؟ کب سے بھائی ہو اور کس رشتے سے میرے سارے ہو؟ پہلے اپنا تعارف تو پیش کرو۔“
 ”میں دین اسلام کے رشتے سے بھائی ہوں۔ اپنی بہن کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ جو سمجھ رہی ہیں وہ ہم نہیں ہیں۔ ہم اسے اغوا کرتا نہیں چاہتے تھے۔۔۔“
 جلتے اور بشری نے ایک دوسرے کو سمجھنے کے انداز میں دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ جلتے کا ڈھ... ہمارے دل صاف ہیں۔ ہم تو اس کی سلامتی کے لیے اسے وہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔“
 جلتے نے کہا۔ ”اچھا تو تم لوگ ہو۔ میری وائف کی سلامتی چاہتے تھے اور اسے گن پوائنٹ پر لے جا رہے تھے۔“
 ”یہ بات نہیں ہے۔ تم ہمیں غلط نہ سمجھو۔ ہم سچے دل سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”نوٹ اپ۔ تم مسلمان نہیں ہو بیروہیہ ہو۔ دنیا کا ہر مسلمان خواہ وہ کسی ملک کا ہو اسے اسلام علیکم کہنا آتا ہے۔ تم تو سلام کرنا ہی نہیں جانتے۔“
 ”جانتا ہوں۔ ہائی کافیس تمہارے جیسا مسلمان ہوں۔“
 ”اچھا تو پہلا کافیس۔“
 ”آں۔ وہ۔ وہ بات یہ ہے کہ میرے ماں باپ عیسائی ہیں۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ کونسا ہوتا ہے۔“
 جلتے نے فون بند کر دیا۔ پھر بشری سے کہا۔ ”سناتم نے؟ ابھی صرف چھ گھنٹے گزرے ہیں اور یہ بھلا نے بڑی آسانی سے میرا فون نمبر معلوم کر لیا ہے۔“
 ”عجب ہے کیسے معلوم کیا ہوگا؟“
 ”بہت آسانی سے۔ انہوں نے ہماری کار کے نمبر سے رجسٹریشن آفس میں معلوم کیا ہوگا۔ وہاں میرا نام رہائشی پتا فون نمبر اور دیگر کوائف درج ہیں۔“
 بشری نے حقارت سے کہا۔ ”وہ ایک نہیں تین مرد



ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار



f Marhaba Laboratories

UAN: 111-152-152

www.marhaba.com.pk

سمجھایا۔ ”وہاں چرچ میں کوئی باس نہ آیا تو اس کا کوئی دست راست آئے گا۔ اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کس تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اور مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟“ چونکہ ہم مسلمان ہیں اور میں پاکستانی ہوں۔ اس لیے اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ مراد سے ہمارا کوئی تعلق ہے۔ تم اس سے لاشعری ظاہر کرو گے۔ میں بعد میں باتیں بناؤں گا۔

”میں اور بشری وہاں پہنچے رہیں گے۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا لیکن تم سب محتاط اور مستعد رہو گے۔ ضرورت کے وقت چشم زدن میں ہمارے پاس ہتھیار پہنچاؤ گے۔“

بشری نے ایک دکان سے راہبہ کا لباس خرید کر ایک کپڑے میں جا کر اسے چھپا لیا۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس میں چھپ گئی۔ اس کے بال بھی اس کا رنگ میں چھپ گئے تھے۔ چار منٹ کے بعد چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ بتا دیا کہ کارڈ رائیڈ کرتا ہوا ہائی وے پر آ گیا۔ وہ بشری کو سمجھا رہا تھا کہ وہاں کیا کرے گی اور جتنا سمجھایا جا رہا ہے، اس سے آگے کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ اگر کرے گی تو اسے آئندہ کسی مہم میں ساتھ نہیں لے جائے گا۔

وہ بڑی فرمانبرداری سے اس کے ہاتھ دھو کر رہی تھی کہ وہاں اپنی عقل استعمال نہیں کرے گی۔ خون پر ماتحت نے کہا کہ وہ دوساتھیوں کے ساتھ چرچ میں پہنچ گیا ہے حیاتی تین ابھی پہنچنے ہی والے ہیں۔

وہ چرچ ہائی وے پر آبادی سے دور تھا۔ وہاں اتنی دور عمارتیں گزار آ جاتے تھے۔ عام دنوں میں وہ ویران رہا کرتا تھا۔ دن سے گزرنے والے عقیدت مندی سے رک کر چرچ کے اندر جاتے، سر جھکا کر راہب سے اپنے لیے دعا کراتے پھر اپنے راستے چلے جاتے تھے۔

اس روز بھی وہ ویرانی تھا۔ اس کے عقب میں رہائشی کوارٹرز تھے۔ بشری اور جلال کے پاس آ گئے۔ وہاں ایک کوارٹر میں راہب تھا۔ دوسرے کوارٹروں میں ایک بوڑھی اور ایک جوان راہب تھی۔ انہوں نے تینوں کو کھانا پھر ان سے کہا۔ ”آج یہاں چرچ میں گولیاں چل سکتی ہیں۔ تم تینوں کو یہاں سے دور ایک محفوظ پناہ گاہ میں پہنچایا جا رہا ہے۔ ہم بھروسہ کرو۔ تعاون کرو، شام سے پہلے تمہیں یہاں واپس لے آئیں گے۔“

دروازے پر دو گن مین کھڑے ہوئے تھے اور وہ تینوں سے ہوئے تھے۔ جتنے نے بوڑھی راہب سے کہا۔ ”تم

سے کھینچے ہو گے۔ بہتر ہے اپنی اصلیت بتا دو۔ تم میاں بیوی کون ہو اور کس کے لیے کام کرتے ہو؟“

جتنے نے کچھ سوچا۔ وہ ان کے اندر پہنچ کر ان کی اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا ردیہ بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک..... پیشرور فائزر اور شوٹر ہوں۔ جو مجھے اچھی رقم بے کرتا ہے، میں اس کے لیے کام کرتا ہوں۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ایسے بولنا تم کرائے کے کرمشل ہو۔ ہمارا بھی کام کر سکتے ہو۔“

اس نے پوچھا۔ ”کام کیا ہے؟“ ”یہ تو ہمارا باس ہی بتائے گا۔ میں جہاں کہتا ہوں وہاں آ کر ہم سے ملنا ہوگا۔“

”میں پہلی ملاقات کسی کے اڈے میں نہیں کرتا۔ تم ہمارے باس سے کسی کھلی جگہ مل سکتا ہوں۔“ ”تم بولو کیا ملنا چاہتے ہو؟“

”شہر سے تیس گھنٹہ دور ہائی وے کے کنارے ذرا فاصلے پر ایک چرچ ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ اگر تمہارا باس وہاں چل سکتا ہے تو وہاں آ جائے۔“

”میں ٹھوڑی دیر بعد تمہیں وہاں کے ملاقات کنفرم کروں گا لیکن ہمارا باس اس دلیر عورت سے بھی ملنا چاہے گا۔ اسے اپنے ساتھ لانا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ جتنے نے بشری کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اے دلیر عورت! تیار ہو جا۔“

وہ خوش ہو گئی۔ جتنے نے اپنے ایک ماتحت سے فون پر کہا۔ ”ہائی وے کے میرا چرچ میں کسی کرمشل تنظیم کا باس مجھ سے ملے آئے گا۔ تم میری جگہ کرائے کے شوٹر بن کر اس سے ملو گے۔ اپنے ساتھیوں سے کہو، ابھی فوراً اس چرچ میں جا کر اندر اور باہر مورچے بنائیں۔ میں اپنیوائف کے ساتھ وہاں چھپ کر آ رہا ہوں۔ اس جگہ میں کال کروں گا۔“

اس نے رابطہ ختم کر کے بشری سے کہا۔ ”ابھی یہاں سے نکلو۔ قریبی مارکیٹ میں چلو۔ وہاں ایک عیسائی راہبہ کا لباس خرید کر پہنو۔ تم وہاں چرچ کے اندر دھنوں کے سامنے ایک راہبہ کی حیثیت سے موجود رہو گی۔“

وہ خوش ہو رہی تھی۔ اسے اپنے جتنے کے ساتھ اپنے گھر میں رہنے کا چانس مل رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد ہی کال آئی کہ ان کا باس ہائی وے کے میرا چرچ میں دو گھنٹے بعد پہنچنے والا ہے۔ جتنے نے گھڑی دیکھی۔ اچانک مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ اس نے ماتحت کو

کرنے کے باوجود انہیں اور کوئی وہاں نظر نہیں آیا۔ تب پاس نے حکم دیا۔ ”ان راہبوں کی تلاش کرو۔“

باہر سے ایک عورت وہاں آئی۔ اس نے بوڑھی عورت اور بشری کی سر سے پاؤں تک تلاشی لی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ انہیں راہب بھی نہ ملے۔ تب وہ پاس مطمئن ہو کر ایک ہاڈی گاڑو کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ ایک قد آور صحت مند نیکو تھا۔

اس نے اندر آ کر صلیب سے کچھ فاصلے پر رک کر بٹے کے ماتحت سے کہا۔ ”میرا نام نکس بارور ہے۔ میں اسی دس منزلہ شاپنگ پلازا کا مالک ہوں، جہاں میرے تین نیکو ماتحت اس روز پولیس والوں سے چھپنے آئے تھے۔ تمہاری گھر والی نے ان تینوں کو اچھی طرح دوڑا دیا تھا۔ میرے آدی نے فون پر کہا تھا کہ میں اس دلیر خاتون سے ملنا چاہتا ہوں۔“

بشری نے زیر لب مسکرا کر بٹے کو دیکھا۔ ماتحت نے کہا۔ ”میری گھر والی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ابھی اپنی بات کرو۔ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ اگر دھندے کی بات ہے تو مجھے سوائے کے شو سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟ کیا کسی ریکٹ، سنڈیکٹ یا اور کسی گروہ سے تمہارا تعلق ہے؟“

”میں اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا اور تمہارے بارے میں بھی سچوں کا لیکن پہلے ہمارے درمیان دوستانہ اعتماد قائم کرنا ضروری ہے۔ یہ دیکھو میں اپنی کن ہٹا رہا ہوں۔“

اس نے اپنی کن کو ہولسر میں رکھ دیا اور پھر کہا۔ ”میں خالی ہاتھ ہو گیا۔ تم بھی اپنی کن ایک طرف رکھ دو اور دوستوں کی طرح مصافحہ کرو۔“

”ضرور کروں گا۔ پہلے اپنے آدمیوں کو باہر جانے کے لیے کہو۔ یہاں میری طرح تمہیں بھی تنہا ہونا چاہیے۔“

اس نے سوچتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو دیکھا پھر انہیں باہر جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ سب بٹے گئے وہ تنہا رہ گیا۔ ماتحت نے کہا۔ ”پہلے ہمارے درمیان اعتماد قائم ہوگا پھر ہم کسی دل سے مصافحہ کریں گے۔“

وہ ماتحت اوپر سے کوو کر نیچے آیا اور مسکرا کر بولا۔ ”اب تم اصل آدی سے بات کرو۔“

اس نے بٹے کے پاس آ کر اپنی کن اسے دی۔ جس بارور نے حیرانی سے ایک راہب کو کن پکڑتے دیکھا۔ بٹے نے کہا۔ ”میں نے فون پر تمہارے آدی سے باتیں کی تھیں۔ میں راجر اسٹریٹ کے اس اپارٹمنٹ میں اپنی وانف کے ساتھ رہتا ہوں۔“

بشری نے اپنے سر سے اسکارف اتار کر چھیک دیا۔ پھر

ہمارے ساتھ یہاں رہو گی۔ باقی دونوں جائیں گے۔“

وہ کن مین ان دونوں کو بٹے کی کار میں لے گئے۔ بٹے نے وہاں راہب کا لباس پہن لیا۔ بشری بوڑھی راہب سے کہہ رہی تھی۔ ”تم ہماری ماں ہو۔ ہم پر بھروسہ کرو۔ گولیاں چلنے کے باوجود تم پر ایک ڈرا آج نہیں آئے گی۔“

بوڑھی نے کہا۔ ”اب میری زندگی کتنی رو مٹی ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میں مدد کہلاتی ہوں۔ تم مسلمان ہو کر مجھے ماں کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گی۔“

بٹا اور بشری اس کے ساتھ چرچ میں آ گئے۔ اس وقت فون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے فون دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں بولو، تم دہی ہوتا...؟“

”ہاں۔ ہم چرچ کے قریب آ گئے ہیں۔ تم کہاں ہو؟“

”میں چرچ کے اندر ہوں۔ آ جاؤ۔“

تھوڑی دیر بعد ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ بٹے نے ایک ماتحت نے فون پر اسے بتایا کہ وہ لوگ چرچ کو چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔

ابھی معلوم ہونے والا تھا کہ وہ دوست لہا یا دشمن؟ حقیقت سامنے آنے سے بٹے سب ہی اپنے اپنے طور پر احتیاطی تدابیر پر عمل کر رہے تھے۔

اور کچھ وقت گزرنے کے بعد چرچ کا دروازہ کھلا۔ ایک کن مین نے اندر آ کر دیکھا۔ اس وقت بٹے کا خاص ماتحت ہاتھوں میں ایک کن لیے ایک اونچی جگہ سے اچھا ہوا۔

بشری نے بٹے بشری اور بوڑھی راہب کو اپنے نشانے پر رکھا تھا۔ وہ تینوں ایک بڑی سی صلیب کے سائے میں سبے ہوئے بیٹھے تھے۔

آنے والے نے پوچھا۔ ”کیا تم وہی کرائے کے کمرنل ہو جس سے فون پر بات ہو چکی ہے؟“

”ہاں میں تو وہی ہوں مگر وہ نہیں ہو۔“

اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔ ہمارا پاس باہر گاڑی میں ہے۔ وہ پہلے اطمینان کرنا چاہتا ہے۔“

”اسے کہو، جلدی اطمینان حاصل کرے۔ میں نے ان بے چارے راہب اور راہباؤں کو جبراً یہاں بٹھا رکھا ہے۔“

اس نے فون پر کہا۔ ”ہاں! یہاں صرف وہی کرائے کا کمرنل ہے۔ اس نے کچھ فاصلے پر ایک راہب اور راہباؤں کو کن پکڑا ہوا اسٹ پر رکھا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد اور دو کن مین آ گئے۔ وہ چرچ کے اندر کسی چھپنے والے کو تلاش کرنے لگے۔ اچھی طرح تلاش

کہا۔ ”مجھ سے ملنے کی تمنا تھی۔ اب بولوں میں سامنے ہوں۔“
وہ بول نہیں پارہا تھا۔ حیرانی سے بٹے اور بشری کو دیکھ
رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میڈم...! ہمارے بگ باس نے
کہا ہے، آپ کی خدمات ہر قیمت پر حاصل کی جائیں۔ وہ
آپ سے بہت متاثر ہے۔“

بشری نے پوچھا۔ ”یہ بگ باس کون ہے؟“
”میں ابھی تمام سوالوں کے جواب دوں گا۔ پہلے یہ
بتاؤ، تم میاں بیوی کتنی تنظیموں کے لیے کام کرتے ہو؟“
بٹے نے کہا۔ ”یہ ہمارا پیشہ ورانہ پرسنل راز ہے۔ ہم
کسی کو نہیں بتاتے۔ تم اپنے کام کی بات کرو۔“

اس نے کہا۔ ”مراد علی منگی کا نام دنیا کے تمام مجرم
جانتے ہیں۔ تم لوگ بھی جانتے ہو گے۔ وہ پاکستانی ہے۔ تم
بھی پاکستانی ہو۔ اس سے جان پہچان ضرور ہوئی؟“

وہ بولا۔ ”اسے اچھی طرح جانتا ہوں لیکن کبھی اس
سے ملاقات نہیں ہوئی۔“
”بھی تو کسی نہ کسی ذراقت کے دوران میں اس سے
سامنا ضرور ہوا ہوگا؟“

”ایک بار اس سے مقابلہ ہونے والا تھا لیکن میں اس
سے کٹر کر نکل گیا۔ وہ بھی مجھ سے کٹر آتا ہے۔“
وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں نہیں مانتا۔ وہ بھی
کٹر آتا نہیں ہے۔ اچھے اچھوں کو کٹر کے رکھ دیتا ہے۔“

”وہ مجھ سے اس لیے دور ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں
ایک دوسرے کے حیر بھائی ہیں۔“

”یہ حیر بھائی کیا ہوتے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”حیر کا مطلب ہے (saint)
سینٹ... اللہ کے پسندیدہ بندے۔ ہم ان کے عقیدت مند
ہیں۔ انہیں حیر کہتے ہیں اور ہم دوسری ہی ان کے مرید ہیں۔ اس
حوالے سے ایک دوسرے کے حیر بھائی بناتے ہیں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تو بے حیر بھائی ہو کر
ایک دوسرے سے دور رہتے ہو؟“

”ہمارے راستے اور ہمارے مزاج الگ ہیں۔ اس
کے باوجود میں کسی مصیبت کے وقت اسے بلاؤں تو وہ میری مدد
کرنے چلا آئے گا۔ وہ کسی کام سے مجھے ہٹا کرے گا تو میں اس
کی طرف دوڑا چلا جاؤں گا۔ ہمارے حیر بابا نے سختی سے تاکید
کی ہے کہ ہماری ذات سے کسی حیر بھائی کو تکلیف نہ پہنچے۔“

”اتنا بتاؤ اگر کبھی اس سے ملنا چاہو گے تو کیسے
ملو گے؟“

”میں حیر بابا سے گزارش کروں گا۔ وہ مراد کو حکم

دیں گے تو وہ میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔“
وہ بٹے کی طرف دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ”اور
گاؤ...! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ اگر تم مراد سے ہماری
دوستی کرادو گے تو ہم تمہارے وزن کا سونا تول کر تمہیں
دیں گے۔“

بٹے نے پوچھا۔ ”تم ہو کون؟ کیا کرتے ہو؟ کس تنظیم
سے تمہارا حلق ہے؟ اور مراد سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہو؟“
وہ بولا۔ ”تم نے یقیناً ڈی ڈی ٹی یعنی ڈیئرنگ ڈائمنڈ
ٹریڈرز کا نام سنا ہوگا؟“

”ہاں سنا ہے۔ ایک بہت ہی امیر کبیر خطرناک سرچھرا
مجموعہ میکانو رابرٹ اس تنظیم کا سربراہ ہے۔“

اس نے کہا۔ ”جیسے سرچھرا کہہ رہے ہو وہ افریقا کی
سب سے بڑی بیروں کی کان “کا کوٹا ڈائمنڈ مائن“ کا مالک
ہے۔ وہ وہاں چلتا کہ اس کے پاس کتنے بیش قیمت
بیروں کا ذخیرہ ہے اور وہ کس قدر دولت مند ہے۔“

”تو بے حیر بھائی کی منہ مانی رقم دیں گے۔ تم مراد سے میکانو
رابرٹ کی ایک ملاقات کرادو۔“

بٹے نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”یہ اتنا آسان نہیں
ہے۔ میرے کہنے سے وہ ملاقات نہیں کرے گا۔ وہ میرا حیر
بھائی کسی مشکل میں ہی میرے کام آنے کے لیے آسکتا
ہے۔ ورنہ مجھ سے بھی دور رہتا ہے۔“

بارورڈ نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”کیا تمہیں پورا یقین ہے
کہ وہ تمہاری کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے آسکتا ہے؟“
”بے شک۔ ہمارے حیر بابا حکم دیں گے تو وہ مجھے کسی
مصیبت سے نکالے چلا آئے گا۔“

پھر مراد کو آسانی سے میکانو رابرٹ کے پاس بلایا
جاسکتا ہے۔ تم اپنے حیر بابا سے بولو کہ میکانو رابرٹ کے چنگل
میں پھنس گئے ہو۔ وہاں سے نکلنے کے لیے مراد کی ضرورت
ہے۔ وہی تمہیں وہاں سے نجات دلائے گا۔“

اس نے کہا۔ ”مراد علی منگی کا نام دنیا کے تمام مجرم
جانتے ہیں۔ تم لوگ بھی جانتے ہو گے۔ وہ پاکستانی ہے۔ تم
بھی پاکستانی ہو۔ اس سے جان پہچان ضرور ہوئی؟“

وہ بولا۔ ”اسے اچھی طرح جانتا ہوں لیکن کبھی اس
سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”بھی تو کسی نہ کسی ذراقت کے دوران میں اس سے
سامنا ضرور ہوا ہوگا؟“

”ایک بار اس سے مقابلہ ہونے والا تھا لیکن میں اس
سے کٹر کر نکل گیا۔ وہ بھی مجھ سے کٹر آتا ہے۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں نہیں مانتا۔ وہ بھی
کٹر آتا نہیں ہے۔ اچھے اچھوں کو کٹر کے رکھ دیتا ہے۔“

”وہ مجھ سے اس لیے دور ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں
ایک دوسرے کے حیر بھائی ہیں۔“

”یہ حیر بھائی کیا ہوتے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”حیر کا مطلب ہے (saint)
سینٹ... اللہ کے پسندیدہ بندے۔ ہم ان کے عقیدت مند
ہیں۔ انہیں حیر کہتے ہیں اور ہم دوسری ہی ان کے مرید ہیں۔ اس
حوالے سے ایک دوسرے کے حیر بھائی بناتے ہیں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تو بے حیر بھائی ہو کر
ایک دوسرے سے دور رہتے ہو؟“

”ہمارے راستے اور ہمارے مزاج الگ ہیں۔ اس
کے باوجود میں کسی مصیبت کے وقت اسے بلاؤں تو وہ میری مدد
کرنے چلا آئے گا۔ وہ کسی کام سے مجھے ہٹا کرے گا تو میں اس
کی طرف دوڑا چلا جاؤں گا۔ ہمارے حیر بابا نے سختی سے تاکید
کی ہے کہ ہماری ذات سے کسی حیر بھائی کو تکلیف نہ پہنچے۔“

”اتنا بتاؤ اگر کبھی اس سے ملنا چاہو گے تو کیسے
ملو گے؟“

”میں حیر بابا سے گزارش کروں گا۔ وہ مراد کو حکم

دیں گے تو وہ میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔“
وہ بٹے کی طرف دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ”اور
گاؤ...! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ اگر تم مراد سے ہماری
دوستی کرادو گے تو ہم تمہارے وزن کا سونا تول کر تمہیں
دیں گے۔“

بٹے نے پوچھا۔ ”تم ہو کون؟ کیا کرتے ہو؟ کس تنظیم
سے تمہارا حلق ہے؟ اور مراد سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہو؟“
وہ بولا۔ ”تم نے یقیناً ڈی ڈی ٹی یعنی ڈیئرنگ ڈائمنڈ
ٹریڈرز کا نام سنا ہوگا؟“

”ہاں سنا ہے۔ ایک بہت ہی امیر کبیر خطرناک سرچھرا
مجموعہ میکانو رابرٹ اس تنظیم کا سربراہ ہے۔“

اس نے کہا۔ ”جیسے سرچھرا کہہ رہے ہو وہ افریقا کی
سب سے بڑی بیروں کی کان “کا کوٹا ڈائمنڈ مائن“ کا مالک
ہے۔ وہ وہاں چلتا کہ اس کے پاس کتنے بیش قیمت
بیروں کا ذخیرہ ہے اور وہ کس قدر دولت مند ہے۔“

”تو بے حیر بھائی کی منہ مانی رقم دیں گے۔ تم مراد سے میکانو
رابرٹ کی ایک ملاقات کرادو۔“

بٹے نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”یہ اتنا آسان نہیں
ہے۔ میرے کہنے سے وہ ملاقات نہیں کرے گا۔ وہ میرا حیر
بھائی کسی مشکل میں ہی میرے کام آنے کے لیے آسکتا
ہے۔ ورنہ مجھ سے بھی دور رہتا ہے۔“

ہی موت جھپٹ پڑی۔ یکبارگی تین ستوں سے فائرنگ ہوئے گی۔

ہارورڈ کے چار شوٹرز آئے تھے ان پر گولیاں چلانے والے بڑا اور بشری وغیرہ سیٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ انہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگے۔ لیکن دروازے تک نہ جاسکے۔ موت نے ان کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے گرے تو پھر اٹھ نہ سکے۔

ان میں سے ایک وہاں آ کر گر جاہاں ہارورڈ بیٹوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے مردہ شوٹرز کو دیکھنے لگا۔ پھر ذرا گردن نیڑھی کر کے دیکھا تو باقی ماتحتوں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ اس کی اپنی پلاننگ خاک ہو رہی تھی۔

اسے اپنے کی آواز سنائی دی۔ ”ہارورڈ...! تیرے چاروں گئے۔“ اور کہتے ہیں، انہیں بھی ملا۔

پھر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اپنے کے جو ماتحت مچے ہوئے تھے وہ دشمنوں پر گولیاں چلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں پہلے سے آ کر چرچ کو گھیر لیا تھا اور اس کو اس میں بھی تھے کہ انہیں کسی نے دیکھا نہیں ہے۔

ان کی طرف آنے والی گولیاں نے سمجھا دیا کہ موت سے کوئی چھپ نہیں سکتا۔ وہاں بڑی ڈیرے لگاؤ فائرنگ ہوتی رہی۔

چرچ کے اندر خاموشی تھی۔ ہارورڈ جہاں چھپا ہوا تھا وہاں سے نکلنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ باہر کی فائرنگ سن کر سمجھا رہی تھی کہ بلا نہ چرچ کے اندر تھا ہے نہ باہر... وہ بھی اپنی فوج لے کر آیا تھا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خاموشی چھان گئی۔ ایک شوٹرز نے فون کے ذریعے ہارورڈ سے کہا، ”ہمارے تمام آدمی مارے گئے ہیں۔ میں اور وہی جان بچا کر بھاگتے ہوئے ہائی وے پر آ گئے ہیں۔“

وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”آپ اپنے شوٹرز کے ساتھ چرچ میں محفوظ ہوں گے۔ ہمیں حکم دیں ہم کیا کریں؟ کیا آپ کو وہاں سے نکالنے کے لیے اور شوٹرز کو بلائیں؟“

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”شوٹرز کی فوج آ جائے گی، تب بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکے گی۔ یہاں بھی وہ چاروں مارے گئے ہیں۔ میں تیار ہوا گیا ہوں۔ ابھی ان سے کھجوتا کرنے والا ہوں۔ میری کال کا انتظار کرو۔“

”سوری مسٹر ہارورڈ...! انہ میں پیر بابا سے جھوٹ بولوں گا، نہ مراد کو دھوکا دے کر بلاؤں گا۔“

”تم مال کمانے کے لیے گن چلاتے ہو۔ ہم تمہارے اکاؤنٹ میں آج ہی دس لاکھ ڈالر جمع کر دیں گے۔“

”دس کروڑ بھی دو گے تو مراد کو دھوکا نہیں دوں گا۔“

وہ اپنے کوتا کواری سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ آخر اپنی گن نکال کر بولا۔ ”پھر تو ہم تمہیں یہاں سے پکڑ کر لے جائیں گے۔ اپنا قیدی بنا کر رکھیں گے۔ اس کے بعد تم اپنے پیر بابا سے سچ بولو گے۔ مراد کو بھی دھوکا نہیں دو گے۔ پھر تو وہ تمہاری مدد کرنے کے لیے دوڑا چلا آئے گا۔“

اپنے کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا مجھے جیسا قیدی بناؤ گے؟“

”اگر ہمارے ساتھ راضی خوشی نہیں جاؤ گے، ہمیں مجبور کر دے تو جبر کرنا ہی ہوگا۔“

”یعنی ہم دونوں ابھی گولیاں چلائیں گے۔ دونوں زخمی ہوں گے یا دونوں مر جائیں گے۔“

وہ تن کر بولا۔ ”میں ایک مٹی فوج لے کر آیا ہوں۔ مجھے موت آنے کی تب بھی تیرے آدھی نہیں قیدی بنا کر لے جائیں گے۔“

دراصل وہ باتوں میں الجھا رہا تھا۔ وہاں چرچ کے اندر بیٹھ کر عبادت کرنے والوں کے لیے کئی قطاروں میں چھپ چکی تھیں۔ ہارورڈ اچانک ہی چھلانگ لگا کر وہ قطاروں کے درمیان جا کر گر پڑا، ان کی نظروں سے چھپ گیا۔ پلاننگ کی اور ماتحت نے بھی پھرتی دکھائی۔ بوڑھی راہبہ کو پہنچ کر دوڑتی قطاروں کے درمیان آ گئے۔

ماتحت کے وہاں ہتھیار چھپا کر رکھے تھے۔ وہ اونڈھے منہ ریٹکتا ہوا انہیں گھس کے اندر گیا۔ وہاں سے بلیٹس اور گیس اٹھا کر لے آیا۔ ہارورڈ بے خبر تھا کہ وہ چپکے چپکے کیا کر رہے ہیں۔

وہ چیخ کر رہا تھا۔ ”تم ایک گن لے کر کب تک چھپتے اور مقابلہ کرتے رہو گے؟ میرے سچ فوجی ابھی آ رہے ہیں۔“

اس نے فون کے ذریعے باہر اٹھار کر لے والوں کو حکم دیا۔ ”ایک کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں یہاں صرف ایک ہی آدمی کے پاس گن ہے۔ اندر آ جاؤ۔“

حکم سننے ہی چرچ کا دروازہ کھلا۔ جو باہر گئے ہوئے تھے وہ اپنی اپنی گن سنبھالتے ہوئے اندر آئے۔ انہیں اطمینان تھا کہ مقابلے میں ایک ہی گن ہے۔ لیکن اندر آتے

وہ فون بند کر کے اونچی آواز میں بولا۔ ”مسٹر بلال احمد... ایشیاں مان گیا تم زبردست ہو۔ میں تمہیں سلیپ ٹ کرتا ہوں۔ تم بہت ذہین پلان میکرو ہو۔“

وہ خوشہ انداز انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”ہمارا بگ باس میکا نورابرٹ بھی تمہاری دلیری اور ایسی پلاننگ کی قدر کرے گا۔ میری سلامتی کے عوض ابھی تمہیں بھاری رقم دی جائے گی۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“

چرچ کے اندر بٹنے کی آواز گونجی۔ ”کیا مراد علی منگلی سے ملاقات کیے بغیر جاؤ گے؟“

وہ بولا۔ ”مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔ ابھی تمہاری منہ مانگی رقم وہاں جمع کر دی جائے گی۔ تم تصدیق کرنے کے بعد مجھے یہاں سے جانے دو۔“

”پہلے میری آواز کی سمت اپنی گن پیک کر میرے سامنے آؤ۔ پھر کوئی بات کرو۔“

ہارورڈ کے لیے سلامتی کا اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ گن پیک کر سینوں کے درمیان سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دروازے کی طرف بھی بٹری لگا اور اس کا ماتحت ان قطاروں کے درمیان سے ابھر آئے۔

بٹری نے اس کی گن اٹھا کر بگ باس کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے تیرے سین ٹیگروں کو دم دیا کر بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”بائی گاؤ...! ہم سب تمہارے قدر دان ہیں۔ یقین کرو ہم بگ باس کے حکم سے اسی دن تم کو ہلاک کر دیتے۔“

”بلال! تم کو اپنا دوست بنانا چاہتے تھے۔“

”بلال نے کہا۔“ اور ہم دیکھ رہے ہیں دوستی کی آڑ میں دشمنی ابھی ظاہر ہوگئی ہے۔“

بٹری نے کہا۔ ”اپنی باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے گولی مارنے دے۔ میں اسے بھی ٹھنڈا کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”نہیں، اسے زندہ جانے دوں گا۔ اس کے بگ باس میکا نورابرٹ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مراد علی منگلی کا پیر بھائی بھی کتنا زبردست ہے۔“

پھر اس نے ہارورڈ سے کہا۔ ”تمہیں کتنی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ مراد بگ باس سے ہی ذریعے پہنچ سکے۔ تم آئندہ مجھے ٹھہرنے اور پکڑنے کی کوششیں کرتے رہنا۔ فی الحال جاؤ یہاں سے...“

اسے رہائی مل رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا جا کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ہائی وے پر آگیا۔ وہاں اس نے رفتار کو معمول پر لاتے ہوئے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی پھر فون نکال کر بگ باس سے رابطہ کیا۔

رابطہ ہونے پر میکا نورابرٹ کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”ہاں یولو، کام ہو گیا؟“

اس نے ٹھکست خورہ انداز میں وہاں کی روداد سنائی۔ پھر کہا۔ ”یہ بلال احمد بھی مراد کی طرح زبردست ہے۔ اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ بھی خطرناک بلا ہے۔ انہیں کسی بھی طرح دوست بنانا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ناکام رہا ہوں۔“

وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو ششپن میں۔۔۔ وہ آپ کی کال کا خطر ہے۔ آپ کو مراد کے بارے میں کوئی خبر پراثر دینا چاہتا ہے۔“

ادھر بٹنے کے ہاتھوں نے تمام لاشوں کو چرچ سے دور لے جا کر پھینک دیا تھا۔ ہاں فرش پر پھیلے ہوئے ہو کو پانی سے دھو دیا تھا۔ راہب اور راہبہ کو بھی وہاں سے لے آئے تھے۔ چرچ کا ماحول پہلے کی طرح سکون اور امن و امان والا ہو گیا تھا۔

بٹری نے مایوسی سے کہا۔ ”مجھے حیرت نہیں آتا۔ میں سمجھ رہی تھی ایکشن میں رہنے کا موقع ہے۔ کچھ کر کر دیکھ لیکن تو نے تو ایک بھی گولی چلانے نہیں دی۔“

وہ بولا۔ ”کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ ایکشن والے اور فائرنگ کرنے والے مرحلوں سے گزرتے رہیں۔ آج میں نے بھی کچھ نہیں کیا ہے۔ میدان میرے ہاتھوں نے ہارا ہے۔“

وہ اسے ایک باروں کے حصار میں لے کر بولا۔ ”مجھے یہ تجربہ حاصل کرنا چاہیے کہ اسے وقت کس طرح حکمت عملی سے کام لیا جاتا ہے۔ تو دیکھنا میں ان کے بگ باس کی کال آئے گی۔ پھر تجھے معلوم ہوگا کہ میں کیسا زبردست حکم چیل رہا ہوں۔“

وہ اپنی حکمت عملی کو سمجھتے ہوئے درست کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی میکا نورابرٹ نے فون پر اسے بلا لیا۔ ”مسٹر بلال...! تم سے رابطہ کر کے دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ تم نے بہترین پلاننگ کے ذریعے ہارورڈ کے شوٹرز کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اگرچہ میرا ہی نقصان ہوا ہے۔ لیکن میں تمہاری حکمت

عملی اور دلیری کی قدر کرتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”یہ بڑی بات ہے۔ تم نے مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے گویا دوستی کرنے کے لیے تیس ہارورڈ کو زندہ چھوڑ کر فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔“

ہٹے نے کہا۔ ”واقعی۔ اسے زندہ چھوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مراد علی منگلی کے پیر بھائی ہو۔ مجھے امید ہے میرے دوست بن کر مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ ایک بار ضرور مراد سے میری ملاقات کراؤ گے۔“

”میں تمہاری یہ مراد ابھی پوری کروں گا۔“

بتاؤ میرا ایک راز اپنے دل میں چھپا کر رکھو گے؟“

وہ جیسے تڑپ کر جلدی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہے ہو...؟ ابھی مراد سے ملاقات کرو گے...؟ او گاؤ...! میں وعدہ کرتا ہوں یہ راز میرے دل میں رہے گا۔ کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔ میں کوئی دیواروں سے اور اپنے سامنے سے بھی نہیں بولوں گا۔“

”تم ماسٹر کو بوبو سے کبھی نہیں ملو گے۔“

”میں کس طرح یقین دلانا کہ تمہارے رازوں کا امین رہوں گا۔ قارڈ کاؤ سیک بتاؤ مراد کی بات کرو۔“

ہٹے نے اچانک مراد کی آواز اور لہجے میں تبدیلی محسوس کی۔ ”راز یہ ہے کہ تم ان لمحات میں مراد علی منگلی سے باتیں کر رہے ہو۔“

میکانو رابرٹ جہاں بیٹھا ہوا تھا وہاں سے ایک نیا آدمی کھڑا ہو گیا۔ شدید حیرانی سے بولا۔ ”تم... تم مراد علی منگلی ہو...؟“

مراد علی منگلی کی ریکارڈنگ اور اس کی حرکات و سکنات کی ویڈیو ٹیکسٹ کے ذریعے ریکٹس اور سنڈیکٹس میں پہنچی ہوئی تھیں۔ میکانو اس کی آواز کو پہچاننے کے لیے غار خانے میں بھی سن کر پہچان سکتا تھا۔

ان لمحات میں اچانک اس کی آواز سن کر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جس سے ہر قیمت پر ملاقات کا ارادہ ہے وہ اچانک ہی اس کے فون میں گھس آیا ہے۔

وہ یقین کرنے کے باوجود بے یقینی سے بولا۔ ”اوہ گاؤ...! وہی آواز ہے۔ وہی لہجہ ہے۔ میں کیا کروں گا۔“

یقین دلاؤ کہ تم ہی مراد علی منگلی ہو؟“

بشری حیرانی سے ہٹے کا منہ تک رہی تھی۔ وہ ایک نئی چال چل رہا تھا۔ ایک نیا گیم شروع کر رہا تھا۔ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”ابھی میں نے صرف بتایا ہے کہ مراد ہوں۔ آئندہ دیکھتا

رہوں گا کہ یہ راز کب تک اپنے پیٹ میں رکھ سکو گے؟“

وہ اس کے اندر بے یقینی اور ہانچل پیدا کر رہا تھا۔ اس کی شدید ضرورت کو سمجھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”جب تم پر بھروسہ ہو جائے گا تو اچانک ہی تم سے ملاقات کروں گا۔۔۔“

فی الحال ضروری نہیں ہے کہ میرے مراد ہونے پر یقین کرو۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں یقین کر رہا ہوں۔ تم میری خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکو گے۔ آج تم سے دوستی کی ابتدا کرتے ہوئے تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ کیا میں ایک بڑی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں؟“

”ہرگز نہیں۔ پہلے ایک دوسرے پر اعتماد قائم ہوگا۔ پھر تم سے لین دین ہوگا۔“

وہ بڑی بے تابی سے بولا۔ ”مراد...! مجھے خند نہیں آتی۔“

”میں ابھی دو روز تک لندن میں ہوں۔ پھر پتا نہیں کہاں رہیں گا؟ تم اتنی رازداری سے لندن آؤ کہ اپنی ڈی ڈی ٹی کے ذریعے ان کو تمہاری یہاں موجودگی کا پتا نہ چلے۔ جب ہی میں کہیں مل سکوں گا۔“

آواز اور لہجہ سے اس کی بے انتہا مسرتوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”اوہ گاؤ...! میں ابھی یہاں سے نکل پڑوں گا اور بڑی رازداری سے وہاں آؤں گا۔“

”آج نہیں نکل ہی آؤ۔ اگر کل کسی وجہ سے نکل سکا تو پرسوں ہر حال میں ملاقات کروں گا۔“

ان کے درمیان ملاقات طے ہو گئی۔ رابطہ قائم ہو گیا۔ بشری نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تو مراد بھائی بن کر کیا کرنے والا ہے؟“

”یہ معلوم کروں گا کہ وہ مراد سے دوستی کرنے کے لیے اس قدر بے یقینی کیوں ہے؟ اس کے ذاتی خفیہ معاملات کیا ہیں جن سے غصے کے لیے مراد لازمی ہو گیا ہے؟“

”میں ماسٹر کو بوبو کو اعتماد میں لوں گا اور اس سے ڈیل گیم کھیلنے کی اجازت حاصل کروں گا۔ میکانو یہی سمجھے گا کہ مراد صرف ماسٹر کے لیے ہی نہیں اس کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔ جبکہ میں مراد بن کر اس کا اعتماد حاصل کرتا رہوں گا۔ اس کا کام بھی کرتا رہوں گا اور اس سے بڑی بڑی رقمیں بھی حاصل کرتا رہوں گا۔“

بشری نے اس کے ساتھ کار میں آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو لاکھوں کروڑوں ڈالر دیکھائے گا۔“

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے

کہا۔ ”وہ ہیروں کا تاجر ہے۔ آئندہ میں ہیروں سے جرے ہوئے زیورات تجھے پہناؤں گا۔“
وہ خوش ہو کر اس کے بازو سے لگ گئی۔

☆☆☆

جزیرہ سسلی یورپ اور افریقہ کے درمیان بحیرہ روم میں ہے۔ سسلی کی اہمیت کا اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے شمال میں اٹلی، اسیمن اور البانیہ ہیں۔ جنوب میں مراکش، الجزائر، تونس اور لیبیا ہیں۔ مغرب میں پرنگال اور مشرق میں ترکی، شام اور اسرائیل ہیں۔

اسنے اہم ممالک کے درمیان یہ جزیرہ اسمگلنگ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ بڑے بڑے مال بردار بحری جہاز اس جزیرے کے آس پاس سے گزرتے ہیں۔ جہازوں میں نشیات اور ہتھیاروں سے بھرے کنٹینرز بھی ہوتے ہیں۔ اسمگل ہونے والی حسین عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں۔ جب اطلاع ملتی ہے کہ کسی بھی ملک کی مطلوبہ بندرگاہ میں غیر قانونی مال اسمگلنگ جاسکے گا تو وہ جہاز سسلی کے قریب گھرے پانی میں رک جاتا ہے۔ وہاں سے سسلی کی مافیا تنظیموں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ وہ غیر قانونی مال وہی تنظیمیں جہاز سے اتار کر لے جاتی ہیں۔ وہاں سے ان کے ملک کے قانونی محافظ انہیں روکنے نہیں آتے۔ اس سمندر کے گہرے پانی میں مافیا والے ہوتے ہیں۔

ان دنوں ریڈارٹ کا نیکی براؤن سسلی کے شمالی علاقوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ بحرمانہ معاہدے کے مطابق تمام غیر قانونی کنٹینرز کو اور عورتوں بچوں کو گھرے پانی میں کنٹینروں پر اتارا جاتا تھا پھر انہیں جزیرے کے مختلف ساحلوں پر پہنچایا جاتا تھا۔

یہ بڑی عجیب اور حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ایک سو میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے جزیرے میں تقریباً ایک سو مافیا خاندان آباد ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ سسلی ان کے باپ دادا کا ہے۔ وہ کسی اور کو اپنی زمین پر قبضہ نہیں کرنے دیتے۔

ان تمام مافیا فیملیز نے ایک دوسرے کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپس میں اتحاد قائم رکھا ہے۔ ریڈارٹ کو تمام مافیا گروہس کا سرپرست بنایا ہے۔ ان کے اتحاد نے وہاں کی حکومت اور قانون کو کمزور بنا دیا ہے۔ وہاں انتخابات کے بعد جو بھی حکمران آتا ہے، وہ ریڈارٹ کے ہاتھوں میں کھینچ لی بن کر رہتا ہے۔

نیکی براؤن کو صحیح معنوں میں بے تاج بادشاہ کہا جاسکتا

تھا۔ وہ اپنی بیوی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ پہنچ گیا۔ میڈوٹا نے جہاز سے اترتے ہی باپ سے کہا۔ ”پاپا! فون کریں، معلوم کریں ایمان علی کسی لڑکی کے ساتھ کہاں گیا ہے۔“ وہ یہ سوچ کر تھلا رہی تھی کہ ایک حسین لڑکی نے اس کے ہونے والے شوہر پر قبضہ جمالیا ہے اور نیکی یہ سوچ کر بے چین ہو رہا تھا کہ ایمان علی ان کے جہاز میں نہیں تھا۔ یہی کچھ میں آ رہا تھا کہ سن سنی گیا ہے۔

اسے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ ہونے والا داماد وہاں کیوں گیا ہے جہاں اس کے دشمن ماسٹر کو بوکا ہیز کوارٹر ہے؟ اس نے اپنے ایک دست راست سے فون پر پوچھا۔

”سن سنی میں ہمارے کتنے جاسوس ہیں؟“
اس نے جواب دیا۔ ”ایک ماہ پہلے بارہ تھے۔ اب پانچ رہ گئے ہیں۔ ماسٹر کے جاسوس بہت ہی شاطر ہیں۔ انہوں نے ایک ماہ میں ہمارے سات آدمیوں کو ڈھونڈ کر مار ڈالا ہے۔ باقی پانچ بھی سنبھل رہے ہیں۔ واپس آتا چاہتے ہیں۔“
وہ ناگوار لگ کر بولا۔ ”جو واپس آئے گا، اس کے پورے خاندان کو یہاں سے رسیہ کر دیا جائے گا۔ فوراً ان پانچوں سے رابطہ کرو۔ ان کے بلوکے ایمان علی نامی ایک جوان شخص ایک لڑکی کے ساتھ اسی واپس پہنچا ہے۔ وہ معلوم کریں کہ اس نے سن سنی میں کہاں قید کیا ہے؟ اور وہاں کیا کر رہا ہے؟“

پھر اس نے لندن میں اپنے کارندوں سے کہا۔ ”ایمان علی کے باپ ڈاکٹر نیکی سن کے پاس جاؤ۔ اس سے پوچھو کہ اس کا بیٹا سن سنی کیوں گیا ہے؟ اور اس کے ساتھ لڑکی کون ہے؟“

اس نے حکم دیا۔ ”ڈاکٹر سے کہو وہ بیٹے کو کسی بھی پہلی فلائٹ سے لندن آئے کو کہے۔ وہ اسے واپس نکس بلائے گا تو اسے سخت وارننگ دی جائے گی۔“

اس نے فون بند کیا تو ایک کارندے کی کال آئی۔ اس نے کہا۔ ”جس عورت نے ہماری بے بی کو گرایا تھا، وہ راجر اسٹریٹ میں اپنے مرد کے ساتھ رہتی ہے۔ مرد کا نام بلال احمد ہے۔ عورت کا نام بشری ہے۔ بلال احمد ایک چھوٹے سے ماہ کا مالک ہے۔“

”کیا یہ معلوم کیا ہے کہ بشری نے میری بیٹی سے بدعاشی کیوں کی تھی؟“

”ہاں! ہم معلوم کر رہے ہیں۔“

اس نے غصے سے کہا۔ ”اس عورت کی بدعاشی کے پیچھے کوئی تو خاص وجہ ہوگی پھر وہ عورت گمن چلاتی ہے۔ وہ

غور سے پڑھیں کہیں آپ بھی تبخیر معدہ گیس ٹریل کے شکار تو نہیں؟

بد ہضمی۔ پیٹ کا بڑا ہو جانا۔ دل کی گھبراہٹ
دماغ کی بے چینی۔ سر کو چکر۔ قبض کی پرالیم۔
جسم کی تھکاوٹ۔ جوڑوں کا درد۔ سینے میں
جلن اور خوراک کا ہضم نہ ہونا۔ طبیعت کا ہر
وقت مایوس رہنا۔ زندگی سے بیزاری چہرے
کا بے رونق ہو جانا اور وزن کا بڑھ جانا یہ
سب تبخیر معدہ گیس ٹریل کی علامت ہیں
شفا منجانب اللہ پرایمان رکھیں۔ تبخیر
تبخیر معدہ گیس ٹریل کے شکار ہوں تو آج ہی
نہان پر رابطہ کریں۔ گھر بیٹھے بذریعہ ذاک
ویسی بھی جانی قدرتی جزی بونیوں والا ہم
سے تبخیر معدہ گیس ٹریل کو رس منوالیں۔

دار الشفاء المدنی

ضلع حافظ آباد پاکستان

0333-1647663

0301-8149979

اوقات رابطہ

صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

فرار ہونے والے مجرموں پر گولیاں چلا رہی تھی۔ اس کا
مطلب ہے وہ بشری اور بلال عام شہری نہیں ہیں۔ مجرموں
سے نکرانے والے لوگ ہیں۔

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہو جائے گا
کہ وہ دونوں ہمارے ہی اتحادیوں سے تعلق رکھتے ہیں یا
دشمنوں سے؟“

”وہ دشمنوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس
عورت نے میری بیٹی سے دشمنی کی تھی۔ کل صبح تک ان کی
اصلیت معلوم نہ ہو تو اس عورت کو... کیا نام ہے اس کا؟“
کارندے نے کہا۔ ”بشری...“

”ہاں اسے اٹھالو۔ ہم اس سے اصلیت انکوائس کے
اس نے فون کو بند کر دیا۔ جنگی نے کہا۔ ”پاپا! آپ
پتا نہیں کتنے معاملات سے نمٹتے ہوئے گھر جا بیٹھے۔ میں
اپنی کار میں جا رہا ہوں۔ جو لیا میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ان سے دور ہوتا چلا گیا۔
اس کی ماں نے کہا۔ ”جنگی کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس نے
شادی کرنے کی ضد کی ہے۔ آپ کی ڈانٹ سن کر فی الحال
چپ ہے لیکن اس کی طلب سے باز نہیں آ رہا ہے۔“
ٹیکسی براؤن نے کہا۔ ”فوننگ اس سے دل بھر
جائے گا تو خود ہی اسے چھوڑ کر دوسری کو لگ جائے گا۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ اسے چھوڑے گا۔ اسے رادری
میں کتنی ہی حسین لڑکیاں ہیں۔ کسی سے اس کی شادی
کر دیں۔ نئی آنے کی تب ہی پرانی دل سے اترے گی۔
اس میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اس بکھت مراد علی علی
سے فرحت کس مل رہی ہے۔ اسے جلد ہی موت کے کھات نہ
اتارا گیا تو وہ مجھے بڑا نقصان پہنچائے گا۔“
”دشمنی تو جلی جی رہتی ہے۔ وہ دشمن قابو میں نہیں
آئے گا تو کیا بیٹے کو کنواہر ہی دیکھیں گے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے کھانے کے بعد بھی
بیٹا ماں کی نظروں میں کنواہر ہے۔“

”میری بات فہمی میں نہ اڑا لیں۔ کیا اپنے وارث
اپنے پوتی پوتے نہیں چاہتے ہیں۔ اس دشمنی نے پہلے
آپ کے بہنوئی برتاؤ کو مارا۔ پھر آپ کے بھائی کو مارا۔
ہمارے ایک بچے کو ختم کر ڈالا۔ کیا ہمارا خاندان اسی طرے پر
ہو جائے گا، آپ کی آئندہ نسل پیدا نہیں ہوگی؟“

اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ ”ہاں، وہ پہلا
دشمن ہے جو میرے خاندان کو ختم کر رہا ہے۔ ہمیں جلد سے
جلد اپنے بیٹے کی شادی کر دینا چاہیے۔ یہ بات دل کو لگ رہی

جو ایمان علی کو سحر زدہ کر چکی ہے۔ کیا میں اس سے کم ہوں؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟
باپ نے فون پر پوچھا۔ ”میری کار لے کر کہاں جا رہی ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میں آپ سے نہیں بولوں گی۔ اگر میری خوشی چاہتے ہیں تو کسی بھی پبلی فلائٹ میں مجھے سن سٹی جانے دیں۔ میں اس ٹھوس کو کوئی مار کر ایمان کو یہاں لے آؤں گی۔“
”فضول باتیں نہ کرو، وہ ایسے دشمن کا شہ ہے جو مراد کے ذریعے میرے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کر رہا ہے۔ وہ دشمن تمہاری بو پاتے ہی تمہیں کچا چبا جائے گا۔“
”میں کہہ چکی ہوں۔ مر جاؤں گی لیکن اسے کسی دوسری کے ساتھ برداشت نہیں کروں گی۔“ پھر وہ چیخ کر پوچھی۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گی۔ وہ اس کے ساتھ بتی مون منا کر رہا ہے۔“

چلا رخصت۔ واپس آؤ۔ مجھے ایمان علی کے بارے میں معلوم کرے۔ وہ اگر وہ ایک عام شخص کی طرح تفریح کرنے گیا ہے اور کسی کا اطلاق دودھ تک بھی ماسٹر کو بو بو سے نہیں ہے تو میرے آؤ کی اسے یہاں آنے پر مجبور کر دیں گے۔ اگر وہ آنے سے انکار کرے گا تو اسے کوئی مار دیں گے۔ یہی مناسب ہے۔ وہ نہیں رہے گا کہ ہمارا پاگل پن ختم ہو جائے گا۔“

”نوڈیڈ! اسے میرے لیے زندہ رکھیں۔ میں اس طرح اس خوب صورت بلا کو ختم کر دیں پھر مجھے سکون ملے گا۔“
”میں وعدہ کرتا ہوں۔ کل شام تک تم اس لڑکی کی موت کی خبر سنو گی۔ واپس آ جاؤ۔“

میز دنا نے کار روک دی۔ پھر اسے واپس کے لیے موڑنے لگی۔ ایک گھنٹہ کے بعد اس نے نیکی سے کہا۔ ”باس! ڈاکٹر عینی سن لندن میں نہیں ہے۔ وہ انڈیا گیا ہے اور وہ یونا مراد بھی اس کے ساتھ ہی گیا ہے۔“
”ڈاکٹر کا فون نمبر معلوم کرو۔“

اس نے فون بند کیا تو سن سٹی کے کارندے نے کال کی۔ ”باس! بڑی اہم رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ ماسٹر کو بو بو، وی پلیس آف لوٹ سٹی میں آیا تھا۔ اس نے وہاں ایمان علی سے ملاقات کی ہے۔ ان کے درمیان کوئی اہم بحثے داری ہے۔“

نیکی نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟“
وہ بولا۔ ”جو آنکھوں سے دیکھا ہے وہی بول رہا ہوں۔ ماسٹر نے ایمان علی کو گلے لگایا تھا۔ میں دور تھا۔ ان کی

تھی کہ نسل کو آگے بڑھانا ہے۔ اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا۔“ تم لڑکی پسند کرو۔ میں الجھنوں میں رہ کر رہ کر رہا ہوں۔ اپنی آئندہ نسل کے بارے میں سوچنا بھول گیا ہوں۔ ہمارے گھر میں پوتی پوتے جلد سے جلد ہونے چاہئیں۔“

میز دنا نے باپ کی گردن میں ہاتھیں ڈال کر کہا۔ ”آپ بھائی کی شادی جلدی کریں گے۔ میرا کیا ہوگا؟ کیا آپ کے آؤی ایمان کو سن سٹی سے پکڑ کر نہیں لائیں گے؟“
وہ اس کی پیشانی چوم کر بولا۔ ”باپ کی جان! وہ ہمارے بدترین دشمن کے شہر میں ہے۔ وہاں ہمارا کوئی جیالا جا کر واردات نہیں کر سکے گا۔ ایمان علی نے وہاں جا کر الجھا دیا ہے۔ پہلے یہ معلوم کرنے دو کہ وہ کبھی وہاں کیوں گیا ہے۔“
وہ پاؤں پیچ کر بولی۔ ”ایک لڑکی کے ساتھ گیا ہے۔“
اسی وقت ایک کارندے نے کال کی۔ اس نے کہا۔ ”باس! ہمارے سن سٹی کے جاسوس نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ ایمان علی وہاں اتر پورے سے وی پلیس آف لوٹ سٹی میں گیا ہے۔“

نیکی براؤن نے حیرانی سے کہا۔ ”وہ گاؤ! وہ اتنے جتنے ہوئی میں رہے کیا ہے۔ کیا وہاں کوئی اس کا سیز پاں ہے؟“
”یہ ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کوئی کھ آؤٹ ڈور ریسپنڈنٹ اتر پورٹ میں اس کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ جلد ہی مزید معلومات حاصل ہوں گی تو میں آپ کو رپورٹ پیش کروں گا۔“

واپس ختم ہو گیا۔ میز دنا نے رونے کے انداز میں کہا۔ ”وہ ایک کھٹے ہوئی میں گیا ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ بتی مون منا رہا ہے۔ اس سے شادی کر چکا ہے۔“

وہ باپ کی زبان کو کھینچ کر بولی۔ ”پاپا! اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں اپنی توہین برداشت نہیں کروں گی۔ اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔“

اس نے کہا۔ ”توہین تو میری ہی ہو رہی ہے۔ ایمان علی جیسا ایک عام شہری میرے ہاتھ نہیں آ رہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ جب تک باپ سے پکڑ کر میرے سامنے نہیں لائیں گے تب تک میں بھوکے رہوں گی۔ آپ سے بات بھی نہیں کروں گی۔“

وہ مفرور رہیں زادی ماروی کا وجود برداشت نہیں کر رہی تھی۔ وہ پاؤں پیچتی ہوئی ماں باپ سے دور ہو کر عمارت کے باہر پارکنگ ایریا میں آئی۔ پھر باپ کی کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

یہ سوچ کر فضا آ رہا تھا کہ وہ خوب صورت بلا کون ہے

لیے بچ گیا تھا۔ صرف زخمی ہوا تھا۔ چاروں تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ مرینہ نے اس کی حصار داری کی۔ جب اسپتال سے نکلا تو مرینہ جا چکی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن کی فلائٹ سے انڈیا پہنچ گیا۔

اس نے اپنے باپ سے کلمہ پڑھنے کو کہا تھا۔ ڈاکٹر مینی سن کے عیسائی رفعتے دار انڈیا سے لندن تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان سب کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان مذہبی کشیدگی تھی۔ ادھر ایمان علی نے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ کلمہ نہیں پڑھے گا تب تک وہ باپ کے سامنے نہیں آئے گا۔ فون پر بھی اس سے بات نہیں کرے گا۔

اب انڈیا میں باپ بیٹے کا سامنا ہونے والا تھا۔ اس کے شکوک میں جا کر رہتا تھا۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ ڈیڈ کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہے گا لیکن اس سے بات نہیں کرے گا۔

وہ دہلی پہنچا تو ڈیڈ کا بنگلا متقل تھا۔ اس نے ہوٹل میں ایک کمرہ سوا چاکر دو چار روز میں کرائے کا مکان حاصل کرے گا۔ مراد نے اسے بگنی بائی کا فون نمبر دیا تھا اور رہائشی پتا بھی بتایا تھا۔ درخت سے ملنے سے پہلے اس کی ماں سے ملنا ضروری تھا۔

اس نے نمبر شیخ کے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "ماتا جی! میں مراد بول رہا ہوں۔ واپس آ گیا ہوں۔ ڈیڈ کا بنگلا لاکڈ ہے۔ اس لیے ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوں۔" وہ غصے سے چیخ کر بولی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی ہوٹل میں جاتے ہوئے؟ مجھے ماں کہتے ہو اور میرے پاس نہیں آتے۔ مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں اپنی ماں کو مانلوں گا۔"

"کوئی بات نہیں آؤ۔"

"کسی وجہ سے آپ کے پاس نہیں آیا۔ پہلے آپ تنہا آ کر مجھ سے ملیں۔ اگلی ہی مینی کو ساتھ نہ لائیں۔ پھر میں آپ سے باتیں کرنے کے بعد یہاں سے جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آرہی ہوں۔"

وہ آدھے گھنٹے میں آگئی۔ ایمان علی نے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر آداب کہا۔ بگنی بائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خوش رہو بیٹے! تمہاری آواز بدلی ہوئی کیوں ہے؟"

"آپ آرام سے یہاں بیٹھیں میں بتاتا ہوں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ میری پیدائشی آواز اور لب و لہجہ ہے۔ میں مراد نہیں ہوں۔ سچ بچ ایمان علی ہوں اور ڈاکٹر مینی سن کا وہ بیٹا ہوں جو

باتیں نہ سن سکا۔ لیکن ماسٹر کی خوشیاں اور اس کے انداز سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ایمان علی اس کا سگ ہے اور اس کے لیے بہت اہم ہے۔"

میکل براؤن یہ رپورٹ سن رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر مینی سن کا بیٹا ماسٹر کو بوبو کے لیے اہم کیوں ہے؟ اور وہ ایک میٹنگ ہوٹل میں بنی مومن منانے کیوں گیا ہے؟ ماسٹر سے اس کا کیا تعلق ہے؟

میکل براؤن کو اس کے مذکورہ سوالات کا جواب ملے یا نہ ملے، یہ تو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ماسٹر جیسے بدترین دشمن سے ایمان علی کا گہرا تعلق ہے۔

میز وٹا واپس آگئی۔ میکل نے کہا۔ "ہم ایمان علی سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ وہ خطرناک بہروپیا ہے۔ ماسٹر کو اس سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ میری بیٹی، میری جان! اسے دل سے نکالو۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے، وہ ماسٹر کا بہت ہی خاص آدمی ہے۔ نہ وہ ہماری طرف آئے گا، نہ ہم اسے اپنے قریب آنے دیں گے۔ اسے تو اب وہ کچھ ہی گولی مار دیں گے۔"

میز وٹا جھماک کی طرح بیٹھ گیا۔ دل برداشتہ ہو کر بولی۔ "پاپا! وہ ظالم میرے دل سے تین گنے بڑے میری خاطر ایک بار اس کے باپ سے بات کریں۔ اس سے معلوم کریں کہ ماسٹر سے ان لوگوں کا کیا تعلق ہے؟"

"ڈاکٹر مینی سن کا فون نمبر معلوم کیا جا رہا ہے جیسے ہی ملے گا، میں اس سے بات کروں گا۔ تم صبر کرو اور انتظار کرو۔"

وہ اٹھ کھڑی اور مینی کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اپنے کئی ملازم جانے لگا۔

☆ ☆ ☆

ایمان علی فطرتاً حسن بنا ہوا تھا۔ مراد نے بگنی بائی کی بیٹی ورشا کے حسن و جمال کی ایسی تعریفیں کی تھیں کہ وہ اسے دیکھے بغیر اس پر لٹو ہو گیا تھا۔ اس نے مراد سے یہ تمام ہنسنی سنی تھی کہ ورشا اس کی جیسی دیوانی ہے اور وہ کب طرح اس سے دامن بچاتا رہا ہے۔

مراد نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب ایمان علی وہاں جائے گا تو وہ اسے مراد سمجھ کر پھر اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔ گویا وہ اس کے لیے کئی پکائی کبیر تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ انڈیا جائے گا۔ ایسے ہی وقت دشمنوں نے مراد کے دھوکے میں اسے گولی ماری تھی۔ ابھی مقتدر میں زندگی تھی اس

”ہاں، اب تم سے مسلمان ہونے کی ضد نہیں کرے گا۔ لو اس سے بات کر دو۔“

ایمان علی نے اس سے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔
”ذیہ السلام علیکم۔۔۔۔۔“

”خوش رہو بیٹا! تم سلامت رہو ہزار برس۔ تم اپنی ضد چھوڑ کر مجھ سے بول کر مجھے ایک نئی زندگی دے رہے ہو۔“

”ہاں ذیہ! ابھی ماتحتی کی نصیحت سن کر قرآن مجید کی ایک آیت یاد آگئی کہ تمہارا دین تمہارے ساتھ ہمارا دین

ہمارے ساتھ۔۔۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں اب دینی معاملات میں آپ سے کچھ نہیں بولوں گا۔“

”بیٹے! میرا بنگلا لاکھ ہے۔ جتنی بہن کو فون دو۔ تم ابھی کہاں ہو؟ میں کل آ رہا ہوں۔“

”میں ہوٹل میں ہوں۔ اب ماتحتی کے گھر جا رہا ہوں۔“

”جتنی ہائی فون لے کر پوچھا۔“ مراد کہاں ہے؟“ پھر کہا۔۔۔۔۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں کچھ رہی ہوں

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بدلتی ہوئی ہوں۔“

”ہاں۔ وہ اپنے طور پر نکلتا ہے۔“

”اور عبداللہ کبڑی کہاں ہے؟“

”وہ ضروری شاپنگ کے لیے نکلتا ہے۔ کل میرے ساتھ آ رہا ہے اور اب وہ بونا مراد نہیں ہے۔“

”نوا کراٹے والا تھا۔ میں نے پھر سرجری کی اور اس کا پتہ انکس چھوڑ دیا۔“

”یوں بھی اب اس کے لیے ضروری بن کر رہنا ضروری نہیں تھا۔“

”یہاں فرمونہ کے ماں باپ اسے داماد بنانے کے لیے اس کا انتقال کر رہے ہیں۔“

اس نے کچھ دبا دیا۔ ”میں نے اس کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔“

پھر ایمان علی سے کہا۔ ”میں نے اس کے ساتھ چل رہے ہو لیکن جانتے ہونا کہ میری ایک بیٹی اور شامہ کی بیوی ہے۔“

”جانتا ہوں۔ مراد نے اس کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ میں ایک بار اس سے تنہائی میں ملوں گا اور اس سے سچ

بولوں گا کہ میں مراد نہیں ہوں۔ اصلی ایمان علی ڈاکٹر نعیمی سن کا بیٹا ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں دیکھوں گی کہ وہ مراد کو چاہتی ہے۔“

”اب ایمان علی کی شکل و صورت کو اور اس کی شخصیت کو چاہیے۔“

”ہوٹل کے ملازم نے اس کا سامان بگنی ہائی کی کار میں لے جا کر رکھا۔ وہ ماتحتی کے ساتھ کار کی اسٹیزنگ سیٹ پر

باپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

وہ اس کے چہرے کو ٹوٹتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

وہ اسے بتانے لگا۔ ”مراد سے کل ایب میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے یہاں کے تمام حالات بتائے ہیں۔ پھر وہ

وہاں سے لندن چلا گیا ہے۔ دشمنوں نے مجھے مراد کچھ کر گولی ماری تھی۔ چاروں اسپتال میں رہ کر سوچا، بھارت میرا پیدائشی

وطن ہے۔ مجھے یہاں آ کر رہنا چاہیے۔ اس لیے چلا آیا۔“

”تم اپنے ذیہ کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟“

”میں چاہتا تھا، وہ بھی میری طرح مسلمان ہو جائیں۔ انہوں نے انکار کیا تو میں ناراض ہو کر چلا گیا۔“

”تم نے غلط کیا۔ تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

دھرم کوئی سا بھی ہو، اسے دل سے قبول کیا جاتا ہے۔ تم نے دل سے اسلام قبول کیا۔ تمہارے ذیہ کی دل سے عیسائی

ہیں۔ میں دل سے ہندو ہوں۔ جب وہ اپنا مذہب چھوڑنا نہیں چاہتے تو تمہیں ضد نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں اپنی زندگی

بیٹے دو بیٹے!“

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر بولا۔

”آپ درست کہتی ہیں میں ضد نہیں کروں گا۔“

جتنی ہائی نے اپنے فون پر نمبر ۱۱۱ کے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”ڈاکٹر بھائی میں جتنی بول رہی ہوں تم وہاں

خیریت سے ہو؟“

وہ بولا۔ ”تھینکس گاڈ! ابھی تک خیریت ہے۔“

مراد کا دشمن نیکی براؤن میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ مراد کو ایمان علی کے گھر آ کر اسے داماد بنانا چاہتا ہے۔ تم تو جانتی ہو، مراد

اپنی ماروی کے سوا کسی اور کا نہیں ہوگا۔ آئندہ وہ دشمن میرے پیچھے پڑے گا۔ اس کے لیے یہی میں کل کی فلائٹ سے دہلی

آ رہا ہوں۔“

”یہ بہت اچھا کر رہے ہو۔“

”یہ بہت اچھا کر رہے ہو۔“

”ہاں جب مراد مجھ سے فون پر ملے گا تب وہ وہاں موجود تھا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی

ایک ہی ضد ہے کہ میں اس کی طرح مسلمان ہو جاؤں میں نے سوچے اور جواب دینے کے لیے اس سے کچھ نہ

کہا۔“

جتنی نے کہا۔ ”میں نے ابھی ایمان علی کو سمجھایا ہے کہ کسی سے زبردستی اپنا دھرم قبول نہ کرو۔ یہ صرف اور صرف اپنے دل کا اور اپنے عقیدے کا معاملہ ہے۔“

”کیا وہ انڈیا میں ہے؟“

پڑے گا تو اچھی بات ہے۔ یہ یقین کر لو کہ میں وہ ایمان علی نہیں ہوں جو عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔

”عورتوں سے دور بھاگنے والا مرد نہیں ہوتا۔ اچھا ہے کہ تم وہ نہیں ہو۔ میں تمہاری صورت کی تمہاری شخصیت کی پہلے بھی دیوانی تھی۔ اب بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔“

”میں دیکھوں گا کہ تم مجھے کس قدر چاہتی رہو گی۔“

”مجھے کس طرح آزماؤ گے؟“

”اس طرح کہ شادی نہیں کروں گا۔ شادی کرنے کے بعد ایک روٹین لائف گزارنی پڑتی ہے۔ پتی قتی کو مجبوراً ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ شادی نہ ہو روٹین ہوتا رہے تو جوانی کو انجمائے کرنے کا مزہ آتا رہتا ہے۔“

”تم بالکل میری طرح سوچتے ہو۔ میں شادی کے بعد چو لہے پانڈی اور بچوں میں اپنی جوانی برباد نہیں کروں گی۔ ہم عاشق اور معشوق بن کر آزادی سے دنیا گھومتے رہیں گے۔“

وہ مناشا کے ہنسنے میں پہنچ گئی۔ سبیلی نے اس کے لیے اپنا بیڈروم تیار رکھا تھا۔ اس نے ایمان علی کو کچھ کر کہا۔ ”یہ تو وہی ہیں جن کے لیے پاگل ہو رہی ہیں۔ یہ کب آئے؟“

”آج ہی میرے نصیب سے آج ہیں۔ اب مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“

وہ سبیلی کا شکریہ ادا کر کے ایمان علی کے ساتھ بیڈروم میں آگئی۔ دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ مناشا نے دروازے کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ ایسا بیڈروم اور اساتذہ نو جوان اس کی زندگی میں نہیں آیا تھا۔ اس کے چاہنے والے اور اسے شادی کی آفر دینے والے کئی تھے لیکن کوئی آئیڈیل جوان نہیں تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آکر ایک صوفے پر گر پڑی۔ جوانی تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی۔

وہ آٹھ گھنٹے بند کر کے ایمان علی کو اپنے شہر کی گلیوں میں بھٹکتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس پر دھیما دھیما سا جنون طاری ہونے لگا۔ دماغ میں الجھن سی ہونے لگی۔ ”میرا گھر ہے میرا بیڈروم ہے مجھے اپنے بیڈ پر ہونا چاہیے۔ لیکن وہ مزے لوٹ رہی ہے۔“

اس نے آدھے گھنٹے بعد اپنے فون پر ورشا کے کمرے پر کئے وہاں طوفان آکر گزر گیا تھا۔ ایسے وقت اس کے فون سے رنگ نون ابھرنے لگی۔ ایسے رنگین لمحات میں اپنا فون بھی کباب میں ہڈی لگ رہا تھا۔ وہ ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ ورشانے اسے ہاتھ نہیں لگا یا۔ وہ اسے پکارتے پکارتے چپ

ہو گیا۔

فون بند ہوا تو مناشا اور تپ گئی۔ ”ہائے کیا ہو رہا ہے ادھر؟ وہ گرج رہا ہوگا۔ برس رہا ہوگا۔ اس کی گرج چمک میں فون کی آواز نہیں پہنچ رہی ہے، کیا میں یہاں سنبھلتی رہوں؟“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ پھر جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی بیڈروم کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ اندر بڑی پرسراہ اور گرما دینے والی خاموشی تھی۔ اسے بھی ایسے ہی اسرار و رموز سے گزرتا تھا۔

اس نے دروازے پر ہاتھ مارا پھر اسے پیٹ ڈالا۔

درشاہ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ادھر ادھر پڑے ہوئے لباس کو اٹھانے لگی۔ ایمان علی نے اس کے لباس کو چھین کر دور پھینک دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ دوسری دستک نے پھر اسے الگ کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کون؟ مناشا تم ہو؟“

”ہاں میں نے کال کی تھی۔ تم نے انیڈنٹس کی۔ باہر آؤ۔ میں تم کو کچھ چاہتی ہوں۔“

”میں ہاؤس میں آسکتی۔ پلیز سمجھا کرو۔ میں ابھی کال کر رہی ہوں۔ مجھ سے فون نہ لو۔“

اس نے فون اٹھا کر اس کے نمبر پر کال کیے پھر رابطہ ہونے پر پوچھا۔ ”ہاں بولو؟“

”کیا بولوں؟ ایک گھنٹہ ہو رہا ہے۔ کال کا کچھ تو خیال کرو۔“

وہ شدید حیرانی سے بولی۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ ہماری ایسی کوئی ڈیٹنگ نہیں ہوئی تھی۔“

”وہ کوئی زمین جائیداد نہیں ہے کہ اس کے لیے ڈیٹنگ ہوگی۔ اب تم آؤ۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔“

”مفتے سے بولی۔“ تم کیا کہو اس کر رہی ہو؟“

”میری انوکھی بات نہیں کہہ رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے تھکنے ہی معاملات میں شیز کر رہے ہیں۔ پلیز بحث نہ کرو۔ باہر آ جاؤ۔ مجھے اندر جانے دو۔“

”مناشا! میں ہر معاملے میں شیز کر سکتی ہوں۔ مگر اپنے مرد کو کسی کی ہوا بھی نہیں سکنے دوں گی۔“

”وہ تمہارا مرد کہاں سے ہو گیا؟ وہ تمہارا پتی نہیں ہے۔ تم اسے بازار سے خرید کر نہیں لائی ہو۔ دیکھو مجھ پر ہسٹریا کے دورے پڑ چکے ہیں۔ پھر پڑے گا تو مشکل میں پڑ جاؤ گی۔“

ورشا ہونٹوں کو سختی سے سمجھنے کی ایمان علی کو دیکھنے لگی۔ وہ بولی۔ ”میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔“

وہ فون پر چٹ کر بولی۔ ”میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔“

وہ بیڈ پر سے اترتے ہوئے بولی۔ ”کھولتی ہوں۔“

تکلیف سے دہری ہوتی ہوئی جھٹکنے لگی۔ ورشانے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک لائٹ اس کے منہ پر ماری۔ وہ الٹ کر فرش پر ایسی گری کہ بھراٹھ نہ سکی۔ ورشانے اسے دیکھا۔ یہ اندازہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر آ کر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ایمان علی نے اسے آگے بڑھا کر کھلی سڑک پر پہنچ کر پوچھا۔ ”وہ تو جنون میں مبتلا ہو گئی تھی۔ تم نے پیچھا کیسے چھڑا لیا ہے؟“

”اس کی پٹائی کی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ خود ہی پیچھا چھوڑ دیا۔“

وہ چپ رہ کر پریشانی سے سوچنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ہم نے پہلی بار جس کے گھر میں بیمار کی ابتدا کی اسے تم نے مار پیٹ کر بے ہوش کر دیا۔ ہماری محبت کا آغاز اچھا نہیں ہوا ہے۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ہنگامہ کرے گی۔ ہمارے خلاف بولے گی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنا سر بھاری نہ کرو۔ میں ہوں نا۔ جیسے بھی حالات ہوں گے میں نمٹ لوں گی۔“

وہ اپنے ہتھکے میں آگے بڑھتی ہوئی نے بیٹی کو دیکھا تو سمجھ گئی کہ اپنی ضد پوری کر کے ایمان علی کو جیت کر آئی ہے۔

نیٹا اور ڈولی مایوس ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایمان علی کو جیاجی کہہ کر مخاطب کیا۔ ورشانے کہا۔ ”انہیں جیجا ضرور کہہ لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے، ابھی شادی نہیں کریں گے۔“

ماں نے کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی نہیں کرو گی تو کیا بونڈی ہو کر شادی کرو گی؟“

”میں نے اور ایمان نے فیصلہ کیا ہے۔ ابھی ایک برس تک شادی کا نام نہیں لیں گے۔ ہماری عمر ابھی ہواؤں میں اڑتے رہنے کی ہے۔ میں گھر والی اور بچوں والی بن کر جوانی کے خوب صورت دکان کوئی میں نہیں ملاؤں گی۔“

ایمان علی نے بیٹنی بانی کا ہاتھ تمام کر کہا۔ ”میں بھی ورشا کو بیوی نہیں چاہتا۔ بٹا کر لائف انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا ہاتھ تمام کر کہتا ہوں کہ آپ میری بھی ماما بنی ہیں۔ ایک برس بعد جب بھی عہدوں کی میں ورشا کو دلہن بنا لوں گا۔“

بیٹنی بانی نے خوش ہو کر اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ”میں تم پر بھروسہ کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے تم میری بیٹی کو دھوکا نہیں دو گے۔“

ایمان علی نے ایک ہی دن میں بیٹنی بانی کے دل میں اور پوری فیملی میں جگہ بنائی۔ لیکن ورشا کے ساتھ ہمیش کرنا مہنگا

مجھے کپڑے تو پہننے دو۔“

وہ فون بند کر کے جلدی جلدی لباس پہنتے ہوئے بولی۔ ”وہ یاگل ہو گئی ہے۔ ہسٹریا کی مریضہ ہے۔ تمہارے پاس آنے کے لیے پگل رہی ہے۔ میری کیکلی نہ ہوتی تو اسے کوئی مار دیتی۔“

اس نے کہا۔ ”ابھی دروازہ کھولو گی تو وہ مجھ سے آکر لگ جائے گی۔ ہم اس کے گھر میں ہیں۔ میں اسے کیا کہہ سکوں گا؟“

”میں اسے کتنے ہی نہیں دوں گی۔ تم صرف میرے ہو۔ آؤ میرے پیچھے رہو۔ میں اس سے نمٹ لوں گی۔“

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ نتاشا بیٹنی کھڑی تھی۔ ورشانے گھور کر کہا۔ ”کیا بکواس کر رہی تھیں؟ یہ میرا مرد ہے۔ میں نے بازار سے نہیں خریدا ہے۔ دل کا سودا دل سے کیا ہے۔“

وہ ورشا کی طرف نہیں سن رہی تھی۔ ایمان علی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ فون ہانے کے لیے ورشا کے پیچھے آ گیا۔ نتاشا نے کہا۔ ”میرا ہو کر اس کے پیچھے چھپ رہے ہو۔ تم پہلے ورشا سے بھی دور بھاگتے تھے۔ مجھے اندر سے دیکھو گے تو۔۔۔۔۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے گریبان کو چھانڈا۔ اس پر واقعی دورہ پڑ رہا تھا۔ ورشا نے کہا۔ ”ایمان! فوراً باہر جاؤ۔ گاڑی اسٹارٹ کر دو۔ میں رات بھر ہوں۔“

وہ پلٹ کر تیزی سے جانے لگا۔ وہ جیننے لگی۔ ”رک جاؤ۔ میں تمہیں مانتے نہیں دوں گی۔“

وہ دوری ہوئی جا کر اسے پکڑنا چاہتی تھی۔ ورشانے اسے پکڑ کر جھنجھوڑے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو میں آگ اور لہو سے کھیلنے والی بیٹنی بانی کی بیٹی ہوں۔ تمہیں اس لیے ڈھیل دے رہی ہوں کہ تم مریضہ ہو۔ میں نے یہاں آ کر بڑی بھول کی ہے۔ کمرے میں چلو مجھے جاکر تمہاری دوائیں کہاں ہیں؟“

وہ نہیں سن رہی تھی۔ ایمان علی کے پاس جانے کے لیے ورشا کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کمرے کا مرض ایسا ہی ہوتا ہے۔ مریضہ قابو میں نہیں آتی۔

ورشا اسے چھٹی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ پھر اسے بید کی طرف دھکا دیا۔ وہ بیڈ سے ٹکرا کر پھر ایمان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ ورشانے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ پھر ایک گھونسا اس کے پیٹ میں مارا۔ وہ پیٹ پکڑ کر

پڑ گیا۔

”نتاشا نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ رات کو شاپنگ کے لیے میرے ساتھ جاسکتی ہے۔ میں نے جواباً کہا تھا کہ باجاجی سے مشورہ کرنے کے بعد جاسکوں گی۔ پھر میں نے تھوڑی دیر بعد اسے سوری کہہ دیا۔“

”کیا آخری کال سے پہلے تم نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ پریشان ہے یا خوفزدہ ہے؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔ وہ باتیں کرتے وقت بہت فریش تھی۔“

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”جو بھی قاتل ہے وہ کار میں آیا تھا۔ اس کے بوڑھے پڑوسی نے تقریباً پانچ بجے ایک کار کو اس بنگلے کے احاطے سے نکلے دیکھا تھا۔“

ورشہا کچھ پریشان ہوئی پھر بولی۔ ”پڑوسی نے کار چلانے والے کو دیکھا ہوگا؟“

”ہو نہ ہو چاہے، اس کی نگاہیں کمزور ہیں۔ وہ کار کے اندر بیٹھے ہوئے شخص کو نہ دیکھ سکا۔“

ورشہا نے ایمان کی سانس لی۔ ڈرائنگ روم کے باہر کوریڈور میں ایمان کی باتیں سن رہا تھا۔ ورشہا نے اس سے کہا تھا کہ نتاشا کی پہلی ٹی۔وی۔وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کن فلوایدی ہاتھوں سے چلائی گئی تھی کہ وہ مرنے اور ورشہا اسے بے ہوش سمجھ کر چلی آئی تھی۔

وہ جاسوس چلا گیا تھا۔ ورشہا اپنی زبان کے ساتھ نتاشا کے گھر پر سے کے لیے گئی تھی۔ ایمان علی شوق رہا تھا ورشہا سے پیار کی ابتدا اچھی نہیں ہوئی ہے۔ وہ ایک کنواری کی لاش بہت سی چلاک اور تیز نظر تھی۔ اس نے جاسوس کے سامنے باتیں بنا کر خود کو اور ایمان علی کو قتل کے الزام سے بچا لیا تھا۔ لیکن ابھی قتل کے پتھار اور بھی تھے۔

ڈاکٹر نیمن نے پانچ بجے کی فلائٹ سے آیا۔ ایمان علی جھنجھنی بانی کے ساتھ باجی کے استقبال کے لیے انر پورٹ آیا تھا۔ وہیں کرائم برانچ کا ایک انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بولا۔ ”ایمان علی! تمہیں حراست میں لیا جا رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میرے بیٹے کو کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟“

انسپرنے کہا۔ ”آپ اپنے بیٹے کا پاسپورٹ اور مرنے والی کاغذات لے کر ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں آئیں۔ وہاں گرفتاری کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔“

اچانک ایسی افتاد آ پڑی تھی جس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ ایمان علی کو ایک سِل میں پہنچا کر کہہ رہے

دوسرے دن صبح انٹیلی جنس کا ایک سراغ رساں ان کے دروازے پر آیا۔ اس نے جھنجھنی بانی سے کہا۔ ”آپ کی بیٹی ورشہا سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔ ایک بری خبر ہے۔ اس کی سبیلی نتاشا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

جھنجھنی بانی نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر بیڈ روم میں ورشہا کے پاس آکر بولی۔ ”ایک سراغ رساں تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہاری سبیلی نتاشا کو کسی نے قتل کیا ہے۔“

ورشہا پریشان ہو کر ایمان علی کے پاس آئی۔ اس سے بولی۔ ”نتاشا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس بات کا اعتراف نہ کرتا کہ کل ہم اس کے گھر گئے تھے۔ بانی میں سنبھال لوں گی۔“

وہ فون پر نتاشا کی ماں کا فون نمبر بیچ کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ ہاتھ جوڑ کر سراغ رساں کو نمتسے کہا پھر فون پر بولی۔ ”آنٹی! میں ورشہا بول رہی ہوں۔ یہ کیا سن رہی ہوں۔ میری نتاشا اس دنیا میں نہیں ہے؟“

دوسری طرف سے ان کے رونے کی آواز آئی۔ ورشہا نے کہا۔ ”ہائے آنٹی! یہ کیا ہو گیا۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے جاسوس سے پوچھا۔ ”کیا قاتل کو گرفتار کیا گیا ہے؟“

”نہیں۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ شاید تمہارے تعاون سے ہم قاتل کے قریب پہنچ سکیں گے۔“

وہ آفسیر کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں قاتل تک پہنچنے کے لیے دن رات حاضر ہوں۔“

انسپرنے کہا۔ ”کسی نے اس پر ظلم کیا تھا۔ اس کی ناک سے ایک ڈراکس خون نکل کر بند ہو گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کہتی ہے کہ اس کے پیٹ کی ایک رگ پھٹ گئی تھی۔ کسی نے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی تھی۔“

ورشہا نے اس کے پیٹ میں ٹھونسا مارا تھا اور منہ پر ایک لٹک ماری تھی۔ اسی لیے ناک سے خون بہہ کر رک گیا تھا۔ جاسوس نے کہا۔ ”مرڈر شام کے چار بجے کے درمیان ہوا ہے۔ اس سے ایک گھنٹا پہلے تم نے اسے کال کی تھی۔ اس کے فون پر تمہارا نام اور وقت لکھا ہوا ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہاں اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا چاہتی تھی۔ اس نے سوری کہہ دیا کیونکہ گھر میں وہ تنہا تھی۔ اس کے مام اور ڈیڈ نہیں تھے۔“

”پھر اس نے ایک گھنٹے بعد جسمیں کال کی تھی۔ اس کے بعد ہی تم نے جواباً اسے کال کی۔“

ایمان علی کے پاس غوس ثبوت تھے کہ وہ ڈاکٹر مینسن کا بیٹا ہے۔ لندن اور پاکستان میں انڈین ایسیسی کی رپورٹ بھی درست تھی کہ ایمان علی وہاں جا چکا ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بہرہ و پیامرا علی مثلی اب بھی ایمان علی کا چہرہ رکھے یورپ کے کسی ملک میں ہے۔

بہر حال وہ ان کا مطلوبہ مجرم نہیں تھا۔ اسے حراست میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اس لیے اسے رہا کر دیا گیا۔ باپ بیٹے پہلی بار فرصت سے گلے ملے۔ جگنی بائی اور اس کی بیٹیاں خوش تھیں۔ وہ ورشا کو دیکھ کر دل ہی دل میں پریشان ہو کر بولا۔ ”یہ میرے لیے خوش قدم نہیں ہے۔ ابھی دو ہی دنوں میں پہلے تاشا کے قتل کے الزام سے بچا۔ پھر کرائم برانچ والوں کے عذاب سے نجات ملی۔ آگے اور نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟“

جگنی بائی جھون کو اور غوسٹ کو مانتی تھی۔ اس نے تنہائی میں جی پی سے کہا۔ ”ورشا! تمہارے نئے جیون کی شروعات اچھی نہیں ہے۔ جذبات میں اندھی نہ بنو۔ میں نیوٹی مہاراج سے کہتی ہوں دو سبیل کی ختم کنڈی دیکھ کر بتائیں گے کہ تمہیں ایمان علی کے ساتھ رہنی پڑے گا یا چاہیے یا نہیں؟“

دوسرے ہی دن جگنی مہاراج نے کہہ دیا کہ دونوں کی کنڈی نہیں ملتی ہے۔ اگر آئندہ ان کا ملاپ ہوگا تو لڑکی کی ماں پر کوئی بھاری مصیبت آئے گی۔ جگنی بائی نے کان پکڑ لیے۔ وہ جگنی کی ہویں پوری کرنے کے لیے کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس نے ورشا پر کڑی پابندیاں عائد کر دیں۔

ادھر سکی براؤن نے ڈاکٹر مینسن کا فون نمبر حاصل کرنے کے بعد اسے کال کی۔ ”ہیلو ڈاکٹر! میں سکی براؤن بول رہا ہوں۔ میں نے تمہارے بیٹے اور اپنی بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا۔ میرا حکم اب اس کی کبیر ہوتا ہے جو اس پر عمل نہیں کرتا، وہ زندگی سے جاتا ہے۔ یہ میری سچی بات سن رہے ہو؟“

”ہاں تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔“

”یوٹان سنس! یہ میری بیٹی کی زندگی کا اہم معاملہ ہے۔ میرا حکم ہے اور تم اسے بکواس کہہ رہے ہو؟“

”تم نے مجھے ٹان سنس کہا ہے۔ اگر شریفانہ زبان سے نہیں بولو گے تو فون بند کر دوں گا۔“

”شریفانہ زبان کیا بولوں؟ تم باپ بیٹے جھگڑے ہو۔ وہ سن سٹی چلا گیا ہے اور تم انڈیا جا کر مچھپ گئے ہو۔“

”نہ میں تمہاری دھونس میں ہوں، نہ یہاں چھپنے آیا ہوں اور نہ ہی میرا بیٹا ایمان علی سن سٹی میں ہے۔ یہ میرے

تھے۔“ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ ہم ایک عرصے سے تمہاری تاک میں ہیں۔ یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ تم مراد علی مثلی ہو لیکن یہ ثابت کر دیں گے کہ تم بڑی رازداری سے پاکستان جاتے آتے رہے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”آج تک میرے باپ نے بھی پاکستان کی زمین پر قدم نہیں رکھا ہے۔“

”تم میں دن پہلے یہاں سے لندن گئے تھے پھر وہاں سے پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں ہماری انڈین ایسیسی نے رپورٹ دی ہے کہ تم وہاں ڈینٹس کے علاقے میں تھے۔ وہاں تم نے ایک لڑکی ماروی سے شادی کی پھر اس کے ساتھ لندن چلے گئے۔ لندن میں تمہارے جاسوس نہیں نہ دیکھ سکے۔ تم کسی کنفلڈ فلائٹ سے کسی دوسرے ملک چلے گئے تھے اور اب تم یہاں پہنچ گئے ہو۔“

”جناب عالی! میں تقریباً پانچ برس کے بعد یہاں آیا ہوں۔ پتا نہیں میں کون سا دن پہلے آپ نے کسے یہاں سے لندن جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں ثابت کر دوں گا کہ میں پچھلے پانچ برسوں میں استنبول، عمان اور اسرائیل میں رہا ہوں۔“

ان افسروں اور سرانجام دانوں کے سامنے میز پر جو قابض رکھی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے مکی عرف ایمان علی کے ایک ایک دن کی رپورٹس میں۔ لندن اور پاکستان میں انڈین ایسیسی کی غوس چشم دید اطلاعات درج تھیں کہ مراد بیس دن پہلے انڈیا سے گل ایب، وہاں سے لندن، پھر لندن سے پاکستان گیا تھا۔ ایسی چشم دید اطلاعات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

اور حقیقت یہی ہوا تھا۔ ایمان علی کے پیچھے چھپا ہوا مراد ان کی رہائش کے مطابق آخری بار لندن جا کر قتل ہو گیا تھا اور اب انہیں دہلی میں نظر آتا تو انہوں نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔

ڈاکٹر مینسن اور جگنی بائی اس کا پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات لے آئے۔ انہوں نے وہ پاسپورٹ دیکھا تو حیران رہ گئے، دوسرے کاغذات سے بھی یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ بھی پاکستان نہیں گیا تھا۔

ایک افسر نے جھٹلایا کہ ڈاکٹر سے کہا۔ ”موجودہ کون تھا، جو یہاں آپ کا بیٹا بن کر آیا تھا؟“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں خود حیران ہوں کہ وہ کون تھا۔ وہ بہو میرے بیٹے جیسا تھا۔ اگر اس میں اور میرے بیٹے کی کوئی فرق تھا تو میں اس لیے سمجھ نہ سکا کہ وہ پانچ برس کے بعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اور صرف میں ہی نہیں کرائم برانچ کے جہاں دیدہ جاسوس بھی دھوکا کھاتے رہے۔“

باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میں کیا کروں؟ اس کی بنی تمہارا چچا نہیں چھوڑے گی۔ ایک مراد ہی ہے جو باپ بنی سے چچا چھڑا سکے گا۔ پہلے اسکا آپ کے ذریعے ان سے باتیں کرو۔ پھر میں مراد سے بات کروں گا۔“

وہ دونوں فی وی کے سامنے آگئے۔ ڈاکٹر نے فون کے ذریعے نیکی کو اطلاع دی کہ وہ رابطہ کر رہا ہے۔ بیٹے کے ساتھ اپنے فی وی کے سامنے ہے۔ وہ بھی بنی کے ساتھ سامنے آجائے۔

ادھر باپ نے بنی کو بتایا تھا کہ ایمان علی سن سنی میں نہیں ہے انڈیا میں اپنے باپ کے ساتھ ہے۔ ابھی وہ اسے اسکرین پر دیکھ سکے گی اور باتیں کر سکے گی۔

میڈونا یہ سن کر بے چین ہو گئی تھی۔ وقت سے پہلے فی وی کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ جب رابطہ ہوا تو ڈاکٹر یعنی سن نظر آیا۔ دوسری طرف نیکی براؤن اپنے فی وی کے سامنے تھا۔ اس نے کہا۔ ”اپنے بیٹے کو سامنے لاؤ۔ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے میں اسے دیکھوں گا اور باتیں کروں گا۔“

ایمان علی باپ کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ باپ بنی نے حیرانی سے دیکھا۔ انہیں وہ ایمان علی نظر آ رہا تھا جسے وہ اب تک دیکھتے آئے تھے جبکہ اس چہرے کے نیچے کچھ ہوئے مراد کو دیکھتے رہے تھے۔

نیکی براؤن نے پوچھا۔ ”تم تو سن سنی میں تھے؟“ وہ بولا۔ ”تجرب ہے آپ نے وہاں کیسے دیکھ لیا؟ میں تو خواب میں بھی سن سنی نہیں گیا۔ میں آپ کے سامنے یہاں وہی کھڑا ہوں۔ پتا نہیں آپ نے وہاں کسے دیکھا ہے؟“

میڈونا نے کہا۔ ”پاپا! مجھے اس سے بات کرنے دیں۔“ ایمان علی نے کہا۔ ”میں بھی میڈونا کو دیکھنا اور اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

میڈونا باپ کی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس حسن پرست نے پہلی بار اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ عمر زدہ ہو کر دل میں کہنے لگا۔ ”ہائے اس دنیا میں کتنا حسن بھرا پڑا ہے۔ میں کہاں کہاں جاؤں؟ کس کس کو گلے لگاؤں؟“

مقدر مسکرا رہا تھا۔ ”اے حسن پرست...! میں نے مراد کو حیرا ہم شکل بنایا ہے۔ جا... کہاں کہاں جائے گا اور کیسی شامت کو گلے لگائے گا۔“

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گورڈش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ساتھ یہاں انڈیا میں ہے۔“
”جھوٹ بول رہے ہو۔ میری بنی نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ اس وقت سن سنی کے ہوگ دی پتلیس آف لوسٹ سنی میں ہے۔“

”اور وہ اس وقت میرے پاس ہے۔ ابھی ہاتھ روم میں شاور لے رہا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد فی وی آن کر کے بیٹھو اور اسکا آپ کے ذریعے اسے اسکرین پر دیکھ کر اس سے باتیں کرو۔ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔“

وہ رابطہ ختم کر کے بیٹے کے بیڈ روم میں آیا۔ وہ غسل سے فارغ ہو کر ہاتھ روم سے باہر آ رہا تھا۔ باپ نے کہا۔ ”بیٹے! ایک اور مصیبت آرہی ہے۔“

”کیسی مصیبت ڈیڈ؟“

وہ بیٹے کو بتانے لگا کہ جب مرا وحل ایبیل سے لندن آ رہا تھا، تب نیکی براؤن کی نیکی کے ساتھ جہاز میں جان پہچان ہوئی تھی۔ میڈونا، مراد پر عاشق ہو گئی تھی۔ لندن میں نیکی براؤن نے ڈاکٹر کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بنی کی شادی کی تیاریاں کرے۔ انکار کی صورت میں اس نے موت کی دھمکیاں دی تھیں۔

باپ نے کہا۔ ”مراد ان دنوں سن سنی میں ہے اور تم میرے ساتھ ہو۔ نیکی براؤن اور اس کی بنی کو اس کو ایمان علی سمجھیں گے جس سے شادی کی بات طے ہو چکی ہے۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم سے ہی میڈونا کا رشتہ ہوا تھا۔“

بیٹے نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں میں کہہ دوں گا کہ مجھ سے ہی رشتہ طے ہوا تھا۔ کیا میڈونا خوب صورت ہے؟ آپ کی بہو بیٹے کے قاتل ہے؟“

”اُنکی باتیں نہ سوچو۔ نیکی براؤن بہت ہی خطرناک سرسبز کر رہے گا۔ اس کی بنی کو فدا بھی تم سے شکایت ہوگی تو تمہیں اناناکا دیا کرے گا۔“

”جب وہ ایسا خطرناک ہے تو مجھے جبراً داماد بنانا چاہیے گا۔“

ڈاکٹر یعنی سن نے مراد کو ایمان علی کا ہم شکل بن کر اپنے بیٹے کے لیے نئی آفات کے لیے راستے ہموار کر دیے تھے۔ وہ مراد کے دھوکے میں گولی کھا کر اسپتال سے ہوا تھا۔ ورشا کے ساتھ رہ کر ایک مرڈر کیس میں پھنسنے سے پہلے بال بال بچا تھا۔ مراد کا ہم شکل ہونے کے باعث ٹیلی ویژن والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اب حالات کہہ رہے تھے کہ نیکی براؤن اسے اپنا بیوی داماد بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاوے گا۔

مندیے ہال، کڑک دار آواز..... اور کچھ ایسے بھی مل جاتے
ہیں جن کو دیکھتے ہی دل میں پھپھلی ہوئے لگتی ہے۔
کوئی کہتا ہے جا اس کی دعا میں لے۔ یہ بہت بڑا
انسان ہے۔ اس کی دعا میں تیرے کام آجائیں گی۔ تیری

وہ بابا راست چلتے ہوئے مجھے مل گیا تھا۔
بعض بابا ایسے ہوتے ہیں جن کو دیکھتے ہی احساس
ہو جاتا ہے کہ وہ فراڈ قسم کا بندہ ہوگا۔ لال لال آنکھیں،
گلے میں موئے موئے منکوں کی بالائیں، اچھے ہوئے

تسبیح

منظر امام

انسانی خواہشات کی زنجیر ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے مگر
حالات کی ہتھکڑی انسان کو اونچی اڑان سے روک دیتی ہے
بس... یہی وہ مقام ہے جہاں کوئی بے بسی اور بے بسی کی انتہا
کو چھو لیتا ہے۔ ایسے میں یا تو انسان اندھیرے کی طرف بڑھ جاتا
ہے یا روشنی کا کوئی پالہ اسے اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ اس
کے مقدر کا ستارہ بھی بہت روشن تھا اس کے باوجود ایک
تیرگی اس کے دل میں اتر گئی۔

رشتوں کی تختوں کو واضح کرتی ایک

دلچسپ روداد



زندگی بدل لے۔“
 بابا! کیا مجھے اس صبح پر کچھ پڑھنا پڑے گا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، کچھ نہیں پڑھنا۔ یہ صبح تیری پانچ خواہشیں پوری کر سکتی ہے۔ کوئی سی بھی پانچ خواہشات۔ چاہے وہ کتنی ہی ناممکن کیوں نہ ہوں۔“

”وہ کیسے سرکار؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”اس صبح کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کرنا ہے اور وہ خواہش پوری ہو جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ ایک خواہش اور دوسری خواہش کے درمیان کم از کم پندرہ دنوں کا وقفہ ہو۔“ بابا نے کہا۔

میں نے یہ تو یقین کر لیا تھا کہ بابا کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ غیر معمولی شخصیت ہیں لیکن اس صبح کے بارے میں جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، اس پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

”شاید تجھے یقین نہیں آ رہا۔“ بابا غصے سے بولے۔ ”تو سمجھ رہا ہے کہ شاید میں جموٹ بول رہا ہوں۔ چل اس وقت اپنی کوئی خواہش بیان کر۔۔۔۔۔ ابھی پوری ہو جائے گی۔“

میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا کہ ذرا آزما کر دیکھوں کہ بابا کی باتوں میں کہاں تک صداقت ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے میدان تھا اور اس میدان کے شروع میں ایک درخت تھا۔ بہت بڑا درخت۔ انتہائی گھنا مضبوط۔ اندازے کے مطابق کم از کم پچاس ساٹھ سال تک اس کے مرنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے صبح ہاتھ میں لے کر اپنے آواز سے اپنی خواہش بیان کی۔ ”وہ جو سامنے درخت ہے، وہ گھٹ جائے۔“ یہ ایک بے گئی سی خواہش تھی اور صرف آزما کے لے لے کر ہی جبکہ اس درخت کے مرنے کا کافی الحاح کوئی امکان نہیں تھا۔

لیکن ایک عجیب و غریب حیرت انگیز معجزہ۔ ایک دھماکے کے ساتھ وہ تیار درخت اچانک چھوڑ کر زمین پر گر پڑا۔ ناقابل یقین صورت حال تھی۔ نہ تو زلزلہ آیا، نہ کوئی طوفان آیا تھا اور پچاس ساٹھ سال سے پہلے نہ مرنے والا درخت زمین بوس ہو چکا تھا۔

اس میدان میں ایک مجمع سا لگ گیا تھا۔ لوگ چاروں طرف سے اس درخت کے گرد جمع ہو کر پیش گوئیاں کر رہے تھے۔

”بابا! یہ تو۔۔۔۔۔ یہ تو کمال ہو گیا۔“ میں نے عقیدت سے کہا۔

مشکلیں ختم ہو جائیں گی۔ ان کے پیچھے پڑ جا۔
 تو وہ ایسے ہی بابا تھے جن کو دیکھتے ہی یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔ وہ بابا ایک درخت کے نیچے دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ وہ ایک جانماز پر بیٹھے تھے، اپنی دنیا میں مگن۔

ان کو دیکھتے ہی دل میں عقیدت کے جذبات ابھرنے لگے تھے۔ میں نے ان کے پاس جا کر سوکانوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ شاید میری آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

انہوں نے ایک نظر نوٹ کی طرف پھر میری طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولے۔ ”یہ کیا ہے؟“
 ”سرکار! شاید اس کی آپ کو ضرورت ہو۔“ میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ایک معمولی سا ذخیرہ۔۔۔۔۔“

”کیا میں نے مانگا تھا؟“
 ”نہیں سرکار! آپ نے تو نہیں مانگا۔“ میں اسی عقیدت سے بولا۔ ”لیکن ویکن کچھ ہیں۔“ بابا نے غصے سے کہا۔ ”جا اٹھ یہاں سے۔ اور چلا جا۔“

ان کے تہور دیکھتے ہوئے میں نے سوکانوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں دھپس رکھ لیا۔ یقین تھا کہ وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہیں لیکن میں ان کے پاس سے ہٹا نہیں جھکا ان کے سامنے سر جھکا کر گھڑا رہا۔

”کیا بات ہے، کیا چاہتا ہے؟“ اس بار ان کا لہجہ بہت نرم تھا۔
 ”نظر نرم چاہتا ہوں سرکار۔۔۔۔۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔“ میں نے جواب سے کہا۔

”جس کو دیکھو وہی مجبوریوں اور فرماکشوں کی ٹوکریاں اٹھائے گھوم رہا ہے۔“
 ”سرکار! شب و روز کی کوششوں نے اس حال کو جو پہنچا دیا ہے۔“

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔ یہ لے۔“ بابا نے ایک صبح میری طرف بڑھادی۔ ”یہ شاید ابھی تک تیرے ہی لیے امانت کے طور پر میرے پاس رکھی ہوئی تھی۔“

”سرکار! بڑی نوازش۔“ میں نے ادب سے وہ صبح چوم لی۔ اس میں صرف گیارہ دانے تھے اور وہ بھی بہت بڑے بڑے۔ وہ غیر معمولی صبح تھی۔
 ”جا۔۔۔۔۔ لے جا اس کو۔“ بابا نے کہا۔ ”اور اپنی“

”کیا تو نے اس درخت کو مگرانے کی بات کی تھی؟“
بابا نے پوچھا۔

”جی سرکار! صرف آزمانے کے لیے۔“
 ”بے وقوف! تو نے اپنی حماقت سے ایک قیمتی
 خواہش ضائع کر دی۔“ بابا نے کہا۔ ”اب تیرے اور
 تیرے خاندان والوں کے پاس صرف چار خواہشات رہ
 گئی ہیں۔“

بابا! کیا میرے علاوہ میرے گھروالے بھی اس تسبیح سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جس کے پاس یہ تصحیح ہو، وہ اپنی خواہشات پوری کر سکتا ہے۔“ بابا نے کہا۔ ”اب تو چلا جا ادھر کو، خواہشات پوری کر لے۔“

میں نے بڑی عقیدت کے ساتھ بابا کے ہاتھ کو پوسر دیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس وقت جیسے کائنات میرے ساتھ چل رہی تھی۔
کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ بے پناہ دولت، صحت اور بھی بہت کچھ۔ دنیا کا سب کچھ میرے قدموں میں... آ سکتا تھا۔

گھر میں کیا تھا۔ ایک بیوی یا کسی خواتین یا اپنی جوانی میں قبول صورت تھی لیکن مقلی اور پریشانی کے بلے تلے دب کر وہ اپنے وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی تھی۔ چوتھہ کسی زمانے میں خوب صورت تھا، اب اس پر پریشانیوں نے لکڑی کمرچ دی تھی۔

ایسے راہ گھر کے ذخیر میں تبدیلی ہو چکی تھیں جس کے نیچے چنگاری نام کی وہی چیز نہیں تھی۔ ایک بیوی کے علاوہ دو بچے تھے، ایک نیا اور ایک پٹا۔ وہ دونوں بڑے ہو چکے تھے لیکن ان کے پاس جس چیز کا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لڑکی کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا منگنا بہتر زندگی کی تلاش میں بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ خدا معلوم اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ بہت ذہین اور سعادت مند۔ جانے اس نے جا رہے کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میری بیٹی اسے بہت پسند کرنے لگی تھی ہماری مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، جس کے نام کے ساتھ ایک بار واپستہ ہو جائیں پھر کسی اور کے بارے میں سوچتی بھی نہیں ہیں۔

شہانہ بھی ایسی ہی تھی۔ وہ ہر وقت اداس رہتی۔ ہم

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کو ترستے رہتے تھے۔
لاڑکے کے ساتھ ایسا تھا کہ وہ صرف بی اے کر سکا تھا۔ جو
آج کے دور میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا ارادہ ایم بی اے
کرنے کا تھا لیکن اعلیٰ تعلیمی ادارے میں ایم بی اے کی فیس
ہی اتنی ہوتی ہے کہ صرف خواہش کی جا سکتی ہے یعنی ہمارے
چھوٹے سے گھر میں ہر طرف خواہشیں ہی بکھری ہوئی
تھیں..... ادھوری اور سسکتی ہوئی خواہشیں۔ ایسے میں اس
نتیجہ کا مل جانا کسی عظیم نعمت سے کم نہیں تھا۔

میں جب گھر پہنچا تو میرے چہرے پر ہلا کی خود اعتمادی تھی جو شاید اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی۔ کامیابی کے تاثرات ہی الگ ہوتے ہیں۔ چہرے پر ہلا کی چمک اور آنکھوں میں ہلا کی مستی ہوتی ہے۔ جیسے پوری دنیا گھومکروں میں اڑاؤنے کی صلاحیت مل گئی ہو۔

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس اتنا جان لو کہ ہمیں کسی بات کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا، ہمارے پاس وہ سب کچھ ہوگا جس کے ہم خواب دیکھتے آئے ہیں۔“

اس وقت یاسمین کے علاوہ میرے دو بھائی بچے بھی میرے پاس ہی تھے۔ مجھ سے چونکہ برداشت نہیں تھا اس لیے میں نے انہیں وہ شمع دکھا دی۔ ”یہ دیکھو، یہ ہے ہمارے مستقبل کے سنہری دروازے کی سنہری جلی۔“

”کیا بات ہوئی؟ اس طرح کی تو درجنوں شمع گھر میں بڑی ہیں۔“ یاسمین نے کہا۔

”یہ کوئی عام شخص نہیں ہے بے وقوف عورت۔“ میں فخر سے بولا۔ ”یہ بہت اعلیٰ شخص ہے۔ ایک بہت بڑے انسان کا تھقہ۔ یہ ہماری چار خواہشات پوری کر سکتی ہے۔“ وہ کیسے؟ میرے بچے نے پوچھا۔

”وہ اس طرح کہ ہم اس کو سامنے رکھ کر اپنی خواہشیں بیان کریں گے تو وہ پوری ہو جائیں گی۔“

”یہ سب کہاؤں کی باتیں ہوتی ہیں اب۔“ میرے بیٹے ریحان نے کہا۔ ”حقیقی زندگی میں ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کسی نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔“

میں ان سے یہ کہنے والا تھا کہ میں اس تسبیح کو آزما کر دیکھ چکا ہوں۔ پھر بتاتے بتاتے رک گیا۔ وہ سب کے سب

مجھے ہے وقف سمجھتے کہ میں نے خواہواہ ایک امتحانہ خواہش کر کے اپنی ایک خواہش ضائع کر دی۔ میں ہفتوں بعد بیٹھے کہا۔ ”ابا! کیوں نہ ہم ابھی اس صبح کو آزمائیں۔“ میری بیٹے ریحان نے کہا۔

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن خواہش کیا ہوگی؟ یاد رکھو، اس ایک خواہش کے بعد صرف تین خواہشیں رہ جائیں گی۔“

”ہاں ہاں، کوئی بات نہیں۔“ یاسمین جلدی سے بولی۔ ”اس طرح اس صبح کا امتحان تو ہو جائے گا۔“

بہت دیر کی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ اس صبح سے کہا جائے کہ وہ چودھری امجد کا مکان گراوے۔ چودھری امجد ہمارے مکان سے کئی مکان آگے رہتا تھا۔ اس نے جب سے اپنے پرانے مکان کو گرا کر نیا مکان بنوایا تھا ہماری زندگی تلخ کر کے دکھ دی تھی۔

ہر وقت ہمیں یہ احساس دلاتا رہتا کہ ہم ناکارہ اور ناکام لوگ ہیں۔ ہمارے چاہنے والے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ ہم اپنے پرانے مکان پر رنگ و روغن بھی کرا سکیں۔

وہ جب ملتا تو یہی کہتا۔ ”مفدر صاحب! آپ نے تو اپنی زندگی بے کار گزاری ہے جی۔ میں تو یہاں ہوں کہ اپنا مکان بیچ کر کوئی دکان ہی کھول لیں۔ چار پیسوں کی آمدنی ہو جائے گی۔“

”انور صاحب! خدا کے فضل سے میں عزت سے ساتھ جا رہے کمائی لیتا ہوں۔“

”وہ بھلا تھا۔“ وہ طنز یہ انداز میں ہنسنے لگتا۔ ”ہاں جی۔ آج کل چاہیے کتنا بہت مشکل ہے۔ اب یہی دیکھ لیں، آپ نے برشوں سے اپنے مکان پر رنگ نہیں کروایا ہوگا۔ ظاہر ہے کہاں سے گولہ گے۔ اب ہر ایک کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا نا، اب مجھے دیکھیں۔ میں نے پرانے مکان کو تروا کر نیا مکان بنوایا ہے۔ معلوم ہے اس پر کتنے خرچ ہوئے ہیں۔ پورے چالیس لاکھ۔ چالیس لاکھ کم نہیں ہوتے مفدر صاحب۔ بہت بڑی رقم ہوتی ہے لیکن آپ کو کیا معلوم۔“

ایسی باتیں وہ یاسمین اور دونوں بچوں سے بھی کرنا کرتا۔ یہ احساس دلاتا کہ میں ایک ناکارہ انسان ہوں۔ میرے حالات بھی نہیں بدلیں گے اور جس کے حالات ایک دفعہ خراب ہو جائیں، وہ ہمیشہ خراب ہی رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہم سب اس کی کبواں سن کر عاجز آچکے تھے۔ اس

لیے جب یہ بات ذہن میں آئی کہ اس صبح سے چودھری انور کا مکان گرانے کی خواہش کی جائے تو سب نے اتفاق کیا۔ ”چلیں ابا! بولیں اس صبح سے۔“ ریحان نے کہا۔ ”ویسے تو میں جانتا ہوں کہ ہونا ہونا کچھ بھی نہیں ہے لیکن ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”لیکن ابا! ساتھ میں یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ چودھری کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔“ شہانہ نے کہا۔ ”صرف مکان گرا جائے، اس کے علاوہ کوئی نقصان نہ ہو۔“ ”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے صبح سامنے رکھی اور بابا کے بتائے ہوئے طریقے پر بولنا شروع کر دیا۔ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ اس گلی میں جو چودھری انور کا مکان ہے، وہ گرا جائے لیکن کسی کو جانی نقصان نہ ہو۔ صرف مکان ہی گرے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔“

اپنی اس خواہش کو بیان کرنے کے بعد ہم سب ایک دوسرے کو دیکھنے کو کہنے لگے۔ جبکہ یہ انہوں ہی خواہش تھی ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا ہو گیا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار۔ ہم سب پاؤں کی طرح باہر دوڑ پڑے۔ گلی میں ایک بنگامہ برپا تھا۔ گرد و مالا طوفان سا تھا اور لوگ چیخ و پکار کر ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ چودھری انور کا مکان اچانک زمین یوں ہو گیا ہے۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ مکان کیسے گرا ہوگا۔ کچھ کوئی نالودہ آیا، نہ ہی کسی قسم کا طوفان تھا۔ پھر بھی وہ مکان پورے کا پورا گرا ہوا تھا۔

پتا چلا کہ اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ باہر گئے ہوئے تھے۔ صرف ایک مکان اور فرنیچر کا نقصان ہوا تھا یعنی دوسرے معنوں میں چودھری انور کا لاکھوں کا نقصان ہو گیا تھا۔

اس وقت پورا محلہ چودھری انور کے مکان کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں، یاسمین اور دونوں بچے بھی تھے۔ حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے جا رہے تھے۔

کسی نے چودھری انور کو خبر کر دی ہوگی، وہ آندھی طوفان کی طرح اپنے گھر والوں کو واپس لے آیا۔ شاید وہ لوگ نہیں اور گئے ہوئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد جو داویلا مچا..... بس خدا کی پناہ۔ چودھری نے رو رو کر سارا محلہ سر پر اٹھالیا تھا۔ وہ واقعی بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔

پولیس والے بھی تفتیش کے لیے آگئے تھے لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا، وہ مکان اچانک کیسے چننے گیا۔ کسی قسم کا دھماکا بھی نہیں ہوا تھا۔ محلے کے ایک چشم دید گواہ نے بتایا کہ وہ اس وقت مکان کے سامنے ہی کھڑا تھا جب مکان ریت کے ڈھیر کی طرح پھینکے گا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ لمحوں تک ساکت ہی رہا تھا۔ پھر ہوش آنے پر اس نے چیخا چلانا شروع کر دیا۔ ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ یہ کوئی انتہائی پراسرار معاملہ ہے۔ میں اپنے گھر والوں کو گھر واپس لے آیا۔ ہم سب ہلکے ہو کر رہ گئے تھے۔

”دیکھو، خدا کے لیے تم لوگ اپنی زبانیں بند رکھا۔“ میں نے سمجھایا۔ ”کسی کو ہینک بھی نہ لگے۔ ورنہ ہم سب سزا بن جائے گا۔“

”ہاں ابا! یہ تو کوئی بتانے والی بات ہی نہیں ہے۔“ ریحان نے کہا۔ ”لیکن جو کچھ ہوا، وہ انسانی عقل سے باہر ہے۔“

”خدا کی پناہ! یہ خطرناک تاثر ہے صبح کی۔“ یاسمین نے گہری سانس لی، لگتا ہے جیسے جادو ہو گیا ہو۔ ”چار خواہشوں میں سے ایک صرف تین خواہشیں رہ گئی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہارے لیے اب کوئی جلدی نہ کرے۔ اب بقیہ خواہشیں بہت دور ہیں سمجھ کر اور ایمر جنسی میں کی جائیں۔ یعنی یہ سمجھو کہ جب تمہاری پہلو اور لنگر رہی ہو، ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسے ہوں، اس وقت تمہاری زحمت دی جائے۔“

”اب اس صبح کو احتیاط سے اندر کس میں رکھ دیتے ہیں۔“ یاسمین نے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے سامنے پڑی ہو اور ہم انہی سید کی نظر میں گرنے لگیں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ ریحان نے بھی تائید کی۔ ”بہت سوچ سمجھ کر اس کا استعمال کرتا ہے۔“

صبح بکس میں رکھ دی گئی، اس بکس میں ہمارا مستقبل محفوظ ہو گیا تھا۔ ہماری زندگی کے اگلے دنوں کو محفوظ رکھنا۔ اب ہماری دسترس میں تھے۔ ہم جب چاہتے ان دنوں کو نکال سکتے تھے۔ بے شمار خواب تھے لیکن وہ سب اس وقت اوجھڑے رہ گئے، جب دوسرے دن کی صبح ایکسپریٹ ہو اور اسی وقت میری موت واقع ہوگئی۔ ہاں میں مر گیا تھا۔

یہ نا عجیب بات۔ یعنی یہ ظاہر مر گیا تھا میں۔ وہ حادثہ ہی اتنا شدید تھا۔ ایک تیز رفتار گاڑی نے ٹکر مار دی تھی اور میں اچھل کر ایک دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔

یہ ظاہر کوئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن میں مر چکا تھا۔ چوٹ دماغ پر لگی تھی۔ اس کے باوجود میں یہ دیکھ رہا تھا کہ لوگ ہر طرف سے جمع ہو رہے ہیں۔ ایسبولینس آئی ہے اور میرے جسم کو اٹھا کر ایسبولینس میں ڈالا جا رہا ہے۔ میں چیخ رہا ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ میری بات سنو۔ لیکن کوئی میری بات نہیں سن رہا تھا۔ شاید میری آواز کی تک نہیں جا رہی تھی۔ پھر ایسبولینس میرے جسم کو لے کر روانہ ہوئی اور میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری رفتار بہت تیز تھی میں گویا پرواز کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایسبولینس ایک اسپتال کے گیٹ پر آ کر رکی۔ ایسبولینس کے ڈرائیور نے آواز لگائی۔ مجھے لے جانے کے لیے اسٹرینچر بھی آگیا۔ مجھے اسٹرینچر پر لٹا کر اسپتال سے آپریشن تھیمز کی طرف دوڑا دیا گیا۔ میرے ساتھ آنے والے اسٹرینچر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔

”ارے اس بے چارے کے گھر والوں کو خبر دے دو۔“ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے میری جینسین ٹولنی شروع کر دیں۔ میرا شانہ کھانڈا نکالا گیا جس پر میرا پتا لکھا ہوا تھا۔

کسی اور نے شاید دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس دارڈو بوائے نے میری جیب سے پیسے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ شاید سات آٹھ سو روپے تھے۔

پھر مجھے آپریشن تھیمز میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے معائنہ کرنے کے بعد مجھے مردہ قرار دے دیا۔ میں اس وقت بھی وہیں موجود تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں۔ میں ان کے سامنے زندہ کھڑا ہوا ہوں اور یہ مجھے مردہ قرار دے رہے ہیں۔ میں نے ایک بار ان لوگوں کو تھیمز دکان کی کوشش کی کہ میں زندہ ہوں اور ان کے ساتھ کھڑا ہوں لیکن کوئی بھی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں یور ہو کر آپریشن تھیمز سے باہر آگیا۔ اسی وقت میں نے اپنے گھر والوں کو دیکھا۔ وہ سب روتے پینتے ہوئے آپریشن تھیمز کے باہر جمع ہو گئے۔ یاسمین، شہزادہ اور ریحان کے علاوہ خاندان کے بھی کچھ لوگ تھے۔ سب بری طرح رو رہے تھے۔

جب ڈاکٹرز نے باہر آ کر یہ بتایا کہ میری موت ہو چکی ہے تو ان کی آہ وزاری میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ یاسمین کو مجھ سے اتنی محبت تھی۔ وہ روتے

تا کہ ہم آرام کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔“
 ”چلو۔ اب اس صبح کو واپس رکھ دیتے ہیں۔“
 ریمان نے کہا۔
 ”وہ کیوں؟“
 ”بھول گئیں۔ ابا نے بتایا تھا کہ دوسری خواہش
 پندرہ دنوں سے پہلے نہیں کی جاتی۔“ ریمان نے یاد دلایا۔
 ”ان پندرہ دنوں میں اس خواہش کا رزلٹ بھی سامنے
 آ جائے گا۔“

اب خود مجھے بھی تجسس سا ہو گیا تھا کہ یہ صبح دولت کا
 مطالبہ کس طرح پورا کرتی ہے اور ایک ہی ہفتے کے اندر
 حیرت انگیز طور پر ان کے پاس دولت بھی آگئی۔
 یاسمین اس دن اپنے پرانے صندوق سے کپڑے
 نکال رہی تھی کہ پچیس ہزار روپے کا ایک پرائز بونڈ کپڑوں
 کے درمیان سے باہر آ گیا۔
 ”کیا اس وقت وہیں موجود تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں
 نے یہ پرائز بونڈ یاسمین کو اس کی ساگرہ کے تحفے کے طور پر
 دیا تھا جس کو وہ صندوق میں رکھ کر بھول گئی تھی۔
 شاید یہ قدرت کا اشارہ ہی تھا کہ اس کو پرانے
 کپڑوں کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے صندوق کھولا اور وہ
 پرائز بونڈ سامنے آ گیا۔ یاسمین نے یہی سوچا تھا کہ شاید اس
 پرائز بونڈ ہی کے ذریعے کوئی راستہ نکلے (الہ ہے)۔
 اس نے ایک جوش سے ریمان کو آواز دی۔ وہ
 دوسرے ہی کمرے میں تھا۔ وہ دوڑا چلا آیا تھا۔
 ”کیا ہوا ای؟“

”یہاں پرائز بونڈ۔“ یاسمین نے اسے پرائز بونڈ دکھایا۔
 ”ابے، یہ کہاں سے آ گیا؟“
 ”یہاں یہ تمہارے ابا نے میری ساگرہ میں تحفے کے
 طور پر دیا تھا۔“ یاسمین نے بتایا۔ ”ارے اس وقت اس کا
 دکھائی دینا اس بات کا مظاہرہ ہے کہ شاید ہماری قسمت
 بدلنے والی ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر کمال ہی ہو جائے گا۔“ ریمان نے
 کہا۔ ”میں اس کا نمبر لے کر جا رہا ہوں۔ پرائز بونڈز کے
 پرانے ریکارڈز لکھواتا ہوں۔ خدا کرے، بات بن جائے۔“
 اور بات اس طرح بن گئی کہ پورے پانچ کروڑ
 کے گھر والوں کو مل گئے تھے۔ پانچ کروڑ، خدا کی
 بات! اتنی رقم کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔
 میں وہیں موجود تھا جب گھر والوں کے اکاؤنٹ
 میں پانچ کروڑ آ گئے تھے۔ ان سے کیا نہیں ہو سکتا تھا۔

روئے نہ حال ہوئی جا رہی تھی۔ برا حال دونوں بچوں کا بھی
 تھا۔ ریمان تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔
 بہر حال اس کے بعد بھی کئی مراحل آئے۔ میرا پوسٹ مارٹم
 ہوا، اس کی رپورٹ آگئی۔ سچ یہ ہے کہ اپنے جسم کو ٹکڑے
 ہوتے دیکھ کر میں خود بھی رونے لگا تھا۔ میری بے آواز
 سسکیاں کمرے میں گونج رہی ہوں گی لیکن کون سنتا۔
 انسان کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ اپنے آپ
 سے محبت ہوتی ہے۔ اپنے جسم سے پیار ہوتا ہے اور میں اس
 لیے رو رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے میرے بدن کی
 دھجیاں کر دی گئی تھیں۔

خیر۔۔۔ تو اس کے بعد وہی سب کچھ ہوا جو ہوا کرتا ہے۔
 رونا دھونا۔ تدفین کے مراحل۔ رشتے داروں کا آنا جانا وغیرہ۔
 اور میں ہر لحظہ سب کے ساتھ رہا۔ مرنے کے بعد یہ
 دیکھ کر ایک طرح کی خوشی ہو رہی تھی کہ میرے بچے اور میری
 بیوی کو مجھ سے کتنی محبت تھی۔

رورور کر انہوں نے اپنے آپ کو ہلکان کر لیا تھا۔ پھر
 آہستہ آہستہ میرے سوتے کی طرف بڑھتی چلی گئی کہ دنیا کا یہی
 دستور ہے۔

یاسمین کی جب عدت ختم ہوئی تو میں دن بھی بہت
 سے رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پھر سب کچھ
 معمول پر آ گیا۔

پھر ایک رات میری بیٹی نے میری بیوی کی جگہ
 اپنی ماں سے کہا۔ ”ای! اب تو اس صبح کو نکال کر لیں
 سے کاٹ لیں۔“

”اب تو ریمان بھی موجود تھا۔ وہ بھی یہ سن کر
 پر جوش ہو گیا۔ ہاں ای! نکالیں اس صبح کو۔ آخر ہم کب
 تک پریشانی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔“

”یہ لو، مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔“ یاسمین
 نے کہا۔
 ”تو پھر نکالیں۔ آخر وہ ہے جس نے۔“

اس وقت میں بھی اسی کمرے میں موجود تھا۔ جب وہ
 صبح نکال کر سامنے رہ گئی۔

”ہاں بیٹا، اب خواہش بتاؤ۔“ یاسمین نے پوچھا۔
 ”ای! سب سے پہلی خواہش تو یہی ہے کہ ہمارے
 پاس بہت سی دولت آجائے۔“ ریمان نے کہا۔ ”دولت
 آگئی تو دوسرے مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔“

”یہ بات تو ہے۔“ یاسمین نے اس کی تائید کی۔ پھر
 بلند آواز میں بولی۔ ”ہمیں دولت چاہیے۔ ڈھیری دولت

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدہ گاہے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(شعبہ رجسٹرڈ ذاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

بہرہ گینڈا آئرن پلیٹ اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ایک رسالے سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد رکھیں کہ ہمارے پتے پر ایسے بہترین تصدیق ہو سکتا ہے

بیردن ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریاس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11-پیشینش وٹنس باؤسنگ اتھارٹی میں کوہنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

ریحان کی خواہش تھی کہ وہ اپنا کوئی کاروبار کر لے گا اور اب
وہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

شہر اند کی شادی ہو سکتی تھی۔ ہمارا مکان بن سکتا تھا،
کسی اور محلے میں۔ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

۵۱ سب باری باری پوری عقیدت اور احترام کے
ساتھ اس بیچ کو بوسے دیے جا رہے تھے جس نے صرف
ایک ہفتے میں زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔

انہوں نے عقل مندی یہ کی کہ فوراً ہی اپنے دولت مند
ہونے کا اعلان نہیں کیا بلکہ اسی مکان میں رہتے رہے۔ اب
صرف دو خواہشات رہ گئی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پھر اس پر اسرار بیچنے سے
رکھ کر بیٹھ گئے۔ میں اس وقت بھی وہیں پر تھا اور یہ بیچنے
چاہتا تھا کہ اب وہ کیا خواہش کرتے ہیں۔

”ای! اب یہ بات تو طے ہو گئی ہے کہ اس بیچ میں
ایسی قوت ہے جو تمہیں کو ممکن بنا دیتی ہے۔“ شہانہ نے کہا۔
”ہاں، وہ تو کچھ دیر رہے ہیں۔“

”ای! اب ایک خواہش میری بھی پوری کر دیں۔“
”وہ کیا؟“

”نویہ خیریت سے وہاں آ جائے۔“ شہانہ نے کہا۔
نویہ اس کے اس سنگتیر کا نام تھا جو باہر جا کر کہیں
غائب ہو گیا تھا۔

”دیکھو، اس طرح ہماری ایک اور خواہش خرچ
ہو جائے گی۔“ ریحان نے کہا۔

”تو کیا ہوا؟ یہی تو میری زندگی کی سب سے بڑی
خواہش ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ میں ساری زندگی یوں ہی
اس کے غم میں بسر کرتا رہوں۔“

”اچھا بہلا، ایک نو بیچ سے اپنے نویہ کو۔“

میں قریب ہی کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ یہ خواہش بھی
بہت مشکل تھی۔ وہ لڑکا خدا جانے کہاں ہوگا؟ وہ کہاں جا کر
غائب ہو گیا تھا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا اور اب شہانہ اسے
پلانے کی خواہش کر رہی تھی۔

یا کہیں نے بیچ سامنے رکھ کر بولنا شروع کر دیا۔
”میری بیٹی... کا سنگتیر خیر و خوبی کے ساتھ واپس
آ جائے۔“

خواہش بیان کر دینے کے بعد اس بیچ کو پھر صندوق
میں رکھ دیا گیا۔ دیکھنا یہی تھا کہ وہ کس طرح واپس آتا ہے۔
میں چونکہ خالص روح تھا، اس لیے میں پرواز کر کے
کہیں بھی جاسکتا تھا لیکن میں اپنے گھر کے آس پاس ہی

بھٹکارہتا۔ اپنی بیوی کے پاس اپنے بچوں کے پاس۔ اور اس خواہش کو بیان کرنے کے ٹھیک دس دنوں کے بعد شہانہ کا منگیتروید واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک کہانی لے کر آیا تھا۔

اسے ایک جمو نے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس نے شرمندگی کی وجہ سے کسی کو خبر نہیں دی تھی۔ خاموشی سے مقدمات کا سامنا کرتا رہا تھا پھر جب عدالت نے اسے بے گناہ ثابت کیا تو اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ سیدھا پاکستان واپس آ گیا تھا۔

یہ ناممکن تھا جو ممکن ہو گیا تھا۔ ایک ایسی خواہش پوری ہوئی تھی جس کی طرف سے ہم سب مایوس ہو چکے تھے۔ صرف شہانہ آس لگائے بیٹھی رہی تھی۔

جس وقت وہ ہمارے یہاں ملنے کے لیے آیا تو اس وقت سب کی خوشیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔ سب ہی رو رہے تھے بلکہ خود میں بھی ایک طرف کھڑا روئے جا رہا تھا۔

نوید جب مل کر چلا تو شہانہ نے صندوق سے تصبیح نکال کر اسے چومنا شروع کر دیا۔ یہ تصبیح اس کی خوشیاں واپس لے آئی تھی۔ اسی نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

”ای۔“ شہانہ نے کہا۔ ”ہماری دولتیں خرابشیں پوری ہو چکی ہیں۔ اب ہمارے پاس سب کچھ ہے۔“

”ابا۔“ شہانہ نے کہا۔ ”اگر وہ ہوتے تو ہماری خوشیاں ممکن ہوتیں۔“

”لیکن بیٹا! وہ رہے ہو سکتے ہیں۔“

”ای! ہم نے دیکھا ہے کہ یہ تصبیح ناممکن کو ممکن کر رہی ہے۔“ شہانہ نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم اس سے کہیں کہ وہ ابا کو واپس بلا لے۔ تو سوچیں ان کے آئے کے بعد ہماری خوشیاں کتنی بھر پور ہو جائیں گی۔“

”لیکن شہانہ..... ہمارے پاس تو اب صرف ایک ہی خواہش رہ گئی ہے۔“ ریحان جلدی سے بولا۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس ایک خواہش کو ضائع نہ کریں۔ بلا لیں ابا کو۔“

اس وقت بھی میں ان سب کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔

ایک روح کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ کچھ عجیب بات تھی۔ میں نے یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”نہیں، ہم یہ احمقانہ خواہش نہیں کریں گے۔“

”کیوں اماں؟“

”اس لیے کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب ہم لوگ اپنی زندگی میں ایڈ جسٹ ہو چکے ہیں۔ ان کو بلانے کی خواہش سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی صحت کی بات کروں۔ جو دن بد دن... مگر تھی چلی جا رہی ہے۔“

”ای ٹھیک کہتی ہیں شہانہ۔“ ریحان نے بھی تائید کی۔ ”جو چلا گیا اس کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مگر کاسیٹ اپ بدل جائے گا۔ رہنے دوا با کو وہاں جہاں رہ گئے ہیں۔“

”نہیں، ان کی مغفرت کی دعا میں کرتے رہو۔ بس ایک خواہش وہ کی ہے، کم از کم اس کو تو بچا کر رکھیں۔“

”تھیں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔“ تو پھر اس سے کہیں کہ نوید سے میری شادی ہو جائے۔“

”وہ تو ہر دن چاہتی گی۔ ہم مٹتی تو کر چکے ہیں۔“

”ہمارے پاس دولت تو ملنی ہے بلکہ ایک کام کرتے ہیں، اس تصبیح سے کہتے ہیں کہ وہ ہم سب کو کسی پرسکون اور اچھے ملک کی پینٹلٹی دلا دے۔ نوید کی ماں سے ساتھ ہو پھر ہم پیسے لے کر یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”واہ، یہ بات ہوئی نا۔“ ریحان پھل پڑا۔ ”کیا زبردست بات ہوئی ہے۔“ پھر اس نے شہانہ کی طرف دیکھا۔ ”اب تم بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟“

”مجھے کیا کہنا ہے جو آپ لوگوں کی مرضی۔“ شہانہ نے کہا۔ ”کم از کم نوید تو ساتھ ہو گا نا۔“

میں اس مکان میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں رو رہا تھا۔ دنیا اور زندگی بے بسا تک اور بے رحم بن کر میرے سامنے آ گئی تھی۔ ان میں سے کسی کو میری ضرورت نہیں تھی۔ میں مایوس ہو کر اس گھر سے نکل آیا۔

مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس گھر میں انسان سے زیادہ ایک تصبیح کی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تصبیح جو خواہشات پوری کر سکے۔

اب وہ رشتے میں باپ ہو یا کسی بابا کی دی ہوئی تصبیح۔ اگر خواہشات پوری ہوتی تو باپ بھی کارآمد ہے۔



ورنہ دونوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

فخر دین و دنیا

ضیاء نسیم بلگرامی

فخر ہمیشہ ایسی صلاحیتوں پر ہوتا ہے جو کسی کو ہزاروں انسانوں میں بھی نمایاں مقام پر لاکھڑا کریں... لیکن فخر میں بھی اس بات کا احساس لازم رکھنا چاہیے کہ اس سے وابستہ ہونے والے لوگ خود پر فخر کریں... ورنہ انسان اپنی ذات پر آپ ہی فخر کرے تو تکبر کہلاتا ہے۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ انسانوں میں ہوتا تھا جن سے وابستگی ہونے پر عام انسانوں کو خوشی ہوتی تھی۔

دین و دنیا کا تعلق ہے ایک شجرہ
جس کا پتہ ہے جنت و جہنم



مشہور صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی بغداد میں روحانی تعلیم و تربیت کے معاملے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت میں دور دور سے طالبان حق آ کر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ آپ ان میں سے جو ہر قائل کو الگ کر لیتے اور بقیہ کو لکھتیں کر کے واپس کر دیتے۔ جنہیں الگ کرتے انہیں روحانی اور باطنی تعلیم دینے لگتے۔ سہ پہر کو عصر سے ذرا پہلے ایک ستر و سالہ نوجوان آپ سے ملاقات کو حاضر ہوا اور پیش خدمت مرید سے کہا: ”جاؤ

اپنے شیخ سے کہو آپ کا بھانجا ہمدان سے آیا ہے۔ شیخ فخر الدین۔“
مرید نے نوجوان کو اندر پہنچا دیا۔ ماموں نے کھڑے ہو کر نوجوان بھانجے کا استقبال کیا۔ انہوں نے اس کو گلے لگا کر اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ شیخ نے بھانجے سے گھر کے حالات پوچھے۔ بہن کی خیریت معلوم کی۔ بھانجا شیخ کے سوالات کے مختصر جوابات دیتا رہا۔ شیخ کو اس نوجوان میں کچھ غیر معمولی باتیں محسوس ہو رہی تھیں۔
شیخ نے پوچھا۔ ”فخر الدین تم نے کچھ پڑھا بھی ہے؟“

فخر الدین نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے قرآن پاک کم سنی میں ہی حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہمدان ہی میں منقولات اور مقولات پڑھ کر فارغ ہوا۔ اب آپ کی خدمت میں روحانی تعلیم و تربیت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“
شیخ شہاب الدین نے دوران گفتگو اپنے بھانجے میں کئی خاص باتیں محسوس کیں، نوجوان بھانجے کی آواز میں نرم تھا اور آنکھوں سے جذب و مستی لپکتی محسوس ہوتی تھی۔ آپ نے بھانجے سے پوچھا۔ ”کیا تمہاری آواز میں کچن پایا جاتا ہے؟“
نوجوان نے جواب دیا۔ ”میری خوش گلوئی ہمدان بھر میں مشہور ہے۔“

شیخ نے مزید کہا۔ ”تمہارا دل گداز اور آنکھوں میں کف و مستی ہے۔“ نوجوان خاموش رہا۔
آپ نے ایک مرید کو آواز دی اور کہا۔ ”ذرا اپنی آنکھ کو تولا نا جس کا حسن اور معصومیت مشہور ہے۔“
مرید چلا گیا لیکن نوجوان فخر الدین کی حالت غیر ہونے لگی اور جاک آٹھ کر باہر جانے لگا۔ شیخ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا۔ ”فخر الدین! کہاں چلے؟ میں تو تیرے گداختہ دل اور حسن چہرے کا امتحان لے رہا ہوں۔ شاید میں نے تیری بابت درست ہی خیال کیا ہے۔“

فخر الدین نے جواب دیا۔ ”آپ نے میری بابت کیا خیال کیا ہے؟“
شیخ نے جواب دیا۔ ”کچھ حسن پرستی تیری فطرت میں شامل ہے۔ حسن ظن بھی اور کسی بھی شکل میں ہو تو دیکھ کر وارفتہ اور حواس باختہ ہو جائے گا۔“
فخر الدین نے سر دھام بھری۔ ”جلالاموں! کیا عرض کروں؟“

اتنی دیر میں مرید اپنی بیٹی کو لے کر آیا۔ بیٹی کی مست و خمار آلود آنکھوں پر بڑی بڑی لالچیں، اعضا میں جلا کا تناسب اور رنگ سرخ و سفید، میدہ شہابی، غرضیکہ بیٹی کی ایک ایک چیز ایسی تھی کہ دیکھنے والا والد و شہید اچھوٹے۔ فخر الدین نے اس ننھے سے میٹھے کو جو دیکھا تو اپنے حواس ہی اٹھائے اور ایک ہی آنکھ میٹھ کر نیم بے ہوش ہو گئے۔
شیخ نے مرید سے کہا۔ ”اب اس بیٹی کو لے جاؤ، میں نے نہ پایا۔“
مرید بیٹی کو واپس لے گیا۔ آپ فخر الدین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فرمایا۔ ”فخر الدین! ہوش میں آؤ کیونکہ میں جذباتیت ٹھیک نہیں ہے۔“

فخر الدین اب بھی پوری طرح ہوش میں نہیں تھے پھر بھی با کمال ماموں کے حکم پر کسی حد تک ہوش و حواس میں آ گئے۔ شیخ شہاب الدین نے ایک بار پھر آواز دی۔ ”فخر الدین! کیا پوری طرح ہوش میں آ گئے ہو تم؟“
فخر الدین نے جواب دیا۔ ”ماموں! میں اپنے ہوش میں تھا کب نہیں لیکن اب میں بالکل ہوش میں ہوں۔“
شہاب الدین نے فرمایا۔ ”جئے! میں نے محسوس کیا ہے کہ تجھ میں کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور تجھ کو تیری یہ خوبیاں بڑی بلند یوں پر لے جائیں گی۔“ فخر الدین خاموش رہے۔
آپ نے پوچھا۔ ”فخر الدین! کیا شاعری بھی کر لیتا ہے؟“

”ہاں جناب! میں شاعری بھی کر لیتا ہوں۔“
شہاب الدین نے فرمایا۔ ”میں تیری باتوں میں سے سمجھ چکا ہوں کہ تو شاعر بھی ہے لیکن میں تجھ کو بچہ نصیحت کرتا ہوں کہ شاعری مفید طلب چیزوں کی بابت کرتا، ہرزہ سرائی اور بامدہ کوئی سے محفوظ رہنا۔“ پھر پوچھا۔ ”اور تیرا کھس کیا ہے؟“
فخر الدین نے جواب دیا۔ ”ابھی تک میں نے کوئی کھس ہی نہیں رکھا۔“
آپ نے فرمایا۔ ”تو اس وقت سرزمین عراق میں ہے اور اب تجھ کو زیادہ تر اسی سرزمین میں رہنا ہے اس لیے میں نے تیرا کھس عراقی تجویز کیا ہے۔ آج سے تو عراقی ہے۔ فخر الدین عراقی۔“

فخر الدین نے اس شخص کو شکرے اور عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا اور اب وہ فخر الدین عراقی ہو چکے تھے۔ شہاب الدین سہروردی نے انہیں بیعت کیا اور عبادت و ریاضت میں مصروف کر دیا۔ برسوں کے بعد ان کی حالت ہی کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔ ایک دن ماموں نے پوچھا۔ ”فخر الدین! کیا تجھے گھر نہیں یاد آتا؟“

فخر الدین نے جواب دیا۔ ”جب سے میں نے اس سے لو لگائی ہے، ماسوا کو بھلا دیا ہے۔“

شہاب الدین نے حکم دیا۔ ”اچھا تم ہمدان والیں جاؤ اور وہاں تدریس کا کام اختیار کرو۔“

فخر الدین نے اپنے پیر و مرشد ماموں کے حکم کی تعمیل میں بغداد سے ہمدان کا سفر کیا۔ یہاں عزیز رشتے داران سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کامیاب واپسی پر مبارک بادیں دیں۔ عراقی نے ہمدان میں تعلیم دینا شروع کر دی اور ساتھ ہی شاعری بھی کرتے رہے۔ ہمدان میں درس و تدریس کے دوران بھی آپ پراکٹر کسی حسین شے کے دیکھنے سے وجدان اور فطرت کی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ حسن کی بھی شے میں ہوتا۔ شعر میں، شکل میں، مناظر فطرت میں، اچھے اشعار عراقی پر وجد طاری کر دیتے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہتے۔

ایک دن عراقی بڑے جوش و خروش سے پڑھا رہے تھے کہ مدرسے کے سامنے قلندروں کی ایک جماعت نے قیام کیا

قلندروں نے عراقی کو پڑھاتے دیکھا تو خوب ہنسے۔ ایک قلندر نے پوچھا۔ ”عراقی کیا ہو رہا ہے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”علم تقسیم کر رہا ہوں۔“

قلندر نے طنزاً کہا۔ ”عراقی تو کن کاموں میں الجھ گیا۔ تو نے خود کو بیجا ہنسہ بھربھرا کر کس طرح پہچانے گا؟“

عراقی نے پوچھا۔ ”میں خود کو کس طرح پہچانوں؟“

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ”عراقی میں تیرے اندر سوائے عراقی کو جاننا ہوتا ہوں، سن۔“ اس کے بعد قلندر

نے چند دل گداز اشعار پڑھے۔

”میں مسجد کا سامان خرابات لے جا رہا ہوں

اور زہد و کرامات کے سمنے پر خطی خط لکھ رہا ہوں

میں تو پیر مغاں کے کوپے میں عاشقوں کی مصیبت میں بیٹھ گیا

اور رندان خرابات کے ہاتھوں سے شراب کا جام پہننے لگا

ہم زہد و مکافات سے بار بار گزر رہے ہیں

کہ یہ بار بار گزرنے کی طاقت بھی ہمیں زہد و مکافات سے حاصل ہوتی ہے۔“

ان اشعار نے عراقی کو از خود رفتہ کر دیا۔ انہوں نے درس و تدریس کو چھوڑ دی اور حالت وارفشلی میں قلندروں میں چلے

گئے، بولے۔ ”دوستو! تم نے کیا کر دیا؟ میں اپنے دل میں ایک آگ کی محسوس کر رہا ہوں۔“

ایک انتہائی سخی قلندر آگے بڑھا اور کہا۔ ”عراقی! ادھر دیکھو۔“

عراقی نے ادھر دیکھا تو ہوش و حواس بالکل ہی جاتے رہے بے اختیار کہا۔

وہ چہ خوش باشد کہ دل دلہن تو باشی..... ندیم و مونس و یارم تو باشی

(کیا ہی اچھا ہو کہ تو میری دلہن کی قبول کرے..... اور تو میری دوستی و مونس اور یاری میں رہنے لگے)

حسین قلندر نے جواب دیا۔ ”عراقی! ہم تجھے مسجد و مدرسے سے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ تو یہاں سے

ہمارے ساتھ چل اور سیاحت کر۔“

عراقی نے مدرسے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا، قلندروں کے ساتھ ہو لیے اور سیاحت شروع کر دی۔ یہ ایک بار

پھر بغداد گئے اور اپنے ماموں شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات کی۔ ماموں نے حکم دیا۔ ”عراقی! ہندوستان جاؤ۔“

عراقی نے قلندروں سے کہا۔ ”مجھ نے ہندوستان جانے کا حکم دیا ہے۔“

قلندروں نے جواب دیا۔ ”چلو، ہندوستان چلیں، ہمیں وہاں جانے سے کب انکار ہے۔“

اس کے بعد عراقی نے قلندروں کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا۔ مہینوں بعد یہ لوگ ہندوستان میں داخل ہو گئے اور

پہلے برصغیر کے مشہور شہر ملتان میں قیام کیا۔ ان دنوں ملتان میں بہاء الدین زکریا ملتانی کا طوطی بول رہا تھا۔ عراقی

قندروں کے ساتھ بہاء الدین ذکر یا ملتائی کی خدمت میں پہنچے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی کشش محسوس کی۔

عراقی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”شیخ شہناظر آتے ہیں۔“
 ذکر یا ملتائی نے پوچھا۔ ”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے جنہیں کہیں دیکھا ہے۔“
 عراقی نے جواب دیا۔ ”میں شیخ شہاب الدین سہروردی کا بھانجا ہوں۔“
 ذکر یا ملتائی نے فرمایا۔ ”اور میں ان کا مرید اور ادنیٰ خادم ہوں اور انہی کا بھیجا ہوا یہاں آیا ہوں۔“ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

قندروں نے جو یہ منظر دیکھا تو تنہائی میں کہا۔ ”عراقی! ہمارا خیال ہے کہ اب تم سیاحت نہیں کرو گے؟“
 عراقی نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
 حسین قندر نے جواب دیا۔ ”مستان شیخ جنہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور یہ جنہیں روک لے گا۔“
 عراقی نے کہا۔ ”بے شک، میں خود بھی ملتائی پر خوش نظر ہوں۔ کشش محسوس کر رہا ہوں۔ میں یہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھاتا ہوں تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے دونوں پاؤں زمین سے جڑے ہو گئے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ انہیں اٹھاؤں اور تمہارا ساتھ دوں مگر زمین پاؤں پکڑے ہوئے ہے۔“
 قندر نے کہا۔ ”تو تم بیٹھ رہ جاؤ۔ ہم اپنی راہ لیں۔“
 عراقی نے جواب دیا۔ ”نہیں! میں اپنی کوشش کروں گا کہ تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں لیکن میں مستان میں بے بس اور مجبور ہو رہا ہوں۔“

قندروں نے کہا۔ ”عراقی! جنہیں جو فیصلہ کرنا ہے جلد ہی کر لو۔ ہم مستان میں زیادہ دن نہیں رک سکتے۔“
 عراقی نے بہاء الدین ذکر یا ملتائی کی اجازت چاہی۔ ”حضرت! اب اجازت دیجیے۔ میں اپنی سیاحت کو نکلا ہوں اور سیاحت جاری رکھنا چاہتا ہوں۔“
 ذکر یا ملتائی نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! میں نے جنہیں روکا تو نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔ جاؤ لیکن جنہیں ایک نہ ایک دن یہاں آنا پڑے گا۔“

عراقی نے کہا۔ ”حضرت! مستان نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ میرے ساتھی قندر مجھے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ میں وہاں سخت کشاکش میں ہوں، بولے اب میں کیا کروں؟“
 ذکر یا ملتائی نے جواب دیا۔ ”عراقی! تم جا سکتے ہو لیکن میں نے تم سے جو کہہ دیا کہ تم کو یہاں واپس آنا ہے۔“
 عراقی نے کہا۔ ”اگر آپ بلانا چاہیں گے اور بلائیں گے تو میں آ جاؤں گا۔“
 قندر جلدی کر رہے تھے۔ ”عراقی! یا تو ساتھ چلو ورنہ ساتھ چھوڑ دو! اب ہم چلتے ہیں۔“

عراقی نے محسوس کیا کہ پاؤں چھوڑ دیے گئے ہیں اور وہ آزاد ہیں۔ اب قندروں کا رخ دہلی کا تھا۔ عراقی بھی ان کے ساتھ دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں چند دن رہ کر سومات کا رخ کیا۔ اب قندروں نے یہ بات صریح طور پر محسوس کر لی تھی کہ عراقی میں وہ پہلے جیسا جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ لیکن دل کی گدازیت میں زیادہ مدت آچکی تھی۔ عراقی قدم قدم پر یہی محسوس کرتے رہے کہ مستان انہیں کھینچ رہا ہے۔

ابھی سومات فاصلے پر تھا کہ مشرق سے اندھیرے کی چادر اٹھی اور ان کی طرف بڑھنے لگی۔ فضا میں پرند مغرب کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ مشرق سے اٹھنے والی ساری سورج کی شعاعوں سے روشن ہو گئی اور اس میں اڑتے بھاگتے پرند بڑا دلچسپ منظر پیش کر رہے تھے۔ عراقی نے قندروں سے پوچھا۔ ”مشرق فضا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟“
 ایک قندر نے جواب دیا۔ ”یہ آندھی ہے کالی آندھی۔ آندھی آنے سے پہلے ہی پناہ گاہ کا انتظام کر لینا چاہیے ورنہ کہاں بھاگے پھریں گے۔“

اب تیز ہوا کے جھونکے ان کے جسموں سے ٹکرا رہے تھے جس سے ان کا توازن بگڑنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ جب آندھی نے ان کے وجودوں کو ہلا ڈالا اور تنکوں کی طرح انہیں اڑانا شروع کر دیا تو وہ سب بہت پریشان ہو گئے اور خدا

سے حفظ، امان میں رکھنے کی دعائیں مانگیں۔ آندھی کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ ایک قلندر کو کہیں اڑا لے گیا دوسرے جھونکے نے ان سب کو ایک دوسرے سے منتشر کر دیا۔ عراقی نے بڑی کوشش کی کہ خود کو قابو میں رکھے لیکن وہ بے قابو ہی رہے اور مغرب کی طرف بھاگتے ہی چلے گئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا گویا بہت سارے ہاتھ انہیں دھکیل رہے ہیں۔ ہوا کی شدت نے ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ ہوا کپڑوں میں محسوس جاری تھی۔ عراقی نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ "قلندرو! تم سب کہاں ہو؟ آواز دو میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟"

لیکن اس کا جواب ہوا کے جھکڑوں نے یہ دیا کہ انہیں زمین پر گر دیا۔ عراقی زمین پر لڑھکے گئے۔ ہوا انہیں کسی روئے کی طرح دور تک لڑھکائے چلی گئی۔

کافی دیر بعد طوفان تھا تو عراقی نے اپنے آس پاس طوفان کے تباہ کن اثرات دیکھے۔ درختوں کا جال سا بکھر ہوا تھا جو جڑوں سے اکھڑ کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مکانوں کے تختے، چیمبر وغیرہ نے زمین کی پردہ پوشی کر رکھی تھی۔ جانوروں کی لاشیں اور نیم مردہ مویشی ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ انسانوں میں جوان، بوڑھے، بچے یا تو مر چکے تھے یا سبک رہے تھے۔ عراقی نے ان میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملے۔ آخر عراقی نے ان زنجیروں کی مدد کرنا شروع کر دی۔ ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ درختوں کو اٹھا اٹھا کر گاؤں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ وہاں ان کا علاج کیا جانے لگا۔

اب عراقی نے ایک بار پھر اپنے قلندروں کی تلاش شروع کی لیکن ان میں سے ایک بھی نہ ملا۔ یہ بہت پریشان ہو گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ آخر دل نے مشورہ دیا کہ سوماتا کی طرف چل دو وہیں تیرے ساتھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے سوماتا کا رخ کیا اور قلندروں کی تلاش میں دور تک چلے گئے۔

آخر کسی نے کان میں ہانپا۔ عراقی! تو کس کی تلاش میں سرگرداں ہے اب وہ مجھے نہیں ملیں گے۔ اب وہیں واپس جا جس سرزمین نے تیرے پاؤں پکڑ لیے تھے۔"

عراقی نے لوگوں سے پوچھا۔ "بھائیو! متان جانا ہے، مجھے کس طرف سڑ کرنا چاہیے؟"

ایک نے ایک مغربی راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔ "یہ سڑک بیچ و خم کے بعد تمہیں ملان پہنچا دے گی۔"

عراقی تنہا اس سڑک پر چل پڑے۔ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟ بس بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کوئی انہیں اپنی طرف متوجہ نہ رہا تھا اور یہ سمجھنے چلے جا رہے تھے۔ کافی دنوں بعد دور ہی سے ملان کے آثار دکھائی دیے۔

کسی راہگیر سے پوچھا۔ "بھائی یہاں سے ملان کتنی دور ہے؟"

راہگیر نے جواب دیا۔ "اب ملان دور کہاں رہا؟ وہ سائے ہاستان۔"

عراقی فہمِ حقوق میں ملان کی طرف بڑھے اور یہ سفر کس طرح کے ہوا انہیں کچھ ہوش نہ تھا۔

ہوش جو آیا تو بھاء الدین ذکر کیا کہ سائے کھڑا پایا۔

بھاء الدین ذکر کیا کہ بھاء الدین ذکر کیا۔ "عراقی! کہاں، آخر آگئے۔؟" عراقی نے والہانہ انداز میں جواب دیا۔

"زمانہ اور زمانے کے ساتھ ہی میری زندگی میرا ساتھ چھوڑ دے یہ ممکن ہے۔ ناممکن ہے کہ میں تجھ سے منحرف ہو جاؤں اور تجھ سے کریم کہوں۔ میں تیری مہربانیوں کا اسیر ہوں، تیری مہربانی اور نظر ہر تعریف سے بالا ہے۔ شیر مادر (ماں کا دودھ) کتنا ہی کتنا ہی کتنا ہی کیوں نہ ہو لیکن تیری مہربانی اور نظر اپنی وقعت اور قیمت میں سو گنا زیادہ ہیں۔"

بھاء الدین نے ان کا ہاتھ پکڑا اور حلقے میں لے گیا۔ فرمایا۔ "عراقی! تو بہت گھوم پھر لیا اب چل کٹی کر۔"

عراقی تابعدار فرماں بردار بن کر چلے میں بیٹھ گئے۔ بارہویں دن ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ اندر بے اختیار رو رو کر پر سوز لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "ساتی کا پہلا جام ہی اتنا تھا جس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا اس کی آنکھوں کی مستی نے شراب میں کچھ زیادہ ہی اثر بھرا ہے۔"

وہ جب کسی عیش و عشرت کے دلدادہ کو بے خود کرنا چاہتے ہیں تو اس کی خوشی میں بے خودی کی شراب اندھیل دیتے ہیں

جب وہ کسی عاشق کی سرخ جاں کو قید کرنا چاہتے ہیں
تو وہ ان زلفوں کو کام میں لاتے ہیں جو ہمیشہ فتنوں کی تلاش میں رہتی ہیں
ساری دنیا کے آلام و مصائب کو جب ایک جا کیا گیا
تو اس کا نام عشق قرار پایا
افسوس کہ تو اپنا راز خود ہی کھول دیتا ہے اور
عراقی کو خواہ مخواہ بدنام کرتا ہے۔“

عراقی حجرے میں لہک لہک کر اشعار سنار ہے تھے اور ان کی آواز باہر پیر ملتانی کے مریدوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ سہروردیہ سلسلے میں سماع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مریدوں نے حضرت زکریا ملتانی سے شکایت کیا۔ ”حضرت! ہمارے یہاں تو سماع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن عراقی حجرے میں یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہیں منع کیا جائے۔“
حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ”ہاں دوسروں کے لیے سماع ممنوع ہے لیکن عراقی کے لیے اجازت دی گئی ہے۔“ مرید خاموش ہو گئے۔

اب عراقی کی حالت کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔ چند دنوں بعد حضرت زکریا ملتانی کے ایک مرید خرابات کے پاس سے گزرے تو انہوں نے نشے میں بدست رندوں کو وہ غزل گاتے سنا جو عراقی حجرے میں لہک لہک کر سنا چکے تھے۔
مرید نے یہ واقعہ پیر مرشد کو سنایا کیا۔ ”حضرت! اب تو عراقی کا کام رندوں تک پہنچ چکا ہے۔“
حضرت زکریا ملتانی نے فرمایا۔ ”عراقی کا کام تمام ہوا۔“

اس کے بعد عراقی مطلب کیا اور خلوت میں لے جا کر پوچھا۔ ”عراقی وہ مناجات جو حجرے میں کی گئی تھی، وہ وہاں سے نکل کر خرابات تک کس طرح پہنچ گئی؟“
عراقی جواب دینے کے بجائے پیر مرشد کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگے۔ حضرت زکریا ملتانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگالیا اور سر پر ہاتھ پھیرے جو بڑی دعا تھیں دیں۔ آپ نے اپنا خرقد انہیں پہنا دیا اور اپنی بیٹی کا نکاح پڑھا دیا۔ عراقی اپنے پیر مرشد اور خسر کے پاس رہنے لگے اور یہاں پچیس سال گزار دیے۔

☆☆☆

حضرت زکریا ملتانی نے وصال سے پہلے انہیں اپنا خلیفہ اور جانشین بنا دیا لیکن عراقی مغلوب الحال تھے انہیں اپنے آپ پر اختیار نہیں تھا۔ وہ شعروں میں اپنی کیفیات کا بھلا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کے مریدوں کو اس پر اعتراض ہوا اور انہوں نے عراقی پر زور دیا۔ ”عراقی! ہمارے مسلک کے خلاف ہے، تم شاعری چھوڑ دو۔“
عراقی نے جواب دیا۔ ”مجھے میرے مرشد نے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لیے شاعری چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ شاعری نہیں چھوڑ سکتا۔“

مریدوں نے انہیں سے کہا۔ ”اگر تم مسلک سہروردیہ پر قائم نہیں رہ سکتے تو ختم خلیفہ بھی نہیں بن سکتے اس لیے یہ جگہ اس کے لیے خالی کر دو۔“ مسلک سہروردیہ کو جزو ایمان سمجھ رکھا ہے۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”مسلک سہروردیہ اور ایسا کروں گا۔ میں عنقریب یہاں سے نکل اور چلا جاؤں گا۔“
آخر ایک دن آپ نے عدن کی راہ لی۔ عدن کا حکمران عراقی کا بے حد مداح تھا اور اس نے کئی بار ان کو بلوایا تھا چنانچہ جب عدن کے سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ عراقی اس کے پاس آ رہے ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے دربار کے علما اور صلحا کو جمع کیا اور انہیں عراقی کی تشریف آوری کا مژدہ سنایا۔ آخر میں کہا۔ ”عراقی آ رہا ہے تم سب کو اس کا استقبال کرتا ہے۔“

عراقی عدن پہنچے تو انہیں استقبال کرنے والوں کا عظیم الشان ہجوم نظر آیا۔ استقبال کرنے والوں میں سلطان خود بھی شامل تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر عراقی سے بغل گیر ہوا اور بوسہ دیا۔ استقبال کے بعد یہ لوگ شامی قصر کی طرف چل پڑے۔ سلطان نے اپنے محل کے ایک حصے میں عراقی کو ٹھہرایا اور صبح شام ان کی خدمت میں حاضر یاں دینے لگا۔ خاطر تواضع میں حد درجہ تکلف سے کام لیا۔ یہاں تک کہ عراقی کو شرم محسوس ہونے لگی۔ عراقی نے خانہ کعبہ کی زیارت کا منصوبہ

بتایا۔ سلطان سے کہا۔ ”جناب والا! میں خانہ کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہوں اگر آپ لوگ چند دنوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”واہ جناب! آپ کو تنہا کیوں چھوڑا جائے۔ ہم سب آپ کے عقیدت مندوں میں داخل ہیں۔ آپ خانہ کعبہ کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے ہم سب آپ کے گرد و پیش پر دانوں کی طرح موجود رہیں گے۔“

عراقی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مجھ کو اکیلا ہی جانا چاہیے۔“
سلطان نے جواب دیا۔ ”نہیں حضرت! آپ تنہا نہیں جائیں گے۔ ہم سب غمی آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔“
عراقی نے مزید کچھ کہنا فضول جانا اور ایک دن سلطان کو بتائے بغیر کعبہ چلے گئے۔ سلطان کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے خود بھی خانہ کعبہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ دور گیا بھی مگر پھر معلوم نہیں کیا سوچا کہ راستے سے واپس آ گیا۔ اپنے آدمیوں کے ذریعے بے انتہا مال و زر آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور ہدایت کردی کہ پوری کوشش کی جائے کہ عراقی سلطان کا یہ نذرانہ قبول کر لیں لیکن اگر وہ نہ لیں تب پھر اس مال و زر کو ان کے معتقدین میں تقسیم کر دینا۔ واپس ہرگز مت لانا۔

خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ہی ان کا حال ہی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ انہوں نے احرام باندھ کر ایک شاندار قصیدہ کہہ ڈالا۔ اس کے بعد جب خانہ کعبہ پر نظر پڑی تو اس کے انوار اور تجلیات نے انہیں کچھ ایسا مسحور کیا کہ ایک دوسرا قصیدہ بھی کہہ ڈالا۔

سلطان کے آدمیوں نے انہیں وہ مال و زر پہنچایا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور سختی سے کہا۔ ”میں مال و زر سے دور بھاگتا ہوں اور مال و زر کو برا سمجھتا کرتے ہیں۔“

یہاں سے آپ نے مدینے کا سفر شروع کیا۔ مدینے میں داخل ہوتے ہی آپ نے مدینہ کی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک رات میں پانچ قصیدے کہہ دیے۔ طبیعت کسی طرح قابو میں نہیں آتی تھی۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کے مدفنہ اقدس پر حاضری دی اور شدت جذبات سے پرورے پھوٹ کر رونے لگے۔

مدینے سے نکل کر اقصائے روم (ترکی) کی سیاحت کو چل پڑے۔ تو نے پہنچے اور شیخ محی الدین عراقی کے خلیفہ اور جانشین شیخ صدر الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ یہاں عراقی کو بڑی دلچسپی محسوس ہوئی۔ یہیں انہوں نے تصوف کی مشہور کتاب خصوص الحکم کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی مشہور کتاب لمعات تصنیف کی۔ اس کتاب کو صدر الدین نے پڑھا تو اسے حیرت و شوق میں پکارا ٹھے۔

”اے فخر الدین عراقی! تو نے تو اہل ثنوت (جو ان مردوں) کی باتیں سب پر کھول کر رکھ دیں۔“
اس کتاب نے اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل کی کہ مولانا عبدالرحمن جامی نے اشعۃ السمعات اور مولانا صائغ الدین علی ترکہ اصفہانی نے سوا لمعات کے ناموں سے اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کتاب نے اس طرح تعریف کی گئی۔
”ارباب بصیرت کی نظر میں کہ لمعات فیض کا ایک قطرہ صاب ہے جو صبح بہار الدین ذکر یا ملتانی کے دریائے معرفت سے فخر الدین عراقی کی زبان پر نکلا۔“

☆☆☆

تو نے کا امیر معین الدین عراقی کا بے حد معتقد ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت آپ کی دل جوئی کی فکر میں رہتا۔ اس نے بار بار آپ پر زور دیا کہ۔ ”عراقی! اپنے لیے کسی جگہ کا انتخاب کر کے خانقاہ بنا لیجیے۔“

کچھ عرصے تو آپ انکار کرتے رہے لیکن پھر وہاں نامی جگہ میں خانقاہ بنوائی۔
ایک دن امیر معین الدین ان کی خدمت میں کچھ قصیدے کہہ کر حاضر ہوا۔ آپ نے یہ رقم نہیں لی، انکار کر دیا۔ امیر معین الدین کو بڑا دکھ پہنچا اور افسوس سے کہا۔ ”حضرت! آپ نے تو مجھ سے کوئی خدمت لیتے ہیں اور نہ ہی میری طرف التفات فرماتے ہیں؟“

عراقی نے ہنس کر امیر معین الدین کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اے امیر! میرے لیے زحمت نہ کیا کر۔ التفات کا وقت

آنے دے تو خود کچھ لے گا کہ میں تیرے لیے کیا کروں گا۔“
ایک دن امیر ان کی ملاقات کو آیا تو انہیں نہ پا کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ باہر کچھ شور و غل ہو رہا تھا۔ امیر ادھر گیا تو دیکھا کہ چند لڑکوں نے ان کے گلے میں رسی ڈال رکھی ہے اور انہیں ادھر ادھر دوڑا بھاگ رہے ہیں۔ تماشاخیوں نے عراقی پر طنز کیا مگر امیر نے انہیں ڈانٹ دیا اور کہا۔ ”تم لوگ عراقی کو نہیں سمجھ سکتے۔“
امیر نے عراقی کو لڑکوں سے رہائی دلائی اور خانقاہ میں واپس لایا۔ یہاں لا کر پوچھا۔ ”حضرت! یہ سب کیا تھا؟“
آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے ان کی خوشی کا سامان کر دیا۔“

امیر نے کہا۔ ”حضرت! لوگ آپ پر ہنستے ہیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”گو یا میں نے انہیں بھی خوش کر دیا۔“ امیر خاموش ہو گیا۔
کئی دن بعد امیر دوبارہ خانقاہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ عراقی دو دن سے غائب ہیں کچھ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔ امیر نے ہر طرف اپنے آدمی دوڑا دیے لیکن اکثر مایوس واپس آئے کہ ان کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ چوتھے دن چند آدمیوں نے خبر دی کہ ایک پہاڑ کے دامن میں موجود ہیں۔ امیر معین الدین اپنے آدمیوں کے ساتھ مذکورہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔ انہوں نے ایک عجیب سی منظر دیکھا۔ عراقی نیچے پاؤں، نیچے سر بیٹھے ہیں اور برف کے تودوں پر رقص کر رہے تھے۔ امیر نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”عراقی! میں آپ کو واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“
عراقی نے پوچھا۔ ”کہاں..... کہاں واپس لے جانے کا؟“
امیر نے جواب دیا۔ ”آپ کی خانقاہ میں۔ تو قات..... واپس چلیے۔“
آپ نے اپنے شرابور ہمراہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اے امیر! تو میرا حال دیکھ رہے ہو۔ میں جس آگ میں پھنس رہا ہوں اس کو یہ برف بھی سرد نہیں کر سکتی۔“
امیر نے عرض کیا۔ ”میں آپ کو واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ آپ خانقاہ واپس چلیے۔“
عراقی نے جواب دیا۔ ”امیر! مجھے سنکر رہنے دے، میں تیرا شکر گزار رہوں گا۔“

امیر نے اصرار کیا۔ ”حضرت! میں آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ خانقاہ واپس لے جاؤں گا۔“
عراقی امیر کے اصرار کے آگے مجبور ہو گئے اور خانقاہ واپس چلے گئے۔ اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ امیر معین الدین پر شاعی عتاب نازل ہوا اور حکومت کی طرف سے سختی اٹھانے کے احکام صادر ہو گئے۔ ان احکام پر مامور جلدی ہوئے اور امیر کو لوگوں کو بڑی مہرت ہوئی۔ امیر معین الدین اپنی عمر پر کسی شناسا کے گھر چلا گیا لیکن دو ایک دن بعد اس شناسا نے بھی معذرت کر لی اور کہا۔ ”جناب! آپ کہیں اور چلے جائیں کیونکہ آپ حکومت کے معتب ہیں، میں بھی حکومت کی نظر میں آ جاؤں گا۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے آج شام کو میں چلا جاؤں گا تو فکر مند نہ ہو۔“
رات کی تاریکی میں امیر نے بھڑکی بچوں کو ساتھ لیا اور خانقاہ میں چلا گیا۔ آپ نے اس کی بڑی دلجوئی کی اور فرمایا۔
”تو یہیں میرے ساتھ رہ۔“
امیر نے جواب دیا۔ ”نہیں! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ میں کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

عراقی کو بڑا دکھ ہوا۔ پوچھا۔ ”میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“
امیر نے اپنے سامان میں سے جواہرات کا ذخیرہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کہا۔ ”شیخ! اسے آپ اپنے پاس رکھ لیں اور جس طرح چاہیں کام میں لائیں اور اگر مروج کے نام پر ایک کام کرو دیجیے۔“
آپ نے پوچھا۔ ”اپنا کام بتاؤ، کون سا کام ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”شیخ! میرا ایک بیٹا مصر میں قید ہے۔ آپ اس کی رہائی کی کوشش کیجیے۔ اگر وہ رہا ہو جائے تو اس کو اپنے پاس رکھیے اور اس کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیجیے۔ اس کو اپنا پرانا فرقہ پہنا دیجیے اور اس کو موقع نہ

دیکھتے کہ وہ اس خرقے کو ضائع کرے۔ یہ دنیا کچھ بھی نہیں۔ میں دنیا سے مایوس ہو چکا ہوں اور اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ میرا جینا دنیا میں ضائع ہو جائے۔“

امیر پر گریہ طاری ہو گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ آپ بھی رونے لگے اور گلو گرفت آواز میں اس کو تسلیاں دیتے رہے۔ امیر چلا گیا۔ آپ نے جواہرات کا ذخیرہ احتیاط سے رکھ لیا۔ امیر صمیم الدین کے بعد اس علاقے کا امیر خواجہ شمس الدین کو مقرر کیا گیا۔ اسی عہد کے ایک دوسرے بزرگ مولانا امین الدین عراقی سے بڑی محبت کرتے تھے اور نیا امیر خواجہ شمس الدین، مولانا امین الدین کا عقیدت مند تھا۔ خواجہ شمس الدین جب اپنا عہدہ سنبھالنے تو قات آیا تو اس کے ساتھ مولانا امین الدین بھی آگئے اور تو قات میں داخل ہوتے ہی عراقی سے ملنے چلے گئے۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے اور کچھ دیر بعد سیر و سلوک پر گفتگو شروع ہو گئی۔ دن گزر رات آئی اور رات سے پچھلی رات ہوئی مگر دونوں باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ اس طرح مولانا امین الدین عراقی کے پاس تین دن تک مقیم رہے۔ چوتھے دن امیر خواجہ شمس الدین کے پاس واپس پہنچے۔

امیر نے شکایت کیا۔ ”حضرت! آپ نے بڑا انتظار کروایا۔“
مولانا امین الدین نے جواب دیا۔ ”خواجہ! اس مسئلہ کو عراقی سے نہیں ملا۔ میں نے اس جیسا شخص زندگی بھر نہیں دیکھا وہ جس موضوع پر بھی زبان کھولتا ہے سمندر کی طرح اپنا علم بہا دیتا ہے۔ میں تین دن عراقی کے پاس رہا اور اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اگر میں ان کے پاس تین سال بھی رہتا تو یوں ہی کچھ محسوس کرتا اور یہ تین سال بھی کچھ نہیں، شاید پوری زندگی گزارنے کے بعد بھی میں یوں ہی تشہ رہتا۔ وہ تو عجیب و غریب آدمی ہے۔ میں اس کی تعریف تک نہیں کر سکتا۔“

خواجہ شمس الدین نے فرمایا۔ ”اگر یہ بات ہے تو مجھ کو بھی ان بزرگ سے ملوادیجئے۔“
امین الدین نے جواب دیا۔ ”میں تجھے کو عراقی کے پاس ضرور لے جاؤں گا۔“
خواجہ شمس الدین نے عرض کیا۔ ”حضرت! میرے بھی کچھ جذبات ہیں کسی وقت بھی عراقی کے پاس چل سکتا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ میں عراقی کی دعوت کو قبول کر دوں اور وہ اپنے پاک قدم سے میرے غریب خانے کو زینت بنائیں۔“
مولانا امین الدین نے کہا۔ ”عراقی سے آپ کی طرف سے درخواست تو کر سکتا ہوں لیکن یہ بھی معلوم کہ وہ اس دعوت کو قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔“

خواجہ نے کہا۔ ”آپ ان سے درخواست تو کیجئے مگر میں قبول کر لیں۔“
مولانا امین الدین عراقی کے پاس چلے گئے اور صاف صاف عرض کیا۔ ”عراقی! میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں، امید ہے آپ میری درخواست ٹھکرائیں گے نہیں۔“
عراقی نے مسکرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مولانا! آپ درخواست کیوں کر میں حکم دیجئے میں آپ کی بات کس طرح ٹال سکتا ہوں۔“

مولانا امین الدین نے فرمایا۔ ”خواجہ شمس الدین غائبانہ ہی آپ کا مداح اور عظمت مند ہو چکا ہے۔ اس نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر بعد میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی دعوت کر کے آپ کو مدعو کیا جائے چنانچہ اس نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا ہے اور میں نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ آپ کو دعوت میں لے چلنے کے لیے رضامند کر لوں گا۔ اب آپ چاہیں گے تو میں خوش محسوس کریں مجھے بتادیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔“
”عراقی دوسروں کی خوشی کی خاطر زندہ ہے۔“ عراقی نے کہا۔

مولانا نے جواب دیا۔ ”میری خوشی تو اس میں ہے کہ آپ اس کی دعوت پر تشریف لے چلیں۔“
عراقی نے کہا۔ ”میں ضرور چلوں گا۔“

مولانا امین الدین نے خواجہ شمس الدین کو خوش خبری سنائی کہ عراقی نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے چنانچہ خواجہ نے عراقی کے لیے ایک خلعت اور اونٹ روانہ کیا اور اس اونٹ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنہیں عراقی کے آس پاس ادب سے چلنا

دوسری طرف خواجہ شمس الدین نے معززین اور مولانا امین الدین کو ساتھ لیا اور آپ کے استقبال کو آگے بڑھا۔ جب دور سے شیخ عراقی کی سواری نظر آئی تو خواجہ شمس الدین اپنے ہمراہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور نہایت احترام سے عراقی کا استقبال کیا۔ عراقی کی نظر جوں ہی مولانا پر پڑی بے اختیار فرمایا۔ ”مولانا! مجھ کو یہاں تک لانے میں تمہارا ہی فتنہ کار فرما ہے۔“

مولانا نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ جس چیز کو فتنہ کہہ رہے ہیں وہ ہمارے لیے سعادت ہے۔“ خواجہ شمس الدین آپ کے قریب پہنچا اور عرض کیا۔ ”زہے نصیب کہ آپ تشریف لائے۔ یہ آپ کا ایک ایسا کرم ہے جس کا میں شکر یہ کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتا۔“

یہ لوگ امیر کے محل میں گئے۔ عراقی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور سلوک پر گفتگو شروع ہو گئی۔ شیخ عراقی نے بولن شروع کیا تو ہر کوئی کونگا ہو گیا۔ گفتگو کی تاثیر اور گرمی نے سامعین کے دلوں کو چمکلا دیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ خواجہ شمس الدین کا بہت برا حال تھا۔ حاسد جہاں میں موجود تھے۔ کچھ عرصے بعد ان حاسدوں نے حکومت کو مطلع کیا کہ سابق امیر معین الدین کی دولت خانقاہ میں شیخ عراقی کے پاس موجود ہے۔ حکومت نے خواجہ شمس الدین کو حکم دیا کہ شیخ عراقی سے امیر معین الدین کی دولت زبردستی واپس لے لی جائے۔

خواجہ شمس الدین کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کہ وہ اس پر عمل درآمد کی طرح کرے گا۔ وہ خانقاہ میں تلاشی کی نیت سے داخل ہونے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ خواجہ بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کیا کرے۔ آخر وہ تنہا خانقاہ پہنچا اور شیخ عراقی سے کہا۔ ”شیخ! اس وقت میں تنہائی نازک اور اہم مقصد سے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”میں تیری مشکل سے واقف ہوں۔ حاسد تیرا بھی پیچھا کر رہے ہیں۔“ خواجہ نے عاجزی سے پوچھا۔ ”حضرت! بتائیے میں کیا کروں؟ میری تو ہمت ہی نہیں رہی کہ میں حکومت کے حکم کا آپ سے ذکر کر سکوں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”امیر! تو نہ سمجھو اسے وہ بات درست ہے۔ امیر معین الدین کے جواہرات امانت میرے پاس موجود ہیں۔ امیر کا بیٹا مصر میں قید ہے۔ میں اسے رہا کرواؤں گا اور امیر کے جواہرات اس کے حوالے کر دوں گا۔“ خواجہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”حضرت! آپ کا فرما رہے ہیں؟ اس پر حکومت کے بد باطن آپ کو گرفتار کر سکتے ہیں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”خواجہ! حکومت کے آدمی مجھے گرفتار کر سکتے ہیں کرلیں گرفتار لیکن میں امیر معین الدین کی امانت حکومت کے حوالے نہیں کر سکتا، یہ جس کی ہے اسی کو دی جائے گی۔“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! مجھ پر رحم فرمائیں کچھ کریں ورنہ اس خانقاہ میں جو کچھ ہوگا بہت برا ہوگا۔“ عراقی نے جواب دیا۔ ”خواجہ! تو کیوں فکر کرتا ہے۔ میں عنقریب اس خانقاہ سے چلا جاؤں گا اور مصر جا کر امیر معین الدین کے بیٹے کی رہائی کی کوشش کروں گا۔ حکومت کا میرے خلاف حکم آیا ہی اس لیے ہے کہ میں تو قاتل چھوڑ کر مصر چلا جاؤں۔ یہی مشیت ایزدی ہے اور یہی حکم الہی۔“

خواجہ شمس الدین کی آنکھیں بھرا آئیں۔ بولا۔ ”میں یہ بات اپنی زبان سے نہیں ادا کر سکتا تھا۔ میں آپ کی بے حرمتی بھی گوارا نہیں کر سکتا اس لیے بعد ادب آپ سے درخواست ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”میں آج ہی تو قاتل چھوڑ رہا ہوں اور مصر جا رہا ہوں۔“ خواجہ مطمئن ہو کر اپنے محل واپس چلا گیا اور آپ نے اسی وقت سامان سفر باندھا اور امیر امین الدین کی امانت لے کر مصر کا رخ کیا۔ دوسرے آپ کے ساتھ تھے۔ مصر کی خانقاہ صالحیہ میں قیام کیا۔ انہوں نے سلطان مصر سے ملنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ ملاقات کی کوئی صورت نکلی تک نہیں تھی۔ آخر عاجز آ کر سلطان کے محل کے دروازے پر پہنچے اور دربان سے اندر جانے کی اجازت طلب کی۔ دربانوں نے روک لیا اور پوچھا۔ ”تو ہے کون؟ سلطان سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس ایک شخص کی امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطان کے ذریعے اس شخص تک پہنچا دی جائے۔“

در بانوں نے سلطان کے حجب کو مطلع کیا کہ ایک مست قلندر سلطان سے ملنا چاہتا ہے اور تقریب ملاقات میں جو کچھ کہہ رہا ہے، در بان نہیں سمجھ سکے۔

حاجب نے جواب دیا۔ ”اسے حاضر کیا جائے۔“

در بان نے عراقی کو حاجب کے سامنے پہنچا دیا۔ حاجب نے پوچھا۔ ”ہاں تو اب بتا، تو سلطان سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”میرا نام فخر الدین عراقی ہے۔ میں ایک بے ضرر انسان ہوں۔ بادشاہ کو میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“

حاجب نے حیرت سے کہا۔ ”عراقی! یعنی تو فخر الدین عراقی ہے؟ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا بھانجا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں عراقی ہوں شیخ کا بھانجا۔“

حاجب احتراماً ٹھکرا ہوا۔ بولا۔ ”حضرت! معاف کیجئے گا در بان آپ کو کیا پہچانیں گے۔ میں ابھی سلطان سے ملواتا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے، آپ کو روکنا نہیں جانتا۔“ عراقی خاموش رہے۔

حاجب نے سلطان کو مطلع کیا کہ ”مشہور صوفی اور باکمال شاعر فخر الدین عراقی ہم سب کی خوش قسمتی سے ملاقات کو حاضر ہوا ہے۔ باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“

سلطان نے غم و غصہ فوراً حاضر کیا جائے۔“

حاجب عراقی کو اپنے حجرے لے کر سلطان کے پاس پہنچ گیا۔ سلطان آپ کے سامنے سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔

پوچھا۔ ”تیرا مجھ سے کیا کام ہے؟“

عراقی نے جواہرات کی پوٹی دکھا کر سامنے رکھ دی اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے پوٹی کی طرف اشارہ

کر کے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”امانت..... ایک شخص کی امانت ہے جو سلطان کے ذریعے ہی پہنچائی جاسکتی ہے۔“

سلطان نے حاجب کو حکم دیا۔ ”پوٹی کھولی جائے۔“

حاجب نے پوٹی کھولی تو اس میں سے بیش قیمت جواہرات کی چمک نے آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ سلطان حیرت زدہ

دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ ”حضرت! یہ جواہرات کس کے ہیں اور میرے پاس کیوں لائے گئے؟“

عراقی نے پوری روداد سنائی اور کہا۔ ”میں اس امانت کی ذمہ داری بہت پریشان تھا لیکن اب میں خوش ہوں کہ آپ

سے ملاقات ہوئی اور مجھ تک پہنچ گیا۔“

سلطان نے حیرت سے کہا۔ ”عراقی! میں آپ کی ایمان داری پر حیرت زدہ ہوں۔ جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی مجھے

بتایا۔ قیدی کے باپ نے یہ جواہرات آپ کو دیے تھے۔ آپ انہیں اپنے تصرف میں لے سکتے تھے۔ میں آپ سے پوچھتا

ہوں کہ یہ آپ نے کس طرح بھجوا کر امیر معین الدین نے یہ جواہرات اپنے بیٹے کے لیے دیے تھے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”سلطان! میں دنیا کو آخرت کی بھینٹ سمجھتا ہوں۔ مال و متاع انسان کو بھی نہیں رکھتا۔ یہ

جواہرات میرے کس کام کے، ان سے ایک امیر زادہ ہی مطمئن ہو سکتا ہے۔ ایک درویش کا اپنا خرچ ہی کتنا۔ متاع دنیا

جتنی کم ہوگی فقیر کو اتنی ہی آسودگی ملے گی۔“

سلطان آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے پاس ادب سے بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”یہ

مستافی ہے کہ میں آپ سے دور اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں۔“

آپ بڑی دیر تک سلطان کے سامنے تقریر کرتے رہے۔ سلطان دنیا و مافیہا سے غافل آپ کی باتیں سن رہا۔ آخر

ترک سلطان نے عراقی کو محل میں بٹھرایا اور مودبانہ گزارش کی۔ ”حضرت! میں آپ کو اپنی سلطنت کا شیخ الشیوخ بنانا چاہتا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا یہ بہت ضروری ہے؟“

سلطان نے جواب دیا۔ ”ہاں میں بہت ضروری سمجھتا ہوں آپ کی موجودگی سے میری حکومت کو چار چاند لگ جائیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں سلطان کی خوشی کے لیے شیخ الشیوخ کا منصب قبول کر لوں گا۔“

سلطان نے کہا۔ ”تو میں اس تقریب میں شرکت کے لیے سب کو دعوت دے دوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جیسی سلطان کی مرضی۔“

سلطان نے اسی وقت تقریباً چھ ہزار علما اور صوفیا کو شیخ الشیوخ کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے دی۔

سلطان نے موعودہ دن ایک خاص اہتمام کیا۔ عراقی کو بڑے اعزاز کے ساتھ خلعت اور طیلسان پہنایا گیا اور ایک جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ سلطان نے اعلان کر دیا۔ ”اس جلوس میں عراقی کے سوا ہر شخص پیدل چلے گا۔ نذر الدین عراقی گھوڑے پر سوار ہوں گے، تمام صوفیا، علما اور امرائے کے ہم رکاب پیدل چلیں گے۔“

عراقی نے سلطان سے کہا۔ ”سلطان! دوسروں کو بھی گھوڑوں پر سوار ہونے کی اجازت دی جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح موجودہ صورت حال میں، میں آزمائش میں مبتلا ہو جاؤں گا۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”شیخ! یہ عزت منجانب اللہ ہے اور جو چیز اللہ کی طرف سے ہو اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔“ شیخ عراقی خاموش ہو گئے۔

عراقی خلعت و طیلسان پہن کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور شریک جلوس صوفیا، علما اور امرائے سلطان کے حکم سے عراقی کے ہم رکاب پا پیادہ چلے۔ عراقی نے اپنے آس پاس معززین کو پیدل چلتے دیکھا تو اپنی عظمت اور توفیق کی وجہ سے نفس میں غرور کا غلبہ محسوس کیا۔ انہوں نے اضطرابی حالت میں دستار اور طیلسان کو اتار کر زین کے آگے رکھ لیا، گھوڑے سے اتر کر زمین پر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد دستار کو دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا۔

حاضرین نے ان کا مذاق اڑایا۔ ”تعب ہے سلطان کے اس دیوانے کو شیخ الشیوخ بنا دیا۔ آخر اس میں خاص کیا ہے؟“

ایک عالم نے کہا۔ ”مجھے تو اس میں علم بھی نظر نہیں آتا۔ سلطان نے اس میں ایسی کیا چیز دیکھ لی جو ان کا اتنا والد و شیدا ہو رہا ہے۔ میری تو عقل کام کر رہی نہیں رہی ہے۔“

سلطان نے اسے دوسرے سے کہا۔ ”ذرا شیخ سے معلوم تو کرو کہ انہوں نے دستار اور طیلسان کو اتار کر زین کے پاس کیوں رکھ دیا تھا اور خود گھوڑے سے کیوں اتر پڑے؟“

وزیر نے جب یہی سوال عراقی سے کیا تو انہوں نے جواب دیا۔ ”تم سلطان کو بتا دو کہ اس نے جو عزت اور احترام بخشا ہے اس نے میرے نفس میں تکبر اور غرور پیدا کر دیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس تکبر اور غرور کو شرمندہ اور خوار کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کے بغیر سرکش نفس قابو ہی نہیں آتا۔“

وزیر نے آپ کے جواب سے سلطان کو مطلع کیا تو بادشاہ نے حکم دیا۔ ”جلوس چلتا رہے۔“

جلوس اسی شان سے رداں دواں رہا۔ آخر جب چار بجے اختتام کو پہنچی تو خطیبے میں سلطان نے خود سوال کیا۔ ”اے شیخ! آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”سلطان! افسوس کہ تجھ کو حال کی خبر ہی نہیں۔“

سلطان نے کہا۔ ”پھر بھی میں آپ کی زبان سے اس کا سبب جانتا چاہتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”سلطان! اس وقت میں اپنے نفس کا غلبہ محسوس کر رہا تھا اور نفس کو اس طرح قابو میں لایا جاسکتا تھا کہ لوگ اس پر نہیں اس کا مذاق اڑائیں اور اس کو شرمندہ کریں۔“

سلطان نے فرطِ عقیدت سے کہا۔ ”شیخ! آپ نے میرا دل اپنی مٹی میں کر لیا ہے۔ بلاشبہ آپ نہایت عظیم انسان ہیں۔“

سلطان نے ان کے وظیفے میں اضافہ کر دیا۔

آپ کے مزاج کی آشفستگی اور بے قراری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ شیخ الشیوخ ہو جانے کے باوجود آزادانہ بازاروں، چھوٹیوں، سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے اور اب بھی یہ حال تھا کہ حسن انہیں بے قابو کر دیتا۔ آپ اگر کسی حسین چیز کو دیکھتے تو دیکھتے ہی رو جاتے اور یہاں تک کہ اپنے آپ میں نہ رہتے۔ دوسرے لوگ آپ کا مذاق اڑاتے۔ جب یہ کسی بازار سے عامیانہ گزرتے تو حاسدانہیں دیکھ کر خطرہ سمجھتے۔ ”دیکھنا تو بے چارہ شیخ الشیوخ کیسا رواں دواں ہے۔“

ایک حاسد عالم نے کہا۔ ”میاں زمانے کی ناقدری اسی کو کہتے ہیں کہ ایک دیوانہ شیخ الشیوخ بن گیا اور فرزند و درکھڑا حسرت و عبرت سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔“

کسی معتقد نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ لوگ جو جانتے ہیں لیکن میں اس شخص کو دیوانہ نہیں کہہ سکتا۔ سلطان کچھ دیکھ کر ہی اس شخص کو اتنی قدر و منزلت پر مجبور ہیں۔ میں خود بھی اس میں ایک عجیب سی کشش اور شان محسوس کرتا رہتا ہوں۔“

عالم نے اسے جھڑک دیا۔ ”تو خود جاہل ہے تجھ کو کیا پتا کہ علم کیا ہے اور جہل کسے کہتے ہیں کچھ بھی ہو جائے عالم اور دانا اس شیخ الشیوخ کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے۔“

معتقد نے جواب دیا۔ ”ان کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ بال جب خدا نے یہ عظمت اور شان ان کو عطا کر دی ہے تو اب کون ہے جو ان سے جھین لے۔“

ایک دن سلطان کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی مکنی کہ عراقی شیخ الشیوخ ہونے کے باوجود عایوں کی طرح کلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

سلطان نے جواب دیا۔ ”شیخ! اسے جو بے لور عظیم انسان ہیں کہ ہم میں ایک بھی ایسا نہیں جو ان پر عقیدہ کرے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہیں اور ان کے بات کا یقین ہے کہ شیخ کا کوئی بھی قدم غلط نہیں ہوگا۔ اس کے بعد شیخ کو بلا کر عاجزی سے عرض کیا۔ ”شیخ! تاج سے میں نے آپ کو یہ اختیار دیا کہ آپ میرے ہاں جس وقت اور جہاں بھی آنا چاہیں، بے تکلف آزادی سے چلے آئیں۔ آپ کو کوئی بھی نہیں روکے گا حتیٰ کہ میری حرم سرا اور خواب گاہ میں بھی آپ ہر وقت آجاسکتے ہیں۔“

چنانچہ اس اجازتِ خاص کے بعد سلطان کو جب بھی شیخ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آپ کے پاس آجاتا تھا۔ اس کے اوجہ و احترام میں حد درجہ غلو شامل ہو گیا تھا اور اس کی عقیدت خلوص اور اعتماد کا مثالی نمونہ بن گئی تھی۔ لوگوں کو اس خبر کے اور نہ پاوہ انگاروں پر لٹا دیا۔ آپ کی طبیعت مصر سے کی گئی تھی اور سلطان سے کہا۔ ”میں شام جانا چاہتا ہوں۔“

سلطان نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”شیخ! میں آپ کی مفارقت نہیں برداشت کر سکتا۔“

آپ اپنی بات پر قائم رہے اور پھر کہا۔ ”سلطان! میں شام جانا چاہتا ہوں۔“

سلطان نے پھر وہی جواب دیا۔ ”حضرت! میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی مفارقت نہیں برداشت کر سکتا۔“

عراقی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”سلطان! میں شام جانا چاہتا ہوں۔“

سلطان لا جواب ہو گیا پوچھا۔ ”حضرت کتنے عرصے کے لیے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شام کی طرف سے بوئے موانست آ رہی ہے۔ میں شام ضرور جاؤں گا۔“

سلطان نے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھ میں اتنی ہمت و جہاں کہاں کہ آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف روک لوں۔ آپ شام تشریف لے جائیں میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ واپس کب تک آئیں گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”واپس کا علم خدا کو ہے میں نہیں جانتا، میں جو جانتا تھا بتا چکا کہ شام سے مجھے بوئے موانست

آ رہی ہے اور میں اس طرف کھنچا جا رہا ہوں۔“

سلطان نے کہا۔ ”آپ شام تشریف لے جائیں، دو میرے ہی زیرِ نگیں ہے۔“

اس کے بعد سلطان نے شام کے ملک الامراء کے نام فرمان جاری کیا کہ ”شیخ الشیوخ شیخ فخر الدین عراقی تشریف لارہے ہیں۔ ان کا شاندار استقبال کیا جائے اور انہیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے کیونکہ یہ نادر و روزگار ہستی ہم سب کی عزت و احترام کی مستحق ہے۔“

عراقی نے مصر چھوڑ دیا اور شام روانہ ہو گئے۔ شام کے امیر الامراء نے ان کا شاندار استقبال کیا اور ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ آپ کا بیٹا کبیر الدین متمان سے شام ملاقات کی غرض سے پہنچ گیا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور بیٹا سینے میں منہ چھپائے زار و قطار رو رہا تھا۔ آپ بھی رو دیے۔

بیٹے کو اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا۔ ”میں تیری وجہ سے شام چلا آیا اور نہ ابھی مصر ہی میں ہوتا۔“

بیٹے نے کہا۔ ”باو ا جان! متمان تشریف لے چلے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! شام کی مٹی میں اس مصیبت کی بو پائی جاتی ہے۔ یہاں سے اور کہیں نہیں جاسکتا۔“

بیٹے نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ بھر واپس آجائیے گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب اتنا وقت کہاں؟ جامِ عمر چھلنے کی دال ہے۔ زندگی کے ماہ و سال سے یہ لبریز ہو چکا

ہے۔“

بیٹے نے عرض کیا۔ ”میں نے تو اسی لیے حاضری دی تھی۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے تجھے اسی لیے بلایا تھا کہ آخری بار تجھے دیکھ لوں۔“ بیٹا ایک بار پھر زار و قطار

رونے لگا۔

چند دنوں بعد شیخ کے چہرے پر درد نمودار ہوا اور آپ تنفس میں تکلیف محسوس کرنے لگے۔ علاج شروع ہوا لیکن آپ نے اپنے بیٹے کو بتا دیا۔ ”بیٹے! یہ تو عرضِ الموت ہے۔ کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ طعام کی زمین سے انس و محبت کی پو محسوس ہو رہی ہے؟“

بیٹے کو ملال تھا کہ باپ سے ملاقات ہوئی تھی مگر اس وقت۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں۔ ورمِ تنفس کی اذیت نے شیخ کو پانچ دن تک سونے نہیں دیا۔ آخری گھنٹوں میں بیٹے سے کہا۔ ”کبیر الدین! یہ آیت تو نظر سے نہ لے ہو گی“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”باو ا جان کون سی؟ ارشاد فرمائیں۔“

آپ نے آیت پڑھی۔ ترجمہ ”جس روز ایسا آدمی اپنے بھائی، اپنی بیوی، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے

بھگے گا اور ان میں سے کسی ایک کے مشغلے میں ہوگا کہ وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے گا۔“

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ ”بیٹے! خدا حافظ!“

آپ نے کلہرِ طیب پڑھا اور آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کے وقت آپ کی عمر اسی سال تھی۔ انہیں مشہور صوفی شیخ محی الدین عربی کے مزار کے برابر دفن کیا گیا اور یہ دونوں مزار محلہ صالحیہ میں واقع ہیں۔ محی الدین عربی کے مزار پر لکھا ہے ”بحر العرب“ اور شیخ فخر الدین عراقی کے مزار پر ”بحر العجم“ کندہ کر دیا گیا۔ گویا عرب اور عجم کے دو عظیم علمی اور روحانی سمندر دو دو گز زمین میں سامنے اور ان دونوں سمندروں کا فیض آج بھی جاری و ساری ہے۔

ذکارِ اہرار، محمد شوقی شطاری، حیدر علی اکبری، مولانا محمد حسین آزاد۔

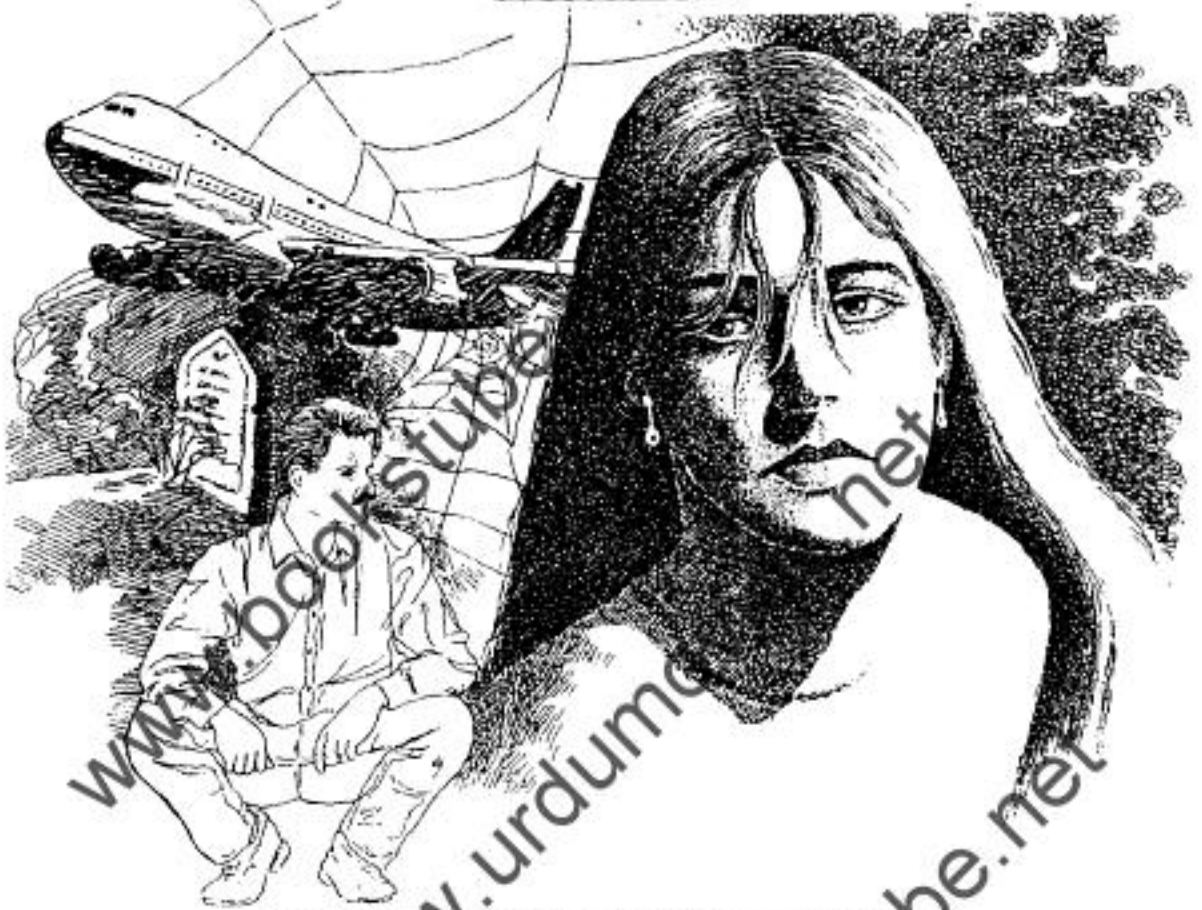
انوار الصفا، محمد خصلت حسین صابری، صوفیائے نقشبند، سید امین الدین۔

انوار الاصفیا، غلام علی ایڈ سنز، سکینتہ الاولیا، دارالاشکوہ

ماخذات

بے وفا

یاسمین مندرجہ



یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس سے شدید محبت کرے اسے صرف اور صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اس میں کسی قسم کی شراکت برداشت نہیں کر سکتا مگر... جب اسے یہ شراکت مجبوراً برداشت کرنی پڑ جائے تو وہ اس سے فرار کے ہر ممکن طریقے پر غور کرتا ہے... خوش قسمتی سے اسے بھی ایک ایسا ہی طریقہ سوچنا تھا جس پر عمل کر کے اس نے لاشی بھی محفوظ کر لی اور سمانپ کا سر بھی کچل دیا۔

قریب سے گزرنے والی کار کی روشنی کمزور سے لگائی اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ ”افسوس میری اندر آئی اور چند لمحوں کے لیے مارون کے تار یک کرے کو جکڑ گئی لیکن جلد ہی چاروں طرف وہی بھیاں یک تار کی دوبارہ پھیل گئی۔ مارون نے بجلی سی آہ بھر کر کرسی سے ٹپک کر گئی اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ ”افسوس میری!

طرف بڑھا توڑی سی کوشش کے بعد اس کا ہاتھ جانی پہچانی بوتل سے ٹکرایا۔ انتہائی ضرورت کے تحت اس نے بوتل کو فوراً اٹھایا۔

”اف!“ جونہی اس کے حلق سے تلخ رقیق اتر کر پیٹ میں گیا۔ ایک ایک رگ سنگ اٹھی۔ سانسوں کی رفتار تیز ہوئی لیکن آہستہ آہستہ اسے اپنے جسم میں حرارت دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ کچھ سکون ملا، گھبراہٹ، بے چینی اور پریشانی دم توڑ گئی اسے یاد آ گیا کہ بائیں ہاتھ میں اس نے جو کاغذ دبا رکھا ہے۔ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ اسے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف حفظ ہو چکا تھا۔ وہ اس کی مخصوص، ترجمانی لیکن سٹری وینڈر اسٹنگ سے واقف تھا۔ وینڈر اسٹنگ ہی سے نہیں بلو بلیک ایک بھی اس کی شناسا تھی۔ وہ اس قلم کو بھی پہچانتا تھا جس سے یہ رقعہ لکھا گیا تھا۔ وہی قلم تھا جو اس نے پچھلے کمرس پر میری کو دوسرے قیمتی تحائف کے ساتھ پیش کیا تھا۔

”میری!“ اس کے ذہن میں کسی نے چلا کر کہا اور دوسرے ہی لمحے رقعے پر لکھے ہوئے میری کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

”میں جیک کے ساتھ جاری ہوں گا، اسے بہت دور۔ میں نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا ہے، بہت سوچ بچ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ ہماری شادی کو مردہ ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں۔ شاید اپنی بے حسی کے باعث تمہیں اس کا احساس نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرے جانے کا دکھ ہوگا دکھ تو غصے کی بجائے مجبور ہوں اور صرف یہی نصیحت کر سکتی ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو زندگی کے اصولوں کو نظر انداز نہ کرو۔ مجھے دولت سے زیادہ تمہاری بھرپور محبت کی ضرورت تھی۔ تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچایا، کبھی کوئی تکلیف نہیں دی پھر بھی میں جیک کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئی ہوں کیونکہ اس کے پاس مجھے وہ چیز لگتی ہے جو میری ہر ممکن کوشش کے باوجود تم سے نہ مل سکتی تھی۔ میں تمہیں بھی نہیں بھلا سکوں گی۔“

اور اس کے ساتھ ہی اس فرنیچر اور کونسل کی فہرست تھی جو میری اپنے بیکے سے لے کر آئی تھی اور اسے وکیل کا پتا درج تھا جس تک میری کی ہدایت کے بموجب مارون کو وہ سارا سامان پہنچانا تھا۔ اس کا جسم اچانک لرز اٹھا اور نہ جانے کیوں وہ گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کھڑکی سے باہر اتھاہ تاریکی تھی۔ شاید کبھی گری تھی۔ اس کا گھر ہمیشہ سے ایسا تھا کہ اس میں رہ کر سردی سے بچنا

ناممکن تھا۔ اگر معقول قسم کی حرارت کا انتظام نہ کیا جاتا تو یہاں رہنے والا ہر شخص ٹھنڈ کر ختم ہو جاتا۔ اس نے ایک بار پھر شراب کی بوتل اٹھائی۔ شراب انڈیلنے ہوئے اچانک چھٹک گئی اور کچھ اس کے کپڑوں اور کچھ میری کے رقعے پر پڑی۔ کپڑوں کو نظر انداز کر کے وہ جلدی جلدی رقعہ صاف کرنے لگا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں میری۔ بہت محبت کرتا ہوں۔“ اس نے رقعے کو مخاطب کر کے کہا۔ ”انسوس، تم نے جانے میں بہت جلدی کی۔“

ایکا ایک رقعے میں جان پڑ گئی۔ ”میں جیک کے ساتھ جاری ہوں، میں جیک کے ساتھ جاری ہوں۔“

اس نے گھبرا کر کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارا۔ جیک کٹری کھپ میں سب سے خوش اخلاق اور خوش پوشاک سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بی بی سی سفید گاڑی تھی اور وہ اسی فرم میں جہاں مارون ملازم تھا، سب سے کم عمر سٹیز فینچر تھا۔ پچھلے دنوں جب اس کے ہاں سفیدی ہو رہی تھی، وہ مارون سے درخواست کر کے چند روز کے لیے اس کے ہاں منتقل ہو گیا تھا اور وہ اپنا زیادہ وقت میری کے ساتھ بیٹھنے میں گزارتا تھا۔

مارون نے انسوس سے اپنا سہارا، اعتبار اور اعتماد اسے بالکل ہی اندھا کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میری اور جیک کا اس حد تک گھٹنا ملنا مناسب نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے جب وہ سالانہ سٹیز کانفرنس میں حصہ لے کر واپس آیا تو اس نے اپنے کمرے میں ایک آدی کی آواز سنی تھی۔

”جیک کی آواز ہے۔“ میری نے اسے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔ ”میری میری کار کچھ خراب ہوئی تھی چنانچہ میل کے بعد وہ مجھے اپنی کار پر کھینک چھوڑنے کے لیے آ گیا۔ اب یہ تو بڑی بد اخلاق کی بات تھی کہ میں اسے گھر مدعو کر کے ذرا سا مشروب تک پینے کے لیے نہ لے جاؤں۔“ اس نے ناؤارتنگ؟ ”مارون کو خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی اخلاق وادب سے عاری نہیں ہے۔ وہ خود جیک کے پاس گیا اور اس نے میری کو گھر تک پہنچانے کے لیے اس کا شکر یہ ادا کیا۔“

”ارے اس میں شکر یہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔“ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے طے کیا کہ اگلے ہفتے نہیں کا ایک دوستانہ بیچ کر لیں گے۔

مارون کے ہاتھ سے میری کا رقعہ گر گیا۔ اس کی آنکھوں میں میری کی تصویر گھومنے لگی۔ میری اور جیک

سرگزشت

ماہنامہ
ستارہ
2015
کی جھلکیاں

اس شخصیت کا زندگی نامہ جس نے زمانہ قدیم
حکمرانی کے اصول مرتب کیے تھے

الکسانڈر

ان شخصیات کا ذکر جن کی موت
عین سالگرہ کے دن ہوئی

ماہنامہ

اس مہینے میں پیدا اور وفات
والے اہم لوگوں کا تذکرہ

انقلاب

جس کے خوف سے امریکن سی آئی اے
اور تھی گروہ غریبوں کا مسیحا کہلایا

ادب

قوت سماعت کے محرم ایک لڑکی کی
جج بیانی۔ اس نے اپنی جگہ کو کیسے پایا

ادبی عالم

سفر نامہ، معروف فلمی شخصیت کا احوال زیست،
میل گریو گرام کر دینے والی سرگزشت "سراب" اور
جی بہت سی جج بیانیاں، سچے واقعات دلچسپ قصے

اپنے اپنے سوٹ کس کار میں رکھ رہے تھے اور اس پر ہنس
رہے تھے کہ جب مارون گھر پہنچے گا اور میری وہاں نہیں ہوگی
تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

لیکن مارون نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ تو اپنی
میری کو یہ خوش خبری سنانے آیا تھا کہ اب اسے زیادہ ستر نہیں
کرنے پڑیں گے اور وہ اپنا زیادہ وقت خصوصاً اپنی راتیں میری
کے ساتھ گزارا کرے گا۔

"مارون!" آج ہی اس کے پاس نے کہا تھا۔ "ہم
لوگ تمہارے کام سے بہت خوش اور بہت مطمئن ہیں۔ اب
ہم نے یہ طے کیا ہے کہ دفتر کا سارا کام تمہیں سونپ دیں۔
وہ کیا آؤٹ ڈور کام تو وہ کوئی اور شخص بھی انجام دے لے
گا۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے تمہاری ماہانہ تنخواہ میں
پچاس فیصد اضافہ بھی کیا جا رہا ہے۔"

مارون یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے گم سم بیٹھا رہ گیا
تھا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ قسمت اس حد تک اس پر مہربان
ہو سکتی ہے پھر اس نے بہت ہی دھیمے لہجے میں اپنے پاس کو
بتایا تھا کہ اس کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی۔ میری سے
دور رہ کر وہ ذہنی سرریض بننا چاہتا تھا۔

اور جب اس کے پاس نے پتہ چلے گا کہ "تم یہ
بات میری کو بھی بتا دو۔ اس کی راتیں تھوڑی گزریں گی
کیونکہ روزانہ سرشام اس کا شو ہر گھر پہنچ چکا ہے۔"

مارون فوراً ہی یہ اطلاع لے کر گھر روانہ ہو گیا۔
جانتا تھا کہ میری یہ خبر سن کر خوش ہوگی۔ اس کی دلی خواہش
تھی کہ وہ کسی کے چہرے کو گھاب کے پھول کی طرح کھلتی
ہوا دیکھے۔ اپنی یہی خوش خبری سن کر وہ اپنے احساسات و
جذبات کو ہزار کوشش کے بعد بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔

مارون دو بجے تک بیٹھا رہا۔ جس وقت اس نے دروازہ
کھولا اس کے ہونٹوں پر خوشی کا نغمہ تیر رہا تھا۔ "روٹھی ہوئی
مستر تیں دوبارہ آگئیں۔ جدائی کے طوفان دم توڑ گئے۔ اب
ہمیں اور تمہیں کوئی جدائیں کر سکے گا۔"

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ میری پر رکھا ہوا
میری کا یہ رقعہ اس کا استقبال کر رہا تھا۔ "میں جیک کے
ساتھ جا رہی ہوں۔"

"میری اور جیک..... میری اور جیک!" اس کا دماغ
جھک لے کھانے لگا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اندر ہی اندر اس کے دل نے
بغاوت کی۔ "میری کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں سمجھ
لوں گا ایک ایک کو۔"

وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا اور فون کے پاس پہنچا۔ یہاں گلی کے کھجے سے ہلکی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں اس نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا پھر چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا کہ اسے فون کہاں کرنا چاہیے؟ پھر اس نے آہستہ آہستہ نمبر ڈال کر شروع کر دیے۔

”ہیلو!“ اس نے اپنی فرم کی کلرک سے کہا۔ ”میں مارون بول رہا ہوں اور جبک سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“ کلرک کی آواز آئی۔ ”مسٹر مارون مسٹر جبک سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ اگلے ہی لمحے جبک کے اسسٹنٹ نے فون سنبھال لیا۔

”مسٹر جبک یہاں نہیں ہیں مسٹر مارون۔“
”کب تک واپس آ جائیں گے؟“
”کم از کم دو ہفتے بعد۔“ اس نے انہیں ایک طویل کاروباری سفر پر بھیج دیا۔
”اس سے میری گفتگو کروادو۔“

”مجھے انکس ہے مسٹر مارون اس کا انکس روم میں تھا۔“
”جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ”مارون“ نے گرج کر کہا۔
”بہت اچھا جناب، بہت اچھا۔“
”چند لمحوں بعد اس کی آواز آئی۔“ مسٹر مارون۔“

مارون نے اپنے چہرے پر آگے بڑھنے کو خشک کیا۔ ”جہیں معلوم ہے اس وقت جبک کہاں ہو چکا ہے؟“
”میں نے اسے کاروباری سفر پر روانہ کر دیا ہے۔“
”اس نے کہا۔“ کوئی خاص بات کہنا چاہتے ہو؟“
”میرا بانی کر کے ذرا یہ معلوم کر لو وہ سفر کے اخراجات کے لیے کتنی رقم لے گیا ہے۔“

”کیسے؟“
”مطلب یہ ہے کہ جیب میں معقول رقم ہو اور ساتھ میں کسی کی اغوا کی ہوئی ممکن ہو تو کوئی شخص بھی کاروباری فرائض ایماندار کی سے انجام نہیں دے سکتا۔“ اس سے قبل کہ اس کا چہرہ اور چہتا، مارون نے ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے چہرے کا پینٹا پونچھنے لگا۔
”یہی ہوگا جبک! اب تو یہی ہوگا۔ تم دونوں نے اپنی تباہی اور بربادی کے بیج خود بوئے ہیں۔ میں تو کبھی اس کاٹنے والا ہوں۔“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
پھر اسے خیال آیا کہ پولیس کو بھی مطلع کر دیا جائے۔

کیا پولیس والے ان دونوں کو واپس لاسکتے ہیں؟ اس نے سوچا۔ ایک عجیب سی سفاکانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ وہ انکس واپس نہیں لاسکتے، میری اور جبک بہت

دور جانچے ہیں پھر بھی پولیس کو اطلاع دینی ضروری ہے۔ انہی بدگمانی خشک نہیں، پولیس کو کنٹینش کا موقع ضرور دینا چاہیے۔ مگر پولیس کو مطلع کرنے سے قبل ضروری تھا کہ ہر شخص کو میری اور جبک کے فرار کی داستان معلوم ہو جائے، کیونکہ وہ پولیس کے ساتھ ہی ساتھ جبک کے منکر، بروکر اور اکاؤنٹینٹ کو بھی اس کی اس حرکت کی اطلاع دیدے؟ ایک دوست نے اپنے دوست کی بیوی کو بھگا کر جس کینے پن کا ثبوت دیا تھا اس سے کبھی کا واقف ہونا ضروری تھا۔ احتیاط اور مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آئندہ بھی کوئی شخص کسی دوست پر اتنا اعتبار اور اعتماد نہ کرے جتنا مارون نے جبک پر کیا تھا۔

اس نے باری باری سب کو جبک اور میری کی داستان بے وفا کی ستائی۔ پولیس کو پوری بات بتاتے ہوئے اس کی آواز بھی بھرا گئی۔ اسے واقعی میری سے دلی محبت تھی اور جبک کو سب کو اطلاع دے چکا تو اچانک اسے شدید سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور رکھ کر بار بار اکاؤنٹینٹ کو اطلاع شروع کر دیا اور دیوار کے سہارے چلتا ہوا وہ دھڑکی خانے کی طرف بڑھا۔

باورچی خانہ خوب گرم تھا مگر گرم رکھنے کے لیے اس نے جس بھی کا انتظام کیا تھا وہ کچن ہو گیا۔ یہ کیسی گرمی تھی جو ابھی تک اس کے کانٹے ہوئے جسم کی سردی دور نہیں کر سکی تھی۔ اس نے ہمت کر کے کئی کا دو اوزہ کھول دیا اور اس کے پاس کھڑے ہو کر ہاتھ تپانے لگا۔ کچن میں میری اور جبک کے جسم جل بھن کر راکھ ہو چکے تھے۔ وہی کچن اسے دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کھرا کر مارون کے کچن میں میری کا رتھ میز پر رکھا ہوا دیکھا اس وقت دونوں اندر ہی تھے اور فرار ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے اور مارون نے نہ بروقت کنکشن کا بلا استعمال کر کے انہیں بے ہوش کر دیا تھا اور جب وہ دونوں بے ہوش ہو گئے تو انہیں کنکشن کے بے سمیت بھی میں ڈال دیا تھا۔

اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پاس میری کا نکلا ہوا خط موجود تھا جس میں اس نے اپنے فرار ہونے کی اطلاع دی تھی۔

”میں جبک کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ وہ پولیس سے شکایت کر سکتا تھا کہ بروقت مطلع کر دینے کے باوجود پولیس جبک اور میری کو تلاش کرنے میں ناکام رہی، مگر وہ اس سردی کا کیا علاج کرے جو ہکتی ہوئی بھی کے باوجود ابھی تک اس کے جسم کی ہڈی دور نہیں کر سکی تھی۔



شہ طنت

سید

کوئی کتنا ہی بڑا شہ زور کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں سمیر کو سوا سمیر مل ہی جاتا ہے۔ وہ بھی اسمی گھمنڈ کا شکار تھا کہ اچانک لکٹنے والی ٹھوکر نے اس کی خال کو ایسا لڑکھڑایا کہ دو قدم بھی چلنا دوپٹہ ہو گیا... ایسے میں منزل تک پہنچنا کس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا۔

فریڈرک نے اسے ایک شہر کا اجازت نامہ دیا

فریڈرک قیمتی فرنیچر کے درمیان بچوں کے بل دبے پاؤں خاموشی سے حرکت کر رہا تھا۔ وہ خام طور پر قیمتی تنگ بادشاہ کے صوفے کے چینی کے گھد ان کے بارے میں خاما خما ط تھا کہ کب تک وہ ٹھوکر کٹنے سے گرنے جائے جو کمرے کے مین وسط میں رکھا ہوا تھا۔ اچانک کمرے کی لائٹیں روشن ہو گئیں۔

فریڈرک نے تیزی سے پلٹ کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں مکان کا مالک ناخن منرو

کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کی نال کا رخ فریڈرک کی سمت تھا۔

”لغت ہو۔“ فریڈرک بڑبڑایا۔

”بے شک۔“ ناخن منرو نے کہا۔

فریڈرک نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے چہرے پر سے ماسک اتار دیا۔ ”میں ادھ مین۔ کیا تمہیں ہفتہ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”عام طور پر مجھے اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن یہ میری بد بختی ہے جیسے جہنم سے آئی ہو۔“

ناخن منرو کمرے کے گوشے میں بنے ہوئے باریک جانب بڑھ گیا۔ اس کے ریوالور کا رخ بدستور فریڈرک کی جانب تھا البتہ اس کے انداز سے قدرتی پیردائی عیاں تھی۔ ناخن منرو بد ظاہر اس ٹائپ کے لوگوں میں سے تھا جو ہاتھ میں کسی ہتھیار کی موجودگی میں خود کو بے حد مطمئن محسوس کرتے ہیں۔

”پہلے تو پیر کے بعد میری کار خراب ہو گئی اور اسے درکشاپ لے جانا پڑا۔ مشکل کے دو ڈرائی کلین والوں نے میرا سوٹ گم کر دیا۔ بدھ کے روپ اپنے پسندیدہ چائینز ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے سے مجھے غور و فکر ہو گئی اور سب سے بڑھ کر اب یہ صورت حال سامنے آگئی۔“ فریڈرک نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری بد قسمتی ہے۔“ ناخن منرو نے کہا۔ ”تمہارے ہاتھ دلی ہمدردی ہے۔“

”میرا ہتھیار یہاں موجودگی کسی ذاتی وجوہ کی بنا پر نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ ڈاکا ڈالنے کو ایک قسم کی بے حرمتی سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں اس بات کا کوئی دخل نہیں ہے۔“ میں ان لوگوں کے گھروں میں ڈاکا ڈالنے کے ارادے سے داخل ہوتا جو مجھے پسند نہیں ہیں تو میں یقیناً یہی کرتا۔“ فریڈرک نے کہا۔

ناخن منرو نے برانڈی کی ایک گلیک اور بولا۔ ”یہ بات تسلی بخش ہے۔“

”مثال کے طور پر تم مجھے بے حد معقول محسوس لگتے ہو۔ ذہین اور عمدہ ذوق کے مالک۔ گفت و شنید لے لے۔۔۔۔۔ آہادہ۔“

”گفت و شنید؟“ ناخن منرو نے بھوئیں اچکاتے ہوئے کہا۔

فریڈرک نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ضروری نہیں یہ بات ہم دونوں کے درمیان

سے کہیں آگے بڑھے۔“

”آئی سی۔“ ناخن منرو نے ایک بار پھر بھوئیں

اچکادیں۔ ”بائی دی وے کیا تم سچ ہو؟“

فریڈرک اس بات پر چونک گیا۔ ”نہیں، نہیں۔ میں

کبھی اسلحہ لے کر نہیں چلتا۔ مجھے ہتھیاروں سے نفرت ہے۔

ان میں بری بات یہ ہے کہ وہ چل پڑتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ

اس کا مطلب نیو یارک کی مرکزی جیل میں سیدھا دس سال

کی قید کا ثنا ہے۔ بلا کسی سبب کے۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ

میں یہاں موجود ہوں؟ میں تین ہفتوں تک اس جگہ کا جائزہ

لیتا رہا ہوں۔ میں تمہاری تمام حرکات و سکنات سے واقف

ہو چکا ہوں۔ اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ اس وقت

میں مکان کے دوسرے حصے میں ہونا چاہیے تھا اور تم نوکی

بات کر رہے ہوتے۔“

”اور حقیقت بالکل ایسا ہی تھا۔“ ناخن منرو نے بتایا۔

”لیکن میں نے حالی ہی میں ایک نئی سکیورٹی ڈیویس نصب

کرائی ہے۔ اس کا نام پتھون تھری زیر وزیر ویزیرو ہے۔“

یہ سن کر فریڈرک کی آنکھیں حیرت سے پھٹ

پڑیں۔ ”اوہ کرائسٹ!“ وہ کیا فائدہ

”مجھے لگتا ہے کہ تم نے اس ڈیویس کے بارے میں

سن رکھا ہے۔“ ناخن منرو نے کہا۔

”ہاں، میں نے سنا ہے کہ وہ ایک جدید ترین سکیورٹی

ڈیویس ہے۔ کہنے کو کیا یہ قدرے غیر ضروری نہیں ہے؟ میرا

مطلب ہے کہ یہ صرف ایک گھر ہے، کوئی فورٹ نہیں۔

تمہاری کسی بھی گاڑی اور ان کی سکیورٹی سسٹم سے اپنا کام

چلا سکے۔ مجھے اس دھوکے باز نے تم سے اس سسٹم کی

ذمہ داری قبول کی ہوگی۔“ فریڈرک نے کہا۔

”ظاہر ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔“ ناخن منرو نے فریڈرک کی مہمی

”ہے۔“ ناخن منرو نے غصے سے کہا۔ ”جس لمحے کوئی بھی

احاطے میں داخل ہوتا ہے وہ مجھے ہوشیار کر دیتا ہے۔

تم نے جس لمحے میرے لان میں قدم رکھا تھا تو مجھے علم ہو گیا

تھا کہ تم یہاں آگئے ہو۔“

فریڈرک نے یہ سن کر اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے

ہوئے سر ہٹا دیا۔ ”اور بلاشبہ تم نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا۔“

”نہیں، میں نے پولیس کو فون نہیں کیا۔ ابھی تک تو

تمہاری۔“ ناخن منرو نے جواب دیا۔

فریڈرک نے حیرت سے ناخن منرو کی طرف دیکھا۔

”ابھی تک نہیں کیا؟“

”نہیں، میں نے ابھی تک اپنے ذہن کو کسی فیصلے پر

”بات اسپیری یا رہائی میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کی نہیں ہے۔“ تاہم منرو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”معاذِ زندگی اور موت میں سے کسی کے انتخاب کا ہے۔“
فریڈرک نے یہ سن کر قدرے توقف کیا پھر بولا۔
”کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟“

”بہر صورت میں تمہیں ابھی اور عین یہیں پر قتل کر سکتا ہوں اور مجھے کون الزام دے سکتا ہے؟ یہاں میں اکیلا اور نہتا۔“

”تمہارے پاس ریوالتور ہے۔“ فریڈرک نے اشارہ کیا۔ ”تم نہتے نہیں ہو۔“

”مجھے کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں اپنی حفاظت کے پیش نظر اپنا ریوالتور اٹھا لیتا ہوں۔ پھر میں اپنی اسٹڈی میں پہنچتا ہوں تو وہاں ایک خطرناک مجرم کو موجود پاتا ہوں جو مجھے کیمینٹا گیری کی قوت سے مجھ پر قتل گجھرتا ہے۔“
”لو، خدا کے واسطے۔“

”اس غیر متوقع حملے پر میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں اور میرا جسم کچھ سوچ کے بغیر حرکت میں آ جاتا ہے۔ پھر اس سے قبل کہ مجھے اچھا لگتا ہوتا کہ کیا ہو گیا ہے، ایک بد قسمت برعکس لاش پڑی وہاں دھکی دھکی ہے جس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہے۔“

”تم ایسا کیوں کر کر سکتے ہو؟“
تاہم منرو بے پروائی سے ریوالتور کو اپنی آنکھوں میں نہاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی بالکل یہی بات سوچ رہا تھا۔“

”خدا ہے کہ تمہیں اس بات کا جواب پسند نہیں آئے گا۔“
”ہماری اس گفتگو میں ایسی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں کہ جن سے میں خاص طور پر لطف اندوز ہوا ہوں۔“
”سچ تو یہ ہے کہ میں شاید تجس کی بنا پر تمہیں قتل کر دوں۔“ تاہم منرو نے کہا۔ پھر کمرے کے ایک گوشے میں موجود شطرنج کی بٹا پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”کیا تم شطرنج جیتے ہو فریڈرک؟“

”ہاں، میں شطرنج کھیلتا ہوں۔ حقیقت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں شطرنج کا نہایت عمدہ کھلاڑی ثابت ہوتا ہوں۔“ فریڈرک نے کہا۔ ”میں یوں کھیل سکتا ہوں، ٹیلی وژن دیکھتا ہوں اور گولف کے کھیل میں میری اوسط سے زیادہ ضربات کی تعداد آٹھ ہے۔ مزید اور کچھ؟“

تاہم منرو نے سائڈ ٹیبل کو ایک جانب ہٹکا تے ہوئے جگہ بتائی اور ایک کرسی کمرے کے وسط میں لے آیا۔
”وہاں میز پر ایک بساط رکھی ہوئی ہے۔ اسے یہاں لاکر

تیار نہیں کیا ہے۔“
فریڈرک کاؤچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور چند قدم آگے بڑھنے کے بعد بولا۔ ”دیکھو میرے پاس کچھ نقد رقم ہے۔ اگر اس سے کوئی فرق پڑ سکتا ہے تو تم ور رقم لے لو۔“
تاہم منرو یوں بن گیا جیسے اس نے فریڈرک کی یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ ”ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”میرا نام؟ فریڈرک!“

”خوب۔۔۔۔۔ فریڈرک۔۔۔۔۔ جب تم نے میرا احاطہ پھلانگ دیا تھا، میرا ان عبور کیا تھا اور میرے گیراج کے راستے گھر کے اندر داخل ہوئے تھے تو کیا تمہیں اس کا رکو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو وہاں کھڑی ہے؟“
”اوں نہیں۔ حقیقت میں نہیں۔ وہاں اند میرا تھا۔“
فریڈرک نے جواب دیا۔

”اگر تم نے وہاں لائٹ جلانے کی زحمت کی ہوتی تو شاید تم اس لمبوی میں سرسلیک اسپورٹس کار کو بھی دیکھ لیتے جو دیگر کاروں کے درمیان وہاں موجود ہے۔“ تاہم منرو نے کہا۔
”اس کار کی کیا خاصیت ہے؟“

”اس کی قیمت تقریباً تین لاکھ ڈالر ہے۔“
فریڈرک کے ہونٹ سیٹی بٹ کے انداز میں سکڑ گئے۔ ”تین لاکھ ڈالر! صرف ایک کار کی قیمت؟“ اس نے ناقابل یقین لہجے میں کہا اور ساتھ ہی حیرت سے سر ہلانے لگا۔

تاہم منرو نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”اب بتاؤ تمہیں اس کی پیکش کر رہے تھے؟“

فریڈرک نے بلند آواز سے ایک لمبا سانس کھینچا۔
”اس حقیقت کے پیش نظر ہم گفتگو کے اس حصے کو حذف کرتے ہوئے برابر اسے ترس کھا کر معاف کر دینے کی بات کرتے ہیں۔“
”تم دیکھنے میں ان گولیوں میں سے ہرگز نہیں ہو جنہیں ترس کھا کر معاف کر دیا جاتا ہے۔“

”تمہیں شاید اس بات پر حیرت ہو۔ میرا مطلب ہے میں حقیقت میں جیل نہیں جانا چاہتا۔“ فریڈرک نے کہا۔
تاہم منرو یہ سن کر بہ ظاہر حیران سا ہو گیا۔ ”کیوں؟“
میں نے تو جیل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میرے خیال میں تم غلط سمجھے ہو۔ جب میں نے یہ کہا تھا کہ میں نے ابھی تک اپنے ذہن کو کسی فیصلے پر تیار نہیں کیا ہے تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آیا تمہیں زندہ رہنے دیا جائے یا نہیں۔“
فریڈرک نے آنکھیں پٹیچے ہوئے کہا۔ ”ایسا کیسی زی؟“

سیٹ کر دو۔" اس نے فریڈرک سے کہا۔

"اگر میں نے یہ کر دیا تو کیا تم مجھے جانے دو گے؟"

"اگر تم نے یہ نہیں کیا تو میں اسی وقت شوٹ کر دوں گا۔"

"تب میں بساط بچھا دیتا ہوں۔" فریڈرک نے بارش کے جیسے بورڈ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ فائر اعلیٰ ہو یا بالکل بھی احساس نہیں ہے؟"

"مجھے اس سے بھی بدترین الفاظ سے نوازا گیا ہے۔"

"حال ہی میں؟"

ناخن منرو یہ سن کر مسکرا دیا۔ "میں سفید مہرے لوں گا۔" "بے شک۔" فریڈرک نے کہا اور جیس ڈیزائن کی ایک کرسی گھسیٹ کر ناخن منرو کے مقابل میز پر بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے اور بہت سے کام بھی کر سکتا ہوں۔ تمہاری مدد کے لیے۔ میں قطعی سنجیدہ ہوں۔ میں حقیقت میں ایک نہایت عمدہ چور ہوں۔" "لیکن شواہد اس کی تائید نہیں کرتے۔"

"مجھے ایک موقع تو دو۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارے پاس پیچیدہ ترین تھری زیر و زور پروسیجر رتی سسٹم موجود ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ ایسے طریقے موجود ہیں جن سے میں تم جیسے شخص کی مدد کر سکتا ہوں۔"

ناخن منرو نے کھیل کا آغاز کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کو آگے بڑھا دیا اور بولا۔ "اب تمہاری باری ہے۔"

فریڈرک اپنا پیادہ دو خانے اٹھا کر ناخن منرو کے وزیر کے سامنے لے آیا اور اپنا جملہ عمل کرتے ہوئے بولا۔ "اور تمہارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔"

"میں سن رہا ہوں۔" ناخن منرو نے اپنا گھوڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

فریڈرک نے جواباً اپنا گھوڑا بڑھا دیا۔ ناخن منرو نے اپنے گل کو حرکت دی تو فریڈرک نے تقریباً بے سوچے سمجھے اپنا دوسرا گھوڑا اسی بڑھا دیا۔

"جیسے کہ تمہیں کسی کے بارے میں کوئی معلومات درکار ہوں۔ تمہارا کوئی مد مقابل یا کوئی اور۔" فریڈرک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یا اس ملازم کے بارے میں جو تمہارے خیال میں تم سے کچھ چوری کر رہا ہو۔"

میں اندر داخل ہو کر وہ معلومات لاسکتا ہوں۔ نہایت رازداری کے ساتھ۔۔۔۔۔ لاسکتا ہوں۔ میں اس معاملے میں نہایت عمدہ ہوں۔"

ناخن منرو کی نگاہیں بساط پر جمی ہوئی تھیں۔ "یہ تم کیا

کر رہے ہو؟" اس نے حواریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس بات سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کہیں تم مجھے شوٹ نہ کر دو۔" فریڈرک نے جواب دیا۔ "میں اس پر توجہ دو، فریڈرک۔ اب تمہیں چال چلنی ہے۔ کیا یہ۔۔۔۔۔ یہ ٹریکسٹر کاؤنٹر ایک ہے؟"

"میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں شطرنج کھیتا رہا ہوں۔" "زبردست!" ناخن منرو نے فریڈرک کو جیتنے کا موقع فراہم کرتے ہوئے کہا۔ "آئی سی۔ اب مجھے تم کو قدرے زیادہ سنجیدگی سے لینا ہوگا۔"

فریڈرک اپنے نکتے پر زور دینے کے لیے آگے کی طرف جھک گیا اور بولا۔ "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اگر تم مجھے صحیح طریقے سے استعمال کر دو۔۔۔۔۔"

ناخن منرو نے پیادہ آگے بڑھایا اور بولا۔ "ایسا اور سی کی بات یہ ہے کہ مجھے ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔" "ایسا کیوں نظر نہیں آتا؟"

"کیا یہ ظاہر نہیں ہے کہ ایک بار جب میں تمہیں یہ کمر اچھوڑ کر جانے کی اجازت دے دوں گا تو میرے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم غائب نہیں ہو جاؤ گے؟" ناخن منرو نے پوچھا۔ "مجھے مار ڈالنے سے تمہیں کچھ ہلکا نہ حاصل ہوگا؟"

ناخن منرو کی نگاہیں شطرنج کی بساط پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم ایک عمدہ۔۔۔۔۔"

فریڈرک اس کی بات کا سنتے ہوئے غصے سے بولا۔ "میرا ہاتھ کا جواب دو۔"

تب ناخن منرو نے سرد مہری سے اپنا ریوالور بلند کیا اور بولا۔ "دھیان سے بوائے چک! اپنے جذبات کو قابو میں رکھو ورنہ پھر میں اپنا جملہ کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ سمجھ گئے؟"

فریڈرک اپنی کرسی پر سکون سے بیٹھ گیا۔ "ٹھیک ہے۔" "تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے کام کیے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ اب تک میں خاص طور پر ایک اچھا آدمی رہا ہوں۔ حقیقت میں تو میں بارہا وہ رہا ہوں جسے تم ایک فضول شخص کہہ سکتے ہو۔"

"مجھے یہ سن کر شک پہنچا۔"

ناخن منرو نے بے ساختہ قبضہ لگایا۔ "میں نے جھوٹ بولا ہے، میں نے دھوکے بازی کی ہے، میں نے چوری کی

ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ کچھ کر چکا ہوں جو تم بھی کر سکو گے بائی فریڈرک! اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود میں نے حقیقت میں آج تک کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں صرف یہ تصور کر سکتا ہوں کہ کسی کو قتل کرنے پر کیسا محسوس ہوتا ہے۔“

”کیا تم سنجیدہ ہو؟“

”کیا میں احساسِ جرم سے خود کو تباہ کر لوں؟ نصف شب کو پیسے میں شراب اور فیڈل سے بیدار ہو جایا کروں؟ تمہارا چہرہ مجھے ذہنی آزار پہنچاتا رہے اور میرے تصور سے نکلنے سے انکار کر دے؟“

”اسی پر انحصار کرو۔“ فریڈرک نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

”یا پھر میں یہ سوچ لوں کہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہوا؟ کیا یہ محسوس کن بات نہیں؟ یہ ان فلسفیانہ سوالات میں سے ایک ہے جو آپ ہمیشہ سوچتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع نہیں ملتا۔“

”کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم قتل کے متعلق بات کر رہے ہو؟“ فریڈرک نے دوبارہ دہرایا۔

”نہیں، قتل کی بات تم کر رہے ہو۔“ ناخن منرو نے وضاحت کی۔ ”میں فقط باقاعدہ کی بات کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرنے والے کی نظروں میں امتیاز بے عمل ہے لیکن ان کے لیے جو ہم میں سے زندہ رہ جاتے ہیں، ایک منفرد اور نمایاں فرق ہوگا۔ قتل ہوا تو مجھے ٹیل جانا پڑے گا۔ بائی دی وے اب تمہاری چال ہے۔“

فریڈرک نے بساط پر ایک اچھتی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے رخ کو آگے بڑھا دیا اور بولا۔ ”کیا تمہارے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے؟“

”اخلاقیات کا درس دیتے ہوئے تم خود خاص طور پر تذبذب کا شکار ہو۔ آخر کار یہ ہو جائیگا کہ تم میں زبردستی داخل ہوئے ہو۔“

”چوری کرنے کے لیے..... قتل کے لیے نہیں! کرائسٹ، اپنے پاس سب کچھ موجود ہونے کے باوجود بھی تم اب بھی کسی چیز کی محسوس کر رہے ہو۔“ فریڈرک نے کہا۔

ناخن منرو نے اپنے شانے سیدھے کیے اور بولا۔

”میں اب بھی تمہاری بات سن رہا ہوں۔“ فریڈرک نے کہا۔

”میں اب بھی تمہاری بات سن رہا ہوں۔“ فریڈرک نے کہا۔

میں نے دوستوں اور دشمنوں کی شکست لاشوں کو پھلانگ ہے اور میں کسی حقیر سے کیڑے کو اس بات کی اجازت دینے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا کہ ڈائم اسٹور کا ایک معمولی چور میری دولت کا ایک ڈالر بھی چھ اکر لے جائے۔ کیا یہ بات ہمارے درمیان مکمل طور پر واضح ہو چکی ہے؟“

”کرشل کے مانند!“

”گڈ!“ ناخن منرو نے ایک اچھتی نگاہ شطرنج کی بساط پر ڈالی اور مسکرا دیا۔ ساتھ ہی اپنے رخ کی چال چلتے ہوئے فریڈرک کے ٹیل کو مار دیا۔ ”اوہ..... تم بے پردا ہو رہے ہو۔ کیا اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو؟“

”یہ کیفیت میرے لیے باعثِ حیرت نہیں ہے۔“ فریڈرک نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سو فیڈل کی طور پر تم مجھے اس لیے قتل کرو گے تاکہ یہ جان سکو کسی کو قتل کرنا محسوس ہوتا ہے؟“

”میں اس پر سوچ بچار کر رہا ہوں۔ خیر اس بات کا سامنا کرتے ہیں۔“ ناخن منرو نے کہا۔ ”میں تم سے بہتر موقع مجھے اور کب مل سکتا ہے؟ تم جیسے مشہور شخصیات کو مچھلنے سے چور نے یہ نیچے تصور کر لیا تھا کہ مجھ سے کچھ بچا کر لے جاؤ گے اور تم نے یہ توقع کی ہوئی تھی کہ تمہیں اس کا کوئی نتیجہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟ اور اس کے علاوہ تمہاری اپنی کسی قسم کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی۔ تم کوئی بہت اچھے چور نہیں ہو۔ تمہارا شطرنج کا گیم پر تخیل تو ہے لیکن قابلِ توجہ ہرگز نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم شادی شدہ نہیں ہو۔“

”نہیں۔“

”تو تمہیں جانا ہی ہوگا لیکن پہلے اس کے دوسرے رخ پر غور کر لیتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں ایک عمدہ جواز مل سکتا ہے کہ میں تمہیں زندہ کیوں رہنے دوں؟“ ناخن منرو نے کہا۔

فریڈرک نے اس سوال پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ پھر بولا۔ ”میرے خیال میں..... میں کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا۔“

”سو تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کس مقام پر آن کھڑے ہوئے ہیں۔“

”ضمیر و! تم نے ابھی کیا کہا تھا..... یہ کہ میں ایک اچھا چور نہیں ہوں۔ شاید اسی سے بات بن جائے۔“

”کیا بات بن جائے؟“

”شاید اسی طرح میں تمہارے لیے دولت حاصل کر سکوں، میرا مطلب ہے حقیقی دولت! میں ایسا پہلے بھی

کر چکا ہوں۔" فریڈرک نے بتایا۔

بورسکوں؟" ناخن منرو نے کہا۔

ناخن منرو نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے ہم اس بارے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔" "میری بات تو سن لو۔ اگر تمہیں وہ بات پسند نہ آئے جو میں کہنا چاہ رہا ہوں تو پھر تم ریوالور کا ٹریڈر ہو سکتے ہو۔" یہ کہہ کر فریڈرک نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ "اس گھر میں تمہاری سب سے قیمتی شے کیا ہے؟"

"یقیناً مصری گلاب!"

فریڈرک کی چوریوں پر ہل آگئے۔ "ایک پھول؟"

"ایڈیٹ وہ ایک ہیرو ہے۔" ناخن منرو نے جواب دیا۔ "مغربی لعنف کرہ میں سب سے مہنگا ڈامنڈ۔ تم مجھے بتانا چاہ رہے ہو کہ تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟ جبکہ میرا یقین یہ ہے کہ تم اسی کو چرانے کے لیے یہاں آئے ہو؟"

"ہوں۔"

"تم آخر کس قسم کے چور ہو؟ مصری گلاب نامی اس ہیرے کی مالیت برسوں پہلے میں بھی ایک کروڑ ڈالرز سے کم نہیں ہے۔"

"زبردست۔ کیا ہیرا ایسے شہر ہے؟"

"یقیناً۔"

فریڈرک کا چہرہ کھل اٹھا۔ "تب یہی حیران کن ہے۔" ناخن منرو نے ابھی نگاہوں سے فریڈرک کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے خدشہ ہے کہ میں کوئی چیز کس کر رہا ہوں۔"

"اوکے، میری پیشکش یہ ہے۔ تم ہمیشہ کی طرح آج رات تک اپنے بیڈروم میں تھے جب تم نے کوئی آواز سنی۔ تم دوڑتے ہوئے آئے لیکن تمہیں دیر ہو چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی، طرف اتری پھیلی ہوئی تھی اور کوئی تمہارا مصری ٹیولپ لے لیا ہوا ہو چکا تھا۔"

"مصری ٹیولپ نہیں مصری گلاب!" ناخن منرو نے صہج کی۔

"جو بھی نام ہو۔ بحث یہ ہے کہ وہ گلاب ہو چکا ہے۔ تم پولیس کو فون کرتے ہو۔ وہ تلاشی لیتے ہیں، لیون کاٹھا کرتے ہیں لیکن قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ وہ ہیرا ریکارڈ میں چوری کردہ درج ہو جاتا ہے۔ پھر میرے مہنی آتی ہے۔ وہ تحقیقات کر رہے ہیں، کوئی لپٹی ہے۔ میری انگلیوں کے نشانات پائی ہے اور ہمارے تمہیں رقم ادا کر دیتی ہے۔ اب تم ایک کروڑ ڈالرز مزید حاصل کر لیتے ہو۔ اب یہ ایک عمدہ نتائج ہے۔"

"کیا تم یہ تجویز کر رہے ہو کہ میں تمہیں مصری گلاب چوری کرنے کی اجازت دے دوں تاکہ اپنے لیے بیس کی رقم

فریڈرک نے لمبی میں سر ہلا دیا۔ "یقیناً میں اسے چوری نہیں کروں گا۔ میں اسے اپنے ہاتھوں میں لوں گا، اس پاس کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دوں گا، اپنی انگلیوں کے نشانات ہر جگہ چھوڑ دوں گا اور پھر اس ہیرے کو تمہیں لوٹا دوں گا۔ اس کے عوض تم مجھے فرار ہونے کی اجازت دے دینا۔"

ناخن منرو خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ "پولیس کے پاس فائلوں میں میری انگلیوں کے نشانات کا ریکارڈ موجود ہے۔ انہیں پہلے ہی علم ہے کہ میں ایک چور ہوں۔ کسی کو بھی یہ شبہ تک نہیں ہوگا کہ ہمارے درمیان کوئی باہمی رابطہ رہا ہے یا ہم کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ سو اس طرح تم ہیرا اپنے پاس رکھنا اور کچھ عرصے کے لیے اسے کسی خفیہ جگہ چھپا کر رکھ دینا، میرے کی رقم وصول کر لینا، اس میں بھی مرنے سے بچ جاؤں گا۔ اس طرح ہم دونوں کی جیت ہو جائے گی۔" فریڈرک نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

ناخن منرو نے کوچہ بنانے کی خاطر اپنی نظریں شطرنج کی بساط پر جمادیں اور بولا۔ "اب کس کی چال ہے؟"

"تمام محاذوں پر اب سب لڑ رہی ہے۔" ناخن منرو بولا۔ "مجھے غور ہے کہ وہ کہ کیا میں تمہاری بات صحیح طور پر سمجھ لی ہے۔ تم خود اپنی سرے گھر میں داخل ہوتے ہو۔ جیسا کہ تم داخل ہوئے۔ تم اسٹڈی میں آ جاتے ہو۔ جیسا کہ تم آئے۔ تم میرے دروازے پر چڑھ جاتی ہو۔ پھر وہ تم مجھے واپس لوٹا دیتے ہو اور پھر وہ اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ جاتے ہوتا کہ پولیس کو وہ نشانات مل جائیں۔ پھر پولیس کو تمہیں گرفتار کرنے اور جیل میں ڈالنے سے روکنا ہے جو کہ تم کسی طور پر نہیں چاہتے ہو؟ کیا میں نے صحیح سمجھا ہے؟"

فریڈرک نے سانس دے دیا۔ "اس کے لیے انہیں پہلے مجھے پکڑنا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ ایک آئیڈیل منصوبہ ہے لیکن مجھے اپنی بقیہ تمام زندگی بھگتے رہنا ہوگا لیکن یہ مرنے سے بہتر ہوگا۔"

"میں تمہاری بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا ہوں۔" ناخن منرو نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے یہ کیسے پتا چلا گا کہ کسی بد قسمتی کے باعث اگر تمہیں دھریا جاتا ہے تو تم سب کچھ اگل نہیں دو گے؟"

"ایک جانب ہمارے پاس ایک انتہائی امیر، دولت مند، کیونٹی میں ایک اچھی ساکھ کے حامل، قانون کی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

- 1- گناہ سے پرہیز کرنا، ثواب حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔
 - 2- جہالت عیب ہے۔ علم کے باوجود عمل نہ ہونا سب سے بڑا عیب ہے۔
 - 3- انسان کی تکمیل علم اور عمل دونوں سے ہوتی ہے۔
 - 4- مسلمان برکت کا خواہش مند اور کافر کثرت کا حریص ہوتا ہے۔
 - 5- جب زبان کی اصلاح ہو جاتی ہے تو دل بھی صالح ہو جاتا ہے۔
 - 6- دل کو روشن کرنا ہو تو غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔
 - 7- خدمت اور ادب کا تاج سر پر رکھو۔
 - 8- خوفِ خدا ہی سے نکلنے والا ایک آنسو قسمت بدل دیتا ہے۔
 - 9- غریبوں کے لیے نکلنے والا دروازہ۔
 - 10- مذاہب مختلف اور اجماعِ عالم انسان کے وقار کو بڑھاتا ہے۔
- مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد
- ***
- علم، دولت اور بھروسہ تینوں دوست تھے، ایک ایسا وقت آیا کہ تینوں کو جدا ہونا پڑا، تینوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ وہ کہاں جاکیں گے؟ علم بولا۔ میں مدرسہ، مساجد اور اسکول جاؤں گا۔
- دولت نے کہا۔ میں محل اور امیروں کے پاس جاؤں گی۔
- لیکن بھروسہ سا خاموش رہا۔
- دونوں نے وجہ پوچھی۔
- تو بھروسہ نے غصہ ڈی آہ بھر کے کہا۔ میں ایک بار چلا گیا تو پھر بھی واپس نہیں آؤں گا۔
- مرسلہ۔ رضوان تنولی گریڈوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

پاسداری کرنے والے سوسائٹی کے اہم ستون کا زبانی حلف ہے تو دوسری جانب ایک سابقہ مجرم کا عہد ہے جو چوری کرتے ہوئے رنکے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔

یہ سن کر ناگھن مزد مسکرا دیا۔ ”کیا تم ایک بات جانتے ہو، فریڈرک؟ مجھے تقریباً یقین ہے کہ یہ پلان کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ البتہ قدرے ترمیم کے ساتھ۔ یہ ایک ایسا پلان ہے جس کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ یہ لگ بھگ میرے شایان شان ہے۔“

”اور قابلِ تعریف بھی۔ اوکے، تو پھر اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کام کو جلد از جلد نمٹا دیتے ہیں۔ اس سے قبل کہ پولیس یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو کہ یہ اگلیوں کے نشانات کس کے ہیں، مجھے کینیڈا کے لیے اپنی فلائٹ بک کرانا ہوگی۔“

یہ کہہ کر فریڈرک نے اپنے دستانے اتار دیے اور پھر تسلسل کے ساتھ کمرے میں موجود ہر شے پر اپنی انگلیوں کے نشانات ثبت کئے، صبح کر دیے۔ اس نے لیمپس، میزوں کو چھوا، درازیں کھینچیں، کتابیں الٹ پلٹ کیں۔

”میں ان کے لیے آسانیاں فراہم کر رہا ہوں۔“

”یہ یقین رہے کہ تمہاری انگلیوں کے نشانات سیف پر بھی اچھی طرح سے ثبت ہو جائیں۔“

”وہ سیف کہاں پر ہے؟“

ناگھن مزد نے میز کے نیچے کسی بن کو دبایا تو سہلے سے دیوار کا ایک حصہ اوپر اٹھ گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے پہنچا اور ایک تصویر کے فریم کے پیچھے لگے ہوئے ایک اور بن کو دبایا۔ دیوار کی دو سطحیں کل میس اور سیف نمودار ہو گئیں۔

”بہت خوب!“ فریڈرک نے ستائشی لہجے میں کہا۔

”تم نے بالکل صحیح کیا۔“ ناگھن مزد نے تائیدی۔ ”تم یہاں ایک عمدہ ترین اسٹیٹ آف دی آرٹ ایکو پمنٹ کو دیکھ رہے ہو، میرے دوست۔ میں نہیں یہاں ایک مہینے کے لیے تباہ چھوڑ دوں تب بھی تم اسے کھول نہیں سکتے۔“

”اس بات کو رہنے دو۔ مجھے اس کا بیٹھن پتاؤ۔“

فریڈرک نے کہا۔

”یہ دس اعداد پر مشتمل کوڈ ہے جس پر تم نے دس گنا یا اس سے بھی کم وقت میں لازمی عمل درآمد کرنا ہے ورنہ پولیس کے پاس الارم بجنا شروع ہو جائے گا۔ اس کوڈ کے نمبروں کو ترتیب کے مطابق ملانا ہے۔ واپس پیچھے کی طرف نہیں جاسکتے ورنہ پولیس کے پاس الارم بجنا شروع ہو جائے

گا۔ ہر نمبر کو چنگی سے ملانا ہوگا ورنہ.....

”میں سمجھ گیا۔ وہ کوڈ کیا ہے؟“

”مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجھے اس کوڈ نمبر پر فخر ہے۔ یہ ایسا نمبر ہے جسے یاد رکھنے کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اس کے باوجود شاید کوئی اس کے مخزن کا کھوج نہیں لگا سکتا۔“

”تمہاری باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے تم کسی عجیب گھر یا خزانے کے ذمے دار عہدے دار ہو۔“ فریڈرک نے تبصرہ کیا۔ ”اور یقیناً میرے اس کام کے بعد تم اس کوڈ کو تبدیل کرنا چاہو گے۔“

”ہاں۔“ تاہن منرو نے افسردگی سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ میری تمام محنت اکارت ہو جائے گی۔“
”یہ دس ملین ڈالر ز ہیں جو تمہیں اضافی ہاتھ آئیں گے۔“ فریڈرک نے یاد دلایا۔ ”اب بتاؤ، وہ کوڈ کیا ہے؟“
”نورٹائن فائو زیر وقایہ ون فائو نو فائو تھری۔“ تاہن منرو نے بتایا۔

فریڈرک نے ایک لمحے کے لیے اس پر غور کیا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیوار کی سیٹھ کی جانب بڑھ گیا۔ ”میں سمجھ گیا۔“ اس نے کہا۔

”یہ ایک دلہن کی بات ہے کہ میں سمجھتا ہوں اس کوڈ نمبر تک کیوں کر پہنچا۔ میں تمہیں اس بارے میں بتا سکتا ہوں کیونکہ مجھے بہر حال اسے تبدیل تو کرنا ہی ہے لیکن.....“

”تو وہ سال ہیں جب نیو یارک یا کینز نے لگا تار پانچ برس تک ورلڈ سیریز میں بال چیمپئن شپ جیتی تھی۔ انیس سو اچھل سے انیس سو تریچن تک یعنی 4950515253 تک۔“

تاہن منرو یہ سن کر قہر سے افسردہ سا ہو گیا۔ ”ہاں۔ تم نے درست شائع کیا ہے۔“

”میں اس بارے میں تمہیں ایک پ دے رہا ہوں۔ عورتیں اپنے لیے جو کوڈ منتخب کرتی ہیں وہ لگ بھگ ہمیشہ ان کے بچوں کی پیدائش کی تاریخیں ہوتی ہیں۔ مردوں کے لیے انتخاب ان کی پسندیدہ اسپورٹس میں ہوتی ہیں۔“ فریڈرک نے بتایا۔ ”تمہارے معاملے میں بال

دے میں موجود نیو یارک یا کینز میں بال ٹیم کے کھلاڑی ڈیرک جیفر کا وہ قد آدم مجسمہ ہے جس نے تمہارے کوڈ کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ اور جو کہ قدرے سنسنی خیز بھی ہے۔“

”تھیک یو۔“ تاہن منرو نے قدرے ترشی سے کہا۔
”میں تمہاری اس شپ کو یاد رکھوں گا۔“

فریڈرک دیوار کی سائڈ میں پہنے ہوئے کی بورڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر تیزی سے اور اعتماد کے ساتھ کی بورڈ کے نمبروں کو پیچ کرنے لگا۔

اچانک کلک کی ایک آواز ابھری اور سیف کھل گیا۔ فریڈرک نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سیف میں داخل کر دیا پھر جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک بڑا سا بیرو پا ہوا تھا۔

”کیسی ہے؟“

”ہاں۔“ تاہن منرو نے سر ہلادیا۔ ”ٹائٹس جاب!“ فریڈرک روشنی میں ہیرے کو جانچنے لگا۔ ”یہ واقعی نہایت خوب صورت ہے۔ آل رائٹ، مجھے نہیں معلوم کہ اس کے دس ملین ڈالر دے سکتا ہوں لیکن کچھ بھی سہی، اس کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔“ اس نے وہ ہیرا اٹھالیا۔

تاہن منرو نے وہ ہیرا اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”اگر کبھی غیر متوقع طور پر عارضی ملاقات دوبارہ ہوجاتی ہے تو تم مجھے یاد دلانا کہ تمہیں وہ داستان بتاؤں کہ یہ ہیرا میں نے کس طرح خریدا تھا۔ ایک چور سے دوسرے چور تک اس ہیرے کے پہنچنے کی داستان!“

یہ کہہ کر تاہن منرو کمرے کے ایک کونے میں گیا اور ایک شیلف پر سے ایک بڑا سا بیگ اٹھا کر فریڈرک کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو!“

فریڈرک نے اچھی نگاہوں سے تاہن منرو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ کس لیے ہے؟“

”تم نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ سیف میں اس ہیرے کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔“ تاہن منرو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تقریباً تیس لاکھ ڈالر نقد رکھے ہوئے ہیں جن کے بارے میں انٹیکس والوں کو علم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کاغذات ہیں جنہیں میں ٹوہ لینے والوں کی نظروں سے چھپائے رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان سب چیزوں کو اس بیگ میں ڈال دو۔ میں انہیں عارضی طور پر کسی اور جگہ محفوظ کر دوں گا۔ جب انشورنس کمپنی اپنی تفتیش مکمل کر لے گی تو میں انہیں ان کی جگہ واپس رکھ دوں گا۔“

فریڈرک نے سراپتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تم ہر ایک بات پر باریک بینی سے دھیان دیتے ہو۔ ہے نا؟“

یہ کہہ کر فریڈرک سیف کی جانب پلٹ گیا اور اس میں موجود تمام اشیاء کو بیگ میں منتقل کرنے لگا۔

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ تاہن منرو نے آہستگی

450/- انسان اور دیوتا

بہنیں سارن کے چھوڑ کر بسکھیں پانی پاکستان
جس نے انھوں کو رام مل اختیار کر لے کر گھر کیا

300/- پاکستان سے دیوار حرم تک

جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا

450/- آخری چٹان

جہاں سے مسلمانوں نے آخری چٹان پر چڑھ کر
جہاں سے مسلمانوں نے آخری چٹان پر چڑھ کر

225/- سو سال بعد

کونہ کی جی کی مہارتات چھوڑ کر مسلمانوں کے
خوف سراسر کی مہارتات چھوڑ کر مسلمانوں کے

325/- سفید جزیرہ

برائے کال کے کسی نامعلوم جزیرہ کی داستان

475/- شاہین

انڈیا میں مسلمانوں کے عجیب و غریب کی کہانی

475/- معجزہ علی

نور علی کی کہانی جس نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا
انڈیا میں مسلمانوں کے عجیب و غریب کی کہانی

550/- خاک اور خون

سنگی، تاریخی داستان، قیامت خیز مناظر،
حکیم برصغیر کے پس منظر میں داستان فرنگوں

450/- کلیسا اور آگ

فرانسیسی مہاجرین مسلمانوں کی خلاف ورزی
فرانسیسی مہاجرین مسلمانوں کی خلاف ورزی

599/- کافلہ حجاز

ہمارے ملک کے مسلمانوں کی ایک بڑی مثال داستان

425/- محمد بن قاسم

عالم اسلام کے آٹھویں صدی کے حکمران کی داستان
عالم اسلام کے آٹھویں صدی کے حکمران کی داستان

300/- پورس کے باغی

1965ء کی جنگ سے پہلے مسلمانوں کی داستان
1965ء کی جنگ سے پہلے مسلمانوں کی داستان

550/- اور تو اور ٹوٹ گئی

جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا
جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا

500/- گمشدہ قافلے

انڈیا کی اسلام آباد، جہاں کی مہاجرین و مسلمانوں
انڈیا کی اسلام آباد، جہاں کی مہاجرین و مسلمانوں

300/- داستان مجاہد

جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا
جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا

450/- پردیسی درخت

اسلام میں پہلی مہاجرین مسلمانوں کے کہانی کہانی
اسلام میں پہلی مہاجرین مسلمانوں کے کہانی کہانی

500/- یوسف بن تاشفین

انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی
انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی

550/- آخری معرکہ

جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا
جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا

اندھیری رات کے مسافر

انڈیا میں مسلمانوں کی آخری چٹان پر چڑھ کر
انڈیا میں مسلمانوں کی آخری چٹان پر چڑھ کر

475/- ثقافت کی تلاش

جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا
جہاں سے مسلمانوں نے جہاں تک پہنچ کر پہنچا

300/- قیصر و کسریٰ

انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی
انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی

625/-

انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی
انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی

475/-

انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی
انڈیا میں مسلمانوں کی کہانی کہانی کہانی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ
دورنگی طباعت اور تصویریں خاکوں سے مزین

165/- اقوال حضرت علی المرتضیٰ

165/- اقوال آنحضرت کرام

195/- حکایات گلستان سعدی

140/- اقوال شیخ سعدی

180/- حکایات رومی

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایات بوعلی سینا سعدی

150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں

160/- ایمان افروز و سبق آموز

165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات



اردولفت

(جامع متون)

مفتاح سعادت کے لئے مفتاح کے لئے مفتاح کے لئے مفتاح کے لئے

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو

ناقص منرو نے سن کر چونک پڑا اور سردگاہوں سے فریڈرک کو گھورنے لگا۔

”شہ“ فریڈرک نے اسے ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔
”تم نے کیا کہا..... سیکو رٹی سسٹم؟“

فریڈرک نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”ہاں۔ خاص طور پر اس نے اپنا وہ بھاری بھرکم ناکام سسٹم ڈیزائن اور مارکیٹ کیا جسے پینتھیون تھری زیرو زیرو کیرو کے نام سے جانا جاتا ہے۔“

ناقص منرو نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔
”کیا یہ بات درست ہے؟“

”حقیقت یہ ہے منرو اور یہ میں تمہارے اچھے فائدے کے لیے بتا رہا ہوں کہ اس سسٹم میں خفیہ ہے۔ دیکھنے میں عمدہ لگتا ہے اور ایک عام سے چور کو تم سے پرے رکھ سکتا ہے لیکن ایک حقیقی پیشہ ور کے ہاتھوں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔“

تب ناقص منرو نے نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور ریو اور کارخ فریڈرک کی جانب کر دیا۔ ”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس ٹکنالوجی کا رخ کس جانب ہو رہا ہے۔“

”تم دو منٹ سے بھی کم وقت میں بہت کچھ جان جاؤ گے۔ بات یہ ہے کہ ایک حقیقی پیشہ ور نہ صرف یہ یہ خوبی جانتا ہے کہ پینتھیون تھری زیرو زیرو کیرو کس طرح مات دی جاسکتی ہے بلکہ ناقابل یقین حد تک یہ سسٹم مالک مکان کے خلاف حقیقت میں کام کر سکتا ہے۔ چند وارنٹس کے بعد کچھ فائدے کو گنڈا کر دیں تو یہ وہ ویڈیو رسائی فراہم کر سکتا ہے جو کچھ فائدے پر موجود بین میں باسانی ٹیپ ہو سکتی ہے۔“

”ویڈیو رسی؟“
”مگر میں موجودہ ادنیٰ نقل و حرکت، وہ کہاں موجود ہیں، کیا کر رہے ہیں، اسے تمہارا کہاں رکھتے ہیں، اس قسم کی باتیں۔“

تب ناقص منرو نے اپنے روبرو کا ٹرنگر دبا دیا۔
”لیکن کوئی فائر نہیں ہوا۔ وہ ٹرنگر دبا جاتا گیا۔“
”سو مفروضہ یہ کہ تم گھنٹوں قبل زبردستی مصر میں داخل ہوتے ہو..... اس وقت جب مالک مکان ڈرنے کے لیے ابھر گیا ہوا ہو..... اور ریو اور میں سے تمام گولیاں نکال گئی ہوں۔“
”تم یہ بات سمجھنے پر مائل ہوتا؟“ فریڈرک نے پرسکون لہجے میں کہا۔

ناقص منرو نے دروازے کی جانب بڑھنا چاہا لیکن فریڈرک نے پھرتی سے اپنا چھوٹا سا ریو اور نکال لیا جو اس

نے اپنی پنڈلی سے باندھا ہوا تھا۔ اس نے ناقص منرو کی پیشانی کا نشانہ باندھ لیا۔ ”اتنی تیزی سے مت دکھاؤ، بوائے چک۔ ابھی ہم نے پورا سبق مکمل نہیں کیا۔“
”میں نے یہ ظاہر تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگا لیا تھا۔“ ناقص منرو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”یہ تمہاری سوچ ہے۔“
”تمہیں کیسے معلوم تھا کہ میں پولیس کو فون نہیں کروں گا؟“ ناقص منرو نے سوال کیا۔

”مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک چانس لیا تھا کہ اپنی دولت پر اترانے والا یہ شخص اس صورت حال کو اپنے طور پر ہینڈل کرنا چاہے گا۔ مجھے اس بات کا کسی طور شبہ نہیں تھا کہ تم مجھے حقیقت میں ہلاک کرنے والے ہو، یہ میرے لیے ایک سربراہ تھا کہ تم مجھے اذیت پہنچا کر تنگی حاصل کر رہے ہو، حرام زادے!“ فریڈرک نے کہا۔

پھر اس نے بیک کی تمام اشیاء ایک جم بیک میں منتقل کر دیں جو اس کے کاؤچ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ ”لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ وہ شخص یہ خوبی جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ شخص جس نے تمہارا سیف ڈیزائن کیا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ آپ کتنے ہی اپنے کام میں ہنرمند رہے ہوں لیکن آپ اس سیف کو کھول نہیں سکتے تھے، ہزار برسوں میں بھی نہیں۔ اس میں موجود کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ اس کا امق مالک عملی طور پر پاس ورڈ آپ کے سرور کو دے اور اس میں خلاف توقع کیا رہا؟“

”سو تم حقیقت میں اسی کے لیے آئے تھے۔ مصری گھاسیہ کے لیے!“ ناقص منرو نے کہا۔

فریڈرک نے شانے اچکا دیے۔ ”میں... لیکن تیس لاکھ ڈالر ایک مہم کنندہ پر اتار رہے۔ اب ڈائمنڈ میرے حوالے کر دو، پلیز!“

ناقص منرو نے ایک مٹکی سانس لی اور اپنی جیب سے ڈائمنڈ نکال کر فریڈرک کے حوالے کر دیا۔

فریڈرک باہر جانے کے لیے آگے بڑھا لیکن پھر پلٹ پڑا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے شطرنج کی بساط کے پاس پہنچ کر اپنا وزیر دوسرے خانے میں کھسکاتے ہوئے ناقص منرو کے بادشاہ کو گھیر لیا اور تحارت سے بولا۔ ”شہ مات، کتیا کے بیچ!“

اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

رات کا مسافر

طاہر حبابہ رحیل

یہ پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہد حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی نذر داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جا رہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... یہ وفائی کی صورت میں ویرانہ ملک کی منتظر تھی لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تھپی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی دھجک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھر اگے خوابوں نے بھی آنکھوں پر عجب سفر باندھ لیا... یہ سمت بھٹکتے ہوئے اس علمی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملتا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو اس سب کے مابین اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نہ توں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے۔ یہ پر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

مشہور نظریاتوں میں، بچے کے لیے ایک اندھے راستے کا

عہدہ اجرا

وہ اپریل کی ایک نیم گرم شام کی عجایب میری مہندی کی رسم ادا ہوتا تھی۔ زور و شور سے تیار ہائی ہو دی تھیں۔ میری شادی میری تایا زاد عارفہ سے ہو رہی تھی۔ وہ لوگ بھی لاہور کے رہائشی تھے اور وہ گلبرگ میں رہتے تھے۔ چوتھی میں تھے۔ ہمارا رشتہ قریباً نوڑھ سال پہلے کے تھا۔ ہم نے چھ دن کن کن کر ہی گزارا کیا تھا اور اب... آخر کار وہ عرس خاں آگئی تھیں جن کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا اور خاص طور سے مجھے اور عارفہ کو۔

میں سارا دن صبح کاموں میں مصروف رہا تھا اور اب قریباً تھک کر چور ہو چکا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بستر پر پڑ کر سو جاتا اور اگلے روز نئی دس بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتا لیکن آج ایسا کیسے ہو سکا تھا جبکہ یہ میری مہندی کی رات تھی۔

دونوں گھروں میں علیحدہ علیحدہ مہندی ہونا تھی۔ یہ



انسان کے دشمن

انسان کے چار دشمن بڑے خطرناک ہیں، ان سے بچنے کے لیے نہایت ہوشیاری اور کوشش درکار ہے۔

1۔ دنیا..... نہایت دھوکے باز اور مکار ہے۔

2۔ نفس..... یہ تمام دشمنوں سے زیادہ مکار ہے۔

3۔ شیطان..... اس کا تو مشن ہی انسان دشمنی ہے۔

4۔ برا انسان..... برا ساتھی، شیطان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تو لا حول و لا سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ تو ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید عباسی، نیو سینٹرل جیل ملتان

میں نے خود کو ملامت کی اور اپنے بے مطلب خیالات کو ذہن سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، باور کی خیالات..... اور توہمات کے لیے میرے ذہن میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی۔ میں نے ہر چیز کو ہمیشہ محسوس ہونے والی اور سائنسی نقطہ نظر کے ساتھ دیکھا ہے۔ شاید یہی وجہ کی کہ اس رات بھی اس واقعے نے مجھ پر تا دیر اثر نہیں کیا۔ میں نے اپنی اس پریشان خیالی کو جلد ہی فراموش کر دیا اور شادی کے بیگانوں میں گھوم گیا۔

کھانے کے بعد پورے جوش و خروش سے مختلف ریسٹورانوں میں گھومنا اور میری برات، گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں، دلہن کو گھبراہٹ سے لے کر چوبی پارک ہماری رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اپریل کی وہ شب بڑی خوبصورت تھی۔ موسم قدرے ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوئی تھی۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں بہانے سے بار بار اپنے کمرے کی طرف جاتا تھا۔ میری بہنیں اور کزنز وغیرہ مجھ پر فخر سے کستی تھیں اور مجھے وہاں سے چلتا کرتی تھیں۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنا مشکل ہو رہی تھیں۔ کتنا اہم ہوتا ہے یہ شادی کا دن۔ زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سے بھی اہم شب عروسی۔ خوشیوں اور مرادوں کی گھڑیاں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جوڑوں کی صورت میں بنایا پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کی پھر انہیں قربت کی سرتوں اور جدائی کی

کبھی کسی منظر کا۔ کبھی کوئی اندیشہ بن جاتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور کبھی کوئی خوب صورت سہنا بن کر آنکھوں میں سما جاتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی ہی قلبی واردات تھی۔

میرے گھر والوں کی واپسی ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ایک بار پھر کمر میں شور اور ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ڈھولک بجنے لگی اور گیت گائے جانے لگے۔ اب ہر ایک کو آنے والے دن کا انتظار تھا۔ تاریخ تھی 17 اپریل اور یہ دن تھا میری شادی کا۔ ہاں، وہی دن جس کا ہل ہل انتظار کیا گیا تھا۔

ان دنوں براتیں شام کے فوراً بعد ہی دلہن کے گھر جا پہنچتی تھیں۔ میری برات بھی آٹھ بجے کے قریب گھبراہٹ میں موجود تھی۔ وہ رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کی رات تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے۔ نکاح کی رسم کے فوراً بعد کھانا شروع ہو گیا۔ میں آج پر بیٹھا تھا۔ رواج کے مطابق میرا کھانا آج پر ہی سیر پر سجا دیا گیا۔ میرے دائیں بائیں میرے گھر والے موجود تھے۔ بڑے بھائی فاروق نے میرے لیے کھانا پلیٹ میں نکالا جس میں پہلا فقرہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ میری نظر سامنے مہمانوں کی طرف اٹھی۔ بہت سے افراد کے چہرے پر ایک شخص نظر آیا اور مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہے۔ یہ وہی کل رات والا ہوا تھا۔ سر سے ہر تک سفید کپڑوں میں ملبوس۔ جبکہ میری طرح نظر نہیں آتا تھا۔ بس سفید اور سیاہ ڈاڑھی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ جیسے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک نکلے کے لیے نظر آکر وہ اوجھل ہو گیا۔ میں ہکا بکا سا بیٹھا تھا۔ اس نے بھائی جان نے کہا۔ ”کیا بات ہے ہارون! کیا ہوا؟“

”لگ..... لگ..... کچھ نہیں بھائی جان۔“

”کسی سے کچھ کہتا ہے؟ انہوں نے پوچھا۔“

”نہیں..... نہیں۔“

”تو کھانا کھاؤ نا بھی۔“ دو چمک میرے ہاتھ میں تھا کر بولے۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں اب کھانا کھاتے ہوئے مہمانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دل پرچ کر کے میں نے کھانا کھانے کی کوشش کی۔ پتا نہیں کیوں کل رات سنا ہوا فقرہ..... بے معنی فقرہ پھر میرے کانوں میں گونجنے لگا..... کم از کم ایک نبھو کے کو تو کھانا کھانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ یہ کیا فقرہ تھا؟ یہ کیا لفظ تھے؟

تکلیفوں سے آشنا کیا..... ایک ایسا نظام بنایا جو اس کائنات میں زندگی کو رواں دواں رکھتا ہے۔

میں گھر کے سامنے گرا سی لان پر اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ مجھے چھیڑنے اور تنگ کرنے میں میرا قریبی دوست خیر بخش پیش تھا۔ دل کے اندر خوشی ہو تو ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر بھی قہقہے لگاتے تھے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میری زندگی ایک سختے سنگین رخ پر مڑنے والی ہے۔ میں ایک ایسے دوراں پر پہنچ چکا ہوں جس کی ایک جانب میری دکن ہے، میرا گھر ہے اور بے مثال خوشیاں ہیں۔ دوسری طرف تاریکی ہے، ویرانی ہے اور لرزادینے والے واقعات ہیں۔

بعض اوقات انسانی زندگی کا رخ موڑنے کے لیے کسی بڑے واقعے یا حادثے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی چھوٹی سی بات، کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی تھمکے خیز تبدیلیاں لے آتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ آج ان باتوں کو کم و بیش 41 سال گزر چکے ہیں۔ میں ایک بھر پور زندگی گزارنے کے بعد ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میرے بچے ہیں، ان کے بچے ہیں۔ زندگی کا باقی سفر شاید اب بہت طویل نہیں رہا لیکن میں آج بھی اس رات کو اور اسی صبح میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ کیا وہ اتنی ہی بڑی بات تھی جس کی وجہ سے میرے حال و سب کچھ ہوا جس نے مجھے ہی نہیں، میرے اہل خانہ اور میرے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، بس جس کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے لگاتے مجھے پیاس محسوس ہوئی تھی۔ میں پانی پینے کے لیے اندر آیا۔ لان میں بھی ایک شامیانہ لگا تھا۔ قات کے قریب سے گزرتے ہوئے میں ذرا ٹھٹک گیا۔ قات کی دوسری طرف ہمارے محلے کی دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں ہر گز اندازہ نہیں تھا کہ کوئی ان کے اتنا پاس ہے اور ان کی آواز صاف سن رہا ہے۔ ایک عورت نے کہا۔ ”ہاں..... ہارون ابھی کرتا ورتا تو کچھ نہیں۔ اب ہی پیسے اس کی جیب میں ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے بوجھ اٹھائے گا بیوی کا اور پھر بچوں کا۔“

دوسری عورت نے کچھ اس سے بھی زیادہ سخت بات کی۔ مطلب اس بات کا بھی وہی تھا جو پہلی عورت کی بات کا تھا۔ پہلی عورت نے دوبارہ کہا۔ ”بس بڑوں نے ہی پکڑ دھکڑ کر شادی کر دی ہے۔ اب وہی اس کا گھر بھی چلا گئے۔“

میں اپنی جگہ بت بٹا کھڑا رہ گیا۔ کان سامنے سامنے کرنے لگے۔ عورتیں سرگوشی کے لہجے میں زہرا گل رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں زمین کے اندر گڑ گیا ہوں۔ میں اتنا گیا گزرا تو نہیں تھا جتنا وہ مجھے سمجھ رہی تھیں اور پھر ان کی زبان اور لہجہ..... میرا دل چاہا کہ ان کے سامنے چلا جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں اور یہ سب کچھ کہنے کا کیا جواز ہے ان کے پاس۔ میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ بندے کو پتا چلتا ہے کہ اس کی پیٹھ پیچھے کس طرح کی بات کی گئی ہے اور وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔

میں اپنی پیاس وغیرہ بھول گیا اور سبز حیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ چھت خالی تھی، میں جیسے نڈھال سا ایک بوڑھے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چھت پر پہنچنے کے بعد جن کے ذریعے آرائشی روشنیاں جگمگ رہی تھیں۔ روشنیوں کی جگمگت چھت پر بھی محسوس کی جاسکتی تھی لیکن میرے اندر کا منظر کچھ اور ہو گیا تھا۔ میرے اندر کی ساری روشنیاں جیسے ایک دم بجھ گئی تھیں۔ گھٹا ٹوپ تار کی چھانگنی تھی۔ مجھے لگا کہ میں کھانسی ہوں، ایک مہرہ اٹھنے لگا ہوں جس کے گفن دفن کا انتظام کیا جائے والا ہے۔ ایک کھنڈر ہوں جو تیز بارش میں کسی بھی وقت منسوخ ہو جائے گا یا ایک کھوکھلی جڑوں والا درخت جسے ہوا کا ایک تیر ہوا کا اٹھائے پھینکے گا۔

یہ کیا ہو گیا تھا میرے ساتھ؟ آنا فلاں میں کیا بن گیا تھا۔ ارد گرد کی خوشیوں، رونقوں اور روشنیوں سے بہت دور چلا گیا تھا میں۔ منظر ابھی محسوس ہو رہے تھے اور ادا کیے بغیر ایک رہی تھی..... ہاں، میں آج بھی سوچتا ہوں کہ اس صبح کی بات تھی کہ میں نے دو عورتوں کو اپنے بارے میں سچا کچھ کرتے سنا تھا یا پھر کوئی اور وجہ بھی تھی..... کوئی ایسی وجہ جو زیادہ بڑی تھی، زیادہ گہری اور کبھی بھی؟

میں قارئین کے لیے کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا، حالانکہ حد سے الفاظ میں بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ کچھ کچھ مجھ سے اتفاق نہ کیا جائے۔ میرے عمل کو غیر حقیقی یا جذباتی سمجھا جائے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ شاید اصل رواد سے فلاں واقعے کا زیادہ تعلق نہیں..... لیکن میں وہی بتاؤں گا جو جو میرے ساتھ ہوا اور جو اس کہانی کا حصہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں قریباً آدھ گھنٹہ اس تاریک چھت پر بیٹھا رہا اور اپنے اندر کی کچھ بھی ہوئی روشنیوں میں سے کوئی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کرن کہیں نہیں تھی۔ روشنی کا نقطہ تک نہیں تھا۔ میں ابھ جھکا تھا۔

بے ساختہ اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ میرے جسم پر وہی دو لمبے والا پینٹ کوٹ تھا..... اور ان پھولوں کی خوشبو ابھی تک میرے لباس میں موجود تھی جو راتوں کے دوران میں مجھ پر نچھاور گئے تھے۔ وہ رات قریباً بارہ بجے کا مکمل تھا۔ میں نے مین سڑک پار کی اور مزنگ چوکی کی طرف چل دیا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ جو لوگ لاہور کے اس علاقے کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہوگا کہ چورنگی پارک اور مزنگ چوکی کے درمیان لاہور کا سب سے بڑا..... بلکہ شاید پاکستان کا سب سے بڑا قبرستان میانی صاحب پڑتا ہے۔ میں اسی قبرستان کے اندر سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور حدنگاہ تک بس جھاڑیاں تھیں یا قبروں کے بیکراں سلسلے تھے۔ مجھے لگ جیسے میں بھی ایک مردہ ہوں اور ابھی ابھی کسی قبر سے نکل کر چل پڑا ہوں۔ جتنی تاریکی باہر تھی، اس سے کئی گنا زیادہ میرے اندر تھی۔

اچانک مجھے دو جیم کتے نظر آئے۔ یہ آوارہ کتے جھاڑیوں سے نکل کر مجھ کی میری طرف بڑھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں بھاگ کھڑا ہوتا لیکن میں زندہ کہاں تھا۔ اپنے اندر کی روحیں مجھ کے بعد، میں تو ایک مردہ تھا اور جو پہلے ہی مردہ ہونے کے لیے یا تکلیف بھگنے کا ڈر کہاں ہوتا ہے۔ کتے شور مچاتے ہوئے میری طرف لپکے تو میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا..... ان کا جوش قدرے بے اندر گیا۔ وہ جیسے تجب کے عالم میں مجھے دیکھتے رہے، پھر وہ کتے بڑھے اور ان کی خوبصورتیاں میری ناکوں سے آئیں۔ مجھے بالکل سی لگا کہ وہ اپنی خوبصورتیوں کے ساتھ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ جیسے وہ جان گئے ہیں کہ میں کتنا بڑا قدم اٹھا رہا ہوں۔ وہ مجھے وہیں پہنچ رہے ہیں۔ مجھے اس سنگین اور بھاری لفظی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں ایک ٹرک سنسان سڑک پر سے فرارے بھرتا ہوا گزرا۔ یہ ٹرک جس دس پندرہ قدم کی دوری پر تھی۔ ٹرک کے شور اور اس کے حرکت ہارن نے کتوں کی توجہ میری طرف سے ہٹا دی..... وہ ڈرے ڈرے انداز میں پیچھے ہٹے اور پھر جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ میری دیوانگی کا ریلنا مجھے پھر اپنے آپ میں بہانے لگا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلا مزنگ چوکی پہنچا۔ وہاں جو بس سب پہلے نظر آئی، میں اس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس چوک شیم خانے کی طرف جا رہی تھی۔ چوک شیم خانے کی جانب جاتے ہوئے یہ بس پھر ہماری رہائش گاہ کی جانب سے گزری۔ قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر مجھے اپنے دو منزلہ

کھل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ دل و دماغ پر ایک سیاہ وحشت سی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی جیسے میرے اندر سے یہ آواز بلند کہہ رہا تھا..... ہارون! چلے جاؤ یہاں سے..... بہت دور نکل جاؤ..... سب کچھ چھوڑ دو..... خیر آباد کہہ دو۔ یہاں کچھ نہیں ہے تمہارے لیے..... یہاں رکے رہو گے تو دم گھٹنے سے مر جاؤ گے۔ تم یہاں کے لیے نہیں ہو..... اور یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ایک بے کار انسان ہو۔ دنیا کی حقیر ترین مخلوق ہو۔ تم کسی کے کام کے نہیں ہو۔ اپنا چہرہ چھپالو..... اپنی جھل لے کر دیواروں کا رخ کر لو، کسی سمندر کی تہ میں بیٹھ جاؤ..... کسی صحرا کی ریت میں دفن ہو جاؤ یا پھر خاک بن کر دور دراز کی ہواؤں میں بکھر جاؤ۔

کوئی مجھے سمجھ رہا تھا۔ مجھے میرے گھر سے نکال رہا تھا۔ جگمگاتی روشنیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ میری دلہن چند قدم کے فاصلے پر جگمگاتی عروسی میں موجود تھی۔ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سننے کی منتظر تھی اور میں ذہنی طور پر اس سے ہر لمحہ اپنے آپ کے فاصلے پر جا چکا تھا۔ ٹھکی منزل سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بچے چکار رہے تھے۔ گھر میں بڑے بھائی چلان کھڑے تھے۔ شاید کل کے ویسے کے لیے ابا جان احمد دوسرے بھائیوں سے مشورہ کر رہے تھے۔

میں جیسے ایک سیاہ غبار میں چلتا ہوا بچہ آیا۔ کسی نے مجھ سے کیا کہا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے کسی کو کیا جواب دیا۔ مجھے بھی یاد نہیں..... میرے ارد گرد اس وقت کیا ہو رہا تھا، میں نے کچھ بھول چکا ہوں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے..... بہت سے مہمان سوچ چکے تھے۔ کئی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا والدہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ شاید شکر اے کے لیے ادا کرنے میں مصروف تھیں۔ میں ان کے پاس سے گزرتا ہوا اپنی الماری تک آیا۔ الماری میں میرا پاسپورٹ اور کچھ دیگر کاغذات موجود تھے۔ میں نے پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈالا، کچھ نقوی الماری میں سے لیا۔ کچھ سلا میوں کی صورت میں میرے بائیں پہلے سے موجود تھی۔ میں کسی معمول کی طرح چلتا ہوا گھر میں پہنچا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ شاید کسی نے عقب سے مجھے آواز دی تھی، شاید میں نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً یہ کہا تھا کہ میں ڈرا باز ایک جا رہا ہوں..... کوئلہ ڈر تک لپٹے.....

اور میں نکل آیا تھا۔ اپنی شب عروسی کو چھوڑ کر، اپنی دلہن کو چھوڑ کر اور اپنے جگمگاتے گھر کو چھوڑ کر۔ میرے قدم

سے دس پندرہ میل دور ہی ہوں گے کہ ایک بار پھر سب دہل گئے۔ اس مرتبہ گاڑی کے نیچے سے کچھ زوردار آوازیں آئی تھیں۔ جیسے لوہے کے ساتھ لوہے نے زوردار گڑکھائی ہو۔ کئی مسافروں نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کنارے پر روک دی۔ کنڈیکٹر بھی نیچے اتر آیا اور مارچ کے ذریعے گاڑی کے نیچے تاک جھانک کرنے لگا۔

مجھے ڈرائیور کے الفاظ آج تک یاد ہیں۔ وہ پہلے تو پچھلے سے انداز میں مسکرایا پھر مسافروں کی طرف دیکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں پندرہ سال سے گاڑی چلا رہا ہوں لیکن اس طرح کا تقاضا میرے ساتھ پہلے بھی نہیں ہوا۔ آپ سوار یوں میں سے جو بھی اپنا برا مقدر لے کر اس بس میں بیٹھا ہوا ہے، خدا کے واسطے نیچے اتر جائے۔ نہیں تو ہم کبھی ساہیوال نہیں پہنچیں گے۔“

میں انہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور نیچے اتر کر چل دیا۔ کئی مسافر۔۔۔ بکا بکا سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے بعد سالوں نے میرے بارے میں کیا کہا یا ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو میں نے کیا تبصرہ کیا۔۔۔۔۔ مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں تو بس اپنے ہی ریلے میں بہتا چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ اور اس وقت مجھے یہی لگ رہا تھا کہ شاید ڈرائیور نے ”برے مقدر والی سواری“ کی جو بات کی ہے وہ میرے بارے میں ہی تھی۔ جو آج مجھ سے برے مقدر والا اور کون ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ جو اپنی من جانی دہن کو پھلوں کی بیج پر چھوڑ کر ویرانوں کی طرف نکل آیا تھا۔

اب رات کا آخری پہر تھا۔ کچے راستے کو گھٹے درختوں اور گھٹانوں پر تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اپنی چٹائی ہولی گھڑی دیکھی۔ فجر کی اذان ہونے میں قریباً پون گھنٹہ باقی تھا۔ میں اندازاً ایک فرلانگ چلنے کے بعد گھیتوں کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے ارد گرد تاریک تھا۔ تاریکی اور ان دیکھے راستے تھے۔ مجھے اپنا گھر یاد آیا۔ اپنی سجدہ گزار ماں یاد آئی۔۔۔۔۔ اور عارف یاد آئی۔ میں رونے لگا۔ پہلے سسکیاں لیتا رہا۔۔۔۔۔ پھر ہچکیوں سے میرا سینہ دھلنے لگا۔ میں رویا اور کھل کر رویا لیکن لگا تار بہتے ہوئے آنسوؤں نے بھی سینے کی آگ کم نہیں کی۔ یہاں کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ۔۔۔۔۔ اے بھلی رات کے سب سے سچے گھٹے گولہ تم ان ویرانوں میں بیٹھ کر کیوں گریہ کر رہے ہو۔۔۔۔۔ دیکھو، تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ تمہارا عروسی لباس مٹی میں لٹھو گیا ہے۔ تمہارے چہرے پر مسافت کی

گھمڑی رنگ برنگی روشنیاں نظر آئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سینے میں پھیلا ہوا غبار کچھ اور بھی گہرا ہو گیا۔ ایک بار جی میں آیا کہ اپنے قدم روک لوں۔ ابھی کچھ نہیں بڑا۔ واپس چلا جاؤں۔۔۔۔۔ لیکن تیرکیاں میں سے نکل چکا تھا۔۔۔۔۔ تیریا دس منٹ بعد میں چوک حیم خانے میں تھا۔ یہاں سے دوسرے شہروں کو جانے والی گاڑیاں۔۔۔۔۔ ہر آسانی مل سکتی تھیں۔ میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ جگہ بھی ہمارے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک بس گھڑی تھی۔ ساہیوال جانے کے لیے تیار تھی، میں اس میں سوار ہو گیا۔

کچھ واقعات اتفاقاً پیش آتے ہیں اور ہم انہیں اپنے ساتھ اور اپنے حالات کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ بس میں جو تین بظاہر غیر اہم واقعات پیش آئے، ان کا تعلق میری ذات سے تھا یا نہیں لیکن وہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ میں انہیں بغیر کی بیشی کے یہاں لکھ دیتا ہوں۔ ہم ابھی یہ مشکل لاہور شہر سے باہر نکلے تھے کہ اچانک بس کے بویہ دروازے پر چڑھ گئے۔ پھر وہ بری طرح لہرائی۔ مسافروں کے منہ سے بے ساختہ ”یا اللہ خیر“ کے الفاظ نکل گئے۔ ڈرائیور گاڑی کو بہت مشکل سے کنٹرول کر سکا تھا۔ دراصل کوئی جانور گاڑی کے منہ آگیا تھا۔

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔ جی نہیں کیوں میری آنکھوں سے لگا تار آنسو بہتے چلے جاتے تھے، جنہیں چھپانے کے لیے میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور ہاتھ جھٹکتا تھا۔ شام کی نشست کی پشت سے لٹائی ہوئی تھی۔ یہ کچھ عرصہ پہلے سے تھا۔ کیوں ہو رہا تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

بس لاہور سے ساٹھ ستر میل دور آچکی تھی، جب ایک بار پھر مسافروں کے دل سینوں میں اچھل کر رہ گئے۔ سڑک ٹکراس کرنے والے کسی دیہاتی کو بچاتے ہوئے بس ایک بار پھر بری طرح لہرائی اور سڑک کنارے بھری کے ایک ڈمپر پر چڑھ گئی۔ ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ اس نے بس کو۔۔۔۔۔ بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ مسافروں میں سے کئی ایسے بھی تھے جو اسے تنقید کا نشانہ بناتے نہ گئے۔ کچھ احتیاط سے گاڑی چلانے کی ہدایت کرتے گئے۔ ڈرائیور بظاہر تجربہ کار ہی دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ تاہم اس مرتبہ گاڑی کی رفتار خاصی کم تھی۔۔۔۔۔ اور ڈرائیور کے علاوہ مسافر بھی الٹ نظر آرہے تھے۔ ابھی ہم ساہیوال

تھے۔ مجھے اس پانی کی گہرائی میں اپنی نجات نظر آرہی تھی۔ جو قدم اٹھا کر میں اپنے گھر سے یہاں چلا آیا تھا، وہ بہت بڑا تھا۔ اس کے نتیجے میں بہت بڑے اور سنگین لگتا تھا۔ ان سارے تکیوں اور اندیشوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی نظر آرہا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اگر میں نہر میں کود جاتا تو یقیناً اس دنیا کے غموں سے چھٹکارا پا جاتا۔

اچانک "اللہ اکبر" کی صدا میرے کانوں میں پڑی۔ یہ اذان فجر تھی۔ آخر شب کی جادوئی فضا میں یہ آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ساعت سے ٹکرائی تو جیسے چند لمحوں کے لیے میرے سینے میں سنگینی ہوئی آگ مہم پڑ گئی۔ اسی دوران میں مجھے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سر ہلایا تو ایک شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تار پل میں حیان سے دیکھا۔ وہ ذرا لمبے قد کا ایک اویس عمر کا شخص تھا جس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر گول براؤن ٹوپی تھی۔

وہ ذرا ڈرے ڈرے لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"سنگ..... کچھ نہیں۔ بس روکے ہی کھڑا تھا۔" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں..... کوئی..... نشہ وغیرہ تو نہیں کیا ہوا تم نے؟"

"نہیں..... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے ہلکے میں کہا۔ اس شخص کا خوف اب ذرا کم ہو گیا تھا۔ وہ ہمدردی سے بولا۔ "مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ میں تمہیں وہاں اس کھیت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے تم نہر میں گر پڑو گے۔ کہاں سے آئے ہو؟" ساہیوال کے کوچوں میں لگتے ہوئے۔

"نہیں..... میں..... جتان سے آیا ہوں۔" میں نے بات بتائی۔ اس نے ایک بار پھر مجھے سر ہلکا ہوا۔ میرا نہایت قیمتی سوٹ، مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ "بھئی بی" کے پونوں کی حالت اس سے بھی بگڑ چکی تھی۔ میری گھڑی، میری انگوٹھی وغیرہ مجھے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ثابت کرتے تھے۔ وہ الجھے۔ "مجھے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔" آؤ میرے ساتھ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک ٹیوب ویل کے قریب نیم کے بیڑے کے نیچے آ بیٹھے۔ اس شخص

مرد ہے اور تمہاری آنکھوں میں بر باد یوں نے ڈیرے ڈال لیے ہیں..... ہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور نہ دلا سا دینے والا تھا۔ بس کانوں میں وہی زہریلے الفاظ گونج رہے تھے جو شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی ان دو عورتوں نے کہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ الفاظ صرف ان دو عورتوں نے نہیں کہے، ساری دنیا نے کہے ہیں لیکن میں پھر کہوں..... میں نے اس وقت سوچا تھا اور اب بھی سوچتا ہوں..... کیا بس وہ چند طرے یہ الفاظ ہی تھے جنہوں نے مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کرایا؟ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر جگہ ہوا ہی کرتی ہیں۔ خوشی کے موقع پر بد خواہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ بڑے بڑے اچھوں کو بھی برا بنادیا جاتا ہے۔ غلط بیانیوں، جھوٹ، الزام تراشیاں، تضحیک، کردار کشی، کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن کیا کسی ایسے واقعے کی وجہ سے اتنا بھیا تک قدم اٹھایا جاسکتا ہے؟ یا پھر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی، اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ تھی..... اور تب..... ایک بار پھر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔

میرے کانوں میں وہی الفاظ فہم فقرہ گونجا..... یہ کیا الفاظ تھے؟ یہ کیوں کہے گئے تھے؟ کیا یہی بس ایک اتفاق ہی تھا یا پھر یہ اتفاق نہیں تھا۔ میری بات ان الفاظ کی بازگشت کو پھر محسوس کرنے لگی..... کم از کم ایک لمحے کے کو تو کھانا کھانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ان الفاظ میں اور میرے یہاں اس جگہ موجود ہونے میں ایک تعلق ہے۔ گہرا تعلق۔

میں نے اسے معنی الفاظ کی بازگشت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر کے لگا لگا بحر اسی کوشش میں اٹھ بیٹھا۔ میرا نیا گھور پینٹ کوٹ کھیتوں کی فضا میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے جھاڑا اور ایک بار پھر کتا معلوم بہت میں چل دیا۔ میں کہاں جا رہا تھا۔ سینے میں پھر وہاں سا بھر رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اپنی اس بے کار اور گناہ گار زندگی سے پیچھا چھڑا لوں..... خود کو ختم کر لوں۔ بس یہی ایک صل نظر آتا تھا اپنے اندر کی بے پناہ اذیت سے چھٹکارا پانے کا۔ اچانک مجھے پانی کے بہاؤ کی مدھم آواز چائی دی۔ میں تھوڑا آگے گیا تو جھاڑیوں کے درمیان ساہیوال کی بڑی نہر نظر آئی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور شب کی خاموشی میں پانی کے بہنے کی صدا بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اس وسیع نہر کے کنارے گھاس پر جا کھڑا ہوا۔ پانی کو دیکھنے لگا۔ دل و دماغ میں پیدا ہوجانے والے خیالات بڑے خوفناک

کچھ ہی دیر میں ہمارے درمیان سارا پروگرام طے ہو گیا۔ مجھے ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر انکل فیروز کا انتظار کرنا تھا۔ اسے شام پانچ بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔

میں نے اپنے کپڑے وغیرہ جھاڑے۔ جہاں مٹی کے سخت داغ تھے ان جگہوں کو گھیلے رومال سے صاف کیا۔ ٹوب وٹل کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا اور اپنے کھمرے بالوں میں گتھی کی، اس کے بعد میں انکل فیروز سے رخصت ہو کر بچی سڑک کی طرف چل دیا۔ اب میری طبیعت کچھ بدلی ہوئی تھی۔ فجر کے وقت تا دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ اب میں آگے..... اور آگے نکلنا چاہتا تھا۔

میں بذریعہ بس دن گیارہ بجے کے قریب ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل سے جھکے اور چائے کا ناشا کیا۔ کچھ مٹی گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ سوچ کر آنکھیں پھر م ہو گئیں کہ اگر اس وقت میں اپنے کھمرے میں دو تاشید عارفہ کے گھروالے اس کا ناشا لے کر ہمارے کھمرے سے ہوتے..... ہر طرف کھانوں کی خوشبو اور تیشے کھمرے سے ہوتے.....

اسٹیشن پر گھبراہٹ تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں انتظار گاہ سے باہر نکلی کی ایک تاشید عارفہ۔ دل میں پھر دھواں سامنے ہونے لگا۔ میرے کھمرے کیا ہو رہا ہوگا؟ عارفہ پر کیا بیت رہی ہوگی؟ گھروالے مجھے کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے؟ لوگ کس طرح کی باتیں بتا رہے ہوں گے؟ دل چاہا کہ کسی جگہ سے، کھرنٹلی فون کروں اور گھروالوں کو کم از کم اتنا بتا دوں کہ خیریت سے ہوں۔ والدہ کی صورت لگا ہوں کے سامنے گھوی اور یہ خیال مزید پختہ ہونے لگا کہ مجھے کسی طرح گھروالوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دے دینا ہے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی مٹی قدم اٹھاتا، ایک بار پھر میرے اندر کی ساری جیاں بھگ گئیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہی سفید کپڑوں والا بیولا میرے پیچھے کہیں موجود ہے۔ جسے میں نے اپنی مہندی کی رات دیکھا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ بھی سفید کپڑے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ مجھے ہرگز داپس نہیں جانے دے گا اور اگر میں جانے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھے زبردستی روکے گا۔ شاید زخمی کر دے گا یا بھر مار دے گا۔

مجھے ایک جبر جبری سی آئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جو فر آئی سو رتیں یا تو تھیں، انہیں پڑھنے کی کوشش

نے اپنا صاف نما کپڑا گھاس پر بچھا دیا تھا۔ اب ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ بج ایک دوسرے کو زیادہ اب مجھے طریقے سے دیکھ سکتے تھے۔ اس شخص کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ اردو بولتا تھا تاہم لہجہ کی حد تک بلوچی تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام فیروز خان بتایا اور..... یہ بتایا کہ وہ یہاں ایک پاس کے گاؤں میں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی بوڑھی والدہ بھی اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ خود کوئٹہ میں ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ مینے دو مینے بعد یہاں گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ یہ گھر اس کی بیوی کو اپنے والدین کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ میں نے فیروز کو اپنا نام اشرف بتایا اور کہا کہ میں مٹان سے اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے ساہیوال آیا تھا۔ رات کو کسی بات پر والد سے جھگڑا ہو گیا اور میں ناراض ہو کر اصرار چلا آیا۔

فیروز نے میری بات پر کس حد تک یقین کیا؟ اور پتا نہیں کیا بھی یا نہیں؟ بہر حال اس نے مجھ سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ اس جھگڑے میں سب سے اہم بات یہی تھی کہ وہ میری حالت پر کتنا دودھ کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور میرے لیے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آج شام ہی کوئٹہ کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور اگر میں اس سے کسی طرح کی مدد چاہتا ہوں تو اسے بتا دوں۔

ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کوئٹہ لے جاسکتے ہیں؟ میں چند دنوں کے لیے اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دھڑکنا چاہتا ہوں۔“

وہ چھوٹے سے سوچ کر بولا۔ ”لیکن تمہارے گھروالے پریشان ہوں گے۔ تمہیں کسی طرح انہیں اطلاع تو پہنچا دینی چاہیے۔“

”آ..... آپ مجھے فکر ہیں۔ میں انہیں اطلاع پہنچا دوں گا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ کرائے کوغمرہ کی فکر نہ کرے، میرے پاس پیسے موجود ہیں۔

وہ بولا۔ ”آؤ، میں تمہیں اپنے گھر لے چلا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ مناسب نہیں ہوگا انکل۔ میرا دل دیکھ کر آپ کے گاؤں والے حیران ہوں گے۔ میں یہاں سے سیدھا ساہیوال ریلوے اسٹیشن چلا جاتا ہوں۔ آپ نے بھی وہاں سے ہی سوار ہونا ہے نا؟“

انکل فیروز کا جواب ”ہاں“ میں تھا۔

سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تیسرے روز ہم کوئٹہ میں تھے۔ بلوچستان کا دارالحکومت، ایک خوب صورت شہر۔ یہاں موسمِ قدرے خشک تھا۔ انگل فیروز کو اب میں فیروز چاچا کہنے لگا تھا اور ایسا فیروز چاچا کی خواہش پر ہی ہوا تھا۔ فیروز چاچا کا خیال تھا کہ ”انگل“ کا لفظ کچھ بھاری بھاری ہے اور اس میں بچہ کی بھی پائی جاتی ہے۔ ان تین دنوں میں فیروز چاچا نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ ان کے بہت اصرار کرنے پر میں نے انہیں اپنا اصل نام ہارون بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا تعلق عمان سے نہیں بلکہ لاہور سے ہے لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا اور فیروز چاچا کی داناتی تھی کہ انہوں نے مزید کچھ جاننے پر زور بھی نہیں دیا تھا۔

کوئٹہ کے بارونق علاقے میں فیروز چاچا کا چھوٹا سا ہونٹ تھا لیکن ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ رات بارہ بجے تک ہونٹ بند ہوجاتا تھا اور ہم اس کے اندر ہی سو جاتے تھے۔ یہ تیسرے روز بھی ایسا ہی ہے، ہم سونے سے پہلے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فیروز چاچا نے میری گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں فی الحال پاکستان میں رہنا نہیں چاہتا اور میری خواہش ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ایران چلا جاؤں۔ فیروز چاچا کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پاس معقول رقم موجود ہے جو ایران کے سفر میں میرے کام آسکتی ہے۔ فیروز چاچا نے کہا: ”ہارون! تم کسی اچھے گھر کے چشمہ و چراغ لگتے ہو اور پڑھ لکھے بھی ہو۔ میں تمہیں مشورہ دینے کے قابل تو نہیں ہوں پھر بھی ایک بڑے کی حیثیت سے اتنا ضرور ہوں گا کہ وہاں..... وطن ہی ہوتا ہے۔ پردیس میں بہت دھکے کھائے پڑتے ہیں۔ اپنی جان پر بڑا غم سہتا پڑتا ہے۔“

”میں نے صبح سوچ لیا ہے چاچا..... اور بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“

”گھروالوں کو جاننے کی اطلاع ہے؟“

”میں نے بتایا ہے نا چاچا..... کہ ساہیوال سے ہی فون کر دیا تھا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

فیروز چاچا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا: ”ٹھیک ہے، اگر تم ارادہ کر رہی ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم سو گئے..... لیکن اگلے روز یہ ہوا کہ فیروز چاچا کی مدد لینے کے بجائے میں نے خود ہی ایرانی ویزے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ پتا نہیں کیا

کرنے لگا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ میرے گھر سے نکلنے میں دو عورتوں کی زہریلی گفتگو کو تاؤ دخل نہیں ہے، جتنا اس سفید پوش ہونے کو ہے۔ اگر میں ان دو عورتوں کی گفتگو نہ بھی سنتا تو شاید کوئی ایسی بات ہو جاتی جس کی وجہ سے مجھے اپنی دلہن کو چھوڑ کر آنا پڑتا۔ یہ سب کچھ ایک بیٹلی کی طرح تھا اور اس کا کوئی پہلو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پروگرام کے مطابق پانچ بجے سے پہلے ہی فیروز اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہ میرے لیے گھر سے آلودالے پر اٹھے کچا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی دبی کی چٹنی تھی۔ اس نے بہت اصرار کر کے مجھے دو چار لقمے کھلائے۔ وہ کنکٹ کے پیسے نہیں لینا چاہتا تھا لیکن میں نے زبردستی دیے۔ وہ دو کنکٹ لے آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے گھر والوں کو فون کیا؟ میں نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بھی مجھے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

گاڑی قریب آدو منٹے لیت تھی۔ جب گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا پلیٹ فارم پر کھلبلی مچ گئی۔ قلیوں کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ہمارے ساتھ جو تکہ برائے نام ہی سامان تھا اس لیے ہم اطمینان سے تھے۔ میں نے یونٹی اپنے عقب میں دیکھا۔ ایک بار پھر مجھے یہی لگا جیسے میں میرا دل رک گیا ہے۔ بھاسنے دوڑتے لوگوں کے پیچھے مجھے ایک بار پھر اسی سفید پوش کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ جھلک ایک سکند کے لیے تھی یا شاید اس سے بھی کم وقت کے لیے۔ میں آنکھیں میاڑے اس سمت میں دیکھتا چلا گیا۔ فیروز نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کیا بات ہے اشرف؟“

”نہیں..... میں نے گڑبڑا کر کہا اور ریلوے لائن کی طرف دیکھنے لگا جہاں دور ہماری گاڑی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔“

میرے ذہن میں کھلبلی مچ ہوئی تھی۔ کیا میں واہموں کا شکار تھا؟ میری نظریں یاد باوجود کھارہ تھیں؟ مجھے ایک ایسا منظر دکھارہی تھیں، جس کا کوئی وجود نہیں تھا؟ نفسیات کی زبان میں اسے ”بھری دھوکا“ کہا جاتا ہے..... یعنی Optical illusion۔ ایسے بھری دھوکوں کا تعلق عموماً انسان کے اپنے اندر کی کیفیات سے ہوتا ہے۔

اسی دوران میں گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے اور ساہیوال سے کوئٹہ کی طرف ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔ میں گاڑی کی کھڑکی میں سے شمال کی طرف دیکھنے لگا..... شمال کی طرف لاہور تھا..... میرا گھر تھا..... میرے گھر والے تھے..... اور میری دلہن تھی۔ میں ان سب

ہو رہا تھا میرے اندر۔ دل یہ چاہتا تھا کہ بس جلد از جلد پاکستان کی سرحدوں سے نکل جاؤں۔ پیچھے کا خیال کرتا تھا تو ایک دم میرے اندر کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی تھیں۔ یہ اندر کا اندھیرا مجھے ڈراتا تھا اور اس اندھیرے میں ایک سفید پوش کا ہیولا چمکنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ ویزے کی درخواست کے لیے سب سے پہلے حفاظتی ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں اور اس کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میں مقررہ اسپتال گیا اور وہاں سے حفاظتی ٹیکے لگوائے۔ حفاظتی ٹیکے لگانے والا بلوچی نوجوان عابد میرے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاہور چھوڑنے کے بعد میرے اندر ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ "مجھ سے ملنے والے" مجھ سے ہمدردی اور دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ پہلے فیروز چاچا اور اب عابد بھائی بھی اسے ہی مدیتے کا اظہار کر رہے تھے۔ فیروز چاچا کی طرح میں نے عابد کو بھی یہی بتایا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ والد سے بھگڑنے کے بعد گھر چھوڑ آیا ہوں اور اب انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔ میرے اندر دکھ میرے لہجے میں بولتا تھا اور سننے والے کو متاثر کرتا تھا۔

میں نے وہ رات عابد بھائی کے گھر ان کی بیٹھک میں ہی گزار دی۔ صبح اٹھ کر مجھے ڈبل روٹی، انڈے، بسکٹ اور چائے کا ناشا کروایا اور والد نے ساتھ ہی اسکوتر پر دفتر لے آیا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس نے میرے ٹیکوں کے کورس والا سرٹیفکیٹ تیار کروادیا۔

میں نے عابد کا شکریہ ادا کیا اور وہ بھی فیروز چاچا کے ہوٹل پہنچ گیا۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ سفر کے لیے معقول رقم بھی موجود تھی۔ مجھے امید تھی کہ ایران کے لیے میرا ویزا لگ جائے گا لیکن اگلے روز مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایرانی تو نصیلت پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ پنجاب میں رہائش رکھنے والوں کو ایرانی ویزا اکوسیڈ سے نہیں اسلام آباد سے ملتا ہے۔

میں سخت پریشان ہوا۔ کسی بندے نے مشورہ دیا کہ

فلاں افسر سے طو شاید کام بن جائے۔ میں اس افسر کے دفتر کی طرف جانا چاہ رہا تھا جب ایک گاڑی نے مجھے روکا اور سخت کھڑکی کی۔ بڑا بدتمیز سا بندہ تھا۔ ایسے لوگوں کا دماغ ٹھکانے لگانا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ وہ اپنے تن و توش میں مجھ سے دو گنا کے قریب تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ میں چند سیکنڈ میں اسے ناکوں پہنے چبوا سکتا ہوں مگر میں اپنے شہر میں نہیں تھا۔ پر ویسی تھا اور بد حال تھا۔ کسی بڑے بھگڑے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس خردماغ گاڑی کی گالیاں بھی سن لیں اور دو چار دھکے بھی کھالے۔ اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ ایک قریبی باغیچے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ ایک بلوچی..... جو شاید میری ہی طرح یہاں کے عملے کا ستایا ہوا تھا، میرے قریب بیٹھا اور تسلی بخشی کی باتیں کیں۔

شام کے وقت میں فیروز چاچا کے ہوٹل واپس پہنچ گیا۔ چاچا کے ہوٹل میں میرا قیام و طعام بالکل مفت تھا۔ دلجوئی کی باتیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ دنیا میں بڑے لوگوں کی باتیں سننا اچھے لوگوں کی بھی کی نہیں۔ میں نے وہ رات بے چینی کے عالم میں گزار دی اور اگلے روز پھر عابد بھائی کے پاس اس کے دفتر میں جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق عابد بھائی بڑی خوش دلی سے ملا۔ چائے، بسکٹ سے میری تواضع کی۔ میری کل کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے صورت حال بتائی۔ وہ بھی آزرده ہو گیا۔ میرا کدھا ٹھیک کر بولا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کل میں نے اس کے ساتھ تو نصیلت جاؤں گا۔"

دفتر کا ٹائم ختم ہو گیا تو عابد مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میری دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اچھا کھانا کھلایا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے آؤٹ لیس میں بٹھا کر ایرانی تو نصیلت لے گیا..... جس خردماغ سیکے دلی گاڑی نے کل مجھ سے بدتمیزی کی تھی، وہ دور کھڑا مجھے ٹھورہ لہاتا۔ بہر حال عابد بھائی کو میرے ساتھ دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھ سے کچھ کہتا یا مجھے روکنے کی کوشش کرتا۔ ہم دونوں برآمدے سے گزرتے ہوئے سپدھے ہائی کشنر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہائی کشنر خندہ پیشانی سے ملا۔ عابد کا حال احوال دریافت کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ عابد نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ ہائی کشنر چند لمبے غور سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر مسکراتے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، تمہیں ویزا دے دیتے ہیں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بہ مشکل شکر یہ

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیکس فیس

ٹی ٹی کی فیکس فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ نکھار دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ اور استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد مچھوٹے چہرے اور گردن کی جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواہش کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ انہیں اور کہیں ملے پھر کسی فیکس فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

f www.facebook.com/top.treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو مضر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سونا، ٹروپن (ششوں کا دھماکا)، کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور دھماکے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بننے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!



HELP LINE ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سنٹر، ہومیو پیتھک سنٹر اور دوا خانہ پر دستیاب

042-35789145&6, 0334-4266255

ندھنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net



کے الفاظ کہے۔

کھنٹی بجا کر ایک ملازم کو بلایا گیا۔ اس نے ویزا درخواست کا فارم اور قلم میرے سامنے رکھا اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ”اسے پُر کر دیجیے۔“

میں نے کانپتے ہاتھوں سے فارم بھرنا شروع کیا۔ اس وقت مجھے مزید حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہائی کمشنر صاحب خود اٹھ کر میرے پاس چلے آئے اور میرے قریب کھڑے ہو کر فارم بھرنے میں میری مدد کی۔ اسی دوران میں باہر کھڑے سکیورٹی گارڈ کو چائے لانے کا آرڈر بھی ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہی خردماغ گارڈ میرے سامنے جبکہ کر چائے پیش کر رہا تھا جس نے کل مجھ سے بدزبانی کی اور دھکے دیے تھے۔ میں چاہتا تو کمشنر صاحب سے شکایت کر سکتا تھا مگر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

عابد بھائی کی کوشش رنگ لائی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہی ایرانی ویزا میرے ہاتھ میں تھا۔ عابد بھائی کے لیے میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔ یہ وقت رخصت میں نے باقاعدہ عابد بھائی کے ہاتھ سے ویزا اور اس نے مجھے گھٹے سے لگا یا..... ساتھ ہی صدق دل سے دعا کی کہ اللہ میری مصیبتیں آسان کرے اور مجھے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو۔ وہ ایک بے لوث شخص تھا۔ میں اس کے بعد اس سے کبھی نہیں ملا لیکن وہ میرے ذہن میں نقش ان گنت یادوں میں سے ایک یاد کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔

میں فیروز چاچا کے ہوش کی طرف چل دیا۔ اپنی شادی کی رات کو لاہور چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے اندر تھوڑی سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ یہ آگے کے سفر پر روانہ ہونے کی خوشی تھی مگر میں ان سنگین حالات اور واقعات سے بالکل بے خبر تھا جو مجھے آئندہ پیش آنے والے تھے۔ یہ واقعات میرے راسخے میں شکاری جانوروں کی طرح گھات لگائے بیٹھے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے جب فیروز چاچا کو چاہا کہ مجھے ایرانی ویزا مل گیا ہے تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے سفر کے بارے میں بے شمار ہدایات دیں (ماضی میں وہ بھی ایک دفعہ ایران کا سفر کر چکا تھا) فیروز چاچا نے مجھے نماز پڑھنے کی ہدایت بھی کی۔ اس نے کہا۔ ”اللہ اپنے بندوں کی مصیبتیں اسی لیے ڈالتا ہے کہ وہ اس کی طرف اپنا دھیان کریں اور جب بندہ دھیان کر لیتا ہے تو مصیبتیں وھند کی طرح چھٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔“

فیروز چاچا کی ہدایات کے مطابق ضروری تھا کہ میں کل بس اڈے پر جا کر اپنا ٹکٹ بک کروالوں۔ رات ہوش میں گزارنے کے بعد میں صبح بس اڈے پہنچا اور تھکانا بارڈر کے لیے ٹکٹ بک کروایا۔ یہیں سے میں نے ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ کرنسی بھی تبدیل کروائی۔ اب میرے پاس پاکستانی روپوں کے علاوہ ایرانی ”تومان“ بھی آ گئے۔ بس کے ڈرائیور اسحاق سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا قیمتی لباس اور چہرہ مہرہ دیکھ کر مجھے خصوصی اہمیت دی۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ نام وغیرہ پوچھا اور لاہور کا حال احوال دریافت کیا۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سے ملنے والے اکثر افراد مجھ میں دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ مجھ سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دل میں میرے لیے ہمدردی بھی جاگتی ہے۔ بس ڈرائیور اسحاق سے ہونے والی گپ شپ بھی میرے لیے فائدہ مند رہی اور اس کا پتا مجھے اگلے روز چلا۔

اگلے روز فیروز چاچا اور دیگر لوگوں سے رخصت ہو کر اور فیروز چاچا کی ڈھیروں دعاؤں کے تحت بس اڈے کی طرف روانہ ہوا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ بس کے روانہ ہونے کا نام ہے اور میں اسے یوں گھنٹاٹھت ہو چکا ہوں۔ رکشا پر سوار جب میں بس اسٹیشن پر پہنچا تو ڈرائیور اسحاق دو تین دیگر سواروں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے مجھ پر غصہ تو تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور بولا۔ ”ہاں بھائی! یار تم نے تو ہمارا بلڈ پریشر ایک دم آسان کر دیا ہے، کہاں رہا تھا تم؟“

”میں..... بہت بہت معافی چاہتا ہوں اسحاق بھائی!“

اس سواری ملنے میں ڈرائیور گونگی۔

”لو کوئی اور ہوتا تو پندرہ بیس منٹ پہلے یہاں سے نکل گیا ہوتا لیکن نام تمہارے لیے رکا رہا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ اسحاق بھائی..... اور ان سب سواروں کا بھی شکریہ میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔“

میں بس میں داخل ہوا، مجھے کہیں جگہ نظر نہیں آئی۔ میں نے روٹی صورت بنائی۔ مجھے لگا کہ شاید اب کھٹنوں تک مجھے پونہی کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑے گا۔ ڈرائیور اسحاق نے مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”گھبراؤ نہ یار! ام نے تمہارے لیے بالکل فرنت پر ایک سیٹ رکھا ہوا ہے۔“

میں نے شکر کی سانس لی اور فرنت پر بالکل اسحاق کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ میرے قیمتی لباس اور جلیبے کی وجہ سے سب لوگ بڑے دھیان سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور کسی حد تک مرعوب بھی نظر آتے تھے۔ بس میں زیادہ تر

مسافر بلوچی ہی تھے۔ میلے کچیلے سندھی افراد کا ایک گروپ بھی نظر آ رہا تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ میں نے سب پر نظر دوڑائی اور یہی وقت تھا جب میری نظر پہلی بار اس پر پڑی۔ وہ سندھی عورتوں اور بچوں کے درمیان بیٹھی تھی، اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ دہلی چکی، چمچے نقوش والی۔ وہ زیادہ خوب صورت بھی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں کوئی کشش تھی جو دیکھنے والے کو چونکا دیتی تھی۔ اس کا رنگ دیگر سندھیوں سے قدرے صاف تھا اور چھوٹی سی ناک میں بڑی سی نتھ چمک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ناک بہ مشکل نتھ کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس کی چنچل آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں کی بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا کیونکہ اس نے فوراً ہی اپنی بھاری اوڑھنی اپنے چہرے کے سامنے کر لی تھی اور رخ بھی ذرا سا پھیر لیا تھا۔

میری ذہنی کیفیت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ میں کسی خوب صورت چہرے یا کسی خوب صورت منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہو سکتا۔ میرے سینے میں لوہے کی جگہ ایک گاڑھا سیاہ دھواں بھرا رہتا تھا اور ارد گرد کی کوئی شے بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

جلد ہی بس چل پڑی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جوں جوں بس آگے بڑھتی گئی ارد گرد کے مناظر بدلتے گئے۔ یہ مناظر میری توجہ کو کسی حد تک اپنی طرف مبذول گئے۔ یہ لٹ و دوٹ صحرائے بلوچستان تھا۔ آبادیاں جیسے بھٹی، جٹک، اور اب میلوں تک کوئی تنہا دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی آبادی کے آثار۔ بس سیاہ چٹانیں ہیں اور خشک بچھر پہاڑ تھے۔ بڑی دیر تک گاڑی چلتی رہتی تھی، جب کہیں جا کر کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر کوئی مچی بستی دکھائی دیتی تھی۔ دھوپ میں جلتی ہوئی اور ریختہ سے ڈھکی ہوئی۔ نہ کہیں سبزے کا نشان، نہ پانی کے آثار۔ یہ خشک مہروں کو سفیدی مائل رنگ کیا جاتا تھا۔ سیاہ پہاڑوں کے چٹانوں کے منظر میں یہ گاؤں نما بستیاں کچھ زیادہ ہی سفید دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد جگہ صحرائی جھگڑ چلنے شروع ہو گئے۔ ریشمی کرہ آلود ہوا بس کے شیشوں سے ٹکرانے لگی اور انہیں مزید دھندلا کر دینے لگی۔ راستے میں پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں ایک دو عیسائی لائن کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر ڈرائیور اسحاق نے بتایا۔ ”یہ زاهدان کو جانے والا لائن ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”اسحاق بھائی! یہ ہماری سڑک ایسے ہی تنگ رہے گی یا آگے جا کر کچھ اچھی بھی ہو جائے گی۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”خوصلہ پکا کرو بابو صاحب۔ آگے جا کر یہ اور خراب ہوگا۔“

اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ ہمارا سفر مزید مشکل اور جھگڑے دار ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ میں بس پر نہیں بلکہ اونٹ پر بیٹھا ہوں اور کسی پرانے دور کا مسافر ہوں۔ وزنی نتھ والی لڑکی کے قریب بیٹھے ایک بڑی عمر کے شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور عاجزی کے لہجے میں بولا۔ ”بابو سائیں، کھڑکی پھر کھل گئی ہے، بند کرو۔“

میں نے کھڑکی بند کر دی۔ یہ دوسری تیسری بار ہوا کہ میں نے کھڑکی بند کی تھی۔ بے دھیانی میں، میں کھڑکی پھر کھول دیتا تھا۔ اور گرم ہوا اندر آنے لگتی تھی، کسی نہ کسی سواری کی درخواست پر مجھے کھڑکی بند کرنا پڑتی تھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد پھر یہی ہوا۔ دھندلے شیشے کی وجہ سے مجھے خشک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویرانے میں اونٹوں کے ایک گروہ کو دیکھنے کے لیے میں نے کھڑکی کھولی سی کھولی۔ گرد آلود ہوا اندر آ گئی۔ اب پھر ایک سواری نے مجھے کھڑکی بند کرنے سے روک لیا لیکن اس مرتبہ عاجزی کے لہجے میں درخواست نہیں کی گئی بلکہ بڑے سخت لہجے میں چلا کر کہا گیا۔ ”بند کرو۔۔۔۔۔ بند کرو۔۔۔۔۔ ان ہنس۔“

مجھے ڈانٹنے والا ایک بچہ جس کی سالہ مضض تھا۔ چہرہ لہبا، ناک اونچی اور آنکھوں میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی سندھی لباس میں تھا اور لڑکی والی نشست گئی میں چمچے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اب تک کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب اگر بولا تھا تو اسے درشت طریقے سے۔

پھر ادا مار کھول گیا۔ میں نے کھڑکی بند تو کر دی مگر محسوس ہوا کہ ”یکساں کر کہا۔“ ”یار بات تو تیز سے کرو۔“

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ کیا تیز۔۔۔۔۔ تم غیبت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ اس کو آگے بات نہیں کی اور وہ کسی نا معلوم زبان میں بڑی تیزی کے ساتھ بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اپنی نشست سے اٹھا اور غصیلے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی فوراً سیل مرغ کی طرح سینہ پھلایا اور میری طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں بس کے اندر ہی ایک دوسرے سے جھڑ جاتے، دو تین افراد ہمارے درمیان آ گئے۔ ڈرائیور اسحاق نے بھی بس سڑک کے کنارے روک دی اور سچ پہاڑ کرانے لگا۔ وہ شخص میری توقع سے زیادہ آتش حراج تھا۔ تاہم میں نے بھی اسے برابر کے جواب دیے۔ اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ عربی

جیسی زبان بول رہا ہے۔ کسی وقت اس کی زبان پر سندھی کے لفظ آجاتے تھے۔

سوار یوں نے ہم دونوں کو ٹھنڈا کر کے اپنی اپنی نشست پر بٹھایا اور دس پندرہ منٹ کی تاخیر سے بس پھر روانہ ہوئی۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان پنجاب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام سلیم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ سندھی کوا“؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ان کے پاس سعودی عرب کے ویزے ہیں۔“

”سعودی عرب کے ویزے؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”ان کی حالت تو سعودی عرب والی نہیں ہے۔“

سلیم مسکرایا۔ ”سنائے جی شاہ فیصل نے ہماری گورنمنٹ سے خاص رعایت کی ہے اور وہاں سعودی عرب میں نا جائز رہنے والے کئی لوگوں کو ویزے دے دیے ہیں۔ یہ لوگ بھی شاید ان میں سے ہیں۔“

اس دوران میں صبح نہ دیکھا کہ اس شخص نے آگے کی طرف جبکہ کرتھ والی ٹرک سے کوئی بات کی۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ بہر حال لڑکی کا چہرہ مجھے نظر نہیں آیا کیونکہ وہ گھونگٹ کے نیچے تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ لے لے قد والے اس سخت گیر نوجوان کا تعلق اس لڑکی سے ہے۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس کا کیا لگتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ میرے ساتھ اس کے سخت رویتے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں اس بس میں عیسائی سے خوش لباس اور اچھے طے والا شخص تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے دو چار دفعہ بے دھیانی میں لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے سوچا کہ بس اس سلسلے میں محتاط رہوں گا اور کھڑکی بھی پندرہ گھنٹوں گا۔ مختصر و مفصل پیشینہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بس نے قریباً 100 کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا جب ڈرائیور اسحاق نے اسے روک دیا اور مسافر وہاں سے کہا کہ وہ کچھ کھانی لیں۔ میں نے دیرانے میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی، کہیں کوئی ہوٹل نام کی چیز نظر نہیں آئی۔ سوار یاں ایک طرف چل پڑی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ کچھ آگے گئے تو ایک منظر دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک بہت بڑی چٹان کو کاٹ کر ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ یہ ہوٹل اندازاً 300 فٹ گہرا اور 100 فٹ چوڑا ہوگا۔ اوپر بوسیدہ چھپر تھے۔ بڑے بڑے منکوں میں پانی رکھا تھا۔ یہاں بجلی

وغیرہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جہازی ساز کی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں، ان کے آگے لکڑی کی بڑی بڑی میزیں تھیں جن پر لائینیں رکھی ہوئی تھیں۔ چار پائیاں پر بڑی بڑی پگڑیوں والے دیونا لوگ بیٹھے تھے۔ کوئی قبوہ لپی رہا تھا، کوئی چرس سے شغل کر رہا تھا۔ کوئی کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ میزوں پر ان کا اسلحہ وغیرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ شوخ آنکھوں والی لڑکی بھی دیگر افراد کے ساتھ ایک چار پائی پر موجود تھی۔ یہ لوگ کھانے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ہوٹل کا ایک ملازم میرے پاس آیا۔ اس نے میکی سی شلوار تھیں پین رنجی تھی۔

”کیا کھائے گا بابو جی؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”بس روٹی سالن لے آؤ۔“

چند منٹ بعد میرے سامنے ایک کشادہ سی پلیٹ رکھی تھی۔ اس میں اونٹ کے گوشت کی دو بڑی بڑی بونیاں تھیں اور شوربے کے علاوہ متن سالم آلو بھی نظر آ رہے تھے۔ ساتھ میں خیر می روٹیاں تھیں، کھانا ہور میں برگر اور چائیز کھانے والے کے لیے یہ بڑا انڈیا کھانا تھا۔ بہر حال بھوک بھی اس لیے چاروٹا چار کھانے لگا۔ گوشت نہ ساخت تھا۔ ایک بوٹی کو دانٹوں سے توڑنے کی کوشش کی تو وہ میرے ہاتھ سے نکل کر میز پر جا گری اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔

میرے کانوں سے ہنسی کی آواز نکلائی۔ جلد تک جیسی یہ دلی دلی ہنسی انہی افراد کی طرف سے ابھری تھی۔ میرے لیے اس طرح بے ساختہ اہل پڑنے والی یہ ہنسی اسی شوخ چٹان کی طرف سے تھی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو وہ ایک بار پھر گھونگٹ میں دکھائی دی۔ اونچی ناک والے دراز قد شخص نے لڑکی کو کھانا اور نمے میں کچھ کہا۔ لڑکی رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔

دو دیگر عورتوں نے کچھ رخ پھیر لیا۔

اس ہوٹل نما جگہ کا ماحول عجیب تھا۔ دیویدیل انسان اور ان کے اسلحے کو دیکھ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ میرے قیمتی لباس کی وجہ سے یہ سب لوگ مجھے بڑے دھیان سے دیکھتے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی بس کی سوار یاں وہاں سے نکل آئیں اور واپس بس میں آئیں۔ یہ قریباً ایک گھنٹے کا وقفہ تھا، بس دوبارہ چل پڑی۔

اس مرتبہ میں نے دیکھا کہ تھ والی چٹیل لڑکی کچھ پیچھے چلی گئی ہے۔ اس کا اونچی ناک والا کرخت سا بھیجی اب ایک چٹیل نشست پر نظر آ رہا تھا۔ نوجوان اور لڑکی کی شکل کچھ ملتی جلتی بھی لگتی تھی۔ وہ بہن بھائی ہو سکتے تھے اور قریبی کزن بھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لڑکی تو روانی سے سندھی

پھر نیوں کے پیچھے ایک جگہ قیام کے لیے چن لی۔
بس کی تمام سواریاں کھلی پاری تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد سب نے اپنی اپنی مرضی کی جگہ بستر وغیرہ بچھانے کے لیے چن لی۔ میرے پاس بستر تو کیا اور پروٹھونے کے لیے چادر تک نہیں تھی۔ ایک گلاس تک نہیں تھا کہ پانی پی سکوں۔ بہر حال میرے لباس اور شکل و صورت کی وجہ سے بس کی اکثر سواریاں مجھے کوئی افسوس کی شے ہی سمجھ رہی تھیں۔ اور کن آنکھوں سے مجھے دیکھتی تھیں۔ ایک نیلے کے پاس مجھے تھوڑی سی ہوا جگہ نظر آئی۔ میں نے اس جگہ کو کنکر وغیرہ سے صاف کیا۔ اپنے ہونوں کے تسمے کھولے۔ انہیں نیچے کی طرح سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ اوپر ایک آسمان تھا اور اس پر ہزار ہا ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا یہی آسمان سیڑگوں میل دور لاہور میں بھی تھا۔ یہاں سے رہا ہوگا۔ یہی ستارے وہاں بھی چمک رہے ہوں گے۔ جیسا کہ، وہاں کیا حالات ہوں گے۔ مجھے کیسے کیسے یاد کیا جا رہا ہوگا اور تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ پہلے اپنی والدہ کا تصور ذہن میں آیا۔ پھر اپنی نوپا بہنا بیوی کا اور آسمان کی طرح بے شمار ستارے۔ میری آنکھوں میں جھلکانے لگے۔ رخساروں پر نمی رہنے لگی۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کیوں ہوا تھا یہ سب کچھ؟ اور وہ سفید بیولا؟ کیا وہ میرا وہم ہی تھا؟ یقیناً وہم ہی تھا لیکن یہ وہم اتنا طاقتور کیوں تھا؟ اور پھر وہ بے معنی الفاظ.....؟

اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ پھر مجھے کھڑی تاک والا وہی دراز قد نو جوان کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر خشک لہجے میں مجھ سے کچھ کہا۔ اس کی سندھی میں سے کچھ دو جملے میری سمجھ میں آئے۔ اور.....

عورتیں..... وہاں.....
"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔
اس نے پھر سندھی میں کچھ کہا۔ سندھی کچھ کچھ میرے پڑے پڑ جاتی تھی کیونکہ میں کان کے زمانے میں کچھ عرصہ ساکڑ میں رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے یہاں سے "بستر" اٹھانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ میں نیلے کی دوسری طرف چلا جاؤں کیونکہ یہاں میری نظر عورتوں پر پڑے گی۔

وہ بالکل نامناسب بات کر رہا تھا۔ مجھے قافلے سے الگ تھلک سلا تا چاہ رہا تھا۔ یہاں غیر مرد تو اور بھی موجود تھے۔ اس کا نزلہ مجھ پر ہی کیوں گر رہا تھا؟ ہاتھ میں سندھیوں میں سے معنی ڈاڑھی والا ایک اور شخص بھی آ گیا۔ اس ادھیڑ

میں بات کرتی تھی لیکن نو جوان نے مجھ سے لڑتے وقت عربی جیسی زبان بولی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت کم سندھی جانتا ہے۔
صبح آٹھ بجے روانہ ہونے والی بس سے پہر چار بجے کے قریب نو کھنڈی پہنچی۔ پاک ایران بارڈر یہاں سے قریباً پانچ میل دور تھا۔ ہمارے دل تیزی سے دھڑکنے شروع ہو گئے۔ باوردی اہل کاروں نے کاغذات کی چیکنگ شروع کی۔ سندھی خواتین و حضرات کافی گھبرائے ہوئے تھے۔ اپنے حلیوں سے وہ بے چارے گداگر ہی لگتے تھے۔

میری باری آئی تو پہلے مکمل جامہ تلاش لی گئی۔ پھر کرنسی کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے کوئٹہ سے تقریباً 1000 پاکستانی روپوں کو ایرانی کرنسی میں تبدیل کر دیا تھا، اس کے علاوہ قریباً 2000 روپیا پاکستانی کرنسی کی صورت میں میرے پاس تھا۔ ان دونوں پر کافی بڑی رقم تھی۔ میں نے آفیسر سے کہا۔ "میرے پاس پانچ سو پاکستانی روپے ہیں۔" اس نے مجھے سرتا پھرا پھر مسکرا کر بولا۔ "لگتا تو ایسا نہیں..... اگر اور پیسے ہیں تو بتا دیں۔ آپ جناب کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

اس کے خوشگوار روپے سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے جراب میں نیچے کی طرف رکھے ہوئے پانچ سو کے تین نوٹ اسے دکھا دیے۔ وہ ہنس کر چپ ہو گیا (ایرانی کرنسی ڈرافٹ کی صورت میں تھی)۔

اس دوران میں میری نظر تھ والی دلی پٹی لٹی ہوئی پڑی۔ وہ ہر وقت جیسے اپنے ہی حال میں مست رہتی تھی۔ اب بھی وہ چیکنگ وغیرہ کی پریشانی سے بے پروا محن میں کھڑی تھی۔ ایک درخت پر سیر کی طرح کا چھوٹا چھوٹا سا پھل لگا ہوا تھا۔ وہ کھوکھٹ میں ہونے کے باوجود پنچوں کے بل کھڑی ہو کر پھل اٹارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اونچی تاک والے درخت نو جوان نے قریب جا کر اسے منع کیا اور اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں آ گیا۔ چیکنگ سے فارغ ہو کر ہم سب پھر بس میں آ بیٹھے اور قریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے پاک ایران بارڈر پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ "تھکان" کہلاتی ہے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ سورج کا سرخ گولہ دریا مغربی افق کی طرف جھلکا چلا جا رہا تھا۔ دن پھر کی گری تھی۔ بعد اب ٹھنڈی ریگستانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ ہمیں آج کی رات اسی ریگستان میں کھلے آسمان کے نیچے گزارنا تھی۔ کسی موزوں جگہ کی تلاش میں ہم تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومے۔

ساری ریت میرے حریف کے پاؤں کے پاس سے اچلی۔ وہ الٹ کر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے، پھر اللہ وادہیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جھک کر اس کا پاؤں دیکھنے لگا، اس کا پاؤں جیسے کسی نے اپنے گھٹنے میں جکڑ لیا تھا۔ تین چار دیگر افراد بھی میرے حریف کی طرف بڑھے۔

”کیا ہوا میڈے سامنے؟“ اللہ داد نے چلا کر پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس کراہ رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ ایک شخص نے لائین اونچی کی اور تب مجھے بھی بتا چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میری ریزہ کی ہڈی میں چھری دوڑ گئی۔ یہ لوہے اور لکڑی کا بنا ہوا ایک رنگ آلود پھندا تھا۔۔۔۔۔ جو نہ جانے کب سے ریشمی مٹی میں دبا ہوا تھا۔ شاید کبھی کسی شکاری نے کسی جانور کے لیے یہ پھندا لگا یا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ پھندے کی جگہ بھول گیا ہو، یا کوئی اور وجہ ہو گئی ہو۔ آج اتفاقاً مجھے سے دراز قد حریف کا پاؤں اس پھندے میں جکڑ گیا تھا اور وہ اس جکڑن کی تکلیف سے ترپنے لگا تھا۔ چند لمبے بعد کھسکی لڑائی کی گرامری بھول کر موقع پر پہنچ گیا۔ میرے دراز قد حریف کے ہاتھوں سے وزنی لاشی چھوٹ چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنڈلی دبائی ہوئی تھی اور کراہ رہا تھا۔ اس کی پنڈلی پر خون کی لالی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً وہ ایک سخت جان شخص تھا۔ کوئی اور ہوتا تو کراہنے کے بجائے چلا رہا ہوتا۔ اس پھندے میں ایک طاقتور اسپرنگ تھا۔ وزن پڑنے کے بعد وہ پورے زور سے کھلا تھا اور لوہے کی دو قوسوں نے اس شخص کی پنڈلی، ٹخنے کے اوپر سے بری طرح جکڑ لی تھی۔ ایک قوس تو اس کی جگہ کی کے اندر دھنس گئی تھی اور شاید ہڈی تک جا پہنچی تھی۔ یہ پھندا ایک رنگ آلود زنجیر کے ذریعے ایک پتھر کے ساتھ ایچ تھا۔ پھندے کی طرح یہ زنجیر بھی ریت میں دبلی ہوئی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ دراز قد شخص کے لیے بڑے اذیت ناک تھے۔ پھندا چونکہ پراتا ہو چکا تھا اس لیے کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دو تین افراد مل کر جب پھندا کھولنے کے لیے زور لگاتے تو دراز قد شخص کا حال اور برا ہو جاتا تھا۔ لائین کی روشنی میں اس کی پیشانی پسینے سے تر نظر آ رہی تھی۔ میرا ذہن ہمیشہ سے کچھ ٹیلیٹل رہا ہے، میرے بڑے بھائی جان فی ٹرائیز بنانے والا ایک بڑا کارخانہ چلاتے تھے۔ مجھے بھی مینوفیکچرنگ کی کافی سمجھ بوجھ تھی۔

عمر شخص کا نام نور بخش تھا۔ اس نے کھڑی ناک والے نو جوان کو تلخ کھامی سے روکنا چاہا اور میری طرف سے بات کی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے میرے لیے یہاں سے اٹھنے کا حکم جاری کرتا رہا۔ بات بڑھ گئی۔ جب کھڑی ناک والے نے میرے بوٹ اٹھا کر دوڑ بھینگنا چاہے تو میں نے اس کی کھائی پکڑ لی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ اب میرے لیے بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تیوری خون نے میرے اندر جوش مارا۔ میں نے سر جھکا کر اس کی کمر کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور پوری طاقت سے دھکیلتا چلا گیا۔ وہ قدم مجھ سے لمبا تھا اور جسم بھی اچھا خاصا تھا لیکن میں نے اس کے قدم جمنے نہیں دیے۔ میں اسے بیس پچیس قدم پیچھے لے گیا۔ ہم عورتوں اور ان کے سامان کے اوپر گرے۔ برتن بکھرتے نظر آئے اور پانی والے چھوٹے منگے ٹوٹ گئے۔ عورتیں چلائی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں۔ میں نے کھڑی ناک والے کے چہرے پر کئی دھڑکنے کے سیدھے۔ میری طلائی انگلی نے اس کا چہرہ چمیل کر رکھا۔ اس نے مجھے ٹانگوں کی دھکیل سے دور پھینکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاشی آگئی تھی۔ یہ چھوٹی لیکن وزنی لاشی تھی۔ اس پر لوہے کے موٹے جھٹے سے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ لاشی مونت کر دیوانہ وار میری طرف لپکا۔ میں اس وقت تک غصا ہوا ہوا تھا۔ اس نے ایک چنگھار کے ساتھ میرے سر پر وار کیا۔ میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو لڑ جاتا ہوں۔ وہ اتنا شدید وار تھا کہ اگر مجھے لگ جاتا تو میرا تہلکہ خیز سفر وہیں ختم ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور آج میں آپ کو یہ روداد سننے کے لیے زندہ نہیں ہوتا۔ مجھے ملنے لگا، میں نے کس طرح خود کو اس وار سے بچایا۔ ہاں یہ بتانے میں کیا کر میں نے اس شخص کو دوسرا وار کرنے کا موقع نہیں دینا، کیونکہ اس سے دوسرا موقع مل گیا تو وہ ضرور میری کھوپڑی توڑ ڈالے گا۔ میرے کانوں میں مردوزن کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نیچے جھکا اور طوفانی رفتار سے اپنے سر کی گھراس غصہ ناک شمع کے سینے پر رسید کی۔ وہ وار کرنے کے لیے لاشی اٹھا چکا تھا۔ بھرپور لڑنے سے اسے آٹھ دس قدم پیچھے ہٹا دیا لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ میں غمنا تھا اور آہنی چھلوں والی خطرناک لاشی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی مگر پھر قدرت نے کرشمہ دکھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص پھر میری طرف آتا یا کسی بھی طرح میری ضرب کا جواب دیتا۔۔۔۔۔ ایک دم کھٹکے کی زوردار آواز آئی۔ جیسے لوہا لوہے سے ٹکرایا ہو، اس کے ساتھ ہی کافی

جامہ بیٹھ گئے۔ سب کے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ارد گرد ایسا کوئی اور پھندا موجود نہ ہو۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا اہم تھا۔ ایرانی اہلکاروں نے ہمارے کاغذات وغیرہ چیک کرنا تھے اور ہمیں ایران میں داخلے کی اجازت ملنا تھی۔ بس کی بیشتر سوار یوں کی حالت گدا گروں جیسی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو ایران میں "انٹری" مل جائے گی۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سب نے برا بھلا ناشا کیا اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ بارڈر کی طرف چل دیے۔ دروازہ جعفر کے پاؤں پر بھاری بھر کم ہٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دوسری افراد کے سہارے چل رہا تھا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کے لبوترے چہرے پر کدورت کے آثار تھے۔ حالانکہ رات کو جو کچھ بھی ہوا، اس میں سراسر اسی کا تصور تھا۔ باقی سب لوگ مجھ سے بہت زیادہ مرعوب نظر آنے لگے تھے۔

بارڈر پر پہنچتے وہاں ایرانی بارڈر پولیس کے اہلکار تو نظر آئے لیکن کوئی ایسی چیز کا انحصار دکھائی نہیں دیا۔ ہمیں روکھے لہجے میں انتظار کرانے کے لیے کہا گیا۔ ہم وہیں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد اپنے سامان کے اوپر بیٹھنا مناسب سمجھا۔ جعفر کا چہرہ بری طرح تھمرا ہوا تھا اور آنکھوں میں سرخی سی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پاؤں کی سوجن کی وجہ سے اسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ قریب دو ڈھائی گھنٹے کے مشکل انتظار کے بعد ہمیں ایک ایرانی افسر کی صورت نظر آئی۔ اس نے اشاروں کنایوں اور ٹوٹی پھوٹی انگلیں میں ہمیں بتایا کہ ان کے بارڈر آپیکس کا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ بولا۔ "یہ بات کلیئر ہے کہ جب تک حکموں کے کاغذات چیک نہیں ہوتے، تم ایران میں داخل نہیں ہو سکتے اس لیے صبر سے انتظار کرو۔" میں نے مترجم کے لیے راضی انجام دیتے ہوئے ایرانی افسر کی یہ بات بس کی دیگر سوار یوں تک پہنچائی۔ سب کے چہرے لنگ گئے۔ جعفر بھی غصیلے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔ بس کی تقریباً تمام سوار یوں نے ایک طرح سے مجھے اپنا لیڈر بنا لیا تھا۔ یہ وہی اندھوں میں کانارا جا والی بات تھی۔ وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ مدقوق چہرے والے ایک دیہاتی نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "ہا بوجی! آپ پڑھے لکھے ہیں، ان سے بات کریں۔ اگر ہم آج یہاں سے نہ نکل سکتے تو کسی اور مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

میری یہ سمجھ بوجھ اس دیرانے میں اس پھنسے ہوئے شخص کے لیے کام آئی۔ میں نے غور کیا تو اندازہ لگا لیا کہ یہ گلجہ زور لگانے سے نہیں کھلے گا بلکہ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر کسی طرح گلجے کے اسپرنگ کو ایک طرف سے نکال دیا جاتا تو وہ بے پناہ دباؤ ختم ہو سکتا تھا جو اسپرنگ کھلنے کی وجہ سے پنڈلی پر آ رہا تھا۔

میں نے وزنی تھوڑی چیل لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ان پریشان کن لمحوں میں وہ اپنا لمبا تھوک ٹھٹھ بھی بھول چکی تھی۔ میں نے اوجیز عمر اللہ داد سے کہا۔ "چاچا! تمہارے سامان میں کوئی بیج کس وغیرہ ہوگا؟"

ایک دوسرا شخص بولا۔ "ہاں سامیں، مینڈ سے بھرے بیج کس۔"

وہ دوڑ کر گیا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا سا بیج کس لے آیا۔ میں لاشیوں کی روشنی میں گلجے کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ دروازہ جعفر کا خون بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ طاہر اسپرنگ کے ایک سرے کو اسٹیل کی ایک موٹی پن کے ڈز سے جکڑ کر کیا گیا ہے۔ یہ پن سوراخ میں سے نکل جاتی تو اسپرنگ کا ایک ٹرا آزاد ہو جاتا اور اسپرنگ گلجے سے باہر نکل آتا۔ میں نے تھوڑی کا کام ایک گول پتھر سے لیا۔ بیج کس کے سرے کو سوراخ میں ڈال کر تین چار لمبی چوٹیں لگائیں تو لوہے کی پن باہر نکل آئی۔ چوٹ بے پناہ زور لگانے کے باوجود نہیں ہو سکا تھا، وہ ایک پن میں جا مٹنے سے ہو گیا۔ اسپرنگ باہر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ جعفر کا لبو لہان پاؤں گلجے میں سے نکل آیا۔

سب کے گلے کی عاتس لی۔ اللہ داد اور دیگر عمر رسیدہ افراد نے مجھے باقاعدہ سناپش دی۔ دروازہ جعفر کا نام مجھے جعفر معلوم ہوا۔ وہ اب گلجے کے قابل کہاں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی پنڈلی دھار رہی تھی اور کراہتا چلا جا رہا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر فاصلے پر چلا گیا۔ عمر رسیدہ سندھی افراد میں سے ایک مفلوک الحال شخص کا نام گوریا تھا۔ یہ بندہ دیکھی طریقہ علاج جانتا تھا۔ اس کے پاس مرہم بنی کاہرا بھلا سامان بھی موجود تھا۔ اس دیرانے میں زخمی جعفر کے لیے اور کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ نور بخش نے اس کا خون بند کرنے کی کوشش کی۔ خون کار سا دم ہو گیا تو اس کے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ دی گئی۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ساکت و

میں نے کہا۔ ”میں کیا بات کروں، میں بھی آپ لوگوں کی طرح انجان ہی ہوں۔“

مورتیں اور بچے بھی پریشان نظر آرہے تھے۔ مری اور پیاس ٹیگھہ پریشان کر رہی تھی۔ بس کی ساری سواریاں بلند آواز میں بائیں کر رہی تھیں۔ پھر کچھ لوگ احتجاجی انداز میں شور مچانے لگے۔ اب دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ شور بڑھا تو ایرانی اہلکاروں میں سے ایک سینئر بندہ باہر آیا۔ اس نے وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی کافی چوڑی تھی۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”مجھے اردو وغیرہ بالکل نہیں آتی۔ میں کیسے آپ لوگوں سے سوال جواب کر سکتا ہوں۔ مجھ سے پاسپورٹ بھی چیک نہیں ہوں گے۔“

پھر اچانک جیسے اس کے ذہن میں خیال آیا۔ مجھے سر تا پا دیکھ کر بولا۔ ”اگر آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں اور پاسپورٹوں کا اندراج رجسٹر میں کر دیں تو کام آسان ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر آپ مجھے بتائیں کہ میں یہ کر سکتا ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

اس شخص نے مجھے ساتھ لیا اور بائیں وائس کنٹر کے سجائے ٹھنڈے دفتر میں پہنچ گیا۔ بس کی سواریاں کوئی پڑتی ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ اس شخص نے مجھے پوچھ کر ڈرائیو دے کر ایک بڑی میز کے سامنے ایک ٹگوری لڑکی پر بھاد بھاد میں مسافروں کے پاسپورٹ چیک کرنے شروع کر دیے۔ میں سوئڈن بوند تھا، کرسی پر بیٹھ کر مجھے لگا جیسے واقعی کوئی اسٹرو بول۔ اپنے اس خیال پر میں خود ہی ہنس دیا۔ صرف چار دن پہلے ایرانی دفتر کے ایک معمولی کارڈ نے مجھے گالیوں سے نوازا تھا اور اب لگا ہوا دھکے دیے تھے۔

اگلے دو گھنٹے میرے لیے کافی ٹھنک تھے۔ پٹانوں اور سندھی بھائیوں کے نام غائبے شکل اور جھجک تھے۔ خاص طور سے خواتین کے نام۔ ان کا اندراج رجسٹر پر کرنا میرے لیے کافی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ جیسے ہر معاشرے سے دو چار سوال بھی کرنا پڑ رہے تھے۔ جعفر تو زخمی ہونے کی وجہ سے باہر ہی بیٹھا رہا۔ بہر حال اس کی سامی لڑکی گودھڑی میرے سامنے آتا پڑا۔ میں کچھ اور بھی اڑا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی اندر آئی۔ وہ واضح طور پر ڈری سکی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا رعب سے اس کا نام پوچھا۔ ”تمہارا نام؟“

”مہر النساء..... سائیں۔“

”یہ سائیں کیا ہے۔ صرف اپنا نام بتاؤ۔“

”مہر النساء..... جی۔ مہر میں مہر کہتے ہیں۔“

”والد کا نام؟“

”غلام نبی..... جی۔“ وہ ذرا جھجک کر بولی۔

”والدہ کا نام؟“

”حبیبہ مائی۔“

”یہ پاسپورٹ پر فوٹو تمہاری ہے؟“

”ہاں جی۔“

”اپنا چہرہ دکھاؤ۔“ میں نے رعب سے کہا۔ حالانکہ چہرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔

وہ چپ ہو گئی۔ پھر لرزاں لہجے میں بولی۔

”سائیں..... میں پردہ کرتی ہوں۔“

میں بھی اسے ستانے پر تیار ہوا تھا۔ ویسے یہ ضرورت بھی تھی کہ اس کی شکل دیکھی جاتی۔ میں نے کہا۔ ”چہرہ نہیں دکھاؤ گی تو کاہل مائی کیسے پوری ہوگی؟ چلو، اٹھاؤ یہ گھونگٹ۔“

اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے لرزتے ہاتھ سے گھونگٹ تھوڑا سا ہٹایا۔ چنچل آنکھوں میں فی الحال شرم کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ چھوٹی سی نازک ناک میں چاندی کی وزنی تھوڑا سا ڈھل رہی تھی۔ عام شکل و صورت کے باوجود اس میں کشش تھی۔ میں اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ٹھیک ہے۔“

میں نے بھاری آواز میں کہا۔

اس نے گھونگٹ دوبارہ لٹال لیا۔

میں نے رجسٹر میں اس کا پاسپورٹ نمبر درج کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ جعفر تمہارا کیا لگتا ہے؟“

”وہ جی..... باپو سائیں.....“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، ایرانی افسر اندر آ گیا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی کام منشانے کو کہا اور میرے اب تک کے کام کو چیک کرنے لگا۔ مہر کا اندراج ہو چکا تھا۔ وہ باہر چلی گئی اور اس کی جگہ ایک اور عورت اندراج کے لیے آ گئی۔

یہ کام مکمل ہوتے ہوتے قریباً ڈھائی بج گئے۔ ایرانی افسر نے خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے لیے بیج منگوا دیا۔ ایرانی طرز کی بریانی اور روست چکن تھا۔ ساتھ میں خشبودار قبوہ۔ مجھے اسے سی والے ٹھنڈے دفتر میں بیٹھ کر کھانا چھانگا۔

کچھ دیر بعد جب میں باہر نکلا تو پھر وہی مری تھی اور وہی پھٹے پرانے کپڑوں والے میرے مسافر سامھی۔ بچے

عربی بول رہا تھا۔

”مجھے اس بارے میں زیادہ پتا تو نہیں ہے جی۔ میرا خیال ہے کہ یہ جعفر صیب عراق میں پلا بڑھا ہے جبکہ یہ لڑکی یہاں نواب شاہ میں رہی ہے اپنی دادی کے پاس۔ باپ شاید فوت ہو چکا ہے۔“

میرا تجسس ان دونوں کے بارے میں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ بہر حال امین کو اس بارے میں اس سے زیادہ معلوم نہیں تھا۔

بس صاف ستھری سڑکوں پر رواں دواں رہی اور میرا ذہن بھی مختلف سمتوں میں بھاگتا رہا۔ پچھلے چند دنوں میں جو کچھ ہوا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ اپنی مہندی کی رات میں نے غنودگی کی حالت میں اپنے سامنے ایک سفید بیولا دیکھا۔ اس نے چند ناقابل فہم الفاظ کہے۔ کم از کم ایک سو تین کے کو تو کھانا کھانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت اور کم ہوئی۔ اور پھر شادی کی رات میں نے دو عورتوں کا مکمل ساتھ دیکھا۔ ان کے پیچھے ہمیشی بول رہی تھیں۔ ان عورتوں کے الفاظ میں میرے اندر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ کیا وہ کسی بڑی بات تھی کہ اس کے نتائج اتنے بڑے نکلتے؟ میں نے اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال آتا تھا۔ میں سوچتا تھا۔ علاوہ عورتیں وہاں موجود بھی تھیں یا نہیں؟ کہیں وہ میرا وہم ہی تو نہیں تھا۔ بھری واہی کی طرح ساقی واہی۔ یعنی Audio Illusion

اچانک میں اپنے سنسنی خیز خیالات سے چونک کر بیدار ہو گیا۔ میں بڑے غصے سے چلا تھا۔ یہ شخص بس کے تین دنوں کے بعد میری ملازمتوں میں سے ایک تھا۔ دراصل سندھی افراد کے گروہ میں سے ایک چھوٹے بچے نے ایرانی کا بوٹ تندا کر دیا تھا۔ بچے کا شاید پیٹ خراب تھا۔ اس نے بس کے فرش پر ہی اپنی حاجت بھری کر لی تھی۔ اب ایرانی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو کر تازہ بر فاری بول رہا تھا۔ بچے کے مفلوک الحال والدین لرزہ بر اندام تھے، ایک مرد نے اپنی چادر سے ایرانی کا بوٹ صاف کیا مگر اس کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب پاکستانی خود کو فیل محسوس کر رہے تھے۔ اور کسی حد تک سہم بھی گئے تھے۔ آدھ پون گھنٹا بولنے کے بعد ہی ایرانی کا ٹیپر بچہ کسی حد تک کم ہوا۔

باقی کا سفر گہری خاموشی اور تناؤ کی کیفیت میں گزرا۔ خدا خدا کر کے زاہدان کے مضافات نظر آنے شروع ہوئے۔ زاہدان ایران کے اچھے اور خوب صورت شہروں

میں رہ رہ کر رہے تھے اور مائیں انہیں جھڑکیاں دینے میں مصروف تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک سے نکل کر اچانک تیسری دنیا کے کسی مصیبت زدہ ملک میں آ گیا ہوں۔

ہم ایرانی علاقے میں داخل ہوئے اور کچھ دور تک پہلے چلے۔ یہاں ماحول بدلا ہوا تھا اور صفائی ستھرائی نظر آتی تھی۔ ہمیں لے کر جانے والی بس سامنے ہی کھڑی تھی۔ یہ جرمنی کی جی ہوئی شاندار بس تھی اور ان دنوں دنیا کی بہترین بسوں میں شمار ہوتی تھی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے عزت بخشے ہوئے فرنٹ سیٹ پر جگہ دی۔ جعفر بھی دو افراد کے سہارے ٹکڑا رہا ہوا بس میں آ بیٹھا۔ ہماری تھک والی سوار بھی اس کے ساتھ تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات بھی عجیب لگی تھی۔ مہرونے اپنی والدہ کا نام ”حبیبہ“ لکھوایا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اندرون سندھ عورتوں کے ایسے نام نہیں ہوتے، خاص طور سے پرانی عورتوں کے۔ کیا ”حبیبہ“ کا تعلق سندھ سے نہیں تھا؟ جعفر کو سندھی کیوں نہیں آتی تھی؟ کیا جعفر اور مہرونے رشتے دار تھے؟ ایسے ہی کئی سوال میرے ذہن میں گھومتے رہے اور ہماری گٹھڑی بس ایرانی شہر زاہدان کی طرف چل پڑی۔

جعفر کے چہرے پر میرے لیے اب بھی کچھ نکل اور کدورت کے آثار تھے۔ وہ اور مہرونے اس دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹائیک کی تکلیف کی وجہ سے ہمیں پیشانی پر گاہے بگاہے ٹل پڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنا دایاں پاؤں اٹھا کر نشست پر رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ مہرونے اپنی باریک اوزنی کے اندر سے اپنا نازک ہاتھ نکالا اور آہستہ آہستہ ٹائیک کی بندلی دبائے گی۔ وہ جب سے زخمی ہوا تھا، وہ اس کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔

میرا تجسس اب کافی بڑھ چکا تھا۔ میرے ساتھ دانی نشست پر رحیم یار خان کا ایک غریب مسکرت نوجوان امین بیٹھا تھا۔ وہ بھی روزگار کے سلسلے میں قسمت آزمائے کے لیے کویت کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ کویت میں وہ سندھی افراد کے ساتھ ہی بس میں سوار ہوا تھا۔ میں نے امین سے پوچھا کہ جولاڑی ہے لال اوڑھنی والی، یہ کیا لیتی ہے جعفر کی؟

”یہ بہن ہے جی اس کی۔“ امین نے کہا۔ ”یہ اسے اپنے ساتھ عراق لے کر جا رہا ہے۔ یہ وہیں عراق میں ہی رہتا ہے شاید بغداد میں۔“

”لیکن..... لیکن لڑکی تو سندھی ہے اور یہ جعفر شاید

میں سے ایک ہے۔ یہاں کے باشندوں میں کچھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ شہر کا نام زاہدان بھی سکھوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں دیکھ کر باہر سے آنے والے لوگوں نے سمجھا کہ یہ متقی و پرہیزگار مسلمانوں کا شہر ہے۔ اس لیے اسے زاہدان یعنی زاہدوں کے رہنے کی جگہ کہا جانے لگا۔

بس ایک خوب صورت اسٹینڈر برکی۔ شہر کی شان و شوکت دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ شیشے کی طرح صاف شفاف سڑکیں، بلند عمارتیں، باغیچے۔ صفائی ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ہم آہستہ آہستہ بس سے اترے۔ زاہدان کی خوشبودار، ٹھنڈی ہوائ نے استقبال کیا۔ زخمی جعفر بھی اپنی بہن اور ایک دوسرے شخص کے سہارے پہنچا۔ بس سے اترے۔ ایک بار دل چاہا کہ اس سے دو چار الوداعی کلمات کہوں لیکن پھر اس کا سوچا ہوا خوب بڑا دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی اب میں تنہا ہی اور سکون کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

میرے پاس مسلمان نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس ایک شاعر سا تھا جس میں میں نے بانی کی دو تین پوٹلیں اور کھانے پینے کی اشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ ذرا آگے جا کے مڑ کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ سندھی مسافروں کا گردہ میرے پیچھے آرہا تھا۔ نیچے اسیوں نے مجھے مستقل طور پر اپنا راہنما تصور کر لیا ہو اور اب میرے نقش قدم پر چلتا جا رہے ہوں۔ مجھے اب محسوس ہوئی۔ میں تو کچھ ”نامعلوم کردہ“ مسافر تھا۔ میرے اندر ذاتی اہلیت کہاں گی کہ کسی خاص طبقے میں ان لوگوں کی راہنمائی یا مدد کر سکتا۔ میں رک گیا۔

”کیا بات ہے بزرگو؟“ میں نے اللہ داو سے پوچھا۔ وہ عاجزی سے بولا۔ ”بابو سا میں! تم پڑھے لکھے ہو، بات کر سکتے ہو۔ رہنے کے لیے جو جگہ ہمیں ٹھیک اور چٹنی لگے گی، وہاں ہم بھی رہ لیں گے۔ کوئی مستی ساسرائے مل جائے تو سب کے لیے ٹھیک رہے گا۔“ میں نے ذرا بیزار سی کہا۔ ”چلا! ابھی میرا کسی سرائے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ لوگوں نے جو کرنا ہے اپنے طور پر کر لیں اور یہ جعفر بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔ یہ تو تھوڑی بہت یہاں کی زبان بھی جانتا ہوگا۔“

”اس کو تو اپنی پڑی ہوئی ہے بابو سا میں۔ آپ ہی کچھ مدد کرو نا۔۔۔۔۔“

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ

روٹھا ہوا۔ یہ واقعہ آج تک پوری تفصیل کے ساتھ میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں اس کو اپنے لیے ایک شرمناک واقعہ ہی کہوں گا۔ ان لمحوں میں جو دولت میں نے اپنے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے محسوس کی، وہ تاحیات یاد رہے گی۔ ہوا یوں کہ جب ہم وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے قریب ہی ایک ایرانی اسکول میں چھٹی کی ٹھنی بج رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں بچے اسکول سے باہر سڑک پر نظر آنے لگے۔ یہ سب لڑکے تھے۔ ان کی عمریں چھ سات سال سے لے کر چودہ پندرہ سال تک تھیں۔ جب یہ بچے اسکول سے باہر آئے، مسافروں میں سے ایک بوڑھا ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کر رہا تھا۔ چنانچہ ان بچوں کے ذہن میں کیا بات آئی۔ ان میں سے کچھ نے پہلے مفلوک الحال مسافروں پر آوازے کئے، پھر انہیں پتھر مارنے شروع کر دیے۔ شاید وہ انہیں گداگر سمجھتے تھے یا پھر چوراچکا ٹھٹھکا کر رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماضی قریب کا کوئی تلخ واقعہ ان کے طیش کا سبب بنا ہو۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا، میں اور اللہ داو بانی قافلے سے جیس جیس میٹر دور کھڑے باتیں کر رہے تھے قافلے میں ایک دم ہلکڈر بج گئی۔ عورتیں چلانے لگیں۔ مسافروں کے ہاتھوں سے بستر بند مگرگئے اور وہ کنتہ وغیرہ بھی جن میں انہوں نے آٹا یا چاول قسم کی اشیاں ڈال رکھی تھیں۔ ماؤں سے بچے علیحدہ ہو گئے اور شوہروں سے بیویاں۔ ایرانی بچے انکھن پتھر مار مار کر ہجرا رہے تھے۔ میں بھی بھاگ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ مفلوک الحال سندھی سامی میرے سامنے آئے۔ میں دھڑکتے ہوئے گزر رہے تھے جیسے ان کے پیچھے موت کے فرشتے آئے ہوں۔ ایک لڑکی دھڑام سے میرے قدموں میں گری۔ وہ چلائی ”بابو سا میں بچاؤ۔“

میں نے دیکھا یہ وہی بھاری تھوڑی مہر تو تھی۔ اس کی پیشانی سے خون ریز دھجلاہٹ۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اپنی اوٹ میں لے لیا۔ میدھی کہ ہم پھرے ہوئے لڑکوں کی نظر سے بچ جائیں گے لیکن پھر ایک گھر کی چھت پر کھڑے شخص نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے انگی سے ہماری طرف اشارہ کیا اور قاری میں چلا کر کچھ کہا۔ تین لڑکوں کی ایک ٹولی بھی سے نکل کر ہماری طرف آئی۔ ایک لڑکے کا ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی۔ اس نے مہر کو دیکھ لیا۔ وہ پُریٹش انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

”رک جاؤ۔۔۔۔۔ اسٹاپ اٹ۔“ میں چلا یا۔

ایک لڑکے نے مجھے دھکا دے کر مہر سے علیحدہ کرنا

محسٹ کر اندر لے آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ یہ ظاہر گل خانی تھی لیکن کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں صرف دعا ہی کر سکتا تھا کہ کسی نے ہمیں دین میں گھستے دیکھا نہ ہو۔

ہم پچھلی نشستوں کے درمیان دھک کر بیٹھ گئے۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس گلی میں مشتعل لڑکے اور دیگر افراد داخل ہو گئے۔ وہ چاروں طرف بھاگ رہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں ہاکیاں یا گولیاں نظر آرہی تھیں۔ کچھ نے پتلونوں کی وزنی ٹیلٹس ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں، وہ گاڑیوں کے اندر جمنا تک رہے تھے اور ہر ایسی جگہ پر نگاہ دوڑا رہے تھے جہاں کسی کے جیسے کا امکان ہو سکتا تھا۔

اندر مہر وئی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور پچھلی آنکھوں میں دہشت کے ڈیرے تھے۔ میں دو نشستوں کے درمیان خلا میں سیدھا لیٹ گیا۔ میں نے مہر و کو اپنے اوپر لٹا لیا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔ دین کے اندر ہم سب کو گلی تھی اور ہم امید کر سکتے تھے کہ شاید ہمیں دیکھا نہ جاسکے۔

”سائیں! یہ لوگ ہمیں گے ہم کو۔“ مہر و کراہی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔ دین کے ارد گرد بھاگ دوڑ کر آوازیں آرہی تھیں۔ پھر دین ہولے ہولے آئی۔ وہ لوگ یقیناً اندر جمنا تک رہے تھے۔ یہ نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ہم اپنی جگہ بچنے کے بہت بن گئے۔ مہر و بے چاری کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور یہ برق رفتار دھڑکن میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ خود کو اچھلی رکھنے کے لیے وہ میرے بالکل ساتھ گلی ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل ترین گھڑیاں گزریں اور دین کے ارد گرد قدرے سکون محسوس ہوا۔

بہر حال یہ سکون برقرار نہ رہا۔ کچھ دیر بعد دین کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور کوئی ایک دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کے انجین میں چابی کھونسنے کی آواز آئی اور وہ اشارت ہو گئی۔

مہر و نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح نشستوں کے درمیان پھنسی پھنسی لیٹی رہی۔ اسٹیشن دین اب تیزی سے چل رہی تھی اور موٹر وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ پتا نہیں یہ شخص کون تھا؟ ہمیں دیکھ لیتا تو اس کا رد عمل کیا ہوتا؟ اس کو بوائے سے جو ہاکی اسٹک میں نے چھپائی تھی، وہ ابھی تک میرے پاس موجود تھی۔ اپنے دفاع کے

چاہا۔ میرا سر پیچھے دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں میں تارے سے تارے نکل گئے۔ جب دوسرے لڑکے نے مہر و کے جسم پر ہاکی سے ضرب لگانا چاہی تو میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ تیسرا لڑکا قدم میں ذرا لپٹا تھا۔ اس نے عقب سے میرے کوٹ کا کارڈ پکڑ کر کھینچا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ اب ضروری تھا کہ میں دفاع کرتا۔ میں نے سامنے والے لڑکے کے پیٹ میں لاث رسید کی اور ایک جھٹکا دے کر ہاکی اسٹک اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ مہر و پشت سے میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ دائیں طرف والے لڑکے نے میری گردن پر گھونسا رسید کیا۔ میں نے بھی بے دریغ ہاکی گھمائی جو اس کی ٹپٹی کے پاس لگی۔ وہ سر پکڑ کر اوندھے منہ گرا۔ یقیناً اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر باقی دونوں لڑکے اگلے قدموں پیچھے ہٹے۔ یہ سارا واقعہ بہ مشکل آٹھ دس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ میں نے مہر و کا بازو پکڑا اور ایک تنگ گلی میں بھاگا۔ چھت پر کھڑا شخص اسے آواز سے چلا رہا تھا۔ شاید دیگر لڑکوں کو بتا رہا تھا کہ ہم اس جگہ سے بھاگ رہے ہیں۔ میری آنکھ میں نہیں آیا کہ اب کس طرف جاؤں۔ ہم جس بکھیں قدم آگے گئے تھے کہ دوڑ بھاگنا بدلے پر مجھے ایک نئون سائن نظر آیا۔ اس پر جو الفاظ لکھے تھے، وہ یقیناً پولیس اسٹیشن کے ہی تھے۔

”آؤ مہر و۔“ میں نے مہر و کا بازو کھینچا اور پولیس اسٹیشن کے رخ پر بھاگا۔

اسٹیشن ابھی ہم نے بہ مشکل آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ گلی کے ایک موڑ پر دو تین ایرانی نظر آئے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا مرد اندام ٹھنڈ تھا۔ اس کے ہاتھ میں دور سے ہی ایک موٹی لڑکی دھمائی دی۔ یہ لڑکی اس نے یقیناً ہتھیار کے طور پر ہی اٹھا رکھی تھی۔ میں دیکھتے ہی وہ زور سے بولا اور انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا کہ میں مہر و کو کھینچ کر ایک اور گلی میں داخل ہو گیا۔ یوں تھا کہ گھر اٹنگ ہو گیا ہے اور ہم ان مشتعل لوگوں سے بچ نہیں سکتے۔ ایرانی اس کو بوائے کے زخمی ہونے سے یہ معاملہ یقیناً اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک سے سامنے ایک اسٹیشن دین نظر آئی۔ اسے ایک دیوار کے ساتھ پارک کیا گیا تھا۔ میری نظروں دین کی گھڑی سے گزری اور مجھے پتا چل گیا کہ اس کا بائیں جانب والا دروازہ لاک نہیں ہے۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے ونڈل پر ہاتھ رکھ کر جھٹکا دیا۔ سلائیڈنگ دروازہ کھل گیا۔ میں مہر و کو

لیے میں اسے استعمال کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔
 قریباً دس منٹ تک زاہدان کی سڑکوں پر چلنے کے بعد
 وین رک گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سایہ دار درختوں
 کے درمیان یہ ایک خاموش جگہ تھی۔ گاڑی والے نے انجن
 بند کیا۔ اب اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ہمیں فوراً دیکھ لیتا۔
 اور پھر یہی ہوا۔ اس ڈاڑھی والے نیم گتے شخص نے پیچھے مڑ
 کر دیکھا۔ ہاکی کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی لیکن
 اس کے بعد جو ہوا، وہ توقع کے مطابق نہیں تھا۔ وہ شخص پہلے
 فارسی میں کچھ بولا پھر انگریزی میں کہنے لگا۔ ”کیٹ
 ڈاؤن..... ناؤ کیٹ ڈاؤن۔“

میں سنائے میں رہ گیا۔ وہ ہماری موجودگی کے
 بارے میں جانتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے
 ہاتھ بڑھا کر سلائڈنگ دروازہ کھول دیا۔ پہلے مہر و اٹھ کر
 باہر نکلی پھر میں بھی نکل آیا۔ ہاکی اسٹک میں نے وین کے
 فرش پر ہی رہنے دی تھی۔

یہ ایک درمیانی عمر کا کراچیا ایرانی تھا۔ اس کی کشادہ
 پیشانی پر مل تھے۔ وہ میری طرف کچھ کرشمہ انگش میں
 بولا۔ ”میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن تم کے کوچوت لگا کرم
 نے بے وقوفی کی ہے۔ اگر تم ان کے پیچھے نہ جاتے تو وہ
 یقیناً تمہاری دو چار ہڈیاں تو توڑ ہی ڈالتے۔“

میں نے بھی انگریزی میں کہا۔ ”جناب! ہم نے یہ
 سب خود کو بچانے کے لیے کیا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں وہ
 لڑکے کیسے ہیں؟“

”اچھا اچھا خٹک ہے..... مجھے وضاحت کی ضرورت
 نہیں۔“ اس نے مڑی بات کاٹی اور بولا۔ ”اب جاؤ یہاں
 سے..... اور ان سے تمہارے بچے کے رہنا۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔
 اس کے ساتھ ہی اس نے وہی اشارت کی اور ایک موٹر
 گاٹ کر درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

ہم اپنی جگہ سکتے زدہ کھڑے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ
 جہاں برے لوگ ہوتے ہیں، وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں۔
 مہر و ابھی تک تھر تھر کا پ رہی تھی۔ میری کچھ میں
 نہیں آیا کہ اب کیا کروں؟ لڑائی کے دوران میں وہ شام
 بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا جس میں، میں نے کھائے
 پینے کی اشیاں رکھی ہوئی تھی۔ اب میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ مہر و
 کا حال بھی یہی تھا۔ اس کے سر پر شاید کوئی پتھر لگا تھا۔
 بالوں میں سے خون رس کر پیشانی تک آ گیا تھا۔ میرے
 کہنے پر اس نے اپنی بھاری اوڑھنی سے خون صاف کیا۔
 ”اب کہاں جانا ہے تو نے؟“ میں نے بیزار لہجے

میں اس سے پوچھا۔
 ”بابو سامیں..... مم..... میں نے پا (بھائی) کے
 پاس جانا ہے۔“
 میں نے جھلا کر کہا۔ ”تو مجھے کیا پتا کہ اب کہاں ہے
 وہ تیرا پا؟ خواہ مخواہ کی مصیبت ڈال دی ہے تم لوگوں نے
 مجھے۔ سریش بن کر چٹ گئے ہو مجھ سے۔“
 مجھے غصے میں دیکھ کر وہ ناک سے سوس سوس کی آواز
 نکالنے لگی اور پھر رونے لگی۔ قریب سے دو سائیکل سوار ہمیں
 گھورتے ہوئے گزرے۔ اس کی وجہ سے کوئی اور مسئلہ کھڑا
 ہو سکتا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”اب یہ رونا دھونا بند کر۔“

کسی اور مصیبت میں نہ ڈال دینا۔“
 اس نے سہم کر اپنے ہونٹ بھیجنے لیے تاہم اس کا سینہ
 دھن دھن سے ہلکی سے دھن رہا۔ میں نے اسے ساتھ لیا
 اور پیدل کوچی ایک طرف چل دیا۔ جب کوئی سڑک پار کرنا
 ہوتی تھی، مجھے اس کا ہاتھ پکڑنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے مستقل
 طور پر ہی اس کی اٹھائی پکڑ لی تھی ایک پر دیسی دوسرے
 پر دیسی کا ہاتھ تھام کر پناہ کی تلاش میں لگتا تھا۔ ہر گھڑی یہ
 دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم غلطی سے پھر اسی طرف نہ نکل
 جائیں جہاں اسکول کے لڑکوں سے واسطہ پڑا تھا۔

مجھے پتا چلا تھا کہ یہاں زاہدان میں مسافر سرائے بھی
 ہوتی ہیں جہاں پر دیسیوں کو بہت کم قیمت پر رہائش اور
 کھانے کی سہولت مل جاتی ہے۔ میں نے راستے میں دو چار
 لوگوں سے پوچھا اور مہر و کو لے کر ایک ایسی ہی مسافر سرائے
 میں جا گیا۔ یہ ایک ہال نما کرا تھا۔ اس کمرے کی دونوں
 سائڈز پر دیسی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔
 تاہم دروازہ کی کمرے کا نہیں تھا۔ فرش پر چٹائیاں بچھی
 ہوئی تھیں، کئی مسافر ان چٹائیوں پر ہی گئے وغیرہ رکھے سو
 رہے تھے۔ ان میں ایک دو فیملیاں بھی تھیں۔ ایک فیملی
 شاید پاکستانی تھی۔ میں مہر و کے ساتھ ایک کمرے میں
 آ گیا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا
 بھائی بہت پریشان ہوگا۔ وہ زخمی بھی ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا
 حالت ہوگی۔

میں نے اسے تسلی بخشی دی۔ سرائے کے ملازم سے
 کھانا منگوایا۔ عجیب طرز کی لمبوتری سی روٹی تھی اور ساتھ کسی
 ترکاری کا ساں تھا۔ مجھے بھوک محسوس رہی تھی لیکن مہر و نے
 کچھ کرسمی نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے سندھی لہجے میں کہنے لگی کہ
 میں باہر جاؤں اور پتا کروں کہ بس کے باقی مسافر کہاں
 گئے ہیں۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پہلے ہی

قابل علاج مرض ہے

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملتی
ایوارڈ
بولڈر

اجمل زیدی

کے دو روپے پاکستان کا مستقل پروگرام

ایکویٹر
ایکویٹر
ایکویٹر



**ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD**



**AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT**

اسلام آباد

مکان بر 62 متر عرض بر 20 متر 1051
 2255880 - 2864526 (051)
 0300-4585188
 3281536

9۔ اپریل 30ء مئی
9۔ اگست 30ء ستمبر
9۔ دسمبر 30ء جنوری



**AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA**

لاَهُو

پیشہ

گلف سینٹر

14 فروری 27 فروری

فیس: 16
لیکچر: 16
نور: 16
0300-8566188

14- جون 27ء جون
14- اکتوبر 27ء اکتوبر

بیشتر اینها

یکم فروری ۱۹۷۱

0300-8566188

نیم جون ۱۹۱۵ء جون
نیم اکتوبر ۱۹۱۵ء - اکتوبر

ملتان

کراچی

پیشانی سارو سبھا

28 مارچ تا 6 اپریل

فون: 4518061-62 (081)
4582803 (0300)-858618

28 جولائی 65ء - اگست
28 نومبر 75ء - دسمبر

فرض

13- تاريخ 27 فبراير

021-7012068-9
0300-8568188

13- جولائی 27ء
13- نومبر 27ء

email: syedta.malzand@yahoo.com syedta.malzand@yahoo.co.uk

میں نے کہا۔ ”بے وقوفی کی بات نہ کرو۔ ابھی لڑکوں والا معاملہ تازہ ہے۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہ ہو اور وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہوں۔“

اس کے سر پر پتھر گرنے سے کٹ سا آگیا تھا۔ میں باہر گیا اور ایک میڈیکل اسٹور سے اس کے لیے دوا لے کر آیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے یہ ”پاؤڈر میڈیسن“ اس کے کٹ پر لگائی۔ مجھے اس کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگتا ہوا تھا۔ اس کے پاس کوئی سفری کاغذ نہیں تھا پاسپورٹ، ٹکٹ وغیرہ اس کے بھائی جعفر کے پاس تھے۔ ایسے میں اگر کوئی پوچھتا چھ کر لیتا تو یہ لڑکی مصیبت میں پڑ سکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں بھی۔

ہم نے رات جیسے جیسے گزاری۔ اگلے روز میں نے اس سے کہا۔ ”میں باہر نکل کر کچھ پتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم کمرے کے اندر بیٹھ رہنا۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”سائیں! اگر کسی نے پوچھا تو؟“

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تم بس سندی ہی بولنا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ تمہیں اس کے خلاف شک نہیں آتا۔“ اسے ضروری ہدایات دے کر میں باہر نکل گیا۔ میں نے دو تین جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تھانہ یا ڈور سے زائد ان کی طرف آنے والی بسوں کا اسٹینڈ کس طرف ہے۔ کہیں سے کوئی سلی بخش جواب نہیں ملا۔ جواب مل بھی جاتا تو مجھے اس طرف جانے میں خطرہ تھا۔ میں گھومتا گھومتا ایک بازار میں داخل ہوا۔ یہاں کپڑوں کی بہت سی دکانیں بھی تھیں۔ ان میں دکانچہ منشی کی شاخیں بھی تھیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ سب سے پہلے اس مہر و نامی لڑکی کا حلیہ تبدیل کرنا ضروری ہے۔ میں نے ایک مقامی طرز کی سستی ہی شلوار قمیض پہنی اور پیرینے کے لیے دو گاؤں تھا جو اکثر ایرانی خواتین زیب تن کرتی تھیں۔ براؤن رنگ کا ایک اسکارف بھی لباس کا حصہ تھا۔

میں یہ چیزیں لے کر سہ پہر کے وقت سرائے پہنچا تو مہر و نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ ”بابو سائیں! ڈر کیجیے۔ لگتی؟“ اس نے شکوہ کناس لہجے میں پوچھا۔

”بس دیر ہو گئی۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”سائیں! پتا چلا کچھ (بھائی) کا؟“

”اب یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ کچھ ٹائم لگے گا اس میں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اور تم

مہربانی فرما کر ذرا حلیہ بدلو۔ اتارو یہ بدبودار کپڑے۔“

”جی؟“ وہ چونک کر بولی۔

میں نے کپڑوں والا لفظ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ لو، ادھر پیچھے زنا نہ حمام ہے۔ وہاں جا کر نہلا اور پکین لو۔“ اس نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پریشان ہو کر بولی۔ ”یہ کپڑے سائیں؟“

”ہاں بھئی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

وہ کچھ دیر ہچکچاتی رہی لیکن جب میں نے سختی سے کہا تو وہ کپڑے لے کر حمام کی طرف چلی گئی۔

وہ قریباً آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو کافی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا گندی رنگ گھبرا گھبرا تھا۔ اس نے اسکارف بھی اتار دیا تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے جاذب نظر کہا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں لیکن فی الوقت ان میں گہری پریشانی کی دھند تھی۔

یہ سارا میرے زیادہ صاف نہیں تھی۔ کھانا بھی ناقص تھا۔ ہاتھ روزمری صاف نہ تھے۔ کسی وقت بدبو کا ٹھکانا بڑے ہال کمرے تک آ جاتا تھا۔ میں نے سوچا کوئی بہتر جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ میری اگلی منزل سرائے تھی لیکن تہران روانہ ہونے سے پہلے میں اس مصیبت سے جان بچانا چاہتا تھا جو مہر و کی صورت میں مجھ سے چٹ گئی تھی۔ میں ایک کو بھی صدقہ دل سے دعا کرتا رہا تھا کہ اس کے وارث اسے دھو دھو کر دے۔ آج صبح پہنچے جا میں اور میں اسے ان کے حوالے کر دوں۔ آج صبح جب میں باہر نکلا تھا، اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا اور وہ یہ کہ کیوں نہ میں سرائے والوں ہی نہ جاؤں میرا کون سا سامان وہاں پڑا تھا لیکن پھر میرے ذہن نے یہ بات قبول نہیں کی۔ وہ جو بھی تھی مسلمان تھی اور میری ہم وطن تھی۔ میں یوں پرویس میں اسے چھوڑ جاتا تو میرا ضمیر رینے کے ملامت کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے اسے چھوڑ کر میں کسی اچھی جگہ کی تلاش میں نکلا۔ اچھی جگہیں کم تھیں لیکن ان کے کرائے بھی بہت تھے۔ کافی کوشش کے بعد میں ایک مناسب جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک سستا سا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر چھ سات کمرے بنے ہوئے تھے۔ کرایہ پاکستان کرنسی کے حساب سے قریباً 100 روپے پر مقرر تھا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ کے ذریعے ہوٹل کے رجسٹر میں اندراج کرایا۔ مہر و کا اندراج میری بیوی کے طور پر ہوا۔ شکر کا مقام تھا کہ اندراج کرنے والے نے مہر و کا پاسپورٹ طلب نہیں کیا۔

عراق چلا گیا۔ نواب شاہ میں رہتا تو انگریز اسے جندہ نہ چھوڑتے۔ اس وقت میرے ابا کی عمر کوئی بیس سال تھی۔ وہاں بغداد میں وہ سخت محدودی کرتا رہا۔ وہاں پر ہی اس کو میری ماؤ (ماں) ملی۔ دونوں کا سبب ہو گیا۔

”اب کہاں ہے تمہارا ابا؟“ میں نے پوچھا۔
اس نے ایک سرد آہ بھینی۔ ”وہ تو سات آٹھ سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اب میں اپنے ماؤ کے پاس رہتی تھی اور داؤی (دادی) کے پاس۔“

”اور تمہاری ماؤ؟“
”وہ بھی کچھ سال پہلے اللہ سامیں کے پاس چلی گئی تھی۔“
”وہ بھی سینیں پاکستان میں فوت ہوئی؟“
”نہیں وہ وہاں بغداد میں ہوئی تھی۔“
”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا تمہارا باپ پاکستان میں تھا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں آنسو ٹپکنے لگے۔ ”ہاں بابو سامیں! ان دونوں کے درمیان بگاڑ ہو گیا تھا۔ میں پانچ چھ سال کی تھی جب میرا ابا مجھے لے کر پاکستان آ گیا تھا۔ میرا ابا (بھائی) جعفر مجھ سے بڑا تھا۔ وہ وہیں ماؤ کے پاس رہ گیا۔ شروع میں ابا سوچتا تھا کہ شاید میری ماؤ میرے بولنے لگنے کے پاکستان آ جائے گی۔ پر ایسا بھی نہیں ہوا۔ نہ ہی پھر میں ابا سامیں بھی واپس عراق گیا۔ پر وہ میری ماؤ کو یاد کر رہا تھا۔“

”کیا تم بھی اپنی ماؤ کو یاد کرتی تھیں؟“
”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ کچھ۔۔۔۔۔ لیکن میں اپنے چاچے کو زیادہ یاد کرتی تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑا ہے۔ ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ پھر میں ابا سامیں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ وہ وہاں اکیلا رہ گیا۔“
”اس کا مطلب ہے کہ اب تیرے چودہ سال بعد وہ تم کو بغداد سے ڈھونڈتا ہوا وہاں نواب شاہ پہنچا؟“

مہرو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی ناک کی پھٹی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دیکھنے لگی۔ میرے سوالوں کے جواب میں مہرو نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں رک رک کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مہرو کا بھائی جعفر بغداد میں رہا لیکن اپنے باپ اور بھائی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس کی بہن مہرو پاکستان کے شہر نواب شاہ میں کہیں رہتی ہے اور ایک ہمساندہ سستی میں اپنے تایا کے پاس لٹکی کی زندگی گزار رہی ہے۔ دوسری طرف جعفر کا شمار کھاتے پیتے

سہ پہر تک ہم اس نئی جگہ منتقل ہو گئے۔ رات کو سونے کا نام ہوا تو میں نے مہرو سے کہا۔ ”میں فرش پر چادر بچھالیتا ہوں۔ تم بیڈ پر سو رہو۔“
وہ گڑ گڑ بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے بابو سامیں؟ آپ اوپر سو گئیں، میں نیچے سو جاؤں گی۔“

میں نے بہت کہا لیکن وہ نہیں مانی۔ مسلسل نفی میں سر ہلاتی رہی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ایک چادر بچھالی اور صوفے کی ایک گدی کے نیچے کے طور پر رکھی۔ ہم اکیلے کمرے میں تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے خوف نہیں کھا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میری ذات پر بہت بھروسہ کر رہی تھی۔ میں بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پریشان لہجہ میں بولی۔ ”بابو سامیں! میرا پا (بھائی) بہت ٹھہرا رہا ہوگا۔ پتا نہیں کہاں کہاں مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میں کیا کروں؟“

میں نے کہا۔ ”میں نہیں کیا بتاؤں کہ تم کیا کرو۔ مجھے تو خود پتا نہیں کہ کیا ہو رہا ہے مجھے تو یہ بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں تمہارا وہ پا (بھائی) مجھ پر نہیں آوا کر نے کا الزام ہی نہ لگا دے۔“
”ارغ وا؟ یہ کیا ہوتا ہے بابو سامیں؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے پشیمانی سے کہا۔ ”کسی کو زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا۔“

”میں نہیں بابو سامیں! تم بہت اچھا ہے۔ ہمارا پا (بھائی) بھی بہت اچھا ہے۔ وہ اس طرح بھی نہیں سوچ سکتا اور پھر میں خود اس کو سب کچھ بتاؤں گی اس کو۔“
”وہ مجھے دیکھنے والے لگتا ہے اور سندھی بھی نہیں لگتا۔ تم پوری سندھ میں ہو۔ تمہارا بھائی کیسے بن گیا؟“

”وہ ادھر عراق میں رہتا ہے بابو سامیں۔ ہم وہاں نواب شاہ میں رہتا۔ اس لیے وہ وہاں اس طرح کا لگتا ہے۔“
”مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“ میں نے کہا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے مہرو سے پوچھا۔ ”تمہارے رجسٹر میں اپنی ماں کا نام حبیہ مائی لکھوایا تھا۔ ہمارے رجسٹر میں تو عورتوں کے نام اس طرح کے نہیں ہوتے۔“

”ماؤ (ماں) تو عراق کی رہنے والی تھی نہ سامیں۔“
”یعنی تمہاری ماں عراق کی تھی اور باپ سندھ کا؟“
”جی سامیں! یہ بڑی پرانی بات ہے، انگریزوں کے وقت کی۔ میرا ابا انگریزوں سے لڑتا تھا۔ پھر وہ بھاگ کر

لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے دل میں اکثر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ پاکستان جائے اور اپنی بہن سے ملے۔ اس کے بعد کوشش کرے کہ وہ اس کے ساتھ بغداد چلی آئے۔ وہ پاکستان پہنچا اور مہر کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ اس نے مہر کو اپنے ساتھ چلنے پر کیسے راضی کیا اور مہر کے تایا نے کیسے اجازت دی، یہ ایک علیحدہ کہانی تھی۔ بہر حال اب مہر اپنے بھائی کے ساتھ اپنی رضا مندی سے بغداد جا رہی تھی۔ سندھی قافلے میں جو نور بخش نام کا یوزر حاضر تھا، وہ بھی دور نزدیک سے مہر کا رشتے دار ہی تھا اور ان دونوں کے ساتھ بغداد جا رہا تھا۔ اب راستے میں یہ واقعہ ہو گیا تھا اور سب لوگ بکھر کر رہ گئے تھے۔ شوخ آنکھوں والی یہ بھولی بھالی سی مہر میرے پلے بندھ گئی تھی اور میری مصیبتوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

اپنی درود اوستا کے بعد وہ فرش پر میرے جوتوں کے پاس ہی لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور مختلف سوچیں میرے ذہن پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ میں جلد ہی مجھے چھوڑ آیا تھا وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ بہر حال اس کے عجیب عجیب نقشے میرے ذہن میں بن رہے تھے اور میرے اندر خوف چکا رہے تھے۔ ذہن میں خیال آتا تھا، چنانچہ وہاں کیا قیامت مچی ہوگی؟ مجھے کیسے کیسے تلاش کیا جا رہا ہوگا؟ جسمِ حقین سے چور تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سنا کہ دوبارہ آنکھ کی شور کی وجہ سے کملی تھی۔ یہ بھی پتا نہیں چلا کہ شور کس چیز کا تھا۔ شاید کوئی زور سے بولا تھا یا پھر کوئی دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، مہر و فرش پر الٹی سیدی لٹنی ہوئی تھی۔ بالوں کی لٹیں ہندی چہرے پر بکھری تھیں۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہیں پھرتے ہوئے ایک چادر اس پر ڈال دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھلی بدمعاش کی لیکن وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے اوڑھنی اپنے سینے پر دھرتی کی۔ پھر آنکھیں مل کر وال کھاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ واش روم میں پہلی گئی اور وضو کر کے باہر آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جائے نماز چھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ ناک سے سوسنٹوں سے آواز نکالتے ہوئے دعا کرتی رہی۔ یقیناً اپنے وارثوں سے دوبارہ ملنے کی دعا کر رہی تھی۔

یہ ایک چٹلی منزل سے پھر شور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے ایک دروازہ زور سے بند ہوا پھر دو تین افراد بلند آواز میں گرجنے برسنے لگے۔ یقیناً یہ ایرانی ہی تھے۔

میں نے باہر والی کھڑکی ذرا سی کھولی اور احتیاط سے جھانکا۔ ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایرانی پولیس کی دو گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ دو باوردی اہل کاروں کے ساتھ دو تین سادہ پوش افراد بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میرا خون رگوں میں جم سا گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ نوجوان ان افراد میں شامل تھا جنہوں نے اسکول کے سامنے لڑائی کے بعد ہمارا پیچھا کیا تھا۔

تو کیا ہمیں ڈھونڈ لیا گیا تھا؟ یا پھر ویسے ہی یہاں تلاشی وغیرہ ہو رہی تھی؟ یہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کا دور تھا۔ ایجنسیاں بہت سرگرم نظر آتی تھیں..... مجھے معلوم ہوا تھا کہ مشکوک افراد کے لیے اکثر ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں چھان بین کی جاتی ہے۔

مہر و عا سے فارغ ہوئی اور ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا ہوا بابو سامیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہاں ہوٹل میں تلاشی ہو رہی ہے۔ ہر مسکے ہے کہ یہ لوگ ہمیں ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔“

”ہائے اللہ، اب کیا ہوگا بابو سامیں؟“ مہر کا رنگ ہلکا ہو گیا۔

اب سیزجیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید الکار اب تلاشی لینے کے لیے آ رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے مہر سے کہا۔ ”مہر! تم اپنی نماز جاری رکھو۔ وہ لوگ جس نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہاں سے چل جائیں۔ وہ اس حلیے میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکیں گے۔“

”اب کوئی سوال نہیں۔“ میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”تم نماز پڑھو، میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔“ میں نے آگے بڑھا کہ دروازہ اُن لاک کر دیا اور خود واش روم میں چلا گیا۔ لڑائی کا سختی مہر نے میری ہدایت کے مطابق نقلی نماز شروع کر دی تھی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اب اوپر کی منزل پر تھے۔ دروازے دھڑا دھڑ بھائے جا رہے تھے۔ الکاروں کی آوازیں گرج دار تھیں۔ وہ قاری بول رہے تھے۔ میں واش روم کی دیوار کے ساتھ لگ گیا اور... کی ہونٹوں سے چابی نکالنے کے بعد ہول میں سے جھانکنے لگا۔ مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس دروازے پر بھی زور سے دھک ہوئی۔ میری ہدایت کے مطابق مہر نماز پڑھنے میں مشغول رہی۔ دوسری

کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔
وہ بڑی خدمت گزار قسم کی لڑکی تھی۔ میں کھانا لاتا تو وہ کہتی۔ ”پہلے آپ کھائیں باپوسائیں۔ میں بعد میں کھاؤں گی۔“
میں نہانے کے لیے ہاتھ روم میں گیا تو اس نے وہاں پہلے ہی صابن تولیا وغیرہ رکھ دیا اور بالٹی بھر دی۔ نہاتے ہوئے میں نے کی ہول سے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنی پرانی اور مٹی سے میرے بوٹ صاف کر رہی تھی۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ مہر دکل رات کی طرح فرش پر چادر بچھا کر سو چکی تھی۔ میں بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ اسی دوران میں ہونٹ کے نیچلے حصے سے موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ جدید قسم کی موسیقی تھی جس میں شور شرابا زیادہ ہوتا ہے۔ میں کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا کہ شاید یہ سلسلہ رک جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند تو ابھی بڑھنے لگی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میں نے ٹیبلٹ سونٹی ہوئی مہر کے چہرے پر ساوگی اور مصویت ٹیبلٹ کس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جوان لڑکی نہ ہو چھوٹی سی لڑکی ہو۔ میں نے اس کے جسم پر چادر درست کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں بیڑیاں اترا اور بجلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر چلا گیا۔ اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ڈائمنگ ہال کی اکثر روشنی کچھ بجی تھیں اور ایک دو کے سوا سب میزیں خالی نظر آتی تھیں۔ راستہ قبالیہ کاؤنٹر پر دو ملازم اوٹھ رہے تھے۔

میں ایک کورڈزور میں داخل ہوا تو موسیقی کی مدھم مدھم طاقت سے سنائی دینے لگی۔ یہ دھما دھم سیاہ رنگ کے ایک دروازے کے پیچھے سے ابھر رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ دروازے کو توڑا سا اندر کی طرف دھکیلا۔ موسیقی کی آواز کان بھاننے لگی۔ اندرونی منظر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ یہاں کچھ جلدور جن لوگ موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد تو جوان لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ یہ بیویوں کا کوئی گروہ تھا اور شاید آج شام ہی اس ہونٹ میں اترا تھا۔ یہ نیم برہنہ مردوزن اندھا دھند تانچ رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں شراب کے جام تھے، کچھ سگریٹ وغیرہ کے کش لے رہے تھے۔ اس پورے ہال میں جس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اور نیم تاریکی میں رنگ برنگی روشنیوں اسپارک کر رہی تھیں۔ ابھی میں حیرت سے یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لمبی ترنگی گوری نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے تیزی سے اندر کھینچ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک دم میرے ساتھ کیا ہو گیا

تیسری دستک کے بعد دروازے کا ہینڈل گھوما اور ایک باوردی اہلکار اندر آیا۔ مجھے بس اس کی ٹانگیں اور پیٹ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا، یہ بڑے نازک لمبے تھے۔ آخر یہ مجھے گزر گئے۔ اہلکار واپس چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اپنے پرے ہوئے لباس اور صلیبے کی وجہ سے مہر سے کوئی پوچھ کچھ نہیں کی گئی تھی۔ میں جلدی سے باہر آیا اور دروازہ پھر اندر سے لاک کر دیا۔

مہر کی پیشانی پر پسینا نظر آ رہا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے اس نے اپنی اور مٹی کو اس طرح سر اور چہرے پر رکھا تھا کہ اس کی ٹھنکی بالکل نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ یہ کچھ بڑی خطرناک تھی اور فوراً اس کی پہچان کرا سکتی تھی۔ ٹھنکی کے علاوہ وہ سندھی لباس بھی ایک شاعر میں موجود تھا جو مہر نے مسافر سرائے میں بدلا تھا۔ یہ شاعر بھی سامنے الماری میں ہی رکھا تھا۔ اگر تلاشی لینے والے تھوڑی سی کوشش اور کرتے تو ہم سخت مصیبت میں مبتلا ہو سکتے تھے۔

میں نے سب سے پہلے تو مہر سے وہ وزنی ٹھنکی اتروائی اور اسے لٹو پیچہ میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا۔ اس کے بعد مہر کا سندھی لباس بھی اچھی طرح الماری کے عقبی خلا میں چھپا دیا۔

”باپوسائیں! کون لوگ تھے یہ؟“ مہر نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ وہی تھے جن کے ساتھ ہمیں لٹا ہوا تھا۔“

مجھے نچے سڑک کی طرف سے کچھ آوازیں آئیں۔ میں نے کھڑکی کا دروازہ میں سے احتیاط کے ساتھ نیچے دیکھا۔ باوردی ایرانی اہلکار چلا آیا۔ افغانی باشندوں کو گرفتار کر کے گاڑی میں بٹھا رہے تھے۔ مجھے یہ لوگ ہونٹ کی تلاشی میں ان کے تھے چڑھے تھے۔ لیکن مہر کی طرح ان کے پاس بھی سفری کاغذات نہ ہوں۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔

وہ دن بھی ہم نے ہونٹ کے اسی کمرے میں چھپ کر گزارا۔ مہر نے مجھے اپنے بارے میں کچھ مزید بتائیں۔ بتائیں مثلاً یہ کہ اس کی دادی اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ اب وہ بہت بیمار رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے بھائی جعفر کے ساتھ عراق بھیجے پر تیار ہو گئی ہے۔ مہر نے اپنے مصوم لب و لہجہ میں یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی جعفر اسے بغداد لے جا کر

ہے۔ میں دیوانہ وار رقص کرتے لوگوں کے گھیرے میں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے، نازیا حرکات کر رہے تھے۔ نیم عریاں جسم موسیقی کی تیز لہروں پر اندھا عند تحرک رہے تھے۔ مجھے اندر کھینچنے والی دروازہ لڑکی نے مجھے بھی رقص میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بار بار اپنی طرف کھینچا۔ میرے ہونٹوں سے بدبودار دھوکے کا جام لگا چاہا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس سے علیحدہ کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن تب ایک اور قیامت میرے سامنے آگئی۔ چوبیس پچیس سال کی یہ خوش اندام ہی لڑکی دھوکے کے سرغولوں میں سے نکلی اور چونک کی طرح مجھ سے چٹ گئی۔

”ڈانس بوائے ڈانس..... ڈانس بوائے ڈانس۔“ وہ مسلسل کہتی جا رہی تھی۔

میں خود کو چمکانے کے لیے اس سے کوئی زبردستی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگی اور اس سے مجھے نیچے گرانے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک دھڑکنے پر ہم ہو گئی۔ ہاتھ ہلا کر انگلیں میں پتا نہیں کیا تھا بولنے لگی۔ ایک ہٹے کئے تھی نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے لڑکی کو زور سے دھکا دیا ہے اور وہ گرتے گرتے پٹی ہے۔ درمیانی عمر کا یہ بچی مجھ میں چور تھا۔ بڑے غصیلے انداز میں میری طرف آیا۔ بالکل ایسے ہی لگا جیسے مجھے تھپڑ مارنا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ یہ غلطی کر کر رہا تو یقیناً اس کے غصے..... بلکہ ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوتا۔ میں تھپڑ کھانے کو تیار رہنے والا شخص نہیں تھا۔ بہر حال اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس سے پہلے کہ ہٹا سکتا بھی مجھ تک پہنچتا، ایک شخص تیزی سے میرے اور پٹی کے درمیان آگیا۔ اس نے کہہ سن کر اپنی کلاں کے بڑھنے سے روک لیا۔ یہ کوئی پاکستانی لگتا تھا۔ اس نے صوف ایک نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے پورے جسم پر ایک ایک کے نشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور دھکم پورہ کیا۔ یہ رحیم یار خان کا وہی امین نامی نوجوان تھا جس نے میں ہمارے ساتھ زاہدان تک کا سفر کیا تھا۔ امین کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ خود بھی نشے میں چور تھا۔ اس کی توانا گردن کی رگیں نشے کی حدت سے پھولی ہوئی تھیں۔

”امین! تم یہاں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
”نہی بات میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں جی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

موسیقی کے شور کی وجہ سے ہم دونوں کو بہت زور سے

بولنا پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا: ”میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس غلطی سے یہاں آ گیا۔“
”یہ ابھی غلطی ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر انجوائے کر لو۔ یہ کھاتے پیتے پٹی ہیں۔ سب کچھ ان کے خرچے پر ہی ہو رہا ہے۔“

یہ امین کا ایک نیا روپ تھا۔ بس میں وہ مجھے ایک غریب صورت، شریف آنکس لڑکا نظر آیا تھا جو حق حلال کی روزی کے لیے پردیس کا رخ کر رہا تھا لیکن یہاں وہ کسی اور ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے ساتھ ساتھ حرص و ہوس کی چمک بھی تھی۔ مجھے اس سے کراہت ہوئی۔ اسی دوران میں ایک ذرا صحت مند ہی لڑکی نظر آئی اور ڈانٹتے کہتے ہوئے امین سے لپٹ گئی۔ امین کے سرخ دھبے پر نظر آنے والے سرخ نشان شاید اسی بھدی سی ہی لڑکی کی لپٹ اسٹک کے تھے۔

میں نے حیران نظروں سے دیکھا۔ کئی بدست جوڑے ہال کے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور ارد گرد کے ماحول سے یکسر بے پروا نظر آتے تھے۔ شاید امین بھی کچھ دیر بعد گندگی کی اسی دلدل میں دھنسنے والا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ شاید چرس کا دھواں بھی مجھ پر اثر کر رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھرتھرتے جسموں کے درمیان سے صاف راستہ بنایا اور سال کمرے کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے مہر کی فکر تھی۔ میں اسے کمرے میں مقفل چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے سیزھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ آہستہ سے چابی گھما کر دروازہ کھولا۔ یہ دیکھ کر شاک لگا کہ مہر و ڈری کبھی میرے کمرے پر بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ روہاسی آواز میں بولی۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے! بوجھائیں! آپ مجھ کو جتا کر تو جاتے۔“

”سوری..... سوری۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بے آرام نہ کروں۔ میں بس ذرا سڑک تک گیا تھا۔“
اس نے غور سے مجھے دیکھا، جیسے جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرے بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

”مجھے کوئی ناچ گانا ہو رہا ہے باؤسا میں!“
”پپ..... پتا نہیں۔ میں اس طرف گیا ہی نہیں۔“
میں نے کہا۔

میرا بازو بدستور اس کے نازک ہاتھوں کی گرفت میں

ہے لیکن بھی بھی اسے یہ بھی لگتا ہے کہ ان مزدوروں میں بندہ اور بندے کی عمر خرچ ہو کر رہ جاتی ہے۔
وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ”ویسے ہارون بھائی! ایک بڑے منافع بخش کام کا پتا مجھے چلا ہے۔ ابھی میں خود ریسرچ کر رہا ہوں، کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو پھر آپ کو بھی بتاؤں گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیسے بتاؤ گے، میں تو بغداد جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم نے خبر سے پہنچانے کو بیت۔“
”لیکن ہارون بھائی! جانا تو میں نے بھی بغداد سے ہو کر ہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہاں دس پندرہ روز ہم رکیں گے بھی۔“ ”ہم“ سے اس کی مراد یقیناً اس کے لوفر بھی ہم سفر ہی تھے۔

اس نے چٹلون کی ایک جیب میں سے بوسیدہ ہوا نکالا اور پھر ایک پرچی پر ایک فون نمبر لکھ کر مجھے دیا۔ یہ کسی یوتھ ہاسٹل کا نمبر تھا۔ کہنے لگا۔ ”ہارون بھائی! بغداد میں آپ اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے رابطہ ہو جائے گا۔“ پھر ذرا چٹک بولا۔ ”لیکن ہارون بھائی! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بغداد میں جا رہے ہیں آپ؟“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ میں نے کہا۔ ”وہاں میرا کوئی اپنا ہے۔“
”کوئی رشتے دار ہے؟“

”رشتے دار تو غم دیتے ہیں۔ وہ غم لینے والا ہے۔ ہارون بھائی! بڑا غم گسار، بڑا مہربان۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے بچپن سے کھول کا مداوا کرے گا اور میرا ہاتھ بھی پکڑے گا۔“

”اللہ کرے جی کہ آپ کی امیدیں پوری ہوں۔ ویسے پردیس میں آپ کی امیدیں کم ہی پوری ہوتی ہیں۔“ میں چپ رہا۔ اسے یہ جواب دیتا۔ دیتا بھی تو شاید اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ میں عالی مرتبت حضرت عبدالقادر جیلانی کی بات کر رہا تھا۔ وہ بغداد میں ہی مدفون تھے۔ ان کے مزار اور عالی شان مسجد کی تصویریں میں نے کئی بار دیکھی تھیں۔ اب وہی جگہ مجھے اپنی طرف کشش کر رہی تھی۔ میں غصے کے ایک ناقابل فہم گھیرے میں تھا۔ ایک ریلا سا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں کسی اللہ والے کے دست مہربان کی ضرورت مجھے بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی میں کہیں بھی جانے سے پہلے، کسی بھی ملک کا رخ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت شیخ جیلانی کے روضے پر

جانا چاہتا تھا۔
ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ وہی بھدی سی سفید فام لڑکی دوبارہ نظر آئی جو کل رات جو تک کی طرح امین سے چٹنی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں مسکراہٹ تھا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور امین سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اب میں اور مہر و تہران کی طرف مجوسفر تھے۔ جرمنی کی شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس مچی جس میں باہر کی گرمی بالکل بے اثر ہو جاتی تھی۔ کسی رن وے کی طرح کشادہ اور صاف شفاف سڑک پر بس بڑے ہموار طریقے سے تیرتی چلی جا رہی تھی۔ مہر و مقامی لباس میں تھی۔ اس نے اپنا چہرہ حجاب میں چھپی رکھا تھا۔ وہ میرے پہلو میں بالکل خاموش اور اداس تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تہران میں کچھ سندھی فیملیوں کے لیڈر ریس میرے پاس ہیں، ان میں دو فیملیاں نواب شاہی بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں سے اس کے وارثوں کا کچھ مل جائے۔ یہ فیملیاں ایک ہی بڑی بلڈ لک میں رہتی تھیں اور ریس میں نے امین اکرم سے ہی لیا تھا۔

سڑک کی دونوں جانب میں کہیں کوئی نہ روخت نظر نہیں آیا۔ چھوٹے چھوٹے قصبے دکھائی دیتے تھے جو نہایت خوب صورت اور صاف ستھرے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ نئے جدید گھر اور شیشے کی نفیس دکانیں جس سے منظر بالکل بگڑی تھا۔

دو گھنٹے میں ایک جگہ بس کچھ دیر کے لیے رکی۔ میں اور مہر و بھی اسی سڑک پر سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ یہاں موسم بدلا ہوا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا راونڈ ہاؤس تھا جس کے اندر باغیچہ سا بٹا ہوا تھا۔ یہاں بہت سی درمیانی عمر کی عورتیں بیٹھی اور لیٹی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھیں اور ہلکے سوری تھیں۔ میں اور مہر و یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ عورتیں اتنی بے فکر سی لگتی ہوئی تھیں۔ مہر و کی نگاہیں شرمیلے انداز میں جھک گئیں۔ بہر حال یہ یہاں کا رواج تھا۔

ہم کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک ہوٹل میں داخل ہوئے تو جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بہت سے ایرانیوں کی میزوں پر بکروں وغیرہ کی ایلنی ہوئی سیریاں رکھی تھیں۔ وہ چھری کاٹنے سے ان سریوں کو نوچ

نوج کرکھار ہے تھے۔ ہلکی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔
 ”بابو سامیں امیر اول مہرار ہا ہے۔“ مہرو نے کہا۔
 میں اسے لے کر فوراً باہر نکل آیا۔ ایک اسٹال سے ہم
 نے دو چکن برگر لیے اور واپس بس میں آن بیٹھے۔ پتا نہیں کیا
 بات تھی میں جب بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، مجھے
 وہ فقرے ضرور یاد آ جاتے تھے جو میں نے اپنی مہندی کی
 رات اپنے کمرے میں سنے تھے۔ جب سے میں اس طویل
 سفر پر روانہ ہوا تھا، وہ فقرے مجھے دوبارہ سنائی نہیں دیے
 تھے اور نہ ہی وہ بیولا نظر آیا تھا۔ جس نے پہلے مہندی کی
 رات اور پھر شادی کی شام مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اس
 کے باوجود پتا نہیں کیوں کھانا شروع کرتے ہوئے مجھے اس
 ہیولے کی اور ان فقروں کی یاد ضرور آتی تھی اور ہنسنے لگتا
 کے لیے جسم پر کچھ سی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بات مہرو نے
 بھی نوٹ کی تھی اور ایک دوبار مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میں
 کھانا شروع کرتے ہوئے ایک دم چپ سا کیوں ہو جاتا
 ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس کا کوئی معقول جواب اسے نہیں
 دے سکتا تھا۔

یہاں کمرے میں پھر وہی مسئلہ تھا۔ ایک ہی ڈبل بیڈ
 تھا۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود مہرو نے یہاں بھی
 وہی ترتیب بنائی۔ یعنی خود لکڑی کے فرش پر چادر بچھائی اور
 مجھے بستر پر سلا یا۔ کافی تھکاوٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم
 سو گئے۔ آگے کھلی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ بھوک محسوس
 ہو رہی تھی۔ مہرو کا چہرہ بھی بھوک کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ہم
 نے کمرالاک کیا اور نکل آئے۔ تہران رنگوں اور روشنیوں
 میں جھجک رہا تھا۔ یہ سستا علاقہ تھا اس کے باوجود لاہور کے
 مال روڈ یا میکلوڈ روڈ سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک جگہ
 ہمیں ایک ریڑھی پر کھانے پینے کی اشیاء نظر آئیں۔ ہم نے

ایک طویل سفر کے بعد ہماری بس عظیم الشان تہران
 کے مضافات میں پہنچ گئی۔ چار بڑے بڑے کارخانے اور
 فیکٹریاں وغیرہ نظر آئیں پھر شاہراہوں کا سلسلہ شروع
 ہوا۔ دیکھ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ اہل تہران کے پاس اتنی
 دولت کہاں سے آئی ہے۔ جا بجا وسیع باغات اور آبی
 مزرعہ ہیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ باغات اور شاہراہوں پر
 جگہ جگہ شاہ ایران کے مجسمے نصب تھے۔ جوں جوں ہم
 تہران کے قریب پہنچے گئے، عمارتوں کے نقشے بدلتے گئے
 اور ان کی بلندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان فلک بوس عمارتوں
 کے پس منظر میں پہاڑ تھے اور دور بریلی چوٹیوں کی جھلک
 بھی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ریمک و بوی کسی اور ہی دنیا میں
 پہنچ گئے تھے۔

بس سے اترے تو شام ہو چکی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر
 پیدل ہی چلتے رہے۔ پھر ایک سائیکل بائیسے میں بیٹھ گئے اور
 سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے
 ہمیں کوئی چھوٹا سا ہوٹل تلاش کرنا تھا۔ وہیں باغیچے میں بیٹھے
 بیٹھے مہرو بولی۔ ”بابو سامیں! آپ تھک گئے ہیں تو میں آپ
 کی ٹانگیں دبا دوں۔“

میں شپٹا گیا۔ ”تمہاری عقل کام کر رہی ہے یا نہیں؟
 کیا میرا اور اپنا تماشانا چاہتی ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔
 وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہم پھر چل پڑے۔ ہم دو سکنیوں کی

سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای

WELCOME
BOOK SHOP

ویکم بک شاپ

سپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی

پی او بکس، 27869، کراہہ، دہلی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 052-9695984

ای میل: welbooks@emirates.net.ae

رات کا مسافر

نگل پڑیں گے۔ ہم بوسیدہ لباس والے اس دراز قد گورے کے ساتھ ہوئی میں داخل ہوئے۔ وہ بظاہر شائستہ نظر آتا تھا لیکن گاہے گاہے چور نظروں سے مہر کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس زمانے کا ایران کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھا۔ چلتی پھرتی عورتوں کو ایسے ہی بے باک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ گورا..... امریکن ہے اور اکیلا ہی ڈل ایسٹ کی سیاحت کو نکلا ہوا ہے۔ اس کا نام اینڈرسن معلوم ہوا۔

میں اپنے کمرے میں یوں آیا جیسے پانی سے بھری ہوئی پھلی واپس تالاب میں آتی ہے۔ سب سے پہلے الماری کا اندرونی خانہ کھول کر اپنا پاسپورٹ اور نقدی وغیرہ چیک کی..... پاسپورٹ کو باقاعدہ ہونٹوں سے لگا کر چوما اور اپنے کٹ کی اندرونی جیب میں احتیاط کے ساتھ رکھ لیا۔

میرے اپنے فرش پر کسی بزم پر کسی بزم کی طرح گم مہم بیٹھی تھی۔ مجھے احساں ہوا کہ راتے میں میری طرف سے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت پریشانی ہی اتنی تھی کہ میں اپنے لب و لہجہ پر غور نہ کر سکا۔

میں نے اسے بدست کی کہ وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ جائے۔ وہ پہلے تو مجھ کو دیکھتی رہی لیکن میں نے ذرا جھک کر کہا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا: ”مجھے نفوس ہے مہر وہاں میں نے تم سے سخت لہجہ میں بات کی..... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اس کے لیے معاف کر دو۔“

وہ ایک دم تڑپ سی گئی۔ ”آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں بابو سائیں! کیوں مجھ کو گناہ گار کر رہے ہیں۔ معافی تو مجھ سے مانگنی چاہیے۔ میں نے اپنی معیشتیں آپ کے گلے میں ڈال دی ہیں۔ میرے لکھ ہی ایسے ہیں۔ اللہ سائیں کرے میرا دل مجھے مل جائے..... یا پھر ویسے ہی مجھے موت آجائے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کہا: ”کوئی بات نہیں میں نے تمہیں دلا یا ہے اور غلطی رونے والے کی نہیں ہوتی رلانے والے کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔ بولو معاف کیا ہے یا نہیں؟“

وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”بابو سائیں! کہاں آپ کی شان..... کہاں میں گھبوں میں رلنے والی سچ ذات..... آپ مجھے اتنا شرمندہ نہ کریں سائیں کہ میری جان ہی چلی جائے۔“

میں نے اسے اٹھا کر دو بارہ کرسی پر بٹھایا۔ تسلی آمیز

ہینے پر پڑی اور وہ ڈسٹ بن سے نکل کر پھول دار پودوں میں گرا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ کسی کمزور بندے سے نہیں پڑا۔ وہ پھولوں والی کیاری سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیچھے لپکتا چاہا لیکن مہر نے میرے راستے میں آکر مجھے روک لیا۔ ”نہیں بابو سائیں..... جانے دیں..... دفع ہو گیا ہے..... جانے دیں۔“

یہ ایک چھوٹی سی نیم تاریک سڑک تھی۔ بس چند دکانوں کے اندر ہی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ارد گرد کسی شخص نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ میں نے اپنا لباس درست کیا..... مہر سے اس کی خیریت پوچھی..... اور تب ایک بار پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ اس بار میں مہر کے آگے آگے چلتے چلے بجائے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب میرا رخ قدرے بڑی اور روشن سڑک کی طرف تھا۔ مہر دیکھ مزید سہم گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چل چل کر اب ہم دونوں کی ہمت جواب دینے والی ہے۔ اچانک مہر نے ایک طرف الٹی اٹھائی اور بولی۔ ”بابو سائیں..... میں گھبرا..... وہ کون ہے؟“

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا اور بکا ایک دل خوشی سے سینے میں اچھل پڑا۔ ایک لمبے قد کا انگریز تھا اور اسے میں نے اسی ہوئی میں دیکھا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اس کے کان سے ہاتھ رکھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور مسکراتے ہوئے بولا: ”ہلو..... ہاؤ آر یو۔“

میں اسے کیا بتاتا کہ میں کیسا ہوں۔ میں نے وردناک لہجہ میں اسے بتایا کہ میں ہوئی کا راستہ بھول گیا ہوں اور اپنی سائیں کے ساتھ قریباً تین گھنٹے سے در بدر پھر رہا ہوں۔

اس نے ہاتھ میں مہر کی ہوئی بوتل سے بیڑ کا ایک طویل ٹھونٹ لیا اور مسکرا کر انکس میں بولا۔ ”مجھے نہیں پتا تم کہاں رہے ہو..... لیکن اب تم اپنے ہوئی سے زیادہ دور نہیں ہو۔ وہ سامنے دیکھو۔ یہی ہوئی ہے۔“

میں حیرت سے ٹٹک ہو کر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ پہاڑ کا عقبی دروازہ ہے۔ وہ سفید رنگ والا بڑا دروازہ سامنے کی طرف ہے۔“

اس نے مجھے اور مہر کو ساتھ لیا اور تیس چالیس قدم چل کر سامنے کی طرف آگیا۔ میں ہوئی کا سفید بڑا دروازہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں لگا کہ خوشی سے آنکھوں سے آنسو

انداز میں اس کا کندھا تھکا اور اسے نادل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوٹی موٹی کے پھول جیسی تھی۔ جلدی سے مرجھا جاتی اور جلدی سے کھل بھی جاتی تھی۔ اس نے اسکارف کے پلو سے اپنی نم آنکھیں صاف کر لیں۔ میں نے کہا۔ ”چلو اب دوبارہ دوستی ہوگئی ہے۔ اس خوشی میں کل دو پہر تمہیں ہونک سے اچھا سا کھانا کھلاؤں گا۔ تمہاری پسندیدہ بریانی.....“

وہ کچھ دیر سوچ کر بولی۔ ”نہیں..... بابو سامیں! آپ کے پاس پیسے کم ہیں۔ ہم فضول خرچی نہیں کریں گے۔ ہم بریانی کھائیں گے لیکن خود پکا کر۔ آپ مجھے دو چار چیزیں لادیں، میں آپ کو سندھی بریانی کھلاؤں گی۔“

”یہاں ساتھ والے کمرے کے پیچھے پادری خانہ بھی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے بابو سامیں! بڑا صاف ستھرا ہے۔ برتن وغیرہ بھی ہیں۔“

”نہیں۔ میں تمہیں اس تکبیزے میں نہیں پڑنے دوں گا۔“

”نہیں بابو سامیں! آپ کے لیے کچھ بڑی خوشی ہوگی۔ مجھے بہت زیادہ اچھا لگے گا۔“ وہ جھجھکتے سے بولی۔

اس کا انداز بالکل سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے رویے میں کہیں کوئی ذرا سی آلائش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ سے بالکل ایسے ہی بات کرتی تھی جیسے اپنے کمرے کے دیگر افراد سے کرتی ہوگی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”چلو ضیک ہے لیکن اب عرصہ است بہت زیادہ ہو چکی ہے۔“

وہ بڑی نرم دل برداری سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے دون پر کمر و نچے کا سرخ نشان ابھی تک نظر آرہا تھا۔ یہ نشان اس کی اداس لڑکوں کی بدتمیزی کا نتیجہ تھا جو راستے میں ہم سے ٹکراتے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں تہہ کیا کہ صبح ناشتے کے بعد پہلا کام یہی کروں گا کہ ان سندھی فیملیز کا سراغ لگاؤں جو یہاں سرائی میں موجود تھیں۔ میری ولی خواہش تھی کہ ہر وہ جلد از جلد اپنے وارثوں کے پاس پہنچ جائے یا کم از کم ایسے قابل بھروسہ لوگوں کے پاس پہنچ جائے جو اس کے وارثوں تک پہنچا سکیں۔

صبح ہر دو کو بھانجھا کر میں ہونک سے نکل کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ میں نے ہونک کا کارڈ جیب میں نہ رکھنے والی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ پاسپورٹ بھی میرے پاس ہی تھا۔ امین کا دیا ہوا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے دو

بیس بدلیں اور پھر قریباً تین گلو میٹر پیدل چل کر اس ایڈریس تک جا پہنچا۔ یہ ایک سرکاری دفتر کی عمارت تھی۔ یہ جان کر مجھے از حد حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی سندھی یا پاکستانی فیملی قیام پذیر نہیں تھی۔ نہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ یہاں بس فرسٹ فلور پر بیرون ملک جانے والوں کو انجکشن وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ امین نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ اس سے امین کی نیت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ میری عقل پر ہتھ پڑ جاتے اور میں اسے اس کے حوالے کر دیتا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں تھکا ہارا سہ پہر کے وقت واپس ہونک پہنچا۔ اس بات کا افسوس تو تھا کہ اس کے والی وارثوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا لیکن اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ ابھی وہ میری سندھی اور کسی غیر فیملی صورت حال کا شکار نہیں تھی۔ ہونک واپس پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی یہاں کسی سندھی فیملی کا سراغ نہیں ملا۔ وہ طویل سانس لے کر روتی۔ اس نے کمرے کو آئینے کی طرح صاف ستھرا کر دیا تھا۔ ہر چیز قرینے سے اس کی جگہ پر رکھی تھی۔ میں ہونک آتے ہوئے مہرو کی بتائی ہوئی اشیائے آیتا تھا۔ یہ ایک نیک سندھی بریانی کی چیزیں تھیں۔ دال، چکن، آکل، پیاز، لہسن اور مسالے وغیرہ۔ بریانی اس نے رات کو پکائی تھی، اس لیے دوپہر کی پیٹ پوجا کے لیے میں دو بڑے برگر اور لسی کی بوتلیں لے آیا تھا۔

کھانا کھاتے کھاتے وہ اچانک بولی۔ ”کچھ لسی لے کر آئی ہوگی؟“

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کچھ لے آئی ہوگی؟“

”بچہ اسی ولی نہیں۔“

”آپ کی زال اسی ہے سائیں؟“ (زال یعنی بیوی)

”بہت اچھی.....“

”آپ اسے چھوڑ کر روزی لے گئے تھل آئے ہیں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہوگی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ہاں، بہت یاد کرتی ہوگی۔“ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں میں دہن بنی عارفہ کا چہرہ گھوم گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی تک جلد عروسی میں بیٹھی تھی۔

”میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔“ اور تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟“

ساتھ ساتھ غصے کی جھلک بھی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ لنگڑاتا ہوا آٹھ دس قدم پیچھے آگیا۔ باقی دونوں افراد بھی ہمارے پیچھے آئے۔ جعفر تیز تیز کچھ بولنے لگا۔ مسجد کے صحن میں اس کی آواز بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ یقیناً مہرہ کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مہرہ میرے پاس ہے اور خیریت سے ہے لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور چلانے لگا۔ وہ عربی میں کہیں کہیں اردو کے لفظ بھی بول جاتا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں صحت بولنے کی کوشش نہ کروں۔

عمر رسیدہ نور بخش میرے اور جعفر کے درمیان آیا۔ اس نے جعفر کو یہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ میں نے نور بخش سے کہا۔ ”تسلیم اس کو سنبھالو۔ میں اسے بتا بھی رہا ہوں کہ مہرہ میرے پاس ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔“

نور بخش کی اردو بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ بہر حال وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے جعفر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ”کہاں ہے ہماری دھی (بہن) ہمیں جلدی سے اس کے پاس لے جاؤ۔ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم دیوانہ ہو گیا ہے سائیک۔“

پکڑی والا سندھی مجھے زاہدان والی بس میں نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً یہ یہاں کا کوئی مقامی سندھی ہی تھا۔ میں ان تینوں افراد کو لے کر ہوٹل میں پہنچا۔ مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی تو مہرہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے مجھ میں چھری تھی اور وہ برائی کے لیے پیاز وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ اپنے سامنے اپنے بھائی کو کچھ کروہ ششدر رہ گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور خوشی کی پورش ایک ساتھ نظر آئی۔ پھر وہ چلا کر اپنے بھائی جعفر سے لپٹ گئی۔ وہ بلند آواز میں رونے لگی۔ عمر رسیدہ نور بخش مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

مہرہ کے رونے سے دراز قد جعفر نے پتا نہیں کیا مطلب لیا۔ اس کے لبوترے چہرے پر میرے لیے ایک بار پھر ٹیش کی لہری دکھائی دینے لگی۔ بہر حال اگلے چار پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہو گیا۔ مہرہ نے جعفر اور نور بخش کو تفصیل سے بتایا کہ میں نے اس سے کیا سلوک کیا ہے اور اس کے لیے کس کس طرح خود کو معصیت میں ڈالا ہے۔

دونوں بزرگ میرے جد شکر گزار نظر آنے لگے تھے۔ جعفر کی نظر میں بھی کچھ جھلکی جھلکی تھیں۔ نور بخش نے مجھے بتایا کہ انہیں زاہدان میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکوں کے

اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں ایک دم رنگ سے بکھر گئے۔ شرما کر بولی۔ ”مجھے کیا پتا تھی..... میرے بڑوں کو پتا ہو گیا پھر میرے پا کو پتا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تمہارا اپنا کوئی خیال نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے ارد گرد کوئی ایسا نہیں جو تمہارے ساتھ شادی کے لیے مناسب ہو؟“

وہ ایک دم فہم پڑی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نہیں بابو سائیک۔“ میں نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”تم فہمی کیوں ہو؟“

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بس ایسے ہی فہمی نکل مئی بابو سائیک۔“

”فہمی ایسے ہی تو نہیں نکلتی۔ کوئی وجہ ہوتی ہے۔“

”بس نکلتی ہو گئی تھی۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے اسے اس بارے میں تھوڑا سا کرید اتو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے چائے چاچے کے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا ہے جو اسے پسند کرتا ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے لیکن اسے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ویسے بھی مہرہ کی معصومیت ایسے معاملوں میں اسے بڑی مہم ہوئی تھی۔

عصر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ مہرہ عرصے بعد دل چاہا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔ میرے اندر جو جان لیوا نوٹ پھوٹ گئی ہوئی تھی، وہ کسی روحانی سہارے کا تقاضا کرتی تھی اور معصیت میں خدا سے بڑا سہارا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ ساتھ مہرہ کے لیے بھی دعا مانگتا چاہتا تھا۔ اس کا بھائی جلد سے جلد مل جائے اور وہ اس دیار غیر میں کی بڑی معصیت کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ اس سے بڑی معصیت ایسی کہ اس کے پاس سفری کاغذات تک نہیں تھے۔ وہ کسی بھی وقت حالات میں پہنچ سکتی تھی۔

مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گیا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرا تو میری نظر سب سے پہلے مہرہ کے بھائی جعفر پر پڑی۔ جعفر کے ساتھ ہی سفید ڈاڑھی والا نور بخش نماز پڑ رہا تھا۔ نور بخش کے ساتھ ہی ایک اور اچھڑ عمر سیدھی تھا۔ اس کے سر پر سنو می ٹیبل کے بجائے بڑی سی پکڑی تھی۔ یہی لوگ مہرہ کے وارث تھے۔ مجھے کچھ دعا مانگنے سے پہلے ہی دعا قبول ہو گئی ہے۔ سید سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ میں اٹھ کر اگلی صف تک پہنچا اور دراز قد جعفر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے..... آخری رنگ میں شدید حیرانی کے

حلقے کے بعد میں اور مہرہ دیکھنے ہی بھاگے تھے۔ وہ تین چار دن زہدان میں ہر ممکنہ جگہ پر مجھے اور مہرہ کو تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس مسافر سرائے میں بھی پہنچے جہاں میں نے اور مہرہ نے دو دن قیام کیا تھا لیکن جعفر اور نور بخش کے پہنچنے تک ہم سرائے سے ہول شفت ہو چکے تھے۔ بہر حال جعفر وغیرہ کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ہم زہدان سے تہران روانہ ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ وہ ہم سے ایک دن پہلے ہی یہاں تہران پہنچے تھے۔

میں نے ان لوگوں کو چائے وغیرہ پلائی۔ میں انہیں کھانا بھی کھانا چاہتا تھا لیکن انہیں جلدی تھی۔ وہ تہران کے مضافات میں ٹھہرے ہوئے تھے اور آخری بس روانہ ہونے سے پہلے بس اسٹینڈ پہنچنا چاہتے تھے۔ قریب ایک گھنٹے بعد وہ لوگ مہرہ سمیت مجھ سے رخصت ہو رہے تھے۔ دونوں بزرگوں نے مجھے بار بار گلے سے لگایا اور شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ جعفر کو بھی میرے ساتھ ساتھ ملنا پڑا اور شکریے کا لفظ کہنا پڑا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا یا شاید مسکراتا ہی نہیں تھا۔ ایک طرح سے یہ وہ دور احسان تھا جو میں نے اس پر کیا تھا۔ پہلا احسان وہ تھا جب میں نے نعمان بارڈر پر، ریت میں دبے ہوئے ٹھنپے سے اس کی جان چھڑائی تھی، ورنہ یقیناً ممکن تھا کہ اس کی ہڈی ہی کوٹھ پالی ساس کا یہ زخم اب کافی حد تک بہتر تھا۔ دوسرے احسان تو میں احسان تو نہیں کہہ سکتا، یہ ایک اخلاقی فرض تھا جو میں نے پورا کیا اور مہرہ کو بخیر و عافیت اس تک پہنچایا۔ اس میں اللہ نے بھی بہت مدد کی..... خاتمہ خدا میں نماز ادا کرتے ہوئے ہمارا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

وقت رخصت مہرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ باپو! میں....." اس نے کہا اور نگاہیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہیں میرے پاؤں کو چھوری تھیں۔ وہ جیسے ایک خاموش ادا کے ساتھ خود بھی یہی کلمات چھوری تھی۔ ایک عجیب عقیدت ایک انوکھا سا احترام تھا اس کے انداز میں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ میں اللہ کا سائبندہ اسے احترام کے قائل تو نہیں تھا اور پھر وہ چلی گئی۔ زندگی کے سفر میں لوگ ایسے ہی ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ شب و روز کی مسافت کو اگر ریل گاڑی سے تعصیبہ دی جاتی ہے تو کچھ غلط نہیں دی جاتی۔

سامنے میز پر چنے ہوئے چاول پڑے تھے۔ کتنا ہوا پیاز اور لہسن وغیرہ پڑا تھا۔ میں نے یہ ساری چیزیں سمیٹ کر ایک شاپر میں ڈالیں اور ہوٹل کے ایک ملازم کو دے دیں۔

اگلے روز کچھ ادا سی رہی۔ ایک اینڈرزن کے بعد ہوٹل میں بھی بہت کم مہمان رہ گئے تھے۔ ہاں وہ امریکی وہیں تھا جو کل رات ہمیں سڑک پر ملا تھا اور ہم اس کی مدد سے اپنے ہوٹل کو پہچان سکے تھے۔ ناشتے کے بعد میں وقت گزاری کے لیے اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اینڈرزن نامی اس امریکن کو بتایا کہ میں آج کل شدید امیہن اور پریشانی کا شکار ہوں اور سکون حاصل کرنے کے لیے بغداد کے ایک بہت بڑے ولی اللہ کے روئے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اینڈرزن نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ قریباً اٹھارہ سال سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ وہ اردو بڑی روانی سے بولتا تھا۔ ہم تادیر لابی میں بیٹھ کر کپ شپ کرتے رہے۔ میں نے اینڈرزن سے کہا۔ "آپ نے قریباً ساری دنیا گھوم لی ہے۔ آپ کو سب سے اچھے لوگ کہاں کے لگے؟" وہ بولا۔ "ایک قوم کی حیثیت سے، میری رائے کے مطابق سب سے بہتر حجاز لوگ ایرانی اور مصری ہیں۔ یہ اپنے خیالات کے معاملے سے بے حد کثرت اور کٹر محسوس ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پاکستان کے بارے میں آپ جناب کا کیا خیال ہے؟"

وہ بولا۔ "میری رائے میں یہ بھی اور سادہ قوم ہے۔ خوش اخلاق بھی ہے..... لیکن کچھ پائستانی مجھے شریک بھی محسوس ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اینڈرزن صاحب! اچھے برے لوگ ہر جگہ جوتے ہیں۔"

اینڈرزن کے ساتھ اچھی کپ شپ رہی۔ دوپہر کو میں کھانا کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں گیا۔ وہاں بھی سری پائے بڑے ذوق و شوق سے کھائے جا رہے تھے..... اور بغیر روٹی کے کھائے جا رہے تھے۔ یہاں پلیٹوں پر مختلف بزرگوں کی تصویریں بھی چھائی نظر آئیں۔ کچھ لوگ ان تصویروں والی پلیٹوں میں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا اور ایک خواجہ والے سے دال روٹی کھا کر پیٹ پوجا کر لی۔ تہران باغات اور پھولوں کا شہر تھا۔ گلی کو چپے جنت کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اطراف کے برف پوش چھاؤں سے آنے والا شفاف پانی، آبی گزرگاہوں سے نکلتا تھا اور تہران کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ باشندے..... شہر سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آتے تھے۔ چاق و چوبند پولیس والے جدید بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکلز پر وندنا تے پھرتے تھے اور کسی کو قانون شکنی کی

ریگستانی علاقہ شروع ہو گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ہم عراق میں داخل ہونے والے ہیں۔ بلندی سے نشیب کا یہ سفر قریباً آٹھ دس گھنٹے پر مشتمل تھا۔ آخر بالکل خشک میدانی علاقہ آ گیا..... آب و ہوا یکسر بدل گئی۔ تھوڑے مزید سفر کے بعد ہم ایران عراق بارڈر پر پہنچے۔ بارڈر پر ایک طرف شاہ ایران کا بلند و بالا مجسمہ تھا اور دوسری طرف صدر صدام حسین کا۔ وہ جیسے آئنے سا سننے کھڑے ایک دوسرے کو نگھور رہے تھے..... ایک کہہ رہا تھا، میرے پاس زیادہ ”تیل“ ہے، دوسرا کہہ رہا تھا میرے پاس زیادہ ”ترقی“ ہے۔

گامڑی یہاں رک گئی۔ ہمارے کاغذات وغیرہ چیک ہوئے۔ تب ہم ایک عراقی بس میں سوار ہوئے اور عراق میں داخل ہو گئے۔ عراقی بس میں بیٹھ کر پاکستان کی کھٹارا بیلوں کی یاد تازہ ہو گئی اور صرف بس ہی نہیں ارد گرد کے سارے مناظر بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ علاقہ خشک اور بخر۔ بغیر فٹ پاتھ کے خستہ حال سڑکیں، بوسیدہ مکانات، کچھ یہی حال لوگوں کا بھی تھا۔ بیلوں لگتے تھے کہ عراقیوں کی اکثریت نے لنڈے کے کپڑے زیب تن کر رکھے ہیں۔ ہماری بس چند گھنٹوں تک خشک میدانی علاقوں میں وحول اڑاتی رہی اور آخر بغداد پہنچ گئی۔ بغداد اب بھی امن اور داستانوں کا شہر جو لاتعداد مرتبہ اجڑا اور بھر آباد ہوا۔ بغداد سے میرا پہلا تعارف بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں مثلاً بغداد کا چور اور الہ دین وغیرہ سے ہوا تھا۔ اب وہی تصویراتی شہر میرے سامنے تھا اور میں اسے اپنی آنکھوں سے جیتی جانتی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ یہ عمر کا وقت تھا۔ بغداد کی مساجد سے شام کی آذان بلند ہو رہی تھی۔

ہمارے جس شہر کے ایک مصافحاتی اسٹینڈ پر رکی تھی۔ میں نے راہ گیروں کے حضرت عبدالقادر جیلانی کے روضے کا پتہ پوچھا اور پیدل ہی چل دی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا لمبا ہے۔ ہوگا۔ میں عجیبی جگہ پر داخل ہوا تو اصل راستے سے ہٹ گیا۔ پرانے شہر کی طرف نکل گیا۔ پرانے بازار، محرابی دروازے، قدیم بالکونیاں اور تنگ راستوں پر چلے پھرتے لوگ۔ سب کچھ کہانیوں کے مناظر جیسا لگا۔

بہت زیادہ چلنے اور تھک کر چور ہونے کے بعد میں
جات کوئی ساڑھے تین گیارہ بجے غوث پاک عبد القادر جیلانی
رحمہ اللہ سے پر پہنچا۔ ایک عجیب طرح کے روحانی احساس
نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں یہ بتانے میں کوئی
عذر نہیں سمجھتا کہ میں زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ نماز پڑھنے میں بھی
باقاعدگی نہیں تھی اور اللہ والوں کے پاس یا ان کے مزارات

جرات نہیں تھی۔ مجھے مہر و کا خیال آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ راستے میں ایک نہایت خوب صورت مسجد میں عمر کی نماز پڑھ کر میں جوں پہنچا تو امرئین اینڈ رن گھوڑے پھرنے کے لیے باہر جا رہا تھا۔ ہم نے دور ہی سے علیک ملیک کی۔

تھمے دیر ادھر ادھر کھوئے اور فی دی دیکھنے کے بعد میں سو گیا۔ دوبارہ میری آنکھ ایک شور سے کھلی۔ کھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی کھول کر دیکھا۔ معمول کے مطابق ہول کا مین دروازہ بند ہو چکا تھا۔ امریکن اینڈرسن باہر تھا اور شور مچا رہا تھا کہ دروازہ کھولا جائے۔ ایرانی گارڈ بعد تھا کہ ناظم اوپر ہو چکا ہے اس وقت کسی صورت دروازہ نہیں کھولے گا۔ امریکن تقریباً آدھ گھنٹے تک شور مچاتا رہا اور انگریزی میں چلاتا رہا لیکن ایرانی گارڈس سے کس نہیں ہوا۔ آخر گارڈ اپنے کیمین میں واپس چلا گیا اور امریکن کچا جھلکا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

صبح سات بجے کے الگ ہو گئے۔ جب ہوٹل کا دروازہ کھلا تو امریکن کو اندر آتا نصیب ہوا۔ وہ ساری رات نہ جانے کہاں جھل خوار ہوتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں ایرانی کا رُخ کی ٹاہرت قدمی پر خوش ہوا۔ اس نے میری ہباؤ کی تسکین دھمکیاں سننے کے باوجود اپنے اصول سے انحراف نہیں کیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”مسٹر ایف ڈی ایم ایک ہی کہتے ہو، ایرانی قوم دنیا کی ”سخت ترین حزان“ کی قوموں میں سے ایک ہے۔“

☆☆☆

طیّک تین روز بعد میں بھرے پرے تہران کو اور اس کی رونقوں کو غور کرنا کہ کرمراق کارخ کر رہا تھا۔ اپنے چند ہم سفرؤں کے ساتھ میں ایک آرام دہ بس میں سوار تھا۔ دو روز پہلے ہی ہمارے پاس عراق کے ویزے تھے۔ ویزے کے کٹنے کے بعد اور ٹکٹ خریدنے کے بعد اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اب ایک نیا سفر تھا، نئی سرزمین میں، نئے لوگ، نیا جہاں۔ تاریخ اس خطے کے تذکروں سے بھری پڑی تھی۔ امیر معاویہ سے لے کر صلاح الدین ایوبی تک اور صلاح الدین عباسیہ سے لے کر سلاطین عثمانیہ تک نہ جانے کتنے فرماں روا یہاں آئے اور گئے۔ کتنی تفتیش آباد اور برباد ہو چکی.....

ہماری بس بڑی تیز رفتاری سے پہلے بلند و بالا
پہاڑوں پر چڑھی اور ہمیں شدید سردی کا حور چمکایا..... پھر
بتدریج نیچے اتری..... اور اترتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ

پر جانے کا تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا..... لیکن پچھلے دنوں میں جن سنگین حالات سے گزرا تھا اور میرے اندر جو نوٹ پھوٹ چکی تھی اس نے مجھے، اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ کیا تھا اور مجھے روحانی سہاروں کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقہ مبارک کو دیکھ کر میرے دکھ یلغار کر کے میری آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ جیسے کوئی دکھوں کا مارا بچہ اپنے کسی شفیق بزرگ کو دکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے، میں بھی رو دیا۔ آنکھیں اور آہوں سے میرا سینہ دھلنے لگا۔ نہ جانے میں کتنی دیر اسی طرح اپنی آنکھوں کا پانی ٹھوڑتا رہا۔ آخر دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، مزار کا دروازہ رات گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ بند دروازے کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میرے اندر کا وجدانی جوش مجھے اندر جانے کے لیے اکسارہا تھا۔ میں نے آہنی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد ایک خادم نظر آیا۔ اس نے ایک لمبا چندہ پہن رکھا تھا۔ ہال منتشر تھے، اس کے عربی میں کچھ کہا۔ غالباً یہی پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟

میں نے اشاروں کی زبان اور ہاتھوں کو ملا کر اسے بتایا۔ ”میں ایک مسافر ہوں۔ یہاں رات گزارنا چاہتا ہوں۔“ وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے میں کوئی اٹھائی گھیرا ہوں یا پھر چوری کی نیت رکھتا ہوں۔ اس نے کمر بستہ کچے میں عربی بولی اور مجھے بتایا کہ وہ اس وقت میرے لیے دروازہ نہیں کھول سکتا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی واپس چلا گیا۔

میری دلی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ آنسو مسلسل آنکھوں سے رہے رہے جاری ہے تھے۔ میں کسی دھتکارے ہوئے ہلکے سے گھٹنے کی طرح پھر پھوٹ ہاتھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ بدن کھانا ہے چور تھا۔ رات تو کسی طرح گزارتا ہی تھی۔ ارد گرد تاری تھی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں مجھے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے آبائی قبرستان کا چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ اگر قافچہ پر ہی بیٹھا رہتا تو مستی پولیس والے مجھ سے پوچھ کچھ شروع کر سکتے تھے۔ میں اٹھا اور غنودگی کی سی حالت میں چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا۔ رات کے اس پہر یہ شہر فحوشاں کچھ اور بھی خاموش و سنان نظر آ رہا تھا۔ قبروں کی طویل قطاریں تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں وہ قبریں نمایاں نظر آتی تھیں جن پر سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ یہ ڈرانے والے مناظر تھے لیکن

موت سے بڑا ڈر کس چیز کا ہوتا ہے..... اور میں تو جیسے زندگی اور موت کے احساس سے بچا نہ ہو چکا تھا۔ شاید میں اسی وقت مر گیا تھا جب اپنے گھر کی چھت پر میرے اندر کی ساری روشنیاں اچانک بجھی تھیں اور میں اپنی منتظر دہن کو چھوڑ کر نکل آیا تھا۔

میری ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ میں ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر شیخ عبدالقادرؒ کے مزار کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں روشنی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو کھڑکی میں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر مبارک بھی نظر آئی۔ ایک بار پھر میں ہتھکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں پکار کر کہا۔ ”حضرت! دیکھیں آپ کا یہ فقیر کہاں کہاں سے ملے گا۔“ کھاتا ہوا آپ تک پہنچا ہے۔ اس کا جسم ٹھکن سے چور ہے اور روح اس سے بڑھ کر زخمی ہے لیکن آپ کے محافلوں نے اسے زندہ کر دیا ہے۔ اسے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دے رہے اور پتا نہیں کہ آئندہ بھی پہنچنے دیں گے یا نہیں.....“

میں روتا رہا۔ رات بھر نہ حال سا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ نیند آ رہی ہے۔ میں کہیں سو گیا ہو گا جانا چاہتا تھا۔ سامنے ہی سنگ مرمر کی دو قبریں ساتھ ساتھ نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ یہ تو کیا اور میرے اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ سائبان سائبان کیا تھا اب قبرستان میں تھوڑی سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ان دونوں قبروں کے درمیان خلا میں کھس کر لیٹ گیا۔ اپنے بوٹ اتار کر میں بیٹھ گیا۔ کچھ کے طور پر اپنے سر کے نیچے رکھ لیے تھے۔ یہ جیسے رات کی طور پر سونا بھی عجیب سونا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے محسوس ہوا کہ دائیں طرف والی قبر سے کسی اوجیز عمر شخص کا ہاتھ لٹکا ہے اور اس نے مجھے اپنی قبر کے اندر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر غنودگی کے بعد بائیں طرف والی قبر میں براسرار حرکت محسوس ہوئی اور میری سماعت سے کسی عورت کی مدھم فہمی کی آواز نکلتی تھی۔ مجھے پتا تھا یہ سب میرے واسطے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد میں سو گیا لیکن میری یہ نیند زیادہ طویل نہیں تھی۔ شاید آدھ پون گھنٹا ہی گزرا ہوگا، اچانک میں جاگ گیا۔ مجھے پھر محسوس ہوا کہ کوئی مجھے اپنی طرف بھیج رہا ہے۔ اس مرتبہ مجھے پہلو کی طرف سے نہیں بلکہ پاؤں کی طرف سے کھینچا جا رہا تھا..... اور یہ یقیناً وہم نہیں تھا۔ کوئی تھا وہاں..... جو مجھے بھیج رہا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے یہی لگا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔

(جاری ہے)